

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

تخلصورت کسانوں کا مجموعہ

# سنسنی

ماہنامہ

جولائی 2016

گلروہی  
معراج رشول



READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

[www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)





# عید مبارک

ایکے خط

8

مدیر اعلیٰ

سپنس کی مجلس مشاورت وقت رائیں کی تلخ و شیریں باتیں اگلے شکوے اور پریشانیوں سے

الغائب

07

جون ایلیا

قوت گویائی اور ظرف سماعت کی اہمیت کو اجاگر کرتی تحسیر

محبت اور فاصلے

59

طاہر جاوید مغل

محبت کو پانے کے لیے فاصلوں کو مٹانے والی ایک عظیم ترہانی کا احوال

بہشت ناز

16

الیاس سینا پوری

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

داک

101

تنویر ریاض

دوسروں کا غم ہلکا کرنے والے ایک بیسار کی حساندار ہوشیاری

شیش محل

70

اسماء قادری

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان

پہلا پتھر

112

مرزا امجد بیگ

رشتوں کے وہاں اور سازشوں کے جہاں میں ابھی جسمات کارروائیوں کا احوال

خط

109

بابر نعیم

محبت کی پیشانی میں ذہن کا ایک زیرک و متاثر کار بہرینا خوب

خفیل شعرون

156

قارئین

آپ کے ہاتھوں بھی ایک انجمن رنگ آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

انابت

145

محمد زبیر سلیمانی

مسکروہ چہرے اور کالے من کے سوداگروں کا چوتھا دینے والا انجمن

جلد 46 • شماره 07 جولائی 2016 • 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: (021) 35895313 (021) 35802551 فیکس: (021) 35802551 E-mail: jdpgroup@hotmail.com



# عید مبارک

179

نسیم جاوید سید

ناواقف

پھونک پھونک کرتے دم رکھنے والے  
محبس کی بدلتی سمتوں کا ماحبرا

159

علی اختر

سو پٹر کرل

نگ مر مر پر چلنے والے قدموں  
کی لرزشوں کا لفسریب ماحبرا

235

ابراہیم جمالی

عزت کا سوال

خود ساختہ سفاک  
رسم و رواج کا خون پس منظر

186

محی الدین نواب

مارگو کی

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی  
عنایتوں، رفاقتوں اور رفاقتوں کا ایک لرباسلا

243

ضیاءتسنیم بلگرامی

فضل حرم

سنت رسول اور احسان  
کے فتد روان ایک ولی کا ماحبرا

239

ثمر عباس

گمشدہ

زندگی کے گم شدہ احساسات کا  
احاطہ کرنے والے کی حبالاکی

259

سلیم انور

مات

مختصر سی دولت کے حصول کی حنا طہر  
قیمتی حبان دینے والے شیرے کا قصہ

255

منظر امام

داستان گوگلوں کی

بے جسی کے مستدرسیں احسان  
کا سنسکر پھیلنے والے شخص کی کاوش

000

ارارہ

کترتیں

دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، حکے،  
اقتباسات، مسکراہٹیں اور تہنہ سب کچھ آپ کے لیے

264

ناہید سلطانہ اختر

حکایت سو دریاں

محبت اور ضرورت کو ساتھ لے کر چلنے  
والے ایک مسافر کی بے سرو سامانی کا منظر



## حقیقت حال

ہر آدمی کو وہ رائے رکھنے دو جو رائے وہ رکھنا چاہتا ہے اور یہی حق گرد ہوں کو بھی دو۔ لوگوں کو وہ بات ضرور کہنے دو جو وہ کہنا چاہتے ہیں۔ جو بس اپنی ہی کہنا چاہتا ہے اور دوسروں کی ایک نہیں سنتا چاہتا اسے مان لینا چاہیے کہ وہ کہنے کی کوئی ایک بات بھی نہیں کہنا چاہتا یا پھر یوں کہہ لو کہ وہ بہت ہی بھونڈی برائیاں بولنے کی خواہش میں مبتلا ہے۔ میں تو یہ گمان کرتا ہوں کہ دنیا میں ایسا کوئی آدمی نہیں پایا جاتا جو دوسروں سے زیادہ بولنے کا حق رکھتا ہو۔ تمہارے ہونٹوں سے چاہے دنیا کی عجیب و غریب حکمتیں ہی کیوں نہ نکلتی ہوں اور دوسرے کی زبان پر بکواس کے سوا اور کچھ بھی نہ ہو پر ہے یوں کہ بولنے کے حق میں دونوں برابر ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سے دانش مند میری اس بات کو ایک بڑے زیادہ کچھ نہ جانیں پر میں یہی کہے جاؤں گا کہ بڑی بڑی باتیں کرنے والو! مجھے بھی بڑھانکنے کا حق دو۔ آخر یہ کب اور کیسے طے ہوا کہ تم بولنے رہو گے اور میں چپکا بیٹھا سنتا رہوں گا؟

وجود کی فضا کا روشنی اور آواز سے جو رشتہ ہے، وہ کتنے گہرے رشتوں کا ایک رشتہ ہے۔ یہ وجود اور وجود کا رشتہ ہے۔ پر ہم نے یہ دیکھا کہ انسانوں میں سے بہت سے انسانوں میں اس رشتے کو توڑنے کی ایک بھیانک ہوس پائی جاتی ہے۔ روشنی اور آواز وجود کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جتنا دیکھ سکودیکھ لو، جتنا بول سکو، بول لو۔ جتنا سن سکو، سن لو۔ سماج سے میرا جھگڑا اور کیا ہے؟ شاید یہی تو ہے کہ یہ سماج ایک ایسے گٹھ جوڑ کا نام ہے جس میں اوپر کے گٹھ جوڑیوں کے سوا باقی سارے لوگ بے جان چیز سمجھے جاتے ہیں۔ کچھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہے اور کچھ میں آتا بھی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ جو لوگ سب کچھ کہنے اور سب کچھ کرنے کا اختیار حاصل کر لیتے ہیں انہیں انسانوں سے ہیر کیوں ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے وجود سے باہر کی فضا کو اپنے حق میں ناسازگار کیوں بنا لینا چاہتے ہیں؟ وہ یہ کیوں پسند کرتے ہیں کہ انہیں ناپسند کیا جائے؟ ہے یوں کہ میں اور تم سوالوں کے آدمی ہیں اور جوابوں سے ہماری معمولی خالی ہے۔ سو میں اپنے آپ سے سوال پر سوال تو کر سکتا ہوں پر اپنے آپ کو جواب دینے کا مقدور نہیں رکھتا اسی لیے اپنی ذات کے گرد و پیش میں میرے لیے حیرتوں اور حسرتوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ سو یہ ہوں میں اور یہ ہے میرا حال اور یہ شخص جو میں ہوں، اس کا ایک نتیجہ ہے جو میرے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ مجھ سے بستیاں بسی ہوئی ہیں اور میں ان بستیوں میں ویران ہوں۔ سوا میں پھر ایک سوال کروں گا اور وہ یہ ہے کہ جب میری ذات کی ساری بستیاں ویران ہیں تو پھر یہ آبادیاں آخر کون پر چھائیوں کی آبادیاں ہیں؟ بتاؤں.....؟ ہاں بتاؤ، بھائی بات یہ ہے کہ یہاں ان لوگوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے جن کا ہونا ان کے سوا باقی تمام انسانوں کا نہ ہونا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی بات منوانے اور اپنا حکم چلانے کا حق رکھتے ہیں۔ پہلے تو یہ حق ان کو میراث میں ملتا تھا یا زور اور زبردستی سے حاصل کیا جاتا تھا۔ کہیں کہیں یہ صورت اب بھی پائی جاتی ہے مگر اب جو عام صورت پیدا ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ حق لوگوں کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ ان عام لوگوں کی طرف سے جو یہ عجیب و غریب حق دینے کے بعد خود کسی حق کے حق دار نہیں رہتے۔ دنیا میں چاہے اور کہیں ایسا ہوتا ہوتا ہوگا مگر یہاں تو ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ بول رہے ہو تو بولنے بھی دو، نہیں تو لوگ بولا جائیں گے۔ گویائی کا شوق ایک نیکی ہے پر اس نیکی کے ساتھ اگر شنوائی کی بدشوقی پائی جائے تو پھر یہ نیکی بدترین بدی بن جاتی ہے۔ اگر گویائی انسان کی صفت ہے تو شنوائی خدا کی صفت مگر کچھ لوگ ہیں جو شنوائی کی صفت سے کسر بے بہرہ پائے گئے۔ جن کی گویائی پر بناؤ اور بگاڑ کا دار و مدار ہوا ان کو تو سراپا شنوائی ہونا چاہیے۔ ان کی شنوائی تو ان کے پورے سماج کی شنوائی ہوتی ہے۔ انہیں تو وہ باتیں بھی سن سکتی چاہئیں جو کہیں بھی نہ گئی ہوں۔ اب اگر ایسے لوگ ناشنوائی کو اپنا روگ بنالیں تو پھر جان لینا چاہیے کہ سماج میں کوئی بھی کسی کی نہیں سن رہا۔

کیا ایسا نہیں ہے کہ جیسے کوئی بھی کسی کی نہ سن رہا ہو اور ایسا یوں ہے کہ جنہیں سب کی سنتی چاہیے وہ کسی کی نہیں سنتے۔ سنو اور سمجھو کہ جہاں شنوائی نہیں وہاں دانش اور دانائی نہیں۔ جتنا سنو گے اتنا ہی سیکو گے، سوا اپنی شنوائی سے سیکھو اور اپنی گویائی سے سکھاؤ۔ یہ بات کہ حقیقت حال کیا ہے، جاننے کی بات ہے یا نہ جاننے کی۔ میرے خیال میں یہ جاننے کی بات ہے۔ خواہش یہ رکھی جائے اور کوشش یہ کی جائے کہ تمہاری شنوائی تک زیادہ سے زیادہ لوگوں کی گویائی کا فیض پہنچے۔ یہ جدا جدا مزاجوں اور جدا جدا مسلکوں کی گویائیاں ہوں۔ یہ نہیں کہ کسی ایک ہی مزاج اور ایک ہی مسلک کی گویائی پر قناعت کر لی جائے۔ اب ذرا سوچو تو کسی کہ وہ لوگ حقیقت حال سے کس قدر بیگانہ ہوں گے اور دانش و دانائی سے کس درجہ بیزار جو زبان بندی کو رو رکھیں۔ یہ کتنا بڑا خسارہ ہے اور اس سے بھی بڑا خسارہ یہ ہے کہ اس خسارے کی خواہش رکھی جائے اور یہاں میں یہ بھی کہہ دوں کہ زبان بندی زبانوں کو بڑے غضب ناک لہجے سکھاتی ہے۔ یہی ہے اور یہی ہوا بھی ہے۔





عزیزانِ من!  
السلام علیکم!

جولائی 2016ء کا دلچسپ شمارہ رمضان المبارک اور عید الفطر کے لمحات کو چار چاند لگاتے ہوئے حاضر ہے۔ تمام اہالیانِ وطن کو ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ بجلی کیشنز کی جانب سے دلی عید مبارک..... اللہ تعالیٰ ہمیں رمضان المبارک کی سماعتوں سے فیضیاب ہونے اور عید کے خوشگوار لمحات میں مستحقین کو بھی یاد رکھنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین) ہم مہذب دنیا کے تہذیب یافتہ باشندے..... کہیں ترقی پذیر تو کہیں ترقی یافتہ اور اکثریت تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ مختلف ناموں سے "وابستہ دن" منانے کتنے ضروری ہوتے ہیں اور ان کے مقاصد سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ پورے سال ہم کوئی نہ کوئی دن منارہے ہوتے ہیں۔ میڈیا پر کوریج ہوتی ہے۔ جلسے، جلوس، سیمینارز منعقد ہوتے ہیں مگر..... افسوس ان سب کا دشور اور شور شرابے کے نتائج..... گویا ہوا میں خاک اچھال دی گئی ہو..... کیونکہ ہم نے صرف دن منانے کا فیشن اپنایا ہے..... اور فیشن تو بس ایک چلن کا نام ہے، چلنا آئے یا نہ آئے چلنا پڑتا ہے۔ مثلاً قادیانہ ڈسے، ارتھ ڈسے، آزادی صحافت کا دن، انجمن لوگوں کا دن، عورتوں کا عالمی دن، ناپیتا افراد کے لیے سفید قمیڑی کا دن وغیرہ وغیرہ اور بے شمار دن۔ اگر کبھی سنجیدگی سے ان کے مقاصد اور اثرات پر توجہ دینے کی کوشش کی جائے اور مختلف پروگراموں کے نام پر لٹائی جانے والی دولت ان کے ثمرات کی تقسیم پر خرچ کی جائے تو ان دنوں کو منانے کی افادیت اور لطف دو بالا ہو جائے مگر..... بد قسمتی سے پاکستان کو شاید سیاست کی ایسی دیمک لگ چکی ہے جو قابلِ اذہان کو بھی سنجیدگی سے اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ سال کے 365 دن مہنگائی کا جو حال رہتا ہے وہ تو اپنی جگہ مگر بجٹ کی دھماکا خیز آمد سے ماشا اللہ اس میں جو باقاعدہ ترقی نظر آتی ہے وہ زندگی کے کسی اور حوالے سے محسوس نہیں ہوتی۔ اب رمضان المبارک میں ہی دیکھ لیجئے ایشیائے سرف کی قیمتوں میں اضافہ جس ذوق و شوق سے کیا جاتا ہے اور اس کی پشت پناہی کرنے والا ارباب اختیار طبقہ کس قدر بے فکری سے اپنے مشاغل میں گم رہتا ہے بلکہ آج کل تو اربکان پارلیمنٹ کے پورے حلقے کا زور اپنی تنخواہوں اور دیگر مراعات میں بے تحاشا اضافے پر ہے۔ جو پہلے سے کروڑ پتی ہیں اور جو ٹیکسوں کی چوری میں ماہر ترین بھی ہیں جن میں سے اکثریت ان کی ہے جنہوں نے کبھی عوامی مسائل پر لب کشائی کی بھی زحمت گوارا نہیں کی ہوگی..... البتہ تنخواہوں کے نام پر ان کا آپس میں اتحاد اور لاکھوں روپے کا مطالبہ..... بلکہ میڈیا پر دکھائی جانے والی مختلف جلسے جلوس کی تیاری پر خرچ کیا جانے والا تحنہ اور ان جلسے جلوس میں ایک دوسرے پر الزامات کی بھرمار دیکھ کر عوام کی بے چارگی کا احساس خون کے آنسو لانے کے لیے کافی ہے۔ جن کے مسائل کے نام پر سیاست چمکائی جاتی ہے ان پر وسائل کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں مگر ہماری محفل کے شرکاب بڑے دل کے مالک ہیں۔ جو ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ رمضان المبارک اور عید کی خوشیوں میں ان کا حصہ بھی ادا کرتے رہیں گے جو خاموشی سے ہماری توجہ کے شکر رہتے ہیں۔ اللہ ان کا بھرم اور ہماری عزت قائم رکھے۔ آمین۔ ارنے محفل کی جانب قدم بڑھائیے بھی کتنی دیر سے دروازے پر کھڑے ہیں۔

محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے کرسی صدارت پر براجمان ہیں "انتہائی سادہ لیکن خوش رنگ جامنی رنگ سے مزین سرورق ایک مدبر اور پرکشش دوشیزہ کا دوپٹے کی آڑ لپے ہوئے انداز بہت دلچسپ ہے۔ انٹرایٹ میں ڈکن سے ایک خط پڑھ کر ذہن میں اردو ادب سے متعلق کئی درجے تک مل گئے۔ اس کی خاص وجہ کہ میرا تعلق بھی حیدرآبادیوں سے ہی ہے اور کئی سال قبل میرا وہاں جانا ہوا۔ میرے ماموں وہاں حکیم طیب ہیں۔ ان کے توسط سے مجھے وہاں کی ادبی شخصیات سے مل بیٹھنے کا موقع ملا۔ پاکستان کے اردو رسائل، ناول، ڈائجسٹ ماہناموں کی تعریف پاکستانی شعراء کے کلام کی تعریف سے ان کی زبان تھک نہیں رہی تھی۔ مجھے بے پناہ مسرت ہوئی۔ ان حضرات کی خواہش پر میں نے 10 مختلف ڈائجسٹ حیدرآبادیوں کو بھجوائے اور وقتاً فوقتاً وہاں جانے والے لوگوں کے ہاتھ بھی کتا ہیں و رسائل بھیجتا رہا۔ جس کی بہت پذیرائی ہوئی (بہت خوشی ہوئی یہ سب جان کر) اب اپنی پیاری خطوط کی محفل کی طرف رخ موڑ لیا۔ سب سے پہلے اپنی عزیز بہن طاہرہ گلزار پشاور جنہوں نے میری آنکھ کے آپریشن کی کامیابی پر عیادت کی۔ جب بہنوں کی دعا میں شامل حال ہوں تو بھائیوں کو کچھ نہیں ہوتا۔ شکر ہے۔ مونا رضوان کورنگی سے صدارت پر فائز ہونے پر بہت مبارک ہو۔ آپ کو میری کورنگی والی بہن ہونے کے لیے بھی مبارکباد۔ آپ کی تحریر بہت فصیح اور سلیبی ہوئی ہے۔ آپ کے تیسرے خط نے کیا کمال دکھایا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ خطوط میں طاہرہ گلزار بہن دوسرے نمبر پر۔ لگتا ہے خواتین بڑی توجہ سے پڑھ کر دلی جذبات سے خط تحریر کرتی ہیں۔ ہم مرد حضرات شاید غم روزگار اور تنگی کی ناگہانی آفتوں کا شکار ہونے کے باوجود خطوط کے ساتھ جسم و جاں کو یکجا کر کے لکھتے ہیں۔ سب سے پہلے اسما قادری کی شیش گل پڑھی۔ اس دفعہ انہوں نے حیدرآباد کی بہت ہی نیکالی زبان کو کہانی میں شامل کیا، حیدرآبادی زبان کا ایک ایک لہجہ بہت ہی اصلی ہے۔ کیا مصنفہ کو حیدرآبادی زبان پر اتنا عبور ہے یا وہ خود حیدرآبادیوں کو سننے سے تعلق رکھتی ہیں؟ کہانی میں بڑی تیزی آتی ہے۔ رہن دادا کی معاملہ بھی بہت عمدہ ہے۔ تمام کرداروں کو بڑی عمدگی سے ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ جو زمین کے مزے آگئے۔ اب یہ عالم ہے بجلی ڈھانکی گھنٹے بعد آئی اور 5 منٹ بعد پھر چلی گئی۔ دماغ تو تھ پیٹ بن گیا ہے۔ یا اللہ تو رحم کر۔ معمولی عورت ایک خاتون نے فلطاً آدمی کا انتخاب کیا۔ مجبوری میں کیونکہ وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ جب ایک عیار آدمی تھا۔ وہ اس کو زہریلی دیتا رہا اور بے اعتنائی برتا تھا۔ خاتون نے ایک نیکی کی۔ بیمار عورت کو طوفان کے باوجود زندگی دی اور نیکی نے اس کی زندگی بچالی اور ایک با مقصد زندگی کی راہ بھی دکھادی۔ بڑی دلچسپ کہانی اور



منظر نامہ تھا۔ درحقیقت، ملک صاحب کا ایک اور منفرد کارنامہ خودکشی کے ساتھ کہیں کو ہاتھ میں لیا تو ایسی حقیقتیں سامنے آئیں کہ محفل حیران ہو گئی۔ بیباکی تھیں کھلنے لگیں۔ یہ خودکشی تھی بلکہ ایک سفاک اور جاہل ماں نے سارا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ آخر سارا معاملہ حل ہو گیا۔ خود اپنے وام میں، دو چور اور طریقہ واردات بہت کارآمد لیکن حرم وہوں نے ان کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیے۔ وہ ساری چالاکی عیاری خدا کی ایک ہی ضرب میں پاش پاش ہو گئی۔ بڑی فصاحت آمیز کہانی۔ مچ ڈاؤن، ایک ذہین عورت جس نے مجرم کے ہتھے چڑھ جانے والی کیملی کے حالات کو اپنے خیال اور بہترین ذہنی صلاحیت کو بروئے کار لا کر نہ صرف اپنی کیملی کی زندگی بچائی بلکہ مجرم کو بھی گرفتار کروا دیا۔ مختصر لیکن بڑی منفرد کہانی۔ نیلی کہانی، ایک کہانی جو جوانی کی بے انکام گھوڑی پر سوار بڑا قدم اٹھانے لگتی ہے۔ نہ صلے کی پروا نہ بدنامی کا خوف۔ جہالت سے بھر پور تھا۔ پرانے وقتوں میں کھجور بوڑھی خواتین اس کا خیال رکھتی تھیں مگر آج کل ان کو خطی سمجھتی ہے یہ نوجوان نسل۔ قدرت نے عجیب انتقام لیا۔ بہشت زار، منگولوں کا دور اور جنت کی جستجو۔ کہانی میں عجیب و غریب واقعات اور جدوجہد۔ کہانی قدیم دور کی ایک دلچسپ داستان۔ قرض..... حرم وہوں، رشوت ستانی کی داستان الم، ہمارے دین نے جس کو منع کیا وہ ہم ضرور کرتے ہیں اور عذاب الہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نیاز احمد نے بے ایمانی سے پیمانہ کیا یا۔ اپنے اہل و عیال اور اولاد کو بھی برباد کر دیا۔ غم گسار، ایک عجیب طرح سے شروع ہوئی۔ ایک گھبرائی ہوئی لڑکی جو کسی کے ڈر سے بھاگ رہی تھی۔ دو غم گساروں نے خوف سے نجات تو دلا دی مگر افسوس موت سے شکست کھا گئی۔ مات، دو کہانیوں کو ساتھ ساتھ چلاتے ہوئے آخر یکجا کر دیا گیا۔ شروع میں خاص مزہ نہ آیا لیکن جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان نسل نے کہانی کو نیا موڑ دیا اور اختتام ایک شخص کے ایمان کی مضبوطی، حوصلہ، وطن پرستی کی لازوال داستان۔ کتر نہیں اس دفعہ کچھ کم نظر آئیں لیکن بہت شاعرانہ اشعار کی محفل بھی لا جواب تھی۔ (آپ کا انداز اور اشارے پر گہری نظر تو ہمیں بھی چونکا دیتی ہے)

اشفاق شاہین، کراچی سے محفل میں شریک ہیں "ٹائٹل بہترین تھا۔ انشائیے میں جون ایلیا نے اردو کے ارتقا و تاریخ سے پردہ اٹھایا۔ محفل میں پہنچے تو مونا رضوان کرسی صدارت پر براجمان تھیں، بہترین خط کے ساتھ۔ طاہرہ گلزار، صفدر معاد، یہ عمران جوانی بھی بہترین مخطوط کے ساتھ شامل بزم تھے۔ باقی دوستوں کے مخطوط بھی لا جواب تھے۔ اپنی غیر حاضری کھٹکی۔ دو تین ماہ پیشہ وارانہ ذمے داریوں کی وجہ سے نہ لکھ پائے، اب سے باقاعدہ۔ بہشت زار عام تاریخی کہانیوں سے ذرا ہٹ کر تھی، بہترین رہی۔ طاہرہ جاوید محفل مختصر مگر پُر اثر کہانی کے ساتھ موجود تھے۔ طاہرہ صاحبہ آخری صفحات کے لیے کچھ جلد لکھیے پلیز۔ شیش محل میں دوسروں کی طرح ہم بھی فاروق کی صحت یابی اور جوئیٹ کے ساتھ ملاقات کے منتظر ہیں۔ رہن کے دن بھی برسے لگ رہے ہیں۔ دیکھیں اس معرکے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ ایک بندے کا نقصان تو ہو چکا اس بار ایسا لگا کہ صفحات کم تھے۔ ساتھ، بتایا نہ چلا کہ ختم ہو گئی۔ ہاں جو زمین کے کردار میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے جس سے کہانی پر بھی اثر پڑ سکتا ہے اس کو جلد ختم کریں، مطلب ڈائری کو۔ ملک صفدر حیات بھی معمول سے ہٹ کر مختصر مگر پُر اثر تحریر لے کر سامنے آئے۔ گند۔ نیلی کہانی، مختصر کہانیوں میں سب سے بہترین تھی مزہ دے گئی۔ ویلڈن نعمان اسحاق۔ ماروی میں ہم کب سے منتظر ہیں کہ اس کے کردار انسانی جون میں آئیں لیکن ہمارا امتحان لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ خدا را کچھ خیال کیجیے۔ مات آخری صفحات کی بہترین تحریر تھی۔ تمام کردار بہترین تھے۔ خصوصاً روحی اور ایان کا کردار اور انجام بھی خوب صورت رہا۔ محفل شعر و سخن میں اس بار بھی انتخاب لا جواب تھا خصوصاً صفدر معاد، کھکشاں فاروق اور رضیہ عمیر کا انتخاب بہترین تھا۔" (مختصر اور جامع تبصرہ بہت لا جواب رہا)

تحسیریم شاہ، لاہور سے محفل میں حاضر ہیں "شدید گرمی میں ٹائٹل کے لائٹ کلر ز کو دیکھ کر ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ خاص طور پر ٹائٹل گرل کی جیولری پسند آئی پھر فہرست پڑھی اور کاشف زبیر کا نام نہ دیکھ کر دکھ بھی ہوا اور مایوسی بھی۔ ساتھ ہی جون ایلیا نے دکن سے ایک خط میں میری پسندیدہ اور محبوب زبان اردو کی تاریخ اور آج کا حال واضح کر دیا جسے پڑھ کر شدت سے احساس ہوا کہ اردو کو پاکستان میں بھی جو اہمیت اور مقام ملنا چاہیے، وہ نہیں مل رہا اور انگلش کے مقابلے میں اردو آنے والی نسلوں کے لیے غیر اہم اور مشکل زبان بنتی جا رہی ہے۔ آپ نے بھی ادارے میں یا نکل درست فرمایا۔ ماہ شعیان اور رمضان آنے والے ہیں اور لوڈ شیڈنگ گرمی کی طرح بڑھتی جا رہی ہے اور حکمرانوں کو آپس میں لانے سے فرصت ہی نہیں ہے تو ہماری تکلیف کا مداوا بھلا کون کرے گا..... سوائے اللہ کے جو کسی بھی مسلمان کی پہلی اور آخری امید ہے۔ خیر اب آتے ہیں اپنی بیبیری سی محفل کی طرف۔ سب سے پہلے تو بہت، بہت شکریہ کہ آپ نے اپنی بیبیری سی بارونق محفل میں اتنی قیمتی جگہ میرے خط کو دی اور سنی کے شمارے میں میرا پہلا نڈٹ شائع کیا۔ سہنس سے محبت کا عالم دیکھ لیجیے کہ پیپر میں مصروف ہونے کے باوجود خط لکھ رہی ہوں کہ کہیں آپ لوگ مجھے بھول نہ جائیں۔ مونا رضوان کو بہت مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ آخر کار تیسری کوشش میں سید عاصم صدارت نصیب ہو گئی۔ طاہرہ گلزار آئی مجھے اتنے پیار سے ویکلم کرنے کا بہت شکریہ اور بات رہی عمر کی تو ابھی تو آپ نے بس گولڈن جوبلی مکمل کی ہے، میری دعا ہے کہ آپ انشاء اللہ سچری پوری کریں گی۔ مرحا گل کو اس دفعہ محفل میں مس کیا۔ سب سے پہلے عادت سے مجبور ماروی پڑھی جس میں عابد علی منگی عرف عالی کا کردار بہت پسند آیا لیکن یہ کیا..... اس قسط میں ماروی کو ہی مارو یا، یہ مجھے ذرا اچھا نہیں لگا۔ قرض بھی اچھی تھی لیکن انجام اچھا نہیں ہوا۔ بھلا اس محسوم چھ سال کے بچے کا کیا تصور تھا کہ اس کے باپ نے اسے حرام کھلایا۔ شاہدہ نے بھی اس بے چارے کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ یقیناً وہ بھی کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔ معاشرے کا یہ بہت برا نظام ہے کہ باپ کے کیے کی سزا اولاد کو دی جاتی ہے۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے انشاء اللہ اگلی بار بھر پور تبصرہ کروں گی۔ ابھی پیپر میں مصروفیت کی وجہ سے کم پڑھ پائی ہوں۔" (دیکھیے جناب..... سہنس سے محبت اپنی جگہ مگر پہلے تعلیم پر توجہ ضروری ہے۔ تبصرے کا شکریہ)

قاسم رحمان، ہری پور سے تبصرہ کر رہے ہیں "ایگزیمز کی وجہ سے سہنس کی محفل سے غیر حاضر ضرور رہا لیکن اپنے پیارے دوست سہنس کو بھولا نہیں (بس یہی اپنایت تو ہے جس نے آپس میں سب کو جوڑے رکھا ہے) اس مرتبہ سہنس اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ 20 سنی کول ہی گیا۔ ٹائٹل پر حسینہ دو پٹامنٹ کے آنے کر کے بالی وڈ ایکٹریس کی طرح شرمانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ انشائیے میں جون ایلیا





کی باتیں ہمیشہ دانائی سے بھر پور ہوتی ہیں۔ مونا رضوان اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ کربھی صدارت پر قبضہ بنانے نظر آئیں۔ مبارک ہو صدارت کی۔ طاہرہ گلزار اپنے بھر پور جامع تبصرے کے ساتھ محفل میں موجود تھیں۔ ساگرہ مبارک ہو اگرچہ وہیر سے دس کر رہا ہوں۔ مرزا طاہر الدین آپ کے تبصرے سے زیادہ مجھے آپ کا شعر پسند آیا۔ ناہید یوسف اور عبید احمد ملک و یلکم ان سہنس..... ایم عمران جوانی کا تبصرہ پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ کتنے بیچور انسان ہیں آپ۔ عبادت کاظمی، معراج عباسی اور رضوان ثنوی کو کس کیا..... کہانیوں کی ابتدا ہمیشہ شیش محل سے ہی ہوتی ہے۔ کونے ٹریا کے لیے جان دے کر حقیقی معنوں میں اپنے بھائی ہونے کا فرض نبھایا۔ ضروری تو نہیں رشتے صرف خون کے ہوں، دل کے رشتے خون کے رشتوں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط اور پائیدار ہوتے ہیں۔ جوزف اور جوزفین کی ہسٹری بھی انٹرنیٹنگ لگ رہی ہے۔ چاند بانو کا کردار بھی کافی مضبوط ہے۔ آخری صفحات پر مات عمر عبداللہ کا ایک اور شاہکار ناول تھا۔ روحانہ کے کردار کی مضبوطی نے کافی متاثر کیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ خدانے شایان صدیقی کے دل کو اپنی راہ کی طرف موڑ دیا۔ ملک صفدر حیات کی تعینیش نے بھی بھر پور تفریح مہیا کی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی قرض ایک بہترین کہانی تھی۔ نیا احمد کے گناہ کا کفارہ اس کے بیٹے کو ادا کرنا پڑا..... واقعی جس کا خیر لقمہ حرام سے اٹھا ہوا اس کا انجام دیکتی ہوئی آگ کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ نعمان اسحاق کی نیلی کہانی میں بیگ سسٹرز کے لیے بہترین سبق موجود تھا۔ انسان کو اپنی کرنی کا پھل اس دنیا میں ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ نیلی آپ نے بھی اپنے گناہ کا کفارہ ادا کیا تو زندگی نے وفاندگی۔ خود اپنے دام میں نادر اور وسم اپنے ہی دام میں پھنس گئے۔ زیادہ سے زیادہ کا لالچ ہمیشہ انسان کو زندہ درگور کرتا ہے اور اکثر کشتیاں ساحل کے قریب آکر ہی ڈوب کر رہتی ہیں۔ ابتدائی صفحات پر بہشت زار ایک عمدہ تاریخی ناول ثابت ہوا۔ ماروی اپنے اختتام کی طرف سر پٹ بھاگے جا رہی ہے۔ مغربی شاپاروں میں سے معمولی عورت بیٹ رہی۔ اس معمولی عورت نے اپنے ساتھ اپنی بوڑھی پڑوسی سنسکارے کو بچا کر ایک غیر معمولی کام سرانجام دیا۔ بیچ ڈاکون بھی اچھی تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن میں شوکت علی زخمی، محمد کمال انور، انیلہ رشید اور معراج عباسی کے اشعار بہترین تھے۔ اس بار کتر نہیں بھی اچھی تھیں۔“

✽ ناز اقصیٰ زکی ضلع سرگودھا سے آمد 18 تاریخ کو جون کا شمارہ ملا۔ پہلی نظر چنیل حسینہ پر پڑی۔ ایک آنکھ پر دو پٹا دوسری تیر کی طرح تیز دل ناتواں کو کانتی ہوتی معلوم نہیں شرماتی تھی یا شرمندہ تھی۔ بہر حال ناٹھل اچھا تھا۔ اب تھوڑا سا اپنے بارے میں بتا دوں کہ بہت عرصہ سہنس سے دور رہا ہوں۔ رسالہ تو پڑھتا تھا مگر خط لکھنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ جیسے تیسے کر کے وقت نکال کر آٹھ سال بعد خط لکھ رہا ہوں۔ (سبحان اللہ..... آٹھ سال بعد خیال تو آیا۔ محفل میں خوش آمدید) اکثر دوست غائب ہیں۔ پرانا قاری ایک نہیں تھا۔ میری تمام پرانے دوستوں سے اہل ہے کہ وہ دوبارہ محفل میں حاضر ہوں تاکہ کپ شپ ہو۔ کہانیوں کی کیا بات کریں، سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ سہنس اپنے عروج پر ہے۔ بھائی رانا نارنگ پور سے ملاقات ہوئی تو خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ سہنس کے لیے دعا اور تمام دوستوں کو سلام۔“

✽ زرین آفریدی، حیدرآباد سے محفل میں صنف نازک کی نمائندگی کرتے ہوئے ”شدید گرمی میں دو چکر لگانے کے بعد سہنس کا دیدار ہوا۔ پر پل کھر کے ڈریس اور سلور جیولری میں حسینہ دلوانو کو دیکھ کر گرمی کا اثر کم ہو گیا۔ پتا نہیں سندھ کو کس کی نظر لگ گئی جو گرمی منہ پھاڑے چیخ رہی ہے۔ ہم سندھ کے نازک مزاج لوگ برداشت ہی نہیں کر پارہے۔ اللہ سا میں سے رحم کی دعا کرنے کے بعد، ادارہ سہنس کے شکر گزار ہیں کہ موسم کی سختی کے باوجود ہمیں ایسا شاندار ڈائجسٹ دیا جس کے پڑھنے سے یہ گرم اور بڑے دن جلد گزر جاتے ہیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا محترم کے نام دکن سے ایک خط آیا ہوا تھا جو کہ اردو زبان کی زبوں حالی پر مبنی تھا۔ اردو زبان اور اردو رسم الخط کا جواب نہیں۔ جس کو جو کرنا ہے کر لے، اردو زندہ باد۔ ادارہ یہ ماہ و سال کی فکر کرتا نظر آیا، احباب گرامی یہی تو زندگی ہے رواں دواں، چل سوچل، ہم اشرف المخلوقات یہ سب سختیاں و پریشانیاں سہنے ہوئے آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ پاکستانی قوم ایک بہادر اور مضبوط قوم ہے۔ سب اللہ توکل چل رہا ہے۔ لفظ پھلوانی بہت خوب صورت لگا، شکر..... پھلوانی کا پہلا پھول مونا رضوان، واقعی خوشبو بھی بہترین تھی۔ طاہرہ گلزار آئی پورے صفحے پر قبضہ کیے ہوئے تھیں۔ رضوانہ قریشی اچھی چیز اور اچھی بات کی تعریف اس کا حق ہوتا ہے۔ عمران جوانی اور عبید احمد ملک بھی خوب صورت تبصرے لیے ہوئے تھے۔ ماشی کا آئینہ میں بہشت زار سطر جادو گر تحریر ایک ہی نشست میں ختم کی لیکن تھکنی برقرار رہی۔ اب مزید کا انتظار ہے۔ نیلی کہانی نعمان اسحاق، کہانی آف دی منٹھ قرار دوں گی۔ بہترین عبرت ناک، اثر انگیز اسٹوری ہے۔ احمد سے جذبات انسان کو نہیں رکھتے۔ ملک صفدر حیات کی درحقیقت اس بار حقیقت تک نہ پہنچ سکی۔ اسٹوری میں ادھورا پن تھا۔ رجوعی لڑکیاں بزدل ہوتی ہیں، وہ خودکشی کر لیتی ہیں۔ شرم عباس کی بیچ ڈاکون، بہر حال خوب رہی۔ ڈیانا نے اپنی دوست جولیا کو اس کے مزاج اور سوچ کو پڑھتے ہوئے جبری ہو گن جیسے خطرناک قیدی سے نجات دلوائی۔ خود اپنے دام میں، طاہرہ جاوید مثل صاحب کے کیا کہنے۔ نادر اور وسم کے جرائم اور ان کا انداز انہی کے گلے پڑ گیا۔ بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب قرض کی صورت میں ہم قارئین کے لیے بہترین تحفہ لائے۔ کرپشن، رشوت خوری، دہشت گردی جیسی آفات انسانی عام ہو چکی ہیں مگر یہ سب کرنے والے جب پکڑ میں آتے ہیں تو کچھ نہیں بچتا اور ان کو آتی سلسلوں تک سزا ملتی رہتی ہے۔ عمر عبداللہ صاحب کی مات، ہم قارئین کے لیے سوغات سے کم نہیں ہے۔ ردمانہ کی طرح مضبوط کردار کی لڑکیاں اسلام کو قوت بخشی ہیں۔ اس کو پانے کی لگن میں شایان صدیقی نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ پروفیسر عبدالجبار جیسے اسلامی اسکالر بھی مذہب اسلام کو مضبوط کرنے میں بہترین رول ادا کرتے ہیں۔ الغرض ماہ جون کے سہنس ڈائجسٹ میں تقریباً وہ کہانیاں پڑھنے کو ملیں جو آج کل کی ضرورت ہیں۔ لگتا ہے اسٹوری کی سلیکشن بیچور ہاتھوں میں ہے۔ ماروی کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ ماہ جون کی قسط لا جواب رہی۔ اب یہ داستان اس معیاری ڈائجسٹ کے مزاج و اسٹینڈرڈ کے مطابق چل رہی ہے۔ عالی کا کردار بہت دلچسپی لیے ہوئے ہے۔ شیش محل میں اسٹوری نے جوزفین کی زندگی کو فوکس کیا ہوا ہے جس سے جولیت کے پاس لاکھ کی موجودگی اور حقیقت معلوم ہوگی۔ یہ داستان بھی دلچسپی کا سامان لیے ہوئے ہے جس سے گرمیوں کے لمبے دن سکون سے گزر



رہے ہیں۔ مراٹھے سارے شاعر اور معیاری ہوتے ہیں۔ محفل شعر و سخن تو ویسے ہی میری پسندیدہ ہے، اشعار بار بار پڑھتی رہتی ہوں۔



علی رحمان، سندھیا ڈوہلی سے تشریف لائے ہیں "ایک سال کی مسلسل غیر حاضری کے بعد میں تشریف لارہا ہوں۔ (جی ضرور

ضرور..... خوش آمدید) جون سنس ڈائجسٹ 23 کو طویل انتظار کے بعد ملا۔ سرورق نہایت دلکش رنگوں کا استخراج تھا۔ لڑکی پر دے میں لپٹی اپنے محبوب کو شرمنا کر دکھا رہی تھی۔ فہرست پر نظر ڈالی تو دل باغ باغ ہو گیا کہ میرے ہیرو طاہر انکلی کی کہانی دیکھی۔ اس کے بعد جون ایلیا کا انٹرویو پڑھا اور لفظوں کے سحر میں کھو گیا۔ کربھی صدارت پر مونا رضوان کا خط پڑھا اور کافی شاندار تھا، مبارکباد۔ طاہرہ گلزار کا تبصرہ شاندار اور طویل تھا۔ اللہ آپ کو صحت کامل دے۔ مرزا طاہر بیگ کا شعر کافی پسند آیا۔ طاہر انکلی کی خود اپنے دام میں نہایت پسند آئی۔ نادر سے لفظی ہو گئی۔ وہیم صاحب کہتے بھی رہے کہ وہی چلنا چاہیے مگر نادر نہ مانا۔ انجام اس کا سامنے ہے۔ اسما قادری کی کہانی نہایت شاندار ہے لیکن یہ قسط بوریٹ سے بھر پور ہے۔ جو لیٹ اور فاروق کی کہانی آگے نہیں بڑھ رہی۔ ہر قسط میں باجی چھوٹل تو ہو جاتے ہیں۔ ماروی پڑھی ساری کی ساری دیوتا جیسی۔ ایک گیارہ سالہ نوجوان لڑکا یہ کرے، حیرت اور ناممکن بات۔ آج میں سالہ نوجوان یہ نہیں کر سکتے گا۔ مچ ڈاؤن شرمہاس کی مختصر اور اچھی تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن میں ماہا ایمان، معاد یہ مغل، مچی رحمان، ماسٹر جمیل انور کے شعر پسند آئے۔"

اور لس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے محفل میں شریک ہیں "ناٹشل ڈاکر صاحب کی مہارت کا آئینہ دار تھا۔ اندر انٹائیپ بھی اردوئے معلیٰ کا قسانہ سنا رہا تھا۔ ادارے میں بھی حالات و واقعات کی وہی ڈگر کا ذکر تھا۔ البتہ امید ضرور تھی، امید جس پر دنیا قائم ہے جو زندگی کا پیام ہے۔ ناموں کی محفل میں ہر فہرست مونا رضوان تھیں۔ طاہرہ گلزار کا نام بھی جلوہ گر تھا۔ اچھا تاثر دیا، مبارکباد۔ سب سے پہلے بہشت زار پڑھی۔ ایسا سیتا پوری کی کہانی میں کسی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ اختتام اچھے انداز میں ہوا۔ طاہرہ جاوید کی کہانی خود اپنے دام میں نادر اور وہیم کی سوچ کے مطابق ایسا نہیں ہوا بلکہ ویسا ہوا جیسا ان کے انجام کے مطابق لکھا جا چکا تھا۔ تیسرے نمبر پر اسما قادری کی شیش محل دلچسپ انداز میں آگے چل رہی ہے اور قاری کی دلچسپی کا بھر پور احاطہ کرتی ہوئی یہ تحریر بہت پراثر ہے۔ معمولی عورت میں غیر معمولی استقامت کا مظاہرہ کیا۔ ملک صفر حیات کی درحقیقت بس ٹھیک تھی۔ مچ ڈاؤن بھی اچھی تحریر تھی۔ ڈیانا نے ہمت اور کچھ داری سے کام لیا اور پولیس سے رابطہ کر کے خطرناک، مجرم کو گرفتار کروا دیا۔ مچ مچ میں کتنوں نے بھی لطف اندوز کیا اور آگے کے درواگے۔ اشعار کی محفل میں اچھے اور معیاری اشعار نے کافی محظوظ کیا۔ اس کے بعد باری آئی نیلی کہانی کی۔ اس سے یہ تاثر ملا کہ کسی کی دل آزاری نہیں کرنی چاہیے۔ نیلی نے جوانی کے خمار میں گلے گلے تک ڈوب کر امام سجد کو بھی اپنی اس آگ میں جھلانا چاہا مگر ثابت قدم امام صاحب نے واقعی اللہ کی محبت اور عبادت میں خود کو اتنا منہمک کر لیا تھا کہ نیلی کی لڑائی آگ سے اپنے آپ کو صاف بچا لیا۔ دنیا کے سامنے نیلی کو ایسی عبرت ناک بے عزتی کا سامنا کرنا پڑا یہ ہاتھ نہیں کا وہ فیصلہ تھا جو اٹل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد احمد کی قرض نے بھی متاثر کیا۔ بچے کی حرص وہوس میں مبتلا ہو کر ایک انسان اپنے اعزہ واقربا پر بھی مصیبتوں کے درکھول دیتا ہے۔ نیاز احمد کے ساتھ یہی ہوا۔ حرام کی کمائی نے پورے گھر کو ختم کر دیا۔ دیوں کے سلسلے میں شاہ عبدالرحمن پاک نے بھی دل کو نور کی روشنی سے منور کیا۔ نم گسار میں دو بہنوں نے خوف کا شکار دوسری عورت کے لیے کافی ایثار کیا اور خوف کے اس سلسلے کا خاتمہ کروا جو اسے اپنی زندگی کا بھی تعین نہ کرنے دے رہا تھا۔ آخری صفحات کی کہانی مات بہت خوب صورت اور با مقصد کہانی تھی جس نے وطن پرستی کی محبت کو اجاگر کیا اور وطن کی محبت میں سرشار شایان نے سرخروئی سے وطن کی محبت کا حق ادا کیا اور اسے محبت کی طاقت نے بھی کامیابی سے ہمکنار کیا۔"

صادق معادویہ سعیدی، خان پور، ضلع رحیم یار خان سے تبصرہ کر رہے ہیں "مئی 16ء کے سنس میں اپنا خط پڑھا تو ہوتا چلا کہ آپ نے ہمارے خط پر محبت کی تپتی چلا دی ہے۔ ہم آپ کو تپتی چلانے سے تو نہیں روک سکتے۔ البتہ احتجاج ہمارا حق ہے لہذا اپنا انوکھا احتجاج ریکارڈ کرا رہے ہیں۔ اپنا نام لکھ کر خط پڑھا اور..... اور پھر سنس بند کر کے رکھ دیا اور مئی کے شمارے پر تبصرہ بھی گول کر دیا۔ بے قراری بھی بہت رہی مگر ہم بھی اتنے ضدی ہیں کہ دوبارہ ہاتھ نہیں لگایا۔ زندگی نے وفا کی تو اب مئی کا سنس عید الفطر کے بعد ہی پڑھیں گے (اتنی ناراضی بھی اچھی نہیں ہوتی..... کبھی کبھی جگہ کی قلت ہو جاتی ہے اور جب جگہ ہوتی ہے تو بڑے محظوظ بھی لگا دیے جاتے ہیں) اور اب جون 16ء کا سنس زیب نظر ہے۔ فہرست پر نگاہ ڈالی۔ کاشف زبیر کا نام نہ پیا کر دل دکھ سے بھر گیا۔ حق تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ مونا رضوان صدارت مبارک ہو۔ آپ کا طرز تحریر دل کو چھو گیا۔ لکھتی رہیے گا۔ بیکر غیرت نسوانی عذرا ہاشمی کی طرح غائب نہ ہو جانا۔ طاہرہ گلزار شعر پسند کرنے کا شکر ہے۔ رضوان قریشی آپ تو کمال کرتی ہیں۔ ثنا صادق کا الف لیوی تبصرہ اچھا لگا۔ صفر معادویہ بھائی آپ کا۔ میرا ہم سب کا رونا یہی تو ہے کہ ارباب اقتدار معاشرے سے نا انصافی کا خاتمہ کریں۔ اللہ کرے کسی بھی طرح ہمارے معاشرے سے نا انصافی کا خاتمہ ہو۔ آئین۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل پڑھی۔ کیا کہنے جی تیز رفتار کہانی پر مضبوط گرفت اسما قادری کا کمال ہے۔ ویسے اگر اسما جی! فاروق اور جو لیٹ پر توڑو اساتر س کھائیں تو کیسا رہے گا پھر ماروی پڑھی۔ انکل نواب کے بعد تو ماروی کچھ زیادہ ہی اچھی لگنے لگی ہے۔ اللہ پاک انکل کی مغفرت فرمائے۔ ملک صفر حیات کی درحقیقت ڈھیل ڈھالی کہانی تھی۔ طاہرہ جاوید محفل کی خود اپنے دام میں ایک منفرد اور دلچسپ کہانی تھی۔ نادر اور وہیم اپنے انجام کو شیک پہنچے۔ نیلی کہانی نعمان اسحاق کی شاندار کاوش تھی۔ نیلی نے اپنی یوتی ہوئی اصل کافی۔ کسی کی پکڑی اچھا لگا کر خود آبرو سے رہ لیں، ایسا ممکن تو نہیں۔ مولوی احمد پر ہونے والے ظلم کا انتقام بھورے رچھے نے لیا۔ کیا عجب اور دلچسپ کہانی ہے۔ آخر میں عمر عبداللہ کی مات پڑھی۔ بھارتی درندوں کا وحشیانہ تشدد دل دہلا گیا اور شایان کی استقامت نے دل خوش کر دیا یحییٰ جانے مات دل کی آنکھوں سے پڑھنے کی چیز ہے۔ کہانی میں معلومات کا سمندر موجزن اور جا بجا تاریخ اسلامی کے حوالے لطف دہلا کر گئے۔ مات عمر عبداللہ کی شاہکار تخلیق ہے۔ پڑھ کر لطف آ گیا۔ 3 مرتبہ پڑھ چکا ہوں مگر ابھی تک تشنگی باقی ہے۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ حیات باقی، ملاقات باقی۔ منتظمین و کارکنان سنس اور احباب محفل کو ایڈوانس عید الفطر مبارک۔"





حافظ شعیب معاویہ کی خان پور، خلع رحیم یار خان سے پہلی بار شرکت "سپنس سے دوستی تو کافی دیر سے ہے لیکن بزم دوستوں میں شرکت پہلی مرتبہ کر رہا ہوں۔ (بہت دیر کی مہرباں آتے آتے خوش آمدید) یوں تو پورا سپنس ہی زبردست ہوتا ہے مگر میرا ذوق ہے کہ بزم دوستوں ہی سپنس کی جان ہے۔ اس مرتبہ مونا رضوان الفاظ کے بہترین چناؤ کے ساتھ ایک مکمل اور جامع تبصرے کے ساتھ کربھی صدارت پر جلوہ نکل گئیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ ڈھیر مبارکوں۔ آغا سلمان یا شا اور عذر راہی کو بھی صدارت ملی تھی لیکن وہ ایسے غائب ہوئے کہ..... جیسے..... مونا رضوان جی آپ خیال کرنا غیر حاضر نہ ہونا۔ طاہرہ گلزار، بشری افضل، صفدر معاویہ، ایم عمران جو ثانی، قدرت اللہ نیازی کے تبصرے محفل کی جان اور پہچان تھے۔ سب سے پہلے آخری کہانی پڑھا ہوں۔ اس دفعہ عمر عبد اللہ آخری صفحات کے لیے مات لے کر آئے۔ مات پڑھنا شروع کی تو عمر عبد اللہ کے جاوہ میں جکڑے گئے۔ ایسی دل پر اثر کرنے والی تحریر کہ متعدد بار آنکھیں جھپک گئیں۔ بھارتی ورنڈوں کی وحشت و بربریت کے دلہنہ مناظر، پاک وطن سے والہانہ محبت کے اعلیٰ مناظر، معلومات کی فراوانی، جگہ جگہ تاریخ اسلام کے روشن کرداروں کے حوالے اور شایان کی بے پناہ استقامت دل باغ باغ کر گئی اور اس کا دوری کی شیش گل تو محتاج تبصرہ ہی نہیں۔ زبردست کہانی، جاندار کردار خصوصاً فاروق اور رین دادا کا شہ کہ ہمارے کرتا دھرتا شیش گل میں رین دادا کا کردار پڑھ کر اپنی عوام پر ذرا سانس کر لیں اور ماروی تو اپنی شان آپا کہانی ہے۔ نعمان اسحاق کی نیلی کہانی بھی زبردست رہی۔ نیلی نے مولوی احمد پر تہمت لگائی۔ مولوی احمد کے ساتھ تو جو کچھ ہوا سو ہو مگر نیلی بیچارہ اپنی آبرو بھی کٹوا بیٹھی۔ سچ ہے کہ کسی پر کیچڑ اچھال کر اپنا دامن صاف رکھ لینا ممکن ہی نہیں۔ طاہرہ جاوید محفل کی کہانی خود اپنے دام میں اچھوتی اور ٹاپ گلاس کہانی تھی۔ تنویر ریاض کی معمولی عورت اور ملک صفدر حیات کی درحقیقت بھی اعلیٰ معیار کی تھیں البتہ سچ ڈاؤن نے تمہوڑا سا بورد کیا۔" (اب محفل سے غیر حاضری پر جرمانہ عائد کرنا پڑے گا)

سید عبادت کاظمی، ڈیرہ اسماعیل خان سے محفل میں حاضری لگا رہے ہیں "جاسوسی سپنس سے میرا رشتہ ایسا ہے کہ میں چاہوں بھی تو نہیں توڑ سکتا۔ دو ماہ سے محفل میں حاضری نہیں دی تھی، کسی دوست نے یاد بھی نہیں کیا۔ (جب آپ کے دوست احباب پکار پکار کر کہتے ہیں کہ بہت ہو گئی غیر حاضری اب حاضر ہو جائیں تو..... کوئی کان نہیں دھرتا) 22 مئی کو سپنس خریدنا۔ نائٹل ٹھیک تمام موسم کی مناسبت سے مگر کہتے ہیں ناکہ دل کا موسم اچھا نہ ہوتو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ 19 مارچ کو میرے ابو جان ہمیں چھوڑ کر چلے گئے جب سے لگتا ہے زندگی رک سی گئی ہے۔ (اوہو..... بہت افسوس ہوا۔ اللہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے) مونا رضوان کربھی صدارت کی حق دار پائیں۔ طاہرہ آبی کا طویل تبصرہ محفل کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ واقعی ہم نے محبت کو نفرت میں بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں یہاں ہر کسی کو اپنی پڑی ہے۔ عبدالبجبار رووی کا تبصرہ عمدہ تھا۔ اپنے بہترین لفظوں کے ساتھ جو ثانی بھائی بھی محفل میں موجود تھے۔ ثنا صادق، انم کمال، اور نیس احمد خان عمدہ تجزیے کے ساتھ شریک محفل تھے۔ ہمیشہ کی طرح شیش گل سے شروع کیا۔ رین دادا کی باتیں ہمیشہ اچھی لگتی ہیں۔ لگتا ہے کہ یہی چوٹ کھائی ہوئی ہے۔ فاروق اور بھلا کی قربت کیا رنگ لائے گی۔ چاند بانو کا کردار اچھا لگتا ہے۔ ماروی بس ٹھیک جا رہی ہے۔ آخری صفحات پر مات نے محفل سپنس کی رونق بڑھا دی۔ شایان کی جرأت اچھی لگی۔ روحانہ کا کردار زبردست تھا۔ خود اپنے دام میں زبردست کہانی تھی۔" (دل کا موسم چاہے جیسا بھی ہو، جینے کی ہمت تو کرنا ہی پڑتی ہے)

رانانا بشیر احمد ایاز، ناظم آباد کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "چلپاتی گرم دوپہر کو اچانک سپنس کا ملنا گویا صحرا میں نخلستان مل جانے جیسا محسوس ہوا۔ دو ٹیڑھے سرورق پر پل ٹکڑے سوٹ میں بلبوس، پر پل ٹکڑے کا ہی دو پٹا اوڑھے، صاف دکھتے بھی نہیں اور جھپٹے بھی نہیں کی مکمل عکاسی کرتی نظر آتی۔ آنکھوں میں کاجل، گوری کلائیوں میں ہم رنگ چوڑیاں، گلے میں ہار اور کانوں میں چنبیلی کے پھولوں جیسے چمکے پھن کر کافی اچھی لگی۔ ویلڈن ڈاکرا نکل۔ اشتہارات کی دنیا سے آگے نکل کر انٹائیپ میں جون ایلیا دکن سے آیا ہوا ایک خط پڑھنے میں مصروف تھے۔ ان سے اجازت لے کر سید سے اپنی محفل میں آئے جہاں پر اس دفعہ وکٹری اسٹینڈ پر کورنگی کراچی سے مونا رضوان دو پار کی کوششوں کے بعد آخر کار پہلے نمبر پر آنے میں کامیاب ہو گئیں۔ بہت خوب صورت لکھا آپ نے۔ محترمہ طاہرہ گلزار صاحبہ پشاور سے اس مرتبہ دوسرے نمبر پر رہیں اور بہت بہت سالگرہ مبارک ہو۔ اللہ پاک حیاتِ محترمہ عطا فرمائے۔ آپ نے محفل میں خوش آمدید کیا، بہت اچھا لگا کہ کسی نے ہم جیسے نوآموز کی حوصلہ افزائی کی۔ (یہ محفل آپ کی اپنی ہی تو ہے) محمد صفدر معاویہ گندم کی کٹائی میں مصروف نظر آئے پھر بھی بہت اچھا لکھا۔ جناب غلام یاسین بہت شکر یہ اس دل والی محفل میں اسے خلوص سے خوش آمدید کہنے کا۔ اب تو مستقل ہی لکھنا ہے۔ کافی اچھا لکھا ہے آپ نے۔ عبدالبجبار رووی، انم کمال، احمد خان توحیدی، ثنا صادق، جنید احمد ملک بھی اس دفعہ اچھی فارم میں دکھائی دیے۔ جناب ایم عمران جو ثانی بہت شکر یہ تبصرے کو پسند کرنے کا۔ کہانیوں پر تبصرے سے پہلے تعارف کروانا چلوں۔ سپنس سے عرصہ دس سال سے وابستہ ہوں۔ مابعد دولت عمر عزیز کے 20 ویں سال میں قدم رکھ چکے ہیں اور دس سال سے سپنس سے تعلق ہے (ماشاء اللہ) حیران مت ہوں، دس سال کی عمر سے سپنس پڑھنا شروع کیا تھا (مگر سچ بتائیے کہ تعلیم تو ماستر تھیں ہوئی..... یہ اچھی بات لگتی ہے۔ سچ آج بھی کتاب بینی کا شوق رکھتے ہیں۔ پہلے تعلیم پھر مطالعے کا شوق ہو تو دل کو خوشی ہوگی) پڑھنے کا شوق ابا حضور کو دیکھ کر ہوا۔ ابا حضور اکثر رات کو لائین جلا کر جب رات گئے مطالعے میں مصروف رہتے تو مجھے بڑا تجسس ہوتا تھا کہ آخر اس میں ہے کیا جو رات کو اتنی دیر تک پڑھا جا رہا ہے۔ اس وقت اسکول کی کتاب کے علاوہ کسی چیز کی اجازت نہیں تھی۔ پھر بڑے بھائی سجاد احمد ساحر کراچی سے گاؤں آئے تو ان سے پوچھا پھر کیا تھا انہوں نے نیا شمارہ مجھے دے دیا۔ اسکول میں، میں سپنس چھپا کر لے جاتا تھا اور فری چیریڈز میں پڑھتا تھا۔ بڑے بھائی اور ہم سب مل کر پڑھتے ہیں اور اب ابا حضور سب سے پہلا کام یہ کرتے ہیں جیسے ہی میں ڈائجسٹ لے کر آتا ہوں، پہلے ہی سنبھال لیتے ہیں۔ بہت زار الیاس بیٹا پوری کے قلم کا شاہکار۔ بہت اچھی رہی۔ طاہرہ جاوید محفل اس دفعہ اپنے دام میں خود نظر آئے۔ بہت سبق آموز کہانی تھی۔ چوروں کو بھی سورا پڑ سکتے ہیں لیکن نادار اور دسبم یہ بات بھول گئے۔ محمد اسحاق نعمان





نئی کہانی کے ساتھ موجود تھے۔ بہت اچھی کاوش تھی۔ ناکمل نے جو بیاد ہی کاٹا۔ مولوی محمد احمد کا کردار جاندار تھا۔ شیش گل اس دفعہ فاروق اور ہلا کی آپس میں دو ٹوک گفتگو اچھی لگی۔" (تیسرے کا شعر یہ..... اب غیر حاضری نہیں ہونی چاہیے)

محمد صفدر معاویہ، تحصیل ضلع خانیوال سے تیسرے کر رہے ہیں "جون کا شمارہ بہ آسانی 15 مئی کی بجٹی دھوپ میں ملا۔ سرورق کو ایک بہت ہی خوب صورت، خوب روڈ نشین کان میں چینی کے پھول سے مشابہت اور گلے میں خوب صورت ہار پہنے دلکش ماڈل سے سجایا گیا۔ کہانیوں کی فہرست کو بھی اچھے طریقے سے پیش کیا گیا۔ جون ایلینا محترم دکن سے ایک خط لے کر آئے۔ وہ اردو کی تاریخ کے بارے میں بتاتے ہوئے کہہ گئے کہ اس کا ستیاناس کیا، کس نے مردج بخشا۔ آپ کا ادارہ پڑھا۔ آپ کے الفاظ آپ کے نہیں بلکہ ہم سب کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ یقین جانے اگر ہم عوام اپنا قبلہ درست کر لیں اور حکومت کے سامنے سیدھے ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ حکمران طبقہ سیدھا نہ ہو بس پہلے اپنے اعمال درست کرتے ہیں۔ اپنی مغل میں پہنچے تو کراچی سے مولانا رضوان کو بہت ہی عمدہ تبصرہ کرتے ہوئے کربھی صدارت پر پایا۔ بہترین کاوش مبارکال جی۔ مرزا طاہر الدین بیگ بھی اپنے مفرد انداز کے ساتھ مغل میں جلوہ افروز۔ رضوان قریشی صاحب آپ اتنا خوب صورت لکھتی ہیں تو پھر تمہاری بہت تعریف تو بنتی ہے۔ رانا بشیر احمد ایاز کی بھی بھرپور شرکت۔ اور یس احمد خان آپ خود بھی بہترین انداز میں تبصرہ لکھتے ہیں۔ احمد خان توحیدی دیکھا ادارے والے کیسے دل میں اترتے ہیں۔ جو ادارہ جاسوسی سے وابستہ ہو گیا تو کچھ لوگ وہ تو اس کا ہو گیا۔ ایم عمران جو نانی آپ کو میرا تبصرہ پسند آیا۔ بہت ذرہ نوازی آپ کی آپ خود بھی تو کمال لکھتے ہیں۔ آخر میں شاداد اور جنید احمد ملک کی بھی بہترین تبصرہ نگاری۔ کہانیوں میں شروعات شیش گل سے کی، بہت ہی اچھی رہی یہ قطعاً بھی۔ شریا کی شادی ہو گئی تو کونے اس پر جان وادی۔ فاروق کو لاکھ رکھا گیا۔ جوزفین کے ماضی کی پرتم گل رہی ہیں۔ نواب خاندان کا اضافہ بھی اچھا لگا۔ تجویر ریاض کی معمولی عورت میں غیر معمولی کارنامہ سرانجام دیا مسز جبک نے۔ درحقیقت ملک صاحب کی ڈائری سے ایک کیس، جو رونے اپنے ساتھ خود ظلم کیا۔ نندو نیا کی رہی نہ آخرت کی۔ اس طرح کے واقعات پر ماں باپ کسی کو نہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ میرے اندر درد اتنا بھرا ہے کہ لکھنے پر آؤں تو آپ کے ڈائجسٹ کے صفحات ہی تمہارے پڑ جائیں ایسے واقعات دیکھ کر گریں گے اور پڑ کر میں بے بس ہو جاتا ہوں۔ شرمیاس کی ٹیج ڈاؤن بھی عمدہ رہی جہاں ڈیانا نے جو لیا کا اشارہ بھجوا لیا اور مجرم کو جیل کی سلاخوں میں پہنچایا۔ مغل شہر و سخن میں ہر شعر حراج کے مطابق لگا۔ نعمان اسحاق کی نئی کہانی آپا کی نوجوانی میں کی گئی ایک غلطی کا کتنا بڑا کفارہ ادا کرنا پڑا اسے۔ کافی سبق آموز تحریر تھی کہ اپنا پر عمل سوچ کر کرنا کہ یہ نہ ہو پھر بچھتا پڑے۔ نواب انکل مرحوم کی ماری تک پہنچے۔ یقین تو نہیں آیا کہ ماری مرنے کی۔ ناقابل یقین جس کے نام سے کہانی تھی وہ ہی چل بسی۔ عالی بھی دشمنوں کو ٹھیک پڑھا ہے۔ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آنے والی بات ہے۔ وہیں اسے ہمدرد بھی میسر آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد احمد کے کلم سے قرض لگی۔ رشوت کے موضوع پر بہت عمدہ لکھا۔ رشوت بہت بڑی لعنت ہے جو سب کچھ برباد کر کے رکھ دیتی ہے لیکن آخر میں شہزاد یا آفتاب کے انجام کا دکھ ہوا۔ وہ تو چھوٹا بچہ تھا، اسے کیا معلوم کہ باپ حلال کمار ہے یا حرام۔ شاہ عبدالحق پاک ایک ولی کامل کے حالات زندگی کے بارے میں جانتا اچھا لگا۔ سلیم انور کی نظم گسار میں میا می سسٹرنے مارسیا جو سن کو نام سو دراز سے چھٹکارا دلایا۔ بہت عمدہ۔ عمر عبداللہ مات لے کر آئے۔ بہت ہی ناسخ تحریر رہی۔ جہاں پر شایان نے پہلے تو صحیح معنوں میں دولت ٹھکرانی لگوکاری چھوڑ کر پھر اپنے ملک کی خاطر اپنی جان تک کو داؤ پر لگا دیا لیکن اپنا مقصد پورا کیا۔ ساتھ میں پروفیسر عبدالجبار اور روحانہ کا کردار بھی بہت عمدہ رہا۔ روحانہ کی محبت نے ہی اس کو کامیابی دلائی۔ ایسا سیتا پوری کے کلم سے بہت زار بس گزارہ لائق ہی ہے۔ طاہر جاوید مغل خود اپنے دام میں لے کر آئے جہاں پر نادر کو اس کے لالچ نے مروا دیا۔ وسیم نے تو اچھا مشورہ دیا تھا کہ جب بندہ پھنستا ہے تو اپنے ہی جال میں پھنس جاتا ہے اور پھر حرام کہاں بچتا ہے۔ باقی کترنوں نے بھی بہت لطف دیا۔ اس دفعہ کا سانس بہت عمدہ رہا کیونکہ اس دفعہ ترجمہ شدہ مغربی کہانی کم رہیں۔ تمام پاکستانیوں، ادارے سے وابستہ افراد اور قارئین کو رمضان کی آمد مبارک ہو۔" (آپ سب قارئین کو بھی بے حد مبارک)

مرحوم گل، درابن سے مغل میں شرکت کر رہی ہیں "خود کو ناسخ پر دیکھ کر حیرانی ہوئی (کیوں بھئی..... کہیں خود کو دیکھ کر ڈرتو نہیں لگا) انشاء یہ پڑھا جہاں اردو کی زبوں حالی کا رونا رویا گیا۔ گھوم کر اندر آئے تو اپنے محبوب ڈائجسٹ کو کچھ نہیں بہت بدلا بدلا محسوس کیا۔ بہت سے نئے دوست آئے اور رشتہ جی بکھیرتے گئے۔ ساتھ ہی اپنا تبصرہ تو کیا، نام بھی بلیک لسٹ (کالی بلا) میں نظر نہ آیا۔ (دل بڑا گھس) قدرت اللہ انکل اینڈ عبادت جی کہاں ہیں۔ ماہ جون کی کربھی صدارت پر مولانا رضوان اپنے دلچسپ تبصرے کے ساتھ موجود ہیں۔ پہلا نمبر حاصل کرنے پر مبارکباد۔ دوسرا نمبر طاہرہ گلزار آپنی کا لگا۔ بھئی بے حد مبارکباد۔ صنف نازک کی جیت ہماری جیت ہے۔ بالکل صحیح فرمایا آپ نے، قدرت اللہ جی کو جانے کیوں کچھ کچھ ہو جاتا ہے صنف نازک کو دیکھ کر ہم سے تو..... اللہ معاف فرمائے تنقید کرنے میں بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ محمد صفدر معاویہ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح باوقار اینڈ شاندار تھا، ویلڈن۔ رضوان قریشی کا تبصرہ بے حد پسند آیا۔ ایم عمران جو نانی کا اچھوتا مفرد تبصرہ دل و دماغ میں جگہ بنا گیا۔ اشارت سے ہی کہانیوں پر تبصرہ زبردست۔ اگر دفتر ہمارے راستے میں پڑتا تو ہم دھرنا دیتے ورنہ نہیں کیونکہ ہمارا ہر دفعہ آدھا تبصرہ حاضر ہوتا ہے اس دفعہ شائع کریں ورنہ..... (اک اور دھرنا..... شکر ہے آپ کے راستے میں دفتر نہیں آتا) جنید احمد ملک کے تبصرے کی داد دینی پڑے گی، خوب صورت انداز لیے ہوئے تھا۔ انعم کمال کا تبصرہ حساسیت لیے ہوئے تھا۔ باقی رانا بشیر، اور یس احمد اینڈ احمد خان توحیدی برادرز کے تبصرے بھی پسند آئے۔ اس دفعہ چودھری سرفراز صاحب اینڈ معراج محبوب عباسی، بلقیس خان، احتشام مرتضیٰ کی محسوس ہوئی۔ سب سے پہلے نعمان اسحاق کی کہانی کو پڑھنا شروع کیا۔ دل دکھ سے بھر گیا جہاں صنف و جاہت یعنی (کرتخت) پر غصہ آیا وہاں صنف نازک پر بھی دل دکھ سے بھر گیا اینڈ میں کافی نفرت ہوئی نئی سے۔ اس انجام کی مستحق تھی وہ سبق آموز اسٹوری تھی۔ شیش گل بور سے بور ہوتی جا رہی ہے۔ اس دفعہ گرفت قائم کرنے میں ناکام رہی۔ اگر فاروق کو سمیٹی واپس لا کر پرانی روشنی میں لایا جائے تو کچھ چنچ آئے گا ایسے تو..... ماری کو تو دلیسے بھی سچ سچ میں پڑھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ تجویر ریاض کی اسٹوری بے حد پڑا تحریر تھی۔ ایسے مرد کو روک دیا جانا ہی بہتر ہے، وہ اس سزا کا مستحق تھا۔ ڈاکٹر ساجد احمد اس دفعہ ایک بہترین تحفہ لائے۔ دولت واقعی انسان کو اندھا





کردیتی ہے لیکن حرام کی دولت آخر کار آخری فرد بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ شاہ عبدالرحمن پاک کے علم سے سیراب ہوئے ہاں بکت مینے میں لطف دو بالا ہو گیا۔ غم گسار ایک نہ بھولنے والی کہانی تھی۔ ہمارا خیال بھی آپ سے بہت ملتا جلتا ہے۔ ملک صفدر حیات کی کہانیوں کا تو ہمیں ہمیشہ انتظار رہتا ہے۔ کمال کا جاوہ ہوتا ہے ملک صاحب کی تحریروں میں۔ درحقیقت ایک انفس بھری تحریر تھی۔ کسی کاراز رکھنا بھی راز ہی ہے یعنی راز کی بات ہے۔ جیراں اور یوسف ماچھی کی بے را دی پر انفس ہوا۔ بیچ ڈاؤن خوشگوار سی تحریر تھی اینڈ ذہانت سے بھر پور دوستی نبھانے والی موست فیورٹ رائٹر طاہر جاوید کی تحریر کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ نادر کے لیے اینڈ ہمارے لیے بھی شاید اسے مکافات کہتے ہیں اپنی چھٹی حس کے کہنے پر نہر کے تو پانچویں حس پر رک جاتے بے چارے۔ شمارے کی بیٹ کہانی مات عمر عبداللہ کی، کیا کہوں الفاظ ہی نہیں مگر نہیں الفاظ بنانے پڑیں گے۔ اتنی مضبوط گرفت ہر کردار اپنی جگہ گلینے کی طرح فٹ، کیا کہنے۔ روحانہ کے کردار کی مضبوطی نے گرویدہ کر لیا۔ وہاں شایان کی محبت اور فیصلے کی مضبوطی نے بھی ہمیں لوٹ لیا۔ اس ماہ کہانی اپنے پورے شان شایان سے حق ادا کر گئی۔ شعر و سخن میں محمد صفدر معاویہ کا انتخاب دل کو چھو گیا۔ واقعی حقیقت میں ایسا نہیں۔ باقی محبوب عباسی و رومی انصاری، کشور جہاں کے انتخاب پسند آئے۔ رومی انصاری صاحب کو منگنی کی بے حد مبارک باد اینڈ ڈھیر ساری دعائیں۔ باقی سب دوستوں کو رمضان المبارک مبارک ہو اینڈ ایڈ وائس عید الفطر کی مبارک باد۔“

بیتا وارث علی ملاح، سندھ لیا نوالی سے تمبرہ کر رہے ہیں۔ ”وقت کا کام ہے گزر جانا..... ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ماہ رمضان گیا اور پتا بھی نہیں چلا پھر آ رہا ہے۔ اللہ ہم سب کی دعائیں، ہم سب کی گرمی کی عبادتیں قبول و منظور فرمائے۔ نہ جانے اگلے سال ہم میں سے کون حیات ہو اور کون..... اسی طرح رب تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے ملک کو ہمارے پاکستانوں کو ہر سال عید الفطر کی خوشیاں نصیب فرمائے۔ اس دفعہ کا شمارہ 17 کو فیصل آباد سے ملا۔ ہمارے شہر میں تو 21 کو آتا ہے۔ تمبرہ نگاروں میں ایک سے بڑھ کر ایک شخص موجود تھا ہر کسی نے خوب تحریر کیا۔ مونا رضوان کی تیسری انٹری اچھی لگی اور صدارت کی مبارک دینے کو دل چاہا۔ وزارت عظمیٰ کے لیے محترمہ طاہرہ بکزار ہماری سب کی بہت پیاری آپا موجود تھیں۔ بھئی آپنی جی اتنا بڑا تمبرہ کیسے لکھ راتی ہو۔ بھائی صفدر معاویہ امید ہے اس دفعہ بہشت زار آپ کے ننھی منی سے عقل میں پڑ جائے گی۔ ایم عمران ”جونئی“ بھی بہت بہت شکر یہ حوصلہ افزائی کا۔ عمران نام مجھے بہت اچھا لگتا ہے..... ابتدا حسب معمول شیش محل سے ہی کی..... لیکن چار سطحوں کے بعد بڑے لگانا پڑے کہ شیش محل کے بھڑے ہی آگے نہیں تھے۔ 64 سے لے کر 99 صفحہ تک سب غائب۔ قسم سے بہت دکھ ہوا۔ (ایسا اکثر ہائنڈنگ میں لفظی سے ہو جاتا ہے۔ آپ کو چاہیے تھا کہ اپنے ہا کر کو واپس کر کے دوسرا پرچہ طلب کرتے) شیش محل کی وجہ سے تو ہم سہنس لیتے ہیں۔ آخری صفحات میں عمر عبداللہ کو پڑھا، بہت مزہ آیا۔ شایان نے محبت پاکیزگی سے کی اور پاکیزہ محبت کا ان دونوں کو صلہ ل گیا۔ بیچ میں لفظ فیوں نے جنم لیا تو تھا لیکن وہ لفظ نہیں شایان کے اس کام کے آگے کچھ نہ تھیں جو اس نے انجام دیا۔ نیلی کہانی کو اسٹوری آف منتھہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ نعمان الحق نے بہت نازک اور بہت اچھوتا موضوع چنا اور زبردست طریقے سے انصاف کیا۔ نیلی نے جو احمد جیسے پاک دامن مرد کے ساتھ کیا، اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا تھا۔ قدرت نے ایک بے زبان جالور کے ذریعے احمد کی سچائی ثابت کر دی..... بیچ ہے اچھے اور مومن لوگوں پر آزمائشیں آتی ہیں اور وہ سرخوردگی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی قرض نے ہمیں جو ذکر رکھ دیا، شہزاد بے چارہ معصوم اور بے گناہ ہو کر بھی اپنے والدین کے حرام رزق کی وجہ سے حرام موت مرا۔ یہ کہانی بھی صحت آمیز تھی۔ ملک صفدر حیات نے اس دفعہ کافی رازداری سے کام لیا اور حقیقت تک پہنچ ہی گیا تھا لیکن مزید حقائق کو نہ بتا کر اس نے اچھا ہی کیا۔ خود اپنے دام میں، طاہرہ جاوید انگل کی بہت زبردست مختصر تحریر تھی لیکن سبق سکھا گئی۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے کے مصداق تھی۔ یہ کہانی لالچ، حرص و ہوس پر مشتمل سبق آموز کہانی تھی جس نے بہت کچھ سکھایا۔ ماروی انتہائی عجیب موڑ اختیار کرتی جا رہی ہے..... حیرت کی بات ہے ننھے سے ننھے سے کیسے عجیب عجیب کردار کو رائے جارہے ہیں کہ عقل تسلیم ہی نہیں کرتی۔ شاہ عبدالرحمن پاک المعروف بھڑی والا کافسانہ حیات دلوں کو چھو گیا۔ محفل شعر و سخن میں سارے اشعار بیٹ تھے۔ کتر نہیں کچھ خاص نہ تھیں۔ پچھلے شمارے میں بھائی حبیب الرحمن نے مجھ سے سوچی کیا تھا تو جواب میں میں یہی کہوں گا کہ میں ناراض ہی نہیں تھا بس معروفت میں وقت ہی نہیں مل رہا۔ اللہ ہم سب کو عید الفطر اور مبارک رمضان کی مبارک سماعتوں سے فیض یاب فرمائے۔ آمین۔“ (اسے خوب صورت تمبرے کا شکر یہ)

عبدالغفار فروز، نواں شہر، ایبٹ آباد سے تشریف لائے ہیں ”دن کی چلچلاتی دھوپ، ناساز طبیعت کے کارن جب میں گھر سے اسپتال چیک اپ کے لیے نکلا تو دل میں عجیب سی خوشی بھل رہی تھی کہ آج سہنس کا تازہ شمارہ بھی لیتے آئیں گے۔ جو خوب صورت کہانیوں، دلچسپ ناکٹل اور میری احوال اور شعر و سخن میں انٹری کے ساتھ شاپ پر جلوہ افروز ہوگا۔ کافی دیر بعد اسپتال سے ہم فارغ ہوئے تو نہ چاہتے ہوئے بھی بازار کی طرف چل پڑے۔ کافی دکانوں سے پوچھتا چھ کے بعد آخر کو ایک پر میرے پسندیدہ مگر کے ڈریس میں ملبوس دو شیزہ ادا نے دلہا کے ساتھ ناکٹل پر نمایاں تھی۔ جلدی سے پیسے دے کر کھولا تو ہم احوال میں تو کیا بلکہ لسٹ میں بھی کہیں نہ تھے اور نہ محفل شعر و سخن میں۔ پھر ذہن میں یہ خیال آیا شاید خط ادارے کو پہنچائی نہ ہو۔ پر ایسا بھی میرے ساتھ ہوا نہیں پھر جب اپنے دوسرے پسندیدہ شمارے کو لے کر خط اور اپنے اشعار شائع دیکھے جہاں میرا پہلا خط تھا، وہاں سب شامل احوال اور شعر و سخن تھا۔ خوشی کے ساتھ بہت دکھ ہوا۔ جس رسالے کے پرانے قاری تھے وہاں سے کیسے ریجیکٹ کیا گیا کہ ایک دکھ سا پورے وجود میں سرایت کر گیا۔ احوال میں ہم اپنے پسندیدہ رائٹرز کی موت پر نو حد کتنا ہی تھے ایسا ہم کیا غلط لکھے کہ.....؟ آخری بار احوال میں شرکت کر رہے ہیں، صرف اس جانکاری کے لیے کہ ہمیں کیوں شامل احوال و شعر و سخن نہ کیا گیا؟ کہانیوں میں بہشت زار نے اول سے آخر تک پراسراریت کی دھند میں لپٹائے رکھا۔ کہانی کی شروعات اور اختتام دونوں بہترین ہوئے۔ باقی کہانیوں میں مات، درحقیقت، غم گسار اور خود اپنے دام میں بہترین کہانیاں تھیں۔ ماروی جب بھی پڑھتے ہیں تو بے اختیار ہی الدین نواب صاحب کی یاد پڑ جاتی ہے۔ اب ان کی اور کوئی نئی کہانی کبھی پڑھنے کو نہیں ملے گی۔ نہ جانے ماروی بھی کب اختتام پذیر ہو جائے۔ کافی عرصے سے دیکھ رہا ہوں کہ مغربی کہانیوں میں اب وہ پہلے والا سہنس وہ مزہ نہیں رہا جو آج سے ایک عرصے پہلے ہوا کرتا تھا۔ آخر ایسا کیوں؟“ (بھی کوئی نہ کوئی وجہ





ہوجاتی ہے، آپ کے خط شائع نہ ہونے کی۔ جو خطوط وقت پر مل جاتے ہیں انہیں نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑی بڑی جھمکیاں..... شاید یہ آپ لوگوں کی محبت کا ہی انداز ہو۔ برائے مہربانی اشعار، اقتباس اور خطوط الگ الگ صفحات پر تحریر کیا کریں)

### ✽ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے محفل میں شریک ہیں "معذرت کہ میں بوجہ عیالات گزشتہ ماہ محفل میں حاضر نہ ہو سکا

(اوہو..... تو اب کیا حال ہے..... اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے) جون 2016ء کا سہسپس 16 تاریخ کو مل گیا۔ اس دفعہ کا گیت اب بہت عمدہ تھا، پس ورق بھی قابلِ داد تھا۔ البتہ نثر سادہ۔ انشائیہ اس بار قابلِ فہم زبان میں تحریر کیا تھا اور تحریر معلوماتی بھی تھی۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والی محترمہ مونا رضوان صاحبہ کو مبارکباد، ان کا تبصرہ پسند آیا۔ محترمہ طاہرہ گلزار صاحبہ! میں الفاظ میں کنجوسی نہیں کرتا، بہت ضروری بات کو مختصر کر کے اس لیے لکھتا ہوں کہ دوسروں کو موقع ملے۔ تحریر شاہ تجب ہے آپ کو میرا صرف نام اچھا لگا کام نہیں؟ نام میں کیا رکھا ہے کام دیکھیے یعنی تبصرہ پڑھیے، مختصر اور جامع! بہشت زار، یاد ماضی عذاب ہے یارب۔ خود اپنے دام میں، ارے یہ کیا؟ محفل صاحب اپنے ٹریک سے ہٹ گئے۔ ان کا میدان تو رومان تھا، اب یکا یک جرائم کی دنیا میں آگئے۔ کہانی اچھی تھی۔ شیش محل کی یہ قسط بہت ہی دلچسپ تھی۔ خوب دھیس پٹاس اور اٹھا پٹنگ ہوئی، خوب لطف آیا۔ معمولی عورت شہت جوش اور دولہ لہر جائے تو یہ بڑے بڑے پہاڑ کی چوٹی سر کر لیتی ہے، ہوائی جہاز اڑا لیتی ہے۔ درحقیقت ملک صاحب کا اس دفعہ کا کیس بہت ہی گنجلک تھا، آخر کار ملک صاحب نے مجرم پر ہاتھ ڈال ہی دیا۔ ہمیں تو گمان بھی نہ تھا کہ ماں خود قاتل ہوگی۔ کہانی میں مزہ آ گیا..... ٹیچ ڈاؤن بہت ہی مختصر اور بہت اچھی کہانی۔ نہ سراغ رسانی نہ مارو حجاز اور مجرم بھی گرفت میں آ گیا، کیا خوب۔ ماروی کی یہ قسط پڑھتے ہوئے اس کے اختتام کا سوچ کر بہت دکھ ہوا۔ قرض کافی اثر انگیز اور سبق آموز تھی۔ تمسکار کا پلاٹ بالکل اچھوتا تھا، کہانی پسند آئی۔ مات ایسی کہانی لکھنے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے اور عمر عبداللہ نے یہ معرکہ سر کر ہی لیا۔ یہ اس مینی کی بہترین کہانی ہے، دی اسٹوری آف منتھ..... اشعار کی محفل میں احمد خان توحیدی کا شعر سرفہرست لگانا چاہیے تھا۔ اظہر حسیں بچا اور محمد صفدر معاویہ کے اشعار دوسرے اور تیسرے نمبر پر ہوتے تو اچھا تھا۔"

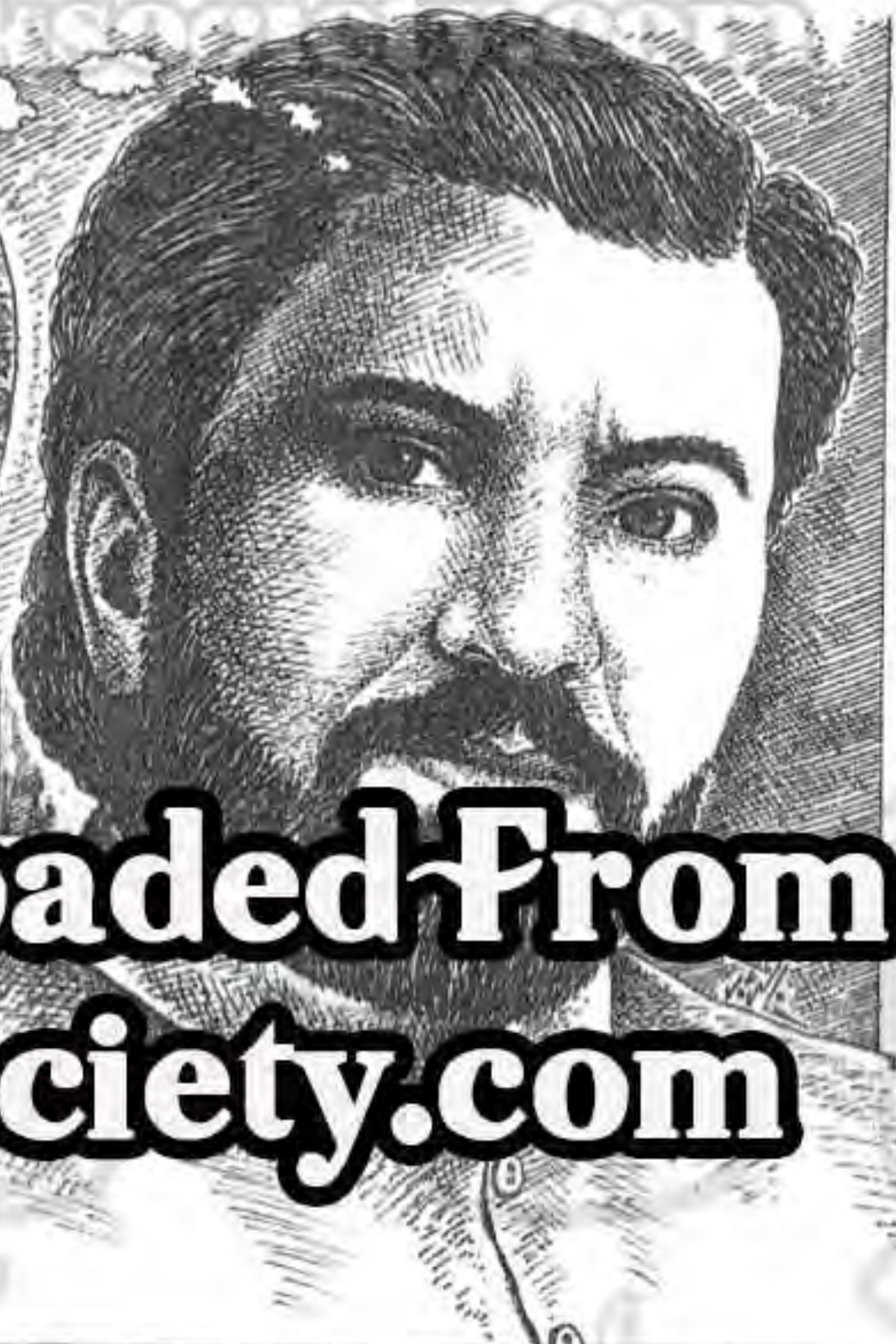
### ✽ عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ سٹی، لاہور سے چلے آ رہے ہیں "جون ایلیا کی اردو سے متعلق تحریر زبردست رہی بہت پسند آئی۔

آپ کے خط میں مونا رضوان کی مایوسی بھی ختم ہوئی اور ایک دم سے صدر محفل بن گئیں۔ بہت بہت مبارک ہوگی۔ ویسے طاہرہ جی پنک گلر بھی لڑکیوں کو بہت پسند ہوتا ہے دیکھ لیں اس دفعہ نائل گلابی گلابی ہو رہا ہے..... ہا..... ہا..... ہا..... معنی کی خیر مبارک جی اور ہم منگیتھ کو یوں دیں گے۔ سرورق میں آپ ہی آپ نظر آتی ہو..... آپ کا بھر پور تبصرہ بہت پسند آیا، مبارک ہو۔ مرزا طاہر الدین نے بھی اچھا لکھا ہے۔ محمد صفدر معاویہ آپ تو سفر میں ہی سرور رہتے ہیں بھی بوڑھی چھانوں میں تمکاوٹ دور کرتے ہیں۔ رضوانہ قریشی نامہ برکا جاوہر چڑھ کر بولے ہے..... جے ڈی، بی اور قارئین میں ایک مقام بتالیا ہے۔ اب آپ کہانیاں پڑھیے کچھ تبصرہ کر دیا کریں۔ بہت اچھا لگے گا۔ رانا بشیر احمد ایاز حیران تو آپ بھی ہو رہے..... نائل گرل کو دیکھ کے۔ ہانس تبصرہ۔ اور بس احمد اور احمد خان توحیدی ایک ساتھ اچھے لگے، رومی حکمرانوں، سیاستدانوں کے وعدے تو وعدے رہے لیکن عوام بھی تو کوئی کردار ادا کرے نہ کہ یہ بس پلے جلوسوں میں ہی شرکت کرنے کو رہ گئی ہے۔ اہم کمال کی رائے بھی اچھی لگی۔ ناہید یوسف نے تو واقعی حیران کر دیا۔ ایسے لگا جیسے پرانی تبصرہ نگار ہوں۔ خوش آمدید۔ اشقان، منظر نگاری اور پلاٹ عمران جو نانی تو گھنٹی ماہر لگتے ہیں۔ ویلڈن جناب۔ ثنا صادق آپ تو بہت اچھا لکھتی ہیں۔ امید ہے لکھتی رہیں گی۔ جذبیہ جنون جنید احمد ملک کی ہمت کو داد دیتے ہیں بہترین تبصرہ لکھا ہے اور جو دوست محفل میں شریک نہیں ہو سکے ان سب کو سلام اور جلدی تشریف لائیں۔ بہشت زار میں اسدا اور جاتا تو اپنے طور پر کچھ کہہ سکے اور تیسرے حسن کے ملنے پر ان میں بھی ہمت آگئی اور پہنچ گئے جنت میں..... دیکھو اب اور کیا کیا دیکھنے کو ملتا ہے۔ بہشت زار میں.....؟ کافی دلچسپ لگ رہی ہے۔ شیش محل میں کوکے قتل ہونے پر اب جنگ شروع ہوگئی۔ اب بھر پور ایکشن دیکھنے کو ملے گا اور قاروق کی بے چینی سے لگ رہا ہے وہ بھی جلد بمبئی پہنچنے والا ہے۔ جو ذہن نوابی اصولوں میں گھری دلچسپ لگ رہی ہے۔ یوں پوری شیش محل ہی دلچسپ ہو رہی ہے۔ ایک چہرہ کئی روپ، عالی کی شکل میں تو اسپانیزر مین مل گیا ہے، وہ بھی گیارہ برس کا حیرانی کی بات ہے۔ اچھل کود کے علاوہ عالی بالکل اپنے باپ پر گیا ہے اور آنے والی قسطوں میں تجو بہ "ماروی" کیا کیا رنگ دکھائی ہے شدت سے انتظار ہے۔ درحقیقت بھی ایک طرح سے غیرت کے نام پر نکل تھا جو ایک ماں نے بیٹی کو مارنے کے لیے کیا اور اس کے اسباب رجوع کے ماں باپ اور سسرالی بھی قصور وار ہیں جو ایک حوا کی بیٹی کو نہ سنہال سکے۔ زندگی تو بہر حال گزر جائے گی۔ اس لیے انسان کی نظر آخرت کے ہمیشہ رہنے والے اصل قائمے کی طرف ہونی چاہیے اور شایان صدیقی نے گانے بجانے کو مات دے کر راہ ہدایت پر قدم رکھ دیا تھا جس سے انڈیا میں اسے صحوہ تیس برداشت کرنا پڑیں اور روحانہ کی دعائیں بھی رنگ لے آئیں۔ جرم چھوٹا ہو یا بڑا، ہوتا تو جرم ہی ہے نا اور جب اس کی پکڑ ہوتی ہے تو اگلے پچھلے سارے حساب بے باک ہو جاتے ہیں اور پھر وہ اپنے ہی دام میں پھنستے چلے جاتے ہیں جیسے نادر اور وسیم کے ساتھ ہوا..... سراغ رساں سے بڑھ کر تو جولیا اور ڈیانا بہت اچھی سراغ رساں ثابت ہو گئیں۔ بس چیز اکھاڑا اور ٹیچ ڈاؤن..... حضرت شاہ عبدالرحمن پاک مست ولی اللہ جن کی کرامات پر دل اش اش کراٹھے۔ دریا میں گرے تو کئی روز بعد زندہ سلامت نکل آئے۔ دند و رام کے جیسے سانپوں کا..... سارا زہر کھینچ لیا۔ مخلوق کی خدمت پہ آئے تو بیلوں کی جگہ خود جت گئے اور کونو میں سے یانی نکالا۔ اللہ کے ولی جب وجد ولایت کو پہنچتے ہیں تو بڑے بڑے کام اللہ کے حکم سے ہو جاتے ہیں تو پھر کیسے نہ ان کا نام روشن ہو جنہیں اللہ تعالیٰ اپنی برگزیدہ ہستیوں میں شامل فرمائے۔ محفل شعر و سخن میں شوکت علی زخمی، سراج محبوب عباسی، انیلہ رشید سیال اور طلعت علی کا انتخاب بہت اچھا لگا جبکہ کترنوں میں ریاض ہٹ، فوجی، بشیر اور اطہر حسین کا تعاون بہترین رہا۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

کامران احمد انصاری، راولپنڈی۔ مرزا طاہر الدین بیگ، میر پور خاص۔ ارشاد بیگ، کراچی۔ خورشید عالم، لاہور۔ ثوبیہ ارشد، سیالکوٹ۔ زرمین نیازی، کوئٹہ۔ مہوش، ملتان۔ مدثر رضا، نواب شاہ۔ جہانزیب احمد، حیدرآباد۔ صلدر شاہ، اسلام آباد





# Downloaded From Paksociety.com

## بہشت زار

ایسا سیتا پوری

منگول قلعہ الموت کا رخ کرتے ہیں... تاریخ  
اسلام کے زبردست لوگ جو فدائی کہلاتے تھے اور  
جن سے بڑی بڑی طاقتیں خوفزدہ رہتی تھیں، ان کی  
داستان... جن سے نہ تو مسلمان محفوظ تھے، نہ  
عیسائی... ان کی بہشتِ ارضی میں جنت کی آسائشیں  
اور نعمتیں یکجا کر دی گئی تھیں۔ ایک لائق ترین انسان نے  
اپنی استطاعت، ذوق اور وسائل کو بروئے کار لا کر ایک ایسا  
نظام اور سامان مہیا کر کے اس کی مدد سے انسانی نفسیات کو  
اپنی مرضی کے مطابق موڑا اور کام میں لیا... لیکن اس طلسم  
کو متمدن دنیا کی کوئی طاقت بھی نہ تو دبا سکی اور نہ ان کا مقابلہ  
کر سکی ان تمام معاملات کو وحشی جبلت کے چالاک اور ذہین  
منگولوں نے صفحہ ارض پر داستان پارینہ کی صورت رقم کر دیا۔ تاریخ  
کا عجیب و غریب دور، ماضی کے انوکھے اور حیرت انگیز لوگوں کی کہانی

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

جولائی 2016ء

16

سپنس ڈائجسٹ







# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



کہا: ”یہ تو ہو میں میرے حصے کی حوریں، میرے ساتھی کے حصے کی کہاں چلی گئیں؟“

لڑکی نے جواب دیا: ”وہ بھی آرہی ہیں۔“  
لڑکی کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ پانچ حسین ترین لڑکیاں اور آگئیں۔ میزبان لڑکی نے اسد سے کہا: ”یہ تیرے حصے کی ہیں۔“

جبار نے ازراہ شرارت میزبان لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا اور شوخ و شریر لہجے میں پوچھا: ”اور تو خود کس کے حصے کی ہے؟“  
لڑکی نے بھی شوخ و شریر لہجے میں جواب دیا: ”جو بھی مجھے پسند کر لے۔“

جبار اور اسد نے ایک ساتھ جواب دیا: ”ہم نے تجھے بھی پسند کیا۔“

اس کے بعد شوخی و شرارت آمیز جملوں کے تبادلے کا کھیل شروع ہو گیا۔ ان دونوں کو شرابیں پلائی گئیں مگر انہوں نے ہر کام نہایت سوجھ بوجھ اور ہوش مندی سے کیا کیونکہ انہیں یہ بات معلوم تھی کہ انبساط اور موت کی حدیں ملی ہوئی ہیں اور ذرا سی غفلت یا بے پروائی انہیں موت کی آغوش میں پہنچا دے گی۔ وہ دونوں یہ سوچ سوچ کر کوفت محسوس کر رہے تھے کہ انہوں نے اس بہشت اور ان حوروں کے لیے خود کو کتنا گرا لیا تھا اور کس طرح اپنی جان کی بازیاں لگا دی تھیں۔ انہیں شیخ الجبال کی ذہانت پر حیرت تھی اور خباث پر غصہ۔ ان کے لطف و انبساط کو شیخ الجبال کا خیال اور اس کے خلاف پیدا ہونے والی نفرت اور کدورت بد مزہ کر رہی تھی۔

جبار کو ذنوبیہ یاد آگئی، اس نے کہا: ”لڑکی! بہشت اعلیٰ کا مزہ ذنوبیہ کے بغیر پھیکا ہے۔ اگر تو بہشت عام اور بہشت اعلیٰ میں آباد اور موجود حوروں میں ذنوبیہ کو ڈھونڈ نکالے تو میں تیرا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔“

میزبان لڑکی نے جواب دیا: ”میں تیرا یہ کام کر سکتی ہوں لیکن یہاں کسی کو نام سے نہیں پکارا جاتا۔ یہاں حوریں رہتی ہیں۔ عورتیں یا ارضی لڑکیاں نہیں، جن کے نام ہوتے اور پتے ہوتے ہیں۔ اگر ذنوبیہ کے چہرے کی بعض اہم علامات اور نشانات کی بابت کچھ معلوم ہو تو ہمیں بتاؤ، ہم اسے بھی تلاش کرالیں گے۔“

جبار نے جواب دیا: ”اس کے گلے پر ایک تل ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی مگر سرگیں۔ پیشانی پر بائیں جانب ہلکا سا چوٹ کا نشان۔ جب وہ ہنستی ہے تو اس کے ساتھ پوری کائنات ہنسنے لگتی ہے۔ اس کی آواز میں موسیقی کی کھنک

حسین لڑکی نے ان دونوں کو ایک برج میں پہنچا دیا۔ پتھروں کو تراش کر بنایا جانے والا یہ برج اندر سے بہت حسین تھا۔ یہاں سب کچھ سنگ مرمر کا تھا۔ دودھ میں نہائے ہوئے اس ماحول میں سنگ موسیٰ اور شکر فی پتھر بھی کام میں لایا گیا تھا۔ یہ برج کافی بڑا تھا۔ اس میں تعیشات زندگی کی ضروری چیزیں وافر مقدار میں موجود تھیں۔ شیشے کے آلات سے کٹی، اعلیٰ درجے کی شراب ایک چھوٹے سے حوض میں بھری ہوئی تھی۔ منقش کرسیاں، میز اور مسبری خوب صورت اور قیمتی قالین جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک بچھا ہوا تھا اور اس میں کہیں بھی جوڑ نہیں تھا۔ دیواروں میں چھپے ہوئے تل، جن کی صرف ٹونیاں ہی نظر آتی تھیں۔ ان تلوں میں دودھ اور شہد، شریانوں میں خون کی طرح رواں دواں تھے۔ برج کے اندر ہی کنارے کنارے موسیٰ پھولوں کے درخت لگے ہوئے تھے اور وہ پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ یہاں بڑھ بھی تھا اور ایک جگہ چھوٹا سا آبشار بھی گر رہا تھا۔ جہاں یہ آبشار گرتا تھا، وہ ایک حوض تھا۔ حوض کا پانی دوبارہ آبشار میں واپس چلا جاتا تھا۔

حسین ترین لڑکی نے ان دونوں کو قالین پر بٹھا دیا اور خود چند غلاموں کو بلا کر کھانے پینے کا سامان منگوا یا۔ اس نے ان دونوں سے کہا: ”صاحبان! معاف کیجیے گا۔ یہ بہشت اعلیٰ ہے یہاں آگ کا کوئی کام نہیں اور جب آگ ہی نہ ہو تو کھانے کی تیاری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا میں تمہیں جو کھانا کھلاؤں گی وہ جنت کا نہیں، کہیں اور کا پکا پکا یا کھانا آپ دونوں کی خدمت میں پیش کروں گی۔“

”میں نہیں جانتا کہ یہاں آگ ہے یا نہیں اور کھانا کس طرح تیار کیا جائے گا اور پانی کی جگہ شراب کیوں پیش کی جائے گی۔“ جبار بولا۔

اسد کو یہاں کی خوشبو مد ہوش کئے دے رہی تھی، سرشار آواز میں کہا: ”چاند کے ٹکڑے! اگر میں تجھ سے تیرا نام پوچھوں گا تو، تو یہی جواب دے گی کہ بہشت میں کسی کا کوئی نام نہیں ہوتا۔“

جبار نے کہا: ”لڑکی! یہاں کیوں بھیجا گیا ہے ہم دونوں کو؟ ہمیں نہیں معلوم لیکن جب ذہن پر زور دیتے ہیں تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہم دونوں بہشت اعلیٰ میں پیش کرنے آئے ہیں۔“ پھر لڑکی سے پوچھا: ”کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

کچھ دیر بعد ہی زرق برق لباسوں میں ملبوس۔ پارے ان دونوں کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ جبار نے



لڑکی نے جواب دیا۔ ”کچھ تو ذنوبیہ نے بتائی تھیں اور کچھ شیخ الجبال کے ان کارندوں نے جنہوں نے جبار کو بہشت میں پہنچایا تھا۔“

طاہرہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”غور طلب بات یہ ہے کہ یہ نوجوان جو ذنوبیہ کو پوچھ رہا ہے، کون ہے؟“ لڑکی نے پوچھا۔ ”ان دونوں کو یہاں تک پہنچایا کس نے؟“ طاہرہ نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں، انہیں یہاں تک کس نے پہنچایا ہے۔ بظاہر تو یہ دونوں یکے بعد دیگرے آگے پیچھے یہاں تک آئے ہیں۔“

لڑکی نے طاہرہ کو متنبہ کیا۔ ”میں آپ کو مخلصانہ مشورہ دے رہی ہوں کہ اس نوجوان کی نفیث اور تحقیق بہت زیادہ ہوشیاری سے کی جائے۔ مجھے تو کچھ گڑبڑ نظر آرہی ہے اس میں۔“

جبار اور اسدان کی باتیں سن سن کر خوفزدہ ہو رہے تھے۔ اسد نے جبار کے کان سے منہ بھڑا دیا، بولا۔ ”استاد! خطرہ۔ سنگین خطرہ۔ کچھ سوچو ورنہ گئے ہم دونوں اس جہاں سے۔ اب کیا ہوگا؟“ جبار نے ہنس کر جواب دیا۔ ”وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔“

اسد نے اصرار کیا۔ ”تم معاملے کی نزاکت اور اس کے خطرناک پہلو پر غور نہیں کر رہے ہو شاید۔ ورنہ اس طرح مسکرا کر جواب نہ دیتے۔“

جبار نے لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”ادھر دیکھو۔ اس طرف۔ لڑکیاں ہم پر غور کر رہی ہیں۔ انہیں کسی قسم کا شبہ ہو گیا ہے، ہم دونوں پر، اب ہمیں کچھ دیر کے لیے چپ ہو جانا چاہیے۔“

دونوں مدہوشی کی اداکاری کر کے بے سدھ پڑ رہے۔ کئی لڑکیاں ان دونوں کے پاس آئیں، ان پر جھکیں اور ان کا جائزہ لیا مگر مدہوش سمجھ کر واپس چلی گئیں۔ سب سے آخر میں طاہرہ گئی اور جاتے جاتے برج کو باہر سے مقفل کر دیا۔

ان کے جاتے ہی جبار اٹھ کر بیٹھ گیا، بولا۔ ”دوست! بات تو بہت بری ہوئی مگر اس میں ایک بات خوشی کی بھی تھی۔ وہ یہ کہ ان کی ساری باتیں ہم نے سن لیں۔ اگر ہم یہ باتیں نہ سنتے تو معلوم نہیں لائے میں کیا کچھ ہو جاتا۔“

اسد نے پوچھا۔ ”اب جو کچھ ہونے والا ہے، اس کی بابت بھی کچھ سوچا ہے تم نے؟“

جبار نے لمبے پردانی سے جواب دیا۔ ”اس پر بھی غور کر لوں گا۔ جلدی کس بات کی ہے۔“

اسد نے ہنس کر مبارکباد دے دی، بولا۔ ”بہر حال خوشی

ہے۔ اس کی چال میں وقار ہے اور کیفیت دستہ بھی، وہ ہر وقت سوئی سوئی سی لگتی ہے۔ وہ رفیق کی ماہر ہے اور یہ میرا دعویٰ ہے کہ اس پوری بہشت میں اس جیسی رفاقت ایک لڑکی یا حور بھی نہ ہوگی۔“

جبار از خود رفتہ ہوتا جا رہا تھا۔ میزبان لڑکی اپنے حافظے پر زور دے رہی تھی کہ اس نے اس صلیب کی لڑکی کہیں دیکھی بھی ہے یا نہیں۔ بظاہر دونوں نشے میں مست و مدہوش ہو گئے۔ حوروں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر کنارہ کشی اختیار کی۔ اس دوران میزبان لڑکی نے دوسری لڑکیوں سے پوچھا۔ ”کیا تم نے کسی ذنوبیہ نام کی لڑکی کو دیکھا ہے کہیں؟“ ایک لڑکی نے کہا۔ ”طاہرہ! یہ کیا غلطی کر رہی ہو؟ اس کا نام لے رہی ہو، اگر ان دونوں میں سے کوئی ہوش میں ہوا تو؟“ میزبان لڑکی کا نام طاہرہ تھا، اس نے ہنس کر جواب دیا۔ ”تو مجھ کو تو نام لینے سے روک رہی ہے اور خود میرا نام لے رہی ہے۔“

لڑکی نے کھسا کر منہ چھپالیا اور دبی دبی ہنسی میں کہا۔ ”میری توبہ! کیا غلطی کر دی میں نے۔“ ایک اور لڑکی نے میزبان لڑکی طاہرہ سے پوچھا۔ ”کیا یہ دونوں مدہوش ہو چکے ہیں؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”خوب اچھی طرح۔ ابھی کئی گھنٹے تک ہوش میں آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

ایک لڑکی نے کہا۔ ”میں ذنوبیہ نامی لڑکی سے واقف ہوں، لیکن وہ یہاں نہیں ہے وہ بہشت عام میں رہتی ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ کہاں سے لائی گئی ہے۔ یہ میں متیم ایل خانی لشکر میں ایک مسلمان تاجر ذنوبیہ کو اصقہان لیے جا رہا تھا، یہ اس کی لونڈی تھی۔ مسلمان تاجر اس کو پہنچانا چاہتا تھا۔ اسی تاجر کے پاس ایک نوجوان غلام جبار تھا۔ خاصا خوب صورت مگر جنونی، ذنوبیہ جبار کو پسند آگئی تھی۔ شیخ الجبال کے آدمی تو ایسوں کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ ذنوبیہ کو اغوا کر لائے اور اسے بہشت عام میں داخل کر دیا اور بعد میں جبار کو بھی بہشت عام میں داخل کر کے ذنوبیہ سے ملوا دیا۔ حسب دستور چند دنوں بعد جبار کو بہشت سے نکال دیا گیا اور شیخ الجبال نے اس کے ذمے ہلاکو خان کا قتل کر دیا۔ شاید یہ نوجوان اسی ذنوبیہ کا ذکر کر رہا ہوگا۔“

اس مختصر داستان نے ہر لڑکی کو چوکنا کر دیا۔ طاہرہ ضرورت سے زیادہ حیران ہوئی، اس کی اس حیرانی میں پریشانی بھی شامل تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”تجھ کو یہ ساری باتیں کس نے بتائیں؟“



کی بات یہ ہے کہ تمہیں ذنوبیہ مل گئی۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”میں بہت خوش ہوں، اچانک خوشی مل جانے سے میرے نشے میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔“

اسد کو اپنا گھر یاد آنے لگا۔ دونوں بڑی دیر تک اپنے موجودہ حالات پر غور کرتے رہے۔ غور کرتے کرتے جب وہ دونوں بہشت کی طرف آتے تو واقعی پریشان ہو جاتے۔ بعد میں وہ دونوں اس تیرہ و تار جگہ کو ترستے اور یہاں دوبارہ آنا تک نصیب نہیں ہوتا۔

ان دونوں نے اٹھ کر اور چل پھر کر اس برج کا جائزہ لیا۔ یہاں کی بلندی سے سامنے کا نظارہ بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ انہوں نے یہاں سے بڑی احتیاط کے ساتھ مرغزاروں اور باغوں کا مشاہدہ کیا۔ برج کے نیچے رواں دواں حوریں کٹھ پتلی معلوم ہو رہی تھیں۔ باہر کے نظارے سے فارغ ہونے کے بعد ان دونوں نے برج کی اشیا کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ یہاں کی ہر چیز باہر کی دنیا سے مختلف اور نرالی تھی۔

جبار نے ان چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جی چاہتا ہے یہ ساری چیزیں یہاں سے اٹھالے چلوں۔“

اسد نے اسے سمجھایا۔ ”یار! یہ تو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ کوئی سنے تو کیا کہے؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”مجھے ذنوبیہ سے ملنے کی خوشی نے پاگل کر دیا ہے۔“

اسد نے کہا۔ ”میں بری بات اپنے منہ سے نکالنا نہیں چاہتا ورنہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری یہ خوشی عارضی اور خطرناک ہو سکتی ہے۔ بہشت کی لڑکیاں تم دونوں کی داستانِ معاشقہ سے واقف ہیں اور یہ امکان پیدا ہو چکا ہے کہ تمہارے بارے میں چھان بین کی جائے۔ یہ وقت خوشی سے پاگل ہو جانے کا نہیں۔ عقل اور ہوش و حواس سے کام لینے کا ہے۔“

جبار نے منہ بتایا۔ کاندھے اچکائے اور سر کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ”دوست اسد! میں تیری باتیں سمجھ رہا ہوں لیکن میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ قسمت میرا ساتھ دے رہی ہے۔ خدا مجھ پر مہربان ہے۔ اللہ نے جاپا تو واپسی میں ذنوبیہ میرے ساتھ ہوگی اور میں بہشت سے نکل کر پہلا کام یہ کروں گا کہ شیخ الجبال کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔“

اسد چونک کر بولا۔ ”شیخ الجبال کی اینٹ سے اینٹ تم کس طرح بجا دو گے بھلا؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”میں اس تدبیر سے واقف ہوں اسد! تو یقین کر میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہی ہوگا۔“

اسد نے باہر کسی کی آہٹ محسوس کی، گلہرا کر بولا۔ ”دوست! کوئی آرہا ہے، مدہوش ہو جاؤ۔“

جبار فوراً ہی مدہوش ہو گیا اور اسد بھی نشے میں دھت، اپنے منہ سے رال گرانے لگا۔ کچھ دیر بعد طاہرہ تنہا اندر داخل ہوئی۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی ان دونوں کا جائزہ لیا۔ باری باری دونوں کو جھک کر دیکھا، اسد کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور پوچھا۔ ”تیرا کیا حال ہے؟ میں تجھ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ چند حوریں باریابی کی منتظر کھڑی ہیں۔“

اسد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بدستور مدہوش رہا۔ طاہرہ نے اس کی باجھوں سے بہتی ہوئی رال کو دیکھا اور مسکرانے لگی۔ ”خدا تجھ پر رحم کرے، اس وقت تو، تو مردوں سے بھی بدتر ہے۔“

اسد کو چھوڑ کر وہ جبار کے قریب گئی اور اسے بھی جھنجھوڑ کر مخاطب کیا۔ ”اور یہ تجھے کیا ہو گیا؟ اٹھ اور ان حوروں سے ملاقات کر جو اپنی باری کا انتظار کر رہی ہیں۔“

لیکن جبار کی طرف سے بھی اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ طاہرہ نے اس کا چہرہ اپنے سامنے کر لیا، بولی۔ ”تم لوگ اتنی زیادہ کیوں پی جاتے ہو کہ پھر اپنی ان حوروں کا بھی ہوش نہیں رہتا جو برسوں سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔“

جبار نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ طاہرہ نے آہستہ سے کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ان دونوں کو کچھ خبر نہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔“

طاہرہ چپ چاپ برج کے باہر گئی اور وہاں سے ایک شخص کو لے کر واپس آگئی۔ یہ پچیس پچیس سالہ تومند خوب صورت نوجوان دبے قدموں اندر داخل ہوا تھا۔ اس نے طاہرہ سے سرگوشی میں پوچھا۔ ”کیا تم نے اچھی طرح اس بات کا اطمینان کر لیا ہے کہ یہ دونوں نشے میں مدہوش ہو چکے ہیں؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”خوب اچھی طرح۔ میں نے ان دونوں کو حوروں کا لالچ دیا مگر ان دونوں نے اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اگر یہ ہوش میں ہوتے تو حوروں کی طرح میں خاموش نہ رہ سکتے تھے۔“

یہ نوجوان پہلے تو اسد کے پاس کھڑے ہو کر اس کی صورت دیکھتا اور پچانے کی کوشش کرتا رہا مگر نہیں پہچان سکا، بولا۔ ”میں نے اس نوجوان کو پہلے کہیں یا کبھی نہیں دیکھا اور جو نوجوان میرے ذریعے اس بہشت زار میں داخل ہوئے ہیں، ان میں یہ نوجوان شامل نہیں رہا ہے۔“

طاہرہ نے جبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔



”اور یہ نوجوان..... اسے بھی غور سے دیکھنا۔“  
 نوجوان جبار کی طرف چلا گیا اور اس کو بغور دیکھ کر  
 بولا۔ ”ہاں اس نوجوان کو میں پہلے بھی نہیں دیکھ چکا ہوں۔“  
 طاہرہ گھبرا کر بولی۔ ”یعنی اس کو پہلے بھی تم نہیں دیکھ  
 چکے ہو؟“

نوجوان جبار کو برابر غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے  
 چہرے پر پھلے ہوئے کرب سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کچھ  
 یاد آنے اور کچھ یاد نہ آنے کے کرب میں مبتلا ہے۔ اس نے  
 بمشکل جواب دیا۔ ”میں نے اس کو نہیں دیکھا ضرور ہے۔“  
 طاہرہ نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اگر اس کو تم نے  
 کہیں واقعی دیکھا ہے تو اپنے ذہن اور حافظے پر زور دے  
 کر بتاؤ کہ کہاں دیکھا ہے؟ یہ بہت ضروری ہے۔“  
 نوجوان نے پوچھا۔ ”سردست میں تم سے ایک بات  
 جاننا چاہتا ہوں۔“

اسد نے جبار سے کہا۔ ”دوست! میری ایک بات کا  
 جواب دو۔ ہمیں بہشت زار کا راستہ اتفاقاً معلوم ہو گیا ہے،  
 شاید ہم جانا بھی یہی چاہتے ہیں۔“  
 جبار نے پشیم نم پوچھا۔ ”کیا ذنوبیہ ہمیں مل جائے گی؟“  
 اسد نے جواب دیا۔ ”ضرور مل جائے گی لیکن خدا  
 کے لیے جو کچھ بھی کرنا ہے، جلد از جلد کر ڈالو۔ خطرے کی  
 تلوار ہمارے سروں پر مستقل لٹک رہی ہے۔“

طاہرہ نے پوچھا۔ ”کون سی بات؟ پوچھو، تکلف کیوں؟“  
 نوجوان نے کہا۔ ”ان دونوں کو یہاں لایا کون ہے؟“  
 طاہرہ نے جواب دیا۔ ”کچھ پتا نہیں۔ یہ دونوں  
 میرے پاس تو تنہا آئے تھے، آگے پیچھے..... پہلے یہ آیا تھا،  
 اس کے کچھ دیر بعد یہ دوسرا اس کا ساتھی۔“  
 نوجوان نے تشویش ظاہر کی۔ ”طاہرہ جی! میں شرطیہ  
 کہہ سکتا ہوں کہ یہ دونوں ہی مشتبہ نوجوان ہیں۔ میں کوشش  
 کروں گا کہ ان کے بارے میں جستجو کروں اور انہیں بے  
 نقاب کر دوں۔“

جبار نے ادھر ادھر دیکھا۔ کافی فاصلے پر کچھ نوجوان  
 چند حوروں کے ساتھ ہنسی مذاق اور چہل قدمی میں مصروف  
 تھے۔ جبار نے مسکرا کر منہ پھیر لیا، بولا۔ ”جنت والوں کی  
 کجھ میں یہ نکتہ کیوں نہیں آتا کہ حوروں سے ان کا ہمہ وقت کا  
 ساتھ ان کی صحبتیں اور ان کی تندرستیوں کو برباد کر دے گا۔“  
 یہ دونوں ان لڑکیوں کی طرف چل دیے۔ اسد نے  
 کہا۔ ”مگر میں یہ سوچ سوچ کر دیوانہ ہو جاؤں گا کہ.....“  
 جبار نے مسکرا کر کہا۔ ”دیوانہ بننے کی کوئی ضرورت  
 نہیں۔ سارے کام یوں ہی ہو جائیں گے۔“

نوجوان وہاں سے جانے لگا تو طاہرہ نے اس سے  
 درخواست کر دی۔ ”عزیز من! میں نے اس نوجوان کی  
 زبان سے کسی ذنوبیہ کا نام کئی بار سنا ہے، میرا خیال ہے اگر  
 ذنوبیہ کے پاس لے جا کر تحقیق کی جائے تو ان کی بابت کچھ  
 کام کی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔“  
 نوجوان نے جواب دیا۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو لیکن میں  
 یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان دونوں کو یہاں تک لایا کون ہے؟  
 اگر میرے اس سوال کا کسی نے جواب دے دیا تو میں سچ  
 الجبال کو بہت کچھ بتا سکوں گا۔“

اپنا تک ایک جھاڑی سے چند لڑکیاں نکلیں اور تیز تیز  
 قدموں سے چل کر ان دونوں کے پاس پہنچیں۔ اسد اور  
 جبار ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ ایک لڑکی نے اسد  
 کو زور کا دھکا دیا۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا نیچے جبار کے  
 قدموں میں گر گیا۔ جبار نے اس کو سنبھالا تو دھکا دینے والی  
 لڑکی ان دونوں کے بیچ میں آگئی، جبار سے بولی۔  
 ”نوجوان! چند لمبے، چند سوال۔ براہ کرم توجہ!“  
 جبار نے اڑ کر جواب دیا۔ ”اجازت ہے۔ تو سوال  
 کر سکتی ہے۔“

وہ نوجوان چلا گیا۔ طاہرہ اسی برج میں رہی، ان  
 دونوں کے پاس۔ اسد اور جبار ان کی باتیں سن چکے تھے۔  
 وہ دونوں دیر تک پڑے رہے۔ کئی گھنٹے بعد جب ان  
 دونوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب مزید مدہوشی بے کار ہے تو وہ  
 ہوش میں آنے لگے۔

لڑکی نے عرض کیا۔ ”تم دونوں نوجوان ہو، مرد ہو۔  
 یہاں تم دونوں کے جوہر کھل جائیں گے۔“  
 جبار نے سوچا۔ ”یہ کیا بات ہوئی؟“  
 لڑکی نے مزید کہا۔ ”ساکنان جنت ایک بات جاننا  
 چاہتے ہیں۔ ایک سوال، ایک استغابیہ اور ایک سوال ہر

☆☆☆



ایک کے دل و دماغ میں موجود اسے تنگ کر رہا ہے۔ براہ کرم اس ابھرنے کو دور کر دو۔“

جبار نے سختی سے کہا۔ ”وقت نہ برباد کر لڑکی، سب کچھ صاف صاف بتا دے۔“

لڑکی نے پوچھا۔ ”ساکنان بہشت زار یہ جاننا چاہتے ہیں کہ جنت میں دو مردوں کے درمیان دوستی کا کوئی تصور ہی نہیں۔ یہاں پر تو حوروں سے دوستی ہوتی ہے مگر تم دونوں مرد ہو اور تم دونوں میں دانت کاٹی دوستی ہے، آخر کیوں؟ کیا اس ابھرنے کا جواب مل جائے گا ہمیں؟“

جبار نے درشت لہجے میں کہا۔ ”لڑکی! مجھے آداب جنت کو بالائے طاق رکھنا پڑ رہا ہے۔ میرے پاس تیرے سوال کا کوئی جواب نہیں۔“

لڑکی نے اسی اکر سے کہا۔ ”اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو میری ہی طرح دوسری بہت ساری لڑکیاں تمہیں گھیر لیں گی اور تم سے اس سوال کا جواب مانگیں گی۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”میں انہیں بھی یہی جواب دوں گا۔“

لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس دیں، ایک نے کہا۔ ”پانی نشیب میں مر رہا ہے۔“

اسد نے جبار کے کان میں کہا۔ ”بات نہ بڑھاؤ جبار۔ یہاں سے بھاگ چلو۔ یہ کسی بڑے مسئلے کی تمہید معلوم ہوتی ہے۔“

یہ بات جبار کی سمجھ میں بھی آگئی۔ اس نے اسد کا ہاتھ پکڑ لیا اور لڑکیوں کا حصار توڑ کر بھاگ نکلا۔ وہ جلد از جلد اس برج میں پہنچ جانا چاہتا تھا جہاں طاہرہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جب یہ دونوں برج کے دروازے پر پہنچ گئے تو انہیں کسی کے ساتھ طاہرہ کے بات کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اسد نے جبار سے سرگوشی میں کہا۔ ”سنو اور غور سے سنو کہ اندر کیا باتیں ہو رہی ہیں۔“

جبار نے بڑی کوشش کی کہ اندر کی باتیں سن لے مگر ناکام رہا کیونکہ وہاں بھی سرگوشی میں باتیں کی جا رہی تھیں۔ آخر دونوں ایک ساتھ برج میں داخل ہوئے۔ یہاں طاہرہ دو ادھیڑ عمر خوب صورت اجنبی مردوں سے باتیں کر رہی تھی۔ ان دونوں کو اپنے سامنے دیکھ کر سبھی پریشان ہو گئے لیکن ہر کسی کی کوشش یہی تھی کہ اس پریشانی کے آثار چہروں پر نمودار نہ ہوں۔

طاہرہ کھڑی ہو گئی اور جبار کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ”نوجوان! میں نے ذنوبیہ کو تلاش کر لیا ہے۔ وہ

بہشت عام میں موجود ہے۔ اگر تم چاہو تو اسے یہیں بلوایا جائے کیونکہ تمہیں بہشتِ اعلیٰ سے وہاں نہیں بھیجا جاسکتا۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”اس کو فوراً بلوایا جائے۔“ طاہرہ نے مزید کہا۔ ”ذنوبیہ کو تمہاری وجہ سے یہ اعلیٰ مقام مل رہا ہے، وہ خوش قسمت ہے۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”پھر میں اس سلسلے میں کس کا شکر یہ ادا کروں، تیرا یا شیخ الجبال کا؟“

طاہرہ نے کہا۔ ”کسی کا بھی نہیں کیونکہ تمہیں جو کچھ بھی ملے گا، تمہاری خدمات اور تقویٰ کے صلے میں ملے گا۔“

جبار نے سوچا، طاہرہ نے پہلے تو کبھی اتنی باتیں نہیں کی تھیں پھر یہ اس وقت اس کو کیا ہو گیا ہے پھر جس طرح اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا تھا اسی طرح اچانک اس کا جواب بھی مل گیا۔ اس نے دونوں مردوں پر اچھتی سی نظر ڈالی شاید طاہرہ اس کو باتوں میں لگا کر دونوں مردوں کو یہ موقع فراہم کر رہی تھی کہ وہ جبار کو اچھی طرح دیکھ کر اس کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش کریں۔ جبار نے اسد سے کہا۔

”اسد! تم ان دونوں مردوں سے باتیں کرو، شاید یہ دونوں ہم ہی سے ملنے آئے ہیں۔ ان کے چہروں پر موجود سوالات ہمیں یہی بتاتے ہیں، آگے اللہ جانے۔“

اسد فوراً ان دونوں مردوں سے کھل مل گیا۔ جبار نے طاہرہ سے پوچھا۔ ”طاہرہ! تو میرے ایک سوال کا جواب دے۔“

طاہرہ نے سوالیہ نظروں سے جبار کو دیکھا مگر سوال نہیں کیا۔

جبار نے پوچھا۔ ”طاہرہ! کیا تو اس بہشت میں خوش ہے؟“

اس سوال نے سبھی کو چونکا دیا۔ طاہرہ حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔ دونوں مرد بھی جبار کو گھور رہے تھے۔

جبار نے کہا۔ ”طاہرہ! تو نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا تو اس بہشت میں خوش ہے؟“

طاہرہ برہم ہو گئی۔ جبار کو دھکا دے کر دور کر دیا، بولی۔ ”نوجوان! یہ تو طاہرہ کس کو کہہ رہا ہے؟ میرا نام طاہرہ نہیں ہے اور اگر تو سمجھتا ہے کہ میرا نام طاہرہ ہے تو، تو ایسا کیوں سمجھتا ہے اور تجھے یہ بات کس نے بتائی؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”میں خوب جانتا ہوں کہ تیرا نام طاہرہ ہے۔ میں ایک روحانی انسان ہوں۔ خدا نے مجھے روحانی قوت دے رکھی ہے اور جب میں اس قسم کی بات کرتا ہوں تو اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے، وہ یہ کہ میرے



حوریں حاضر کی جائیں۔“  
اسد نے طاہرہ سے کہا۔ ”طاہرہ بی بی! آخر میں نے  
کیا گناہ کیا ہے کہ میرے لیے میرے حصے کی حوریں نہیں  
بلو کی گئیں؟“

طاہرہ کو ایک بار پھر تالی بجانا پڑی اور جب عورتیں  
اور غلمان حاضر ہوئے تو انہیں پھر وہی حکم دیا گیا کہ دوسرے  
نوجوان کے حصے کی حوریں بھی حاضر کی جائیں۔ عورتیں اور  
غلمان پھر واپس چلے گئے اور انہوں نے اسد کے حصے کی  
حوریں روانہ کر دیں۔

اسد نے اپنے حصے کی حوروں کو لیا اور برج کے  
دوسرے گوشے میں ان کے درمیان بیٹھ کر ہنسی مذاق کرنے  
لگا۔ جبار کن انکھیوں سے طاہرہ کی حالت پر غور کر رہا تھا۔ وہ  
ملول اور غمزہ سر جھکائے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ جبار نے  
اس کو آواز دی۔ ”طاہرہ! میرے پاس آ جا۔ تو وہاں اتنی دور  
کیوں بیٹھی ہے؟“

طاہرہ بے چون و چرا اٹھ کر جبار کے پاس چلی گئی اور  
اس سے درخواست کی۔ ”نوجوان! کیا تو طاہرہ کی رٹ سے باز نہیں آئے گا۔ آخر تو چاہتا کیا ہے؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”جس بات کو میں حق اور سچ  
سمجھ رہا ہوں، اس سے کیوں باز آ جاؤں؟“ پھر ایک سوال  
کیا۔ ”اور طاہرہ! میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ تو میرے حصے کی  
حور ہے یا نہیں؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”میں کس کے حصے کی حور  
ہوں، مجھے کچھ پتا نہیں لیکن میں یہ ضرور جانتی ہوں کہ جو  
جننی مجھ کو اپنے پاس بلائے گا، میں اس کے پاس جانے  
کی پابند ہوں۔“

جبار نے کہا۔ ”تب پھر میں نے تجھے بلایا اور میں  
تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ یہاں سے کہیں اور نہ جانا۔“

جبار نے بہشتی میوؤں سے دل بہلانا شروع کر دیا۔  
اس کے آگے خشک میوے کا ڈھیر تھا۔ وہ خشک میوہ  
کھائے جا رہا تھا اور طاہرہ سے باتیں کرتا جا رہا تھا۔ اس  
نے حوروں کو حکم دیا۔ ”حورو! میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ  
طاہرہ کا دل بہلاؤ، یہ آج ملول اور غمزہ نظر آرہی ہے۔  
معلوم نہیں کیوں؟“

طاہرہ چیخ پڑی۔ ”تم خدا کے لیے مجھے طاہرہ نہ کہو،  
ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔“

جبار سہم گیا، آہستہ سے کہا۔ ”اچھا، اگر تیری یہی  
خواہش ہے کہ تیرا نام نہ لیا جائے تو میں آئندہ تیرا نام نہیں

رب نے مجھے غیب کی بات بتادی۔“  
طاہرہ نے سختی سے انکار کیا۔ ”لیکن میں کہتی ہوں کہ  
میرا نام طاہرہ نہیں ہے۔ رہا تیرا دوسرا سوال کہ کیا میں اس  
بہشت میں خوش ہوں تو میرے پاس تیری پاؤں کا ایک  
ہی جواب ہے، بھلا بہشت میں رہ کر بھی کوئی شخص ناخوش یا  
ملول ہو سکتا ہے؟“

جبار نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تیرا غصہ اور تیری  
اضطراری حالت مجھے یہ بتا رہی ہے کہ تو حور کے علاوہ بھی  
کچھ ہے کیونکہ بہشت میں غم و غصہ اور اضطراب اور اضطراب کا  
کیا کام۔ یہ چیزیں اور یہ اوصاف و خصائص دنیاوی اور  
بشری ہیں۔“

طاہرہ جبار سے پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے دونوں  
مردوں سے پوچھا۔ ”تم دونوں کو کچھ ملا یا نہیں؟“

دونوں میں سے ایک نے جواب دیا۔ ”ملا، خوب  
ملا۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے پھر کبھی کسی دن بتاؤں گا۔“  
طاہرہ نے ان دونوں مردوں سے کہا۔ ”آپ دونوں  
جانا چاہیں تو چلے جائیں۔“

دونوں مرد گویا اجازت کے منتظر ہی تھے، فوراً چلے گئے۔  
جبار نے طاہرہ کو چھوڑ دیا، بولا۔ ”طاہرہ! میں پھر  
کسی وقت تجھ سے بات کروں گا اس وقت تو بہت جذباتی  
ہو رہی ہے۔“

طاہرہ کانپ رہی تھی، خوشامدانہ لہجے میں بولی۔  
”نوجوان! تو خدا کے لیے مجھے طاہرہ نہ کہہ۔ تو نے ان  
دونوں مردوں کے سامنے طاہرہ کہہ کر بہت ہی برا کیا۔  
ہو سکتا ہے تیری اس بات سے میں کسی قسم کی سزا پا جاؤں۔“  
جبار نے پوچھا۔ ”کیوں؟ یہ سزا کیوں؟ تو نے ایسی  
کون سی بات کر دی کہ تو سزا کی مستحق قرار دی جائے؟“

طاہرہ نے کہا۔ ”تو بار بار مجھے طاہرہ کہہ رہا ہے حالانکہ  
میں تجھ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میرا کوئی نام نہیں۔ میں طاہرہ  
نہیں ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”میری  
یہ شکایت سبب الجبال کو پہنچا دی جائے گی۔ وہاں سے جو سزا تجویز  
ہوگی، میں اسے بھگتنے کی پابند ہوں گی۔“

جبار نے طاہرہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اسد کو لے  
کر برج کے ایک گوشے میں چلا گیا اور زور سے طاہرہ سے کہا۔  
”حوریں حاضر کی جائیں۔ فوراً اسی وقت..... اسی لمحے۔“

طاہرہ نے آہستہ آہستہ تالی بجا کی، کئی عورتیں اور غلمان  
ایک ساتھ حاضر ہو گئے۔

طاہرہ نے ان سے کہا۔ ”اس نوجوان کے حصے کی



لوں گا اور تیرا دکھ درد دور ہو جائے گا۔“

صورت لڑکیوں کو گناہ و معصیت کی راہ پر چلا تے رہیں۔“

طاہرہ نے جبار کی کسی بات کا بھی جواب نہیں دیا، خاموش ہو گئی۔ دوسری طرف اسد اس بات پر حیران اور فکر مند ہو رہا تھا کہ جبار کے پاس سے حوریں کیوں اور کہاں چلی گئیں؟ وہ جبار کے اس تغیر کا سبب معلوم کرنے آیا تو طاہرہ نے اسد سے پوچھا۔ ”کیا تو بھی اس بہشت ارضی میں بن بلا یا مہمان ہے؟“

اسد نے جبار کی طرف دیکھا۔ جبار مسکرا رہا تھا۔ اسد نے جبار سے پوچھا۔ ”طاہرہ کیا کہہ رہی ہے؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”میں نے طاہرہ کو بتا دیا ہے کہ ہم یہاں بن بلائے مہمان ہیں اور یہاں کی مظلوم اور چاند جیسی نورانی اور حسین لڑکیوں کو اس تعزیرِ مذلت سے نکالنے کے لیے آئے ہیں۔“

اسد نے آہستہ سے کہا۔ ”بہر حال تم نے طاہرہ کو جو کچھ بتایا ہے، وہ اچھا نہیں کیا۔ یہ بہت برا ہوا۔“ پوچھا۔ ”حوروں کو کیوں چلتا کر دیا؟“ پھر خود ہی جواب بھی دے دیا۔ ”شاید اس لیے کہ اب تمہیں ان لڑکیوں پر رحم آنے لگا ہوگا۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”بے شک، مجھے ان پر رحم آنے لگا ہے۔“

طاہرہ یہ کہہ کر باہر چلی گئی۔ ”میں کچھ دیر میں واپس آ جاؤں گی۔“

اسد طاہرہ کے پیچھے پیچھے گیا اور پھر اسے جاتا ہوا دیکھ کر واپس آ گیا۔ اس وقت وہ جبار سے بہت ناخوش تھا۔ وہ واپس آ کر کچھ دیر کھڑا خشکیوں نظروں سے جبار کو گھورتا رہا پھر اچانک سوال کیا۔ ”جبار! میں چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں، کیا تم ان کے جواب دو گے؟“

جبار نے نیلے پروائی سے جواب دیا۔ ”کر سوال، میں جواب ضرور دوں گا۔ اگر تمہارے کسی سوال کا جواب نہ دے سکا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ میں لا جواب ہو گیا۔ میں اس سوال کا جواب بعد میں بھی دینے کی کوشش کرتا رہوں گا۔“

اسد نے نہایت تلخ لہجے میں پوچھا۔ ”تم نے طاہرہ کو سب کچھ کیوں بتا دیا؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ عنقریب اس کو سب کچھ دوسرے ذرائع سے معلوم ہو جائے گا۔“

اسد نے کہا۔ ”اگر سب کچھ طاہرہ کو دوسرے ذریعے سے معلوم ہونے والا تھا تو ہم اسے دھندلا سکتے تھے۔“

حوروں نے طاہرہ کی طرف جام بڑھائے، طاہرہ نے یکے بعد دیگرے کئی جام چڑھالیے اور پھر ہنس ہنس کر اصرار کرنے لگی کہ جبار بھی شراب پیے۔ جبار نے بھی شراب پی مگر بہت کم کیونکہ اس کو یہ بات معلوم تھی کہ شراب عام تو ہے مگر اس عام شے کو بہت زیادہ پی کر وہ مست و سرشار اور مدہوش نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے دور برج کے مخالف گوشے میں اسد کو بے نوشی میں مشغول دیکھا۔

کچھ دیر بعد معلوم نہیں کیا سوچ کر جبار نے حوروں کو حکم دیا۔ ”تم سب کچھ دیر کے لیے دُفع ہو جاؤ۔“ حکم کی بندی حوریں اٹھ کر گئیں تو ان کے ساتھ طاہرہ بھی چلی مگر طاہرہ کو جبار نے روک لیا۔ ”میں نے تجھ کو جانے کی اجازت نہیں دی ہے۔“

طاہرہ نے پیٹھی پیٹھی نظروں سے جبار کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر سناٹا طاری رہا۔ جبار کی نظریں طاہرہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں مگر خود طاہرہ سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ جبار سے نظریں چرا رہی تھی، آنکھیں ملاتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ اس سکوت کو جبار ہی نے توڑا۔ بولا۔ ”طاہرہ! تو چپ کیوں ہے؟ کیا مجھ سے واقعی ناراض ہو گئی ہے؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”میں کیا کہوں؟ کچھ کہتے نہیں جتا۔“

جبار نے طاہرہ کو گھورا۔ ”طاہرہ! اداکاری کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب میں اس جنت کی بات کرتا ہوں تو یہ جانتے ہوئے کرتا ہوں کہ یہ سب ذہن ترین لوگوں کا ایک دلچسپ مشغلہ ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔“

طاہرہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”تو تمہیں اس جنت کی بابت کیا کچھ معلوم ہے؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”یہ کہ یہ جنت سادہ لوح سیدھے سادے نوجوانوں کو بے وقوف بنا کر ان سے کام لینے کے لیے بنائی گئی ہے۔“

طاہرہ نے سہم کر پوچھا۔ ”میں پوچھتی ہوں کہ تم دونوں ہو کون؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”ہمارا کوئی خاص تعارف نہیں۔ اگر دو چار لڑکیاں ہمارا ساتھ دے دیں تو ہم انہیں اس جنت ارضی سے کہیں اور پہنچا سکتے ہیں۔ ذرا سوچو تو طاہرہ! کتنی اذیت ناک اور سوہان روح بات ہے کہ ایک شخص یا چند آدمی اپنے مطلب کے لیے جوانی بھر خوب



جبار نے کہا۔ ”نہیں، ہم ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں ان حالات میں یہاں اپنے حمایتی پیدا کرنے ہیں۔“  
اسد نے جھنجھلا کر پوچھا۔ ”کیا تم کو یقین ہے کہ تم یہاں اپنے حمایتی پیدا کر لو گے؟“  
جبار نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں پیدا کر لوں گا۔ ضرور پیدا کر لوں گا۔“

اسد نے کہا۔ ”اگر ہم دونوں کا اتحاد ٹوٹ جانے سے ہمیں کسی خطرے کا احساس نہ ہوتا تو میں نے اسی وقت تم سے علیحدگی اختیار کر لی ہوتی۔“

جبار نے ایک دم اپنا رویہ سخت کر لیا۔ ”اسد! تم میری بات سمجھ کیوں نہیں رہے۔ اب ہم یہاں زیادہ دن نہیں رہ سکتے۔ ہمیں یہاں اپنے ہمدرد بنانے ہیں اور پھر تم یہ تو سوچو کہ جب ہم لوگ یہاں سے نکل کر اپنی دنیا میں پہنچیں گے تو وہاں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ ہم دونوں ہلا کوخان کے مجرم ہیں۔ منگولوں کے معتبوب ہیں لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ ہمیں ان کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ ان سے مدد لینی ہے کیونکہ ان کے تعاون اور مدد کے بغیر ہم شیخ الجبال کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔“

اسد اپنے گوشے میں جاتے ہوئے بولا۔ ”بہر حال اس معاملے میں، میں تم سے اتفاق نہیں کروں گا۔“

آپس کی تلخ کلامی نے جبار کو منحنی کر دیا تھا۔ اس کا سکون برباد ہو گیا تھا۔ وہ برج سے نکل کر باہر چلا گیا۔ وہاں ذرا تشیب میں ایک پہاڑی چٹان پر چند مرد اور چند خوب صورت لڑکیاں اکٹھا کسی وقتی مسئلے پر اظہار خیال کر رہی تھیں۔

جبار نے اکتا کر اس پہاڑی چٹان کا رخ کیا۔ پہلے تو اسے اس ہجوم میں جاتے ہوئے ہچکچاہٹ اور رکاوٹ سی محسوس ہوئی مگر اب اٹھتے ہوئے قدم واپس نہیں ہو سکتے تھے۔ اس نے اپنے دل میں سوچا، ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبراہٹیں کیا۔

جبار اس ہجوم میں داخل ہو گیا۔ ہجوم نے جبار کو دیکھا تو سرگوشیوں میں باتیں ہونے لگیں۔ وہ سرگوشیاں بھی کر رہے تھے اور جبار کو دیکھ بھی رہے تھے۔

جبار نے ہجوم سے پوچھا۔ ”یہاں یہ مجمع کیوں لگا ہوا ہے؟“  
کسی نے بھی جبار کو جواب نہیں دیا اور وہ سب آہستہ آہستہ وہاں سے کھسکنے لگے۔ جبار نے ایک نوجوان، زہد شکن حسن کی مالک حینہ کو بال بکھرائے اس طرح اور اس حال میں کھڑا دیکھا کہ اس کے دونوں رخساروں سے خون جاری تھا اور اس کے بال بال نکل اترے ہوئے اور منتشر تھے۔

اس لڑکی سے دس بارہ قدم دور ایک نوجوان کھڑا تھا۔ شاید وہ نشے میں تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں شراب گھی اور دوسرا خالی تھا۔ اس نے غصے کی حالت میں لڑکھڑاتے ہوئے لڑکی کی طرف بڑھنا شروع کیا، بولا۔ ”ہم دونوں کے معاملے میں کوئی اور کیوں بولے، آمیرے ساتھ گھر چل۔ بہشت زار کے اس گوشے میں، جو ہمارے لیے مختص کر دی گئی ہے۔“

جبار نے آگے بڑھ کر لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ ”لڑکی! تو میرے ساتھ چل۔ ان بڑے لوگوں سے دور، الگ تھلگ، میرے ساتھ چل۔ تو میرے ساتھ رہ کر بڑی خوشی محسوس کرے گی۔“

لڑکی نے کوئی جواب تو دیا نہیں مگر جبار سے ہاتھ ضرور چھڑا لیا۔ اسی عالم میں اچانک ایک پینتیس چھتیس سالہ جوان جبار کے پاس گیا اور نہایت بے تکلفی سے اس کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا۔ ”جبار! تو یہاں کہاں؟“

جبار نے اس شخص کو دیکھا تو شکل جانی پہچانی لگی۔ بالکل پہچان لینے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ یہ شخص اس کو ہلا کوخان کے لشکر میں نور محمد حداد کے ہاں مل چکا تھا۔ جبار اس کا نام نہیں جانتا تھا لیکن جبار گھبرا گیا، پوچھا۔ ”اور تو یہاں کہاں؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”میں شیخ کی مہربانی سے یہاں آ گیا ہوں مگر تم یہاں کیسے آ گئے؟ کیا شیخ الجبال کی مہربانی سے؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”ہاں، شیخ الجبال کی مہربانی سے۔“  
اس شخص نے کہا۔ ”میرا نام رضوان ہے۔ میں نے سنا ہے ہماری بہشت میں چند نوجوان شیخ الجبال کی اجازت یا علم کے بغیر ہی داخل ہو چکے ہیں۔ تم تو صاحب کشف ہو۔ ذرا مکاشفے سے معلوم تو کرو کہ وہ کون لوگ ہیں جو شیخ کی مدد کے بغیر ہی داخل ہو سکتے ہیں۔“

جبار کو ایسا لگا، گویا یہ سب کچھ اسے سنانے کے لیے کہا جا رہا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ مکاشفے سے تیرے سوالوں کے جواب حاصل کر لوں مگر تو کہاں ٹھہرا ہوا ہے؟ کیا ہماری دوبارہ ملاقات نہیں ہو سکتی؟“  
رضوان نے جواب دیا۔ ”میں یہاں قریب ہی اس سامنے والے نیلے برج میں مقیم ہوں۔ وہ نیلا برج جو نکونہ ہے۔“

جبار نے اس نیلے برج کو دیکھا۔ وہ جبار کے برج کے عین مقابل تھا، بولا۔ ”اس وقت تو میں چلتا ہوں، شاید



جبار نے باہر جانے کے لیے منہ پھیرا، بولا۔ ”اچھا پھر میں ابھی واپس آتا ہوں اور اس موضوع پر میں کھل کر گفتگو کروں گا۔ اس کے بعد یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ تم جیسے بہانے چاہو، تراش لو لیکن تم کو میرے یا ہمارے ساتھ ہی اس بہشت زار سے نکلنا ہوگا۔“

طاہرہ کے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ بولی۔ ”کیا تم کو یہ یقین ہے کہ تم تینوں اس بہشت زار سے بہ آسانی نکل جاؤ گے؟ کیا تم کو فرار ہونے دیا جائے گا؟ شاید اب ایسا کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔“

جبار کے ہوش و حواس جاتے رہے، اس نے پوچھا۔ ”میرے یا ہمارے بارے میں بہشت والوں کو کیا معلوم ہے؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”کسی کو کچھ پتا نہیں کہ بہشت کے در پر متعین دربانوں کو کس نے اور کس طرح ہلاک کر دیا، جب ان کی لاشیں سڑنے لگیں اور بدبو کے بھکے بہشت میں داخل ہو گئے تو یہاں کے منتظمین کو فکر لاحق ہوئی کہ یہ بدبو کے بھکے کہاں سے آرہے ہیں؟ آخر کار چند آدمی دربانوں کی سڑی ہوئی لاشوں تک پہنچ گئے۔ اب انہیں دربانوں کے قاتلوں کی تلاش ہے۔ شاید انہوں نے معاملے کی نوعیت کو سمجھ لیا ہے اور اصل واقعہ معلوم کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے حسن نامی ایک نوجوان کو گرفتار بھی کر لیا ہے۔ حسن نے ابھی تک اپنے ساتھیوں کی بابت کچھ نہیں بتایا لیکن پتا یہی چلا ہے کہ حسن کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ وہ دو آدمی کون تھے، بس اسی سوال کا جواب معلوم کرنا ہے۔“

جبار نے اپنی دونوں پنڈلیوں میں سنسنہٹ اور کمزوری محسوس کی۔ فدائیوں کے، زہر میں بچھے ہوئے چھرے جبار کو اپنے پیٹ میں اترتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ حسن کون ہے؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”ان دونوں کا ساتھی جنہوں نے دربانوں کو ہلاک کیا ہے۔“

اب اسد سے ملاقات بہت ضروری ہو گئی تھی اس نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی آتا ہوں، ذرا اسد کو دیکھوں کہاں چلا گیا۔ میرا دوست معلوم نہیں کیوں مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔“

جبار اسد کو تلاش کرتا ہوا ایک آبخار کے قریب پہنچ گیا جہاں سے آبخار کی چادر نیچے گر رہی تھی۔ اسد وہیں بیٹھا اس کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جبار اس کے پیچھے

جبار وہاں سے چلا آیا۔ اب وہ اپنے برج میں جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا لیکن اسد سے ملاقات اب اور زیادہ ضروری ہو گئی تھی۔ وہ سیدھا اپنے برج میں پہنچا اور اسد کو تلاش کرنے لگا۔ اسد بھی کہیں جا چکا تھا لیکن اب طاہرہ آچکی تھی۔ جبار نے طاہرہ سے پوچھا۔ ”یہ اسد کہاں چلا گیا؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں لیکن ابھی ذرا دیر پہلے جب میں یہاں آئی تھی تو اسد نہیں تھا۔“

جبار نے واپسی کے لیے جیسے ہی منہ پھیرا، طاہرہ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ”ذرا ٹھہرنا تو، چند باتیں میری بھی سنتے جاؤ۔“

جبار ٹھہر گیا۔ مڑ کر طاہرہ کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ ”چند باتیں؟ کرو چند باتیں۔“

طاہرہ نے کہا۔ ”آج کافی دیر پہلے تم نے مجھے جو پیشکش کی تھی، میں نے اسے مسترد کر دیا ہے۔ تم کو میرا نام معلوم ہو گیا ہے اور تمہیں جنت کی حقیقت کا علم بھی ہو گیا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو گے کہ اس طرح تم مجھے بہ آسانی ورغلا لو گے لیکن ایسا ناممکن ہے، ایسا نہیں ہوگا۔ میں حقیقی جنت نہ سہی ایک نام نہاد جنت میں تو مقیم ہوں۔ یہاں میں خوش بھی ہوں اور ناخوش بھی لیکن اگر کوئی ایسی ترازو ہو جس میں میری خوشی اور ناخوشی کو تولوا جاسکے تو معلوم ہوگا کہ میں خوش زیادہ ہوں ناخوش کم..... ان حالات میں، میں تمہارا یا کسی اور کا کس طرح ساتھ دے سکتی ہوں؟“

جبار نے زور دیا۔ ”لیکن طاہرہ! یہاں معصیت ہی معصیت ہے، گناہ ہی گناہ ہے۔ تم جیسی شریف لڑکی کو یہاں سے نکلنا چاہیے۔“

طاہرہ نے سخت لب و لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ صرف میں ہی نہیں، یہاں کی ایک لڑکی بھی باہر جانا پسند نہیں کرے گی۔“

جبار نے کہا۔ ”بہر حال تم سوچ لو اور یہ بھی جان لو کہ عنقریب اس بہشت زار پر تباہی اور بربادی کے لشکر حملہ آور ہوں گے۔ اس وقت تم پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتی پھرو گی اور کوئی شخص بھی تمہارا ساتھ نہیں دے گا، تمہیں پناہ نہیں دے گا۔“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”میں نے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کر لیا ہے۔ میں اس ماحول اور اس زندگی کی عادی ہو چکی ہوں۔ میں اس زندگی سے کنارہ کشی نہیں اختیار



کھڑا اسد کی محویت پر غور کرنے لگا پھر آہستہ سے آواز دی۔

”اسد میرے دوست!“

اس نے مزکر جبار کو دیکھا اور بے اعتنائی سے پوچھا۔

”مجھ سے کیا کام ہے؟ یہاں کیوں اور کیا لینے آئے ہو؟“

جبار نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”کچھ پتا

ہے، حسن گرفتار ہو گیا ہے۔“

اس کو گویا بچھو نے ڈنک مار دیا تھا، بولا۔ ”حسن

گرفتار ہو گیا؟ مگر کیوں؟ اس کا جرم؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”ہاں، واقعی مجھے تو یہاں تک

معلوم ہو چکا ہے کہ بہشت زار کے منتظمین کو حسن کے دونوں

ساتھیوں کی تلاش ہے کیونکہ حسن نے ابھی تک اپنے

ساتھیوں کے نام نہیں بتائے۔“

اسد نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اگر حسن

نے ہم دونوں کے نام بتا دیے تو؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”ہمیں جلد از جلد روپوش ہو جانا

چاہیے ورنہ کسی بھی لمحے گرفتار کر لیے جائیں گے۔“

اسد نے طنزاً پوچھا۔ ”اور وہ جسے تو نے اپنا از دار

دعتمسار بنا لیا تھا، اس کا کیا حال ہے؟ کیا وہ وقت پڑنے پر

ہمارا ساتھ دے گی؟ ہماری مدد کرے گی؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”یہ اسی کی مہربانیاں ہیں جو

ہمیں اتنی ساری اطلاعات مل گئیں۔ میں چاہتا تھا کہ جب

یہاں سے جاؤں تو ذنوبیہ اور طاہرہ کو بھی اپنے ساتھ لیتا

جاؤں لیکن طاہرہ نے واپسی کے سفر میں ہمارا ساتھ دینے

سے صاف انکار کر دیا ہے۔“

اسد نے کہا۔ ”یہ تو بہت برا ہوا۔ ہم حسن کو بھی بہشت

والوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم اس کو اپنے ساتھ

لے جائیں گے۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”میں نے بھی اپنے دل میں یہ

عہد کر رکھا ہے۔“

وہ دونوں آبشار کے پاس بیٹھ کر دیر تک صلاح

و مشورے کرتے رہے۔ وہ بڑی مشکل میں پھنس گئے تھے۔

آگے کنواں پیچھے کھائی..... آخر جائیں تو جائیں کہاں؟ کافی

دیر تک صلاح مشورے کے بعد دونوں میں اس بات پر

اتفاق ہو گیا کہ جتنی بھی جلدی ممکن ہو، یہاں سے نکل جایا

جائے۔ حسن کو اپنے ساتھ لیا جائے اور اس سلسلے میں ابھی

سے اس کی تلاش شروع کر دی جائے اور یہ کہ اس برج کو

جلد از جلد چھوڑ دیا جائے۔ طاہرہ اور ذنوبیہ کو یہاں سے نکال

لیا جائے اور ان دونوں کو ساتھ چلنے پر مجبور کر دیا جائے۔

ان دونوں نے ایک ساتھ اس جگہ کو تلاش کرنا شروع

کر دیا جہاں وہ لوگوں کی نظروں سے دور اور الجھل رہیں۔

آبشار کے قریب ایک غار تھا۔ اس غار کے دہانے پر کائی جمی

ہوئی تھی اور اس کے در کے آثار ایسے تھے گویا اس میں

سالوں سے کوئی اندر نہیں گیا تھا۔ اسد کو یہ جگہ پسند آگئی۔

اس نے جبار سے کہا۔ ”میرے خیال میں اس سے اچھی کوئی

دوسری جگہ نہیں ملے گی۔“

جبار کچھ کہنا ہی چاہتا تھا مگر اس نے اس کے منہ پر

ہاتھ رکھ کر خاموش کر دیا اور فوراً ہی غار کے اندر چلا گیا۔ جبار

اس سادہ لوح نوجوان کی دلیری اور جرأت پر حیران رہ گیا۔

وہ کافی دیر تک اندر ہی رہا۔ اس کے بعد باہر آیا۔ جبار نے

اس کے سر پر پیار سے چپت لگائی اور کہا۔ ”مجھ کو تیری دوستی

پر ناز ہے۔ تیرے جیسا بہادر اور حوصلہ مند کوئی دوسرا کم از کم

میں نے نہیں دیکھا۔“

اسد نے جواب دیا۔ ”میں تنہا آدمی ہوں اس لیے

موت سے نہیں ڈرتا۔“

جبار نے پوچھا۔ ”اس غار میں رہائش کس طرح

ہوگی؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”دو چار دن رہ جانے کے لیے

اچھی جگہ ہے۔“

ان دونوں میں طے یہی پایا کہ وہ نہایت ہوشیاری

اور چوکنے پن سے حالات اور واقعات پر اپنی نظریں

رکھیں گے اور اس وقت تک غار میں پناہ نہیں لیں گے جب

تک کہ وہ غار کے باہر محفوظ اور خبردار ہیں۔ جبار کو ذنوبیہ کا

انتظار تھا۔ طاہرہ نے اس سے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ وہ ایک نہ

ایک دن ذنوبیہ کو اس کے پاس لے آئے گی۔

☆☆☆

تقریباً تین دن تک حالات پرسکون رہے لیکن

دونوں کے دل و دماغ کا سکون تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ دونوں

کی نیند اڑ چکی تھی اور خوف نے معدے کو سہا دیا تھا۔ اس

میں ہلکا ہلکا درد رہنے لگا۔ دونوں کی طبیعتوں میں عیش و عشرت

کے لیے گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ حوریں آتیں اور اپنا سامنے

لے کر رہ جاتیں۔ طاہرہ میں پہلی سی بات نہیں پائی جاتی

تھی۔ جبار جب تب اس کے تار ہلانے کی کوشش کرتا تو

نا کام رہتا۔

چوتھے دن جبار نے بی پروائی سے پوچھا۔ ”آنسہ

ذنوبیہ! او معاف کرنا، آنسہ طاہرہ!“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”اس میں معافی کی کیا بات



راز کی بات میں تمہیں کس طرح بتا دوں کہ یہاں کی ساری اطلاعات مجھے کیونکر مل جاتی ہیں؟“

جبار نے پھر پوچھا۔ ”کیا یہ یقین ہو گیا ہے کہ حسن اپنے ساتھیوں کی بابت بہت جلد بتا دے گا؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”ہاں مجھے یہی معلوم ہوا ہے۔“  
جبار ایک بار پھر بری طرح پریشان ہو گیا۔ وہ اس سلسلے میں اسد کے ساتھ مشورہ کرنا چاہتا تھا مگر طاہرہ کی لاعلمی میں اس نے طاہرہ کو پرچایا۔ ”طاہرہ! عزیز ترین خاتون! حسن جیسے آدمیوں کو رکھا کہاں جاتا ہے؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”اسی بہشت زار میں ایک ایسی جگہ ہے، جہاں ایسے مجرموں کو قید کر دیا جاتا ہے۔ یہاں اس جگہ کو دارالعتوبت کہا جاتا ہے۔ دارالعتوبت میں سختیوں کے طریقے ایجاد کیے جاتے ہیں اور آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی مجرم کو یہاں پہنچایا گیا ہو اور اس نے سب کچھ اگل نہ دیا ہو۔“

جبار نے کہا۔ ”کیا ایسا ممکن ہے کہ اس عجیب و غریب جگہ کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”ایسا ناممکن کام بھی نہیں۔ پہلے تو یہی طریقہ تھا کہ بہشت زار میں مقیم حضرات کو ایک آدھ بار دارالعتوبت کی سیر ضرور کرا دی جاتی تھی مگر پھر یہ سلسلہ بند کر دیا گیا اور دارالعتوبت کو ایک دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔“

جبار نے اصرار کیا۔ ”طاہرہ! مجھے دارالعتوبت کی سیر ضرور کرا دو۔ تم چاہو تو یہ کام ہو سکتا ہے۔“

طاہرہ نے پوچھا۔ ”لیکن تم دارالعتوبت کو کیوں دیکھنا چاہتے ہو..... وہاں تمہیں کیا ملے گا؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”بس شوق ہے۔“

طاہرہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”بس اس میں ایک خرابی ہے۔ جب میں دارالعتوبت کے منتظمین سے یہ کہوں گی کہ بہشت زار کے چند یا ایک مہمان دارالعتوبت کو دیکھنا چاہتے ہیں تو انہیں فوراً یہ شبہ گزرے گا کہ کہیں یہ شخص حسن کے ساتھیوں میں سے ایک تو نہیں۔ اس طرح بات بڑھ سکتی ہے اور مسئلہ پیچیدہ ہو سکتا ہے۔ پہلے اس پر غور کر لو، سوچ لو۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”میں اس خطرے سے نہیں ڈرتا۔ میں بہر حال دارالعتوبت کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔“

طاہرہ نے کہا۔ ”میں کوشش کروں گی کہ تمہیں دارالعتوبت کی سیر کرا سکوں۔“

جبار نے محسوس کیا کہ بہشت زار بھی دنیا بن چکی

ہے؟ تم دونوں نے مجھے میزبانی کا شرف بخشا، میرے لیے یہ اعزاز کیا کم ہے؟“

جبار نے بات کو گھما پھرا کر کہہ دیا۔ ”طاہرہ! تم اپنی فطرت ہی سے نیک اور صالحہ ہو۔ میں ایک بار پھر تم سے یہی کہوں گا کہ آؤ میرے ساتھ چلو اور اندر.....“

اسد نے بات کاٹ دی، بولا۔ ”بھائی جبار! اس پاک باطن و پاک دل خاتون کا کیا کہنا، اگر یہ ہمارے پاس رہیں اور.....“

جبار نے اسد کی طرف دیکھا اور طاہرہ کو مخاطب کیا۔ ”طاہرہ! لائق صدا احترام خاتون طاہرہ!“

طاہرہ کو ان شاندار کلمات نے بے زر کا غلام بنا لیا۔ ادب سے کھڑی ہو گئی اور جبار سے پوچھا۔ ”آپ کو مجھ سے کوئی کام؟ بخدا میں تو ہمیشہ دن رات یہی دعا کرتی ہوں کہ خدا یا میرے.....“

جبار نے اس کی بات کاٹ دی، بولا۔ ”اگر تم واقعی یہ چاہتی ہو کہ ہم دونوں خوش رہیں تو اس کے لیے ذنوبیہ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کم از کم میرے لیے۔“

طاہرہ نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔ ”میں دو دن اور چاہتی ہوں۔ بس ان دونوں میں ذنوبیہ یہاں آچکی ہوگی لیکن میں ڈرتی ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ میں ذنوبیہ کو یہاں تک لانے کی کوشش کروں اور ہمارے حاسد اور مخالفین وہاں موجود ذنوبیہ کے ماحول اور معاشرے کو گندا کر رہے ہوں۔“

جبار نے عرض کیا۔ ”خاتون! آپ نے مجھے ابھی تک اچھی طرح.....“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”میں نے تم کو اچھی طرح پہچان لیا ہے، شاید اس بہشت زار میں تمہاں ہی ایسی ہوں جس نے تمہیں پہچانا ہے ورنہ دیکھا تو بہتوں نے تمہیں مگر پہچانا ایک نے بھی نہیں۔“

جبار اس انداز گفتگو اور تیز لب و لہجے پر چونک گیا، پوچھا۔ ”خیریت تو ہے طاہرہ! کوئی خاص بات تو نہیں ہے؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”خاص بات یہ ہے کہ حسن پر سختیاں ہو رہی ہیں اور لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے دونوں ساتھیوں کے بارے میں سب کچھ بتا دے گا۔“

جبار نے پوچھا۔ ”تمہیں یہ ساری معلومات کس طرح حاصل ہو جاتی ہیں؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”تم لوگ بہشت زار میں چند دن رہ کر چلے جاتے ہو، میں یہاں مستقل رہ رہی ہوں۔ یہ



ہے۔ یہاں بھی وہی افکار، وہی جوڑ توڑ، وہی کاروبار، وہی سازشیں، وہی آلام حیات۔ وہ حسن کی گرفتاری اور دارالعتوبت کی سختیوں کا حال سن کر اس نتیجے پر ضرور پہنچ گیا تھا کہ اب خیریت اس کی بھی نہیں۔ کسی بھی وقت اس کو گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ باتیں اسد کو بتانا چاہتا تھا لیکن اسد اچانک ایسا غائب ہوا کہ کہیں نظر ہی نہیں آیا۔ وہ اپنے برج تمامکان سے نکل کر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ وہ آبشار کے پاس بھی گیا۔ اس نے سبزہ زار میں بھی اسد کو تلاش کیا لیکن وہ کہیں بھی نہ ملا۔

جب وہ تنہا ہمارا برج میں داخل ہوا تو اس نے طاہرہ کے ساتھ دو آدمی بیٹھے دیکھے، طاہرہ نے پوچھا۔ ”کہاں چلے گئے تھے؟ یہ دونوں بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

جبار نے پوچھا۔ ”ان دونوں کی تعریف؟ یہ میرا کیوں انتظار کر رہے ہیں؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”میں نے ان دونوں سے تمہاری بابت یہ ذکر کیا تھا کہ تم دارالعتوبت دیکھنا چاہتے ہو۔ یہ دونوں رضامند ہو گئے اور اس وقت یہ تمہیں لینے آئے ہیں۔“

جبار نے ان دونوں کو غور سے دیکھنے کے بعد من پھیر لیا، بولا۔ ”لیکن میں دارالعتوبت تنہا نہیں جاؤں گا۔ میرا ساتھی اسد میرے ساتھ ہوگا۔“

طاہرہ نے ان دونوں سے پوچھا۔ ”آپ دونوں کیا کہتے ہیں؟“

ایک نے کہا۔ ”ان کا ساتھی اسد اس وقت ہے کہاں؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”کچھ پتا نہیں، ہمیں کہیں ہوگا۔ اس کو آ لینے دیا جائے۔“

لیکن دوسرے نے اپنے ساتھی کی مخالفت کی، بولا۔ ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ انہیں اگر چلنا ہے تو اسی وقت ہمارے ساتھ چلیں، ورنہ ملتوی کریں۔ ہمیں ان کے جانے نہ جانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

طاہرہ نے جبار کو راضی کرنے کی کوشش کی۔ ”میرا خیال ہے تمہیں اسی وقت ان کے ساتھ چلے جانا چاہیے۔ جب اسد آجائے گا تو وہ بھی کسی کے ساتھ وہیں پہنچ جائے گا۔“

جبار کی چھٹی حس اسے خبردار کر رہی تھی کہ بیٹے ان کی باتوں میں مت آنا کیونکہ یہ جھوٹے اور دغا باز لوگ ہیں۔ یہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں، قابل اعتبار نہیں ہے۔ جبار نے برج کے ایک گوشے میں جا کر اپنے کپڑے اتارنا شروع کر دیے کہ باہر سے کسی نے چاند ماری شروع کر دی۔ کوئی زور زور

سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ جبار نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے اسد کو کھڑا دیکھا۔

جبار خوشی سے پھولا نہ سما۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کر لیا، گلے لگا کر بولا۔ ”میں کتنی دیر سے تیرا انتظار کر رہا ہوں، یہ تو کہاں چلا گیا تھا؟“

اسد نے پوچھا۔ ”کیا تو نے مجھ کو تلاش کیا تھا؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے تجھ کو تلاش کیا مگر تو نہیں ملا۔ بخدا میں بہت خوش ہوں کہ بالآخر تجھ کو پالیا..... میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ آخر وہ کون سی وجہ تھی جس نے تجھ کو کافی دیر کے لیے لاپتا کر دیا تھا؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”اندر کون کون ہے؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”میں، طاہرہ اور دو آدمی جنہیں میں نہیں پہچان رہا۔“

اسد نے گھبرا کر کہا۔ ”تب پھر میں یہیں سے واپس چلا جاؤں گا اور روپوش ہو جاؤں گا۔“

جبار نے پوچھا۔ ”آخر یہ معاملہ کیا ہے، کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو؟“

طاہرہ نے دور ہی سے پوچھا۔ ”کون آیا ہے، اسے اندر لے آؤ۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”اسد آیا ہے۔“

لیکن اسد پھر باہر نکل گیا، بولا۔ ”دوست! طاہرہ سے بھی ہوشیار رہنا۔ یہ شیخ الجبال کی خاص عورت ہے۔“

جبار نے ہنس کر جواب دیا۔ ”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ طاہرہ نہایت قابل اعتبار انداز میں ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ دارالعتوبت کی سیر کرنا چاہتا ہوں چنانچہ وہ دونوں ہمیں دارالعتوبت لے جائیں گے۔“

اس نے آہستہ سے اپنا سر پیٹ لیا۔ ”جبار! میں تجھ کو کس طرح سمجھاؤں کہ ہم دونوں کے خلاف ایک زبردست کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ یہاں کی انتظامیہ کو یہ شبہ ہے کہ ہم دونوں حسن ہی کے ساتھ آئے ہیں۔ یہ تو ہماری خوش نصیبی ہے کہ ابھی تک حسن نے ہمارا نام نہیں لیا ہے۔ اب ان لوگوں کی کوشش یہی ہے کہ اگر حسن ہمارا نام نہیں لیتا تو نہ لے۔ یہ لوگ اپنے طور پر اپنے وسائل سے ہمیں اپنی گرفت میں لے لینا چاہتے ہیں۔“

ایک بار پھر طاہرہ نے آواز دی۔ ”ارے دروازے پر کھڑے دونوں کیا باتیں کرنے لگے..... اندر کیوں نہیں آتے؟“

جبار نے کہا۔ ”اسد! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے اندر



بعد دارالعتوبت ضرور چلوں گا۔ میں خود بھی اس عجیب و غریب شعبے کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔“

دوسرے نے پوچھا۔ ”تب پھر یہ بات طے پائی کہ آپ کل دوپہر کے بعد دارالعتوبت چلیں گے؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ بات طے پا چکی ہے۔“ وہ دونوں فوراً ہی کھڑے ہو گئے۔ طاہرہ ان دونوں کو دروازے تک چھوڑنے لگی۔ وہاں ان دونوں نے کچھ دیر ٹھہر کر طاہرہ سے معلوم نہیں کس قسم کی باتیں کیں کہ طاہرہ نے ذرا بلند آواز میں کہا۔ ”ہاں کل صبح اور دوپہر کے درمیان وہ بھی آجائے گی۔“

وہ دونوں چلے گئے اور طاہرہ واپس آ کر چپ چاپ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ کسی پس و پیش یا شش و پنج میں مبتلا کچھ سوچ رہی تھی پھر آپ ہی آپ پوچھا۔ ”کیا یہ بات درست ہے تمہاری کہ اس وقت اسدا آیا تھا؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اسدا آیا تھا اور ان دونوں کو یہاں پیشادیکھ کر واپس چلا گیا۔ کہہ رہا تھا پھر کسی دن آؤں گا۔“

طاہرہ نے بے تکلفی سے صاف صاف سوال کر دیا۔ ”سچ بتانا، کیا تم دونوں کا حسن سے کوئی تعلق رہا ہے یا نہیں؟“ جبار نے بے ساختگی سے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ ممکن ہے کیونکہ صاحبزادے.....“

طاہرہ نے ایک دم برہم ہو کر جبار کی بات دہرائی۔ ”ہاں، یہ ممکن ہے کا کیا مطلب ہے؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”جب تم لوگ ہم دونوں پر یقین کی حد تک شبہ کے چارے ہو تو میں کیا کروں؟“ طاہرہ نے کہا۔ ”یہاں کی انتظامیہ یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ تم دونوں یہاں کس کے ساتھ آئے تھے؟ تمہیں بہشت زار تک کس نے پہنچایا تھا؟“

جبار نے سختی سے جواب دیا۔ ”اس سوال کا جواب انتظامیہ کے پاس ہونا چاہیے۔“

طاہرہ بے چینی سے ٹپٹپٹ گئی۔ ”اسدا کو آنا چاہیے لیکن وہ اسی وقت یہاں آئے گا جب انتظامیہ کے لوگ اسے چھوڑ دیں گے۔“

جبار نے چیخ کر کہا۔ ”اگر انتظامیہ نے اسدا کو اپنے پاس جبراً روک رکھا ہے تو یہ بری بات ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کا طاہرہ کو علم ہے مگر کسی وجہ سے وہ چھپا رہی ہے۔ جبار طاہرہ کو گھر میں چھوڑ کر نکل گیا اور کئی گھنٹے ادھر ادھر گھوم پھر کر وقت ضائع

آجانے سے ہمیں خطرہ لاحق ہو جائے گا تو اندر مت آؤ اور مجھے یہ بتاؤ کہ میں تم سے کب اور کہاں مل کر تفصیلی باتیں کروں؟“

اسدا نے جواب دیا۔ ”میں فوراً ہی واپس جا رہا ہوں۔ تم کل ہی علی الصباح آبشار کے پاس مل لینا، پھر باتیں ہو جائیں گی۔“

طاہرہ نے جواب نہ پا کر جبار کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا لیکن اسدا یہ محسوس کر کے کہ طاہرہ آرہی ہے، واپس چلا گیا۔ جب طاہرہ نے اسدا کو نہیں پایا تو پوچھا۔ ”تم تو کہتے تھے کہ اسدا آیا ہوا ہے مگر یہاں تو اسدا کا کوئی پتا نہیں۔ اگر وہ آیا تھا تو کہاں چلا گیا؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”طاہرہ! بہشت زار کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔ اسدا آیا تھا مگر واپس چلا گیا۔ وہ پریشان تھا۔ کل صبح آنے کا وعدہ کیا ہے۔“

طاہرہ نے برا سا منہ بنایا۔ ”تم نے کہا تھا دارالعتوبت دیکھوں گا، تب ہی میں نے ان دونوں کو بلوایا۔ وہ دونوں کہہ رہے تھے کہ اسدا یہاں نہیں آسکتا۔ انہوں نے ایسا کیوں کہا، پتا نہیں لیکن ان کی بات درست ثابت ہو سکتی ہے۔“

جبار، طاہرہ کے ساتھ دونوں اجنبیوں کے پاس واپس آ گیا۔ ان دونوں نے مجتہسانہ نظروں سے شاید اسدا کو تلاش کیا اور اس کو نہ پا کر وہ دونوں مسکرائے، ایک نے کہا۔ ”اسدا یہاں نہیں آسکتا، میں جانتا ہوں۔“

جبار نے پوچھا۔ ”میرے دوستو! اسدا یہاں کیوں نہیں آسکتا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ وہ کافی دیر پہلے معلوم نہیں کس طرح دارالعتوبت پہنچ گیا تھا اور وہاں کے لوگ اس سے کسی موضوع پر طویل گفتگو کر رہے تھے۔ ان حالات میں اسدا کا یہاں آ جانا حیرت کی بات ہے۔“

جبار نے کچھ سمجھا، کچھ نہیں سمجھا، بولا۔ ”میں اس وقت دارالعتوبت نہیں جاسکتا۔ کل دوپہر کے بعد چل سکتا ہوں۔“

دونوں نے جبرے سے منہ بنائے، ایک نے کہا۔ ”ہم جنت کی انتظامیہ کے اس اصول سے پریشان اور مجبور ہیں کہ وہ بہشت زار میں کسی قسم کا ہنگامہ پسند نہیں کرتی۔ ورنہ ہم تمہیں اسی وقت دارالعتوبت لے جاسکتے تھے۔“

جبار نے اس کے خطرناک تیور سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس کو ہر حال میں دارالعتوبت لے جائیں گے اور اس سے کسی قسم کی پوچھ گچھ کریں گے۔ وقت کی نزاکت کے پیش نظر اس نے نرمی سے جواب دیا۔ ”میں کل دوپہر کے



کرتا رہا۔ اب وہ بظاہر تنہا رہ گیا تھا۔ خوف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہشت تھر تھری پیدا کر رہی تھی۔ اس کو یقین ہو چکا تھا کہ بہشت زار کی انتظامیہ نے ان تینوں کی بابت بہت کچھ جان لیا ہے اور وہ ان تینوں پر فرداً فرداً ہاتھ ڈالنا چاہتی ہے۔ وہ دونوں آدمی جو جبار کو دارالعتوبت لے جانا چاہتے تھے، اسی سلسلے کی کڑی تھے اور دارالعتوبت جانے کا یہ مطلب تھا کہ حسن کی طرح اس پر بھی سختی شروع کر دی جائے۔ وہ یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ جب انتظامیہ اس کی طرف سے بالکل مجبور ہو جائے گی تو کسی فدائی کے ذریعے چھرا مار کر ہلاک کر دے گی لیکن جبار اس طرح نہیں مرنا چاہتا تھا۔ وہ ان عیاروں سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ کافی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اب اسے بہشت زار کو چھوڑ دینا چاہیے۔

☆☆☆

علی الصباح وہ آبشار کے پاس پہنچ گیا۔ پانی کی چادر شور کے ساتھ نیچے گر رہی تھی۔ وہاں کا ماحول بڑا پرسکون تھا۔ آس پاس صنوبر کے درخت چھتری کی طرح سایہ کیے کھڑے تھے۔ اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ جبار نے صنوبر کے درختوں کی آڑ میں گھوم پھر کر اسد کو تلاش کیا مگر وہ نہیں ملا۔ پھر وہ ایک چٹان پر بیٹھ کر اسد کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی نظر میں ہر طرف اٹھ رہی تھیں۔ اس نے وہیں درختوں کے جھنڈ میں بہت سی حوروں اور غلمان کو گھومتے ہوئے دیکھا۔ اسی عالم میں معلوم نہیں کس طرف سے اسد بھی آ گیا۔ جبار نے پوچھا۔ ”تم کب آئے؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”میں یہاں بہت دیر کا آیا ہوا ہوں۔ اس وقت تک تم نہیں آئے تھے۔“

جبار نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔ ”ہماری باتیں کہاں ہوں گی؟ یہاں یا کہیں اور؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”شیخ کے کتے مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں پھر جب میں پکڑا جاؤں گا تو شیخ تم پر کندیس پھینکے گا اور اس وقت تم جو کچھ بھی کرو گے غصے، جوش اور جذبہ ایثار کے زیر اثر جو کام بھی ہوگا، وہ کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔“

جبار نے پوچھا۔ ”اس طولانی تمہید کا مطلب؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ بہشت زار کو چھوڑ دیا جائے۔“

جبار نے کہا۔ ”میں نے بھی یہی فیصلہ کیا ہے۔“ پھر پوچھا۔ ”ہاں، یہ بات تو بتاؤ کہ.....“

اسد نے بات کاٹ کر جواب دیا۔ ”دیکھ جبار! انتہائی دشواری سے میں یہاں آیا ہوں۔“ اس کے بعد وہ ایک غار میں داخل ہو گیا، بولا۔ ”یہاں میرے ساتھ آؤ تاکہ ہم واپسی کا منصوبہ تیار کر لیں۔“

جبار اس غار میں چلا گیا۔ اسد نے کہا۔ ”مجھ کو انتظامیہ کے لوگوں نے گرفتار کر لیا تھا۔ وہ لوگ مجھ کو دارالعتوبت لے گئے تھے اور وہاں حسن کے روبرو کھڑا کر کے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ چنانچہ میں بھی انہیں ایسے ایسے جواب دیتا رہا کہ وہ اسے ہمیشہ یاد رکھیں گے پھر میں ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔“

جبار نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”دارالعتوبت کی انتظامیہ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر میں ان کے چنگل سے نکلا ہوں۔ اب میں بھاگ دوڑ کر کے یہاں سے فرار ہو جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

جبار نے پوچھا۔ ”پھر حسن کا کیا بنے گا؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتا کہ اس کا کیا بنے گا۔ اس نے حالات خود بگاڑے ہیں۔“

جبار نے پوچھا۔ ”کیا میں اپنے طور پر حسن کو چھڑانے کی کوشش کروں؟“

اسد نے چڑ کر جواب دیا۔ ”کرو، میں کیوں منع کروں مگر جانے سے پہلے یہ یاد رکھنا کہ اگر تم بھی پکڑے گئے تو میں دونوں کو چھوڑ کر یہاں سے نکل جاؤں گا۔“

جبار نے کہا۔ ”بے شک۔ میں نے تم کو اجازت دے دی۔ میں حسن کو چھڑانے کی کوشش کروں گا۔“

اسد کو جبار کی باتیں گراں گزر رہی تھیں۔ بولا۔

”شاید ہمارے راستے الگ الگ ہو گئے ہیں۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”یہ بات نہیں ہے۔“

اسد نے سختی سے کہا۔ ”یہی بات ہے، شیخ الجبال کا نظام سخت اور شکنجے کی طرح ہے۔ ہم نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور عقل و شعور سے جان لیا ہے، وہی کافی ہے۔ اب ہمیں یہاں سے نکل کر ہلا کوخان کے پاس پہنچنا ہے۔“

جبار ڈر گیا۔ ”ہلا کوخان کے پاس؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”ہاں، ہلا کوخان کے پاس۔“

”مگر کیوں؟“

”مگر یوں کہ اس تابوت میں آخری کیل ہلا کوخان ہی ٹھونک سکتا ہے۔“

جبار نے کہا۔ ”کیا میں پاگل ہو گیا ہوں؟ میری عقل



مندی اور تہہ بر کو کیا ہو گیا؟ ہم ہلا کو خان کے پاس کیوں جانے لگے؟

جبار نے سرد مہری سے کہا۔ ”اگر میں واپس نہ آتا تو جاتا کہاں؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”وہیں جہاں تمہارا ساتھی اسد جا چکا ہے۔ اس کا پتا چلایا نہیں؟“

جبار نے کہا۔ ”وہ مجھ سے ملنے آتا تو اس کا پتا بھی چلتا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ دارالعقوبت والوں نے اس کو بھی پکڑ لیا ہے۔“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، تمہارا شبہ غلط ہے۔ تمہارا اندیشہ فضول ہے۔“

جبار نے سختی سے کہا۔ ”میرا اندیشہ فضول نہیں ہے۔“

طاہرہ نے حوروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم دونوں کے پاس آئی تھیں مگر اب تم تنہا ہو، جس کو چاہو اپنے لیے روک لو اور بقیہ کو واپس بھیج دو۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے یہاں جو بھی آ گیا ہے اس کی خاطر تو واضح کر کے سب کو ساتھ واپس بجا جائے۔“

طاہرہ نے پوچھا۔ ”کیا ان میں ایک بھی ایسی نہیں جس کے ساتھ تم کچھ وقت گزار لو؟ دوپہر کے بعد دارالعقوبت کے آدمی تمہیں لینے آ جائیں گے، اس سے پہلے تمہیں آرام کر لینا چاہیے۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”طاہرہ! تم میری بات سمجھ کیوں نہیں رہیں؟“

طاہرہ برا مان گئی، بات کاٹ کر بولی۔ ”دیکھو، پھر تم نے مجھے طاہرہ کہہ کر مخاطب کیا۔ میں نے کہہ جو دیا کہ یہاں کسی حور کا کوئی نام نہیں ہوتا، پھر مجھے طاہرہ طاہرہ کہہ کر کیوں شرمندہ کر رہے ہو؟“

طاہرہ نے جبار کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور دو حوروں کو اشارے سے حکم دیا کہ وہ جبار کا دل بہلانے کی کوشش کریں۔ دونوں حوریں جبار کے پاس گئیں اور ایک ادائے خاص سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئیں۔

جبار نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا، پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟“

ایک حور نے شرمناک جواب دیا۔ ”جان من! خیریت ہی تو نہیں ہے۔ ہم کب تک صبر کریں۔“

دوسری نے کہا۔ ”کوئی پریشانی لاحق ہو تو بتائیں، بندی اس کا کوئی حل نکالے گی۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”میں تنہائی چاہتا ہوں، مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو۔“

ایک نے کہا۔ ”میری آنکھوں میں جھانکو، دیکھو اس

اسد نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ ہمیں وہیں پناہ مل سکتی ہے۔ شیخ کے فدائی جہنم تک پہنچا کرتے پہنچ جائیں گے لیکن وہ ہلا کو خان تک نہیں پہنچ سکتے۔“

جبار نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ہلا کو خان ہم دونوں کو فوراً ہی قتل کر دے گا کیونکہ ہم نے اس کے ایک سردار کو قتل کر دیا تھا۔“

اسد نے کہا۔ ”ہم ہلا کو خان سے مل کر پہلے جاں بخشی کی درخواست کریں گے پھر جب وہ ہمیں معاف کر دے گا تو ہم شیخ کی بہشت زار کا ذکر کریں گے اور اس کو یہاں تک لے آئیں گے اور جب ہلا کو خان اپنے لشکر کے ساتھ یہاں داخل ہوگا تو گویا ہم اپنا مقصد حاصل کر چکے ہوں گے۔“

جبار ہاتھ پر تھوڑی رکھ کر بیٹھ گیا، اس نے کہا۔ ”ہر بات اپنی جگہ لیکن میں حسن کے لیے کوشش ضرور کروں گا۔“

اسد نے نہایت افسوس سے کہا۔ ”میرا خیال ہے حسن کی طرح تمہاری قسمت بھی دغا دے رہی ہے۔“

جبار نے کہا۔ ”تم جو چاہو کہہ لو لیکن میں حسن کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش ضرور کروں گا۔“

اسد نے مایوسی سے کہا۔ ”یہ بھی کر دیکھو۔“

وہ کسی غیر معمولی فکر میں ڈوب گیا۔ جبار نے کہا۔ ”اچھا، میں چلتا ہوں، اب کہاں ملاقات ہوگی؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”وہاں، جہاں بہشت زار کے دربانوں کو ہلاک کیا گیا تھا۔ میں وہیں موجود ہوں گا اور دو دن تک تمہارا انتظار کروں گا۔“

جبار واپس مڑا تو اسد کو اس شخص پر بہت رحم آیا۔ وہ جبار کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک نظر کام کرتی رہی اور کسی چیز نے مزاحم ہو کر دید کا سلسلہ منقطع نہیں کر دیا۔

☆☆☆

جبار واپسی میں سیدھا گھر نہیں گیا۔ وہ صنوبر کے سائے میں بیٹھ کر اپنے فیصلے پر غور کرتا رہا۔ اس نے یہاں ایک بار پھر سوچا کہ اس کو وہی کرنا چاہیے جو اسد کہہ رہا ہے یا پھر وہ، جس کا خود فیصلہ کر لیا ہے..... اور پھر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ حسن کو لیے بغیر چلے جانا غداری کے مترادف ہوگا۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو اس نے گھر کو حوروں سے بھرا پایا..... ان میں طاہرہ بھی تھی۔ اس نے جبار کا مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔ بولی۔ ”مجھ کو تو یہ کہہ کر ڈرا دیا گیا تھا کہ شاید تم واپس نہیں آؤ گے۔“



میں کون ہے..... یہاں بھی تم ہو، میرے دل میں اتر کے دیکھو، دل کا چپا چپا تمہاری یادوں کا جن زار بن گیا ہے۔ یہاں تمہاری ہی مہک ہے اور تمہاری ہی لہک۔“

دوسری نے جبار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، بولی۔ ”ذرا میرے دل کی حرکت تو دیکھو، کتنی زور زور سے دھڑک رہا ہے یہ۔“

جبار نے ان دونوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے ہٹا کر گھر کے ایک گوشے کا رخ کیا۔ یہ چھوٹا سا کمر بہت آراستہ پیرا استہ تھا۔ وہ ان سے بچنے کی خاطر گھر کے ایک گوشے میں چلا گیا تھا۔ یہ گوشہ غسل خانہ تھا۔ غسل خانے میں وہ کچھ دیر تہائی میں وقت گزار سکتا تھا۔ وہ غسل خانے میں جیسے ہی داخل ہوا، اس نے یہاں کسی کو گھٹھری کی شکل میں پڑا ہوا دیکھا۔ وہ غسل خانے سے نکل بھاگنے کے لیے جیسے ہی مڑا، اس گھٹھری نے آواز دی۔ ”جبار! کہاں چلے گئے، ذرا میرے پاس آؤ۔“

جبار واقعی ٹھہر گیا، یہ آواز جانی پہچانی تھی اور پھر اس آواز نے جس طرح دل کی گہرائیوں سے جبار کو مخاطب کیا تھا، اس میں محبت کی تڑپ تھی، لیکن تھی، خواہش تھی، چاہت تھی۔ وہ اس گھٹھری کے پاس جا کھڑا ہوا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”تم نے مجھے پکارا تھا؟ کیوں؟ تم کون ہو؟“

گھٹھری کا سر اٹھا اور کہا۔ ”جبار! کیا تم نے مجھے بھلا دیا؟“

جبار نے گہرا کر اس طرف دیکھا تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”ذو بیہ! یہ تم! یہ تم یہاں کہاں؟ میں نے تجھے کہاں کہاں تلاش کیا۔ بہشت زار کی حوروں میں تیری جستجو کرتا رہا مگر ناکام رہا اور تو مجھے اب ملی بھی تو کہاں؟ یہاں!“

وہ ذو بیہ کے پاس بیٹھ گیا، اس نے ذو بیہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے بالوں کی لٹ کو آنکھوں سے لگا کر ہونٹوں سے لگایا، بولا۔ ”میں تو اس خوشبو کو آج تک نہیں بھلا سکا۔ اس خوشبو کو میری ناک ہی نہیں، میرا ایک ایک مشام سونگھ سکتا ہے۔ میرے دل و دماغ اس کی مہک میں ڈوبے ہوئے ہیں، میرا وجود اس سے سرشار ہے۔“

ذو بیہ آہستہ آہستہ رورہی تھی، بولی۔ ”جب تم ادھر ادھر بادلوں کی طرح مارے مارے پھر رہے تھے، میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ میں تم سے ملنا چاہتی تھی، میں تمہیں آواز دینا چاہتی تھی۔ لیکن یہ سب میں اپنی مرضی سے نہیں کر سکتی تھی۔ میں دل مسوس کر رہ گئی۔ میں تمہاری آواز سننا چاہتی تھی مگر نہیں سن سکی.....“

جبار نے اس کی بات درمیان سے کاٹ دی۔ ”تیرے بغیر یہ بہشت زار سونی سونی تھی۔ اداس، ویران، پھسکی پھسکی۔ میں تو اس ویرانے سے کوچ کرنے والا تھا۔“

جبار نے اپنے پیچھے آہٹ محسوس کی۔ مڑ کر دیکھا، غسل خانے کے در پر طاہرہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے دور ہی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ طبیعت سنبھلی یا نہیں، دل کی اداسی دور ہوئی یا نہیں؟“

جبار نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ”طاہرہ! میں کس زبان سے تمہارا شکر یہ ادا کروں۔“

طاہرہ نے کہا۔ ”پھر وہی طاہرہ! میں کہتی ہوں باز آ جاؤ۔ یہاں کسی کا کوئی نام نہیں۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”طاہرہ! یہ تم غلط کہہ رہی ہو۔ دیکھو میری طرف، میرے پاس یہ کون ہے؟ ذنو بیہ..... اس کا نام ذنو بیہ ہے پھر یہ نام والی لڑکی بہشت زار میں کہاں سے آ گئی؟“

طاہرہ نے کہا۔ ”تم خود ہی ہر کسی کا نام رکھ لیتے ہو۔ جو شاید تمہاری شناخت کے لیے ضروری ہے۔“

جبار نے ذنو بیہ کو اپنے سامنے بٹھالیا اور اس کے چہرے پر سے رومال ہٹا کر بغور دیکھنے لگا، غلطی باندھ کر۔ ذنو بیہ کی دوٹیس پیشانی کو چوم رہی تھیں۔ باریک بھویں جبار کے دل پر تلوار چلا رہی تھیں اور بڑی بڑی پتلیوں میں تیر و سناں اتار رہی تھیں۔ ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کیف و سرشاری بخش رہی تھی۔

ذنو بیہ نے آہستہ سے پوچھا۔ ”جبار! کیا تم مجھ سے واقعی محبت کرتے ہو؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”کیا تمہیں شک ہے اس میں؟“

ذنو بیہ جبار کو دیکھتی رہی اور مسکراتی رہی۔ ”میں کس طرح یقین کروں؟“

جبار نے کہا۔ ”افسوس کہ میں اپنا دل چیر کے نہیں دکھا سکتا۔ ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ میرا رُواں رُواں تمہارے نام کا ورد کرتا رہتا ہے۔ میں خواب ذنو بیہ تمہارے دیکھتا ہوں اور خیال پر تمہاری حکومت ہے۔“

ذنو بیہ نے پرودائی سے کہا۔ ”تم باتیں اچھی کر لیتے ہو، لیکن عمل ہمیشہ اس کے برعکس رہتا ہے۔“

جبار نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

ذنو بیہ نے کہا۔ ”میں جو کچھ بھی کہہ رہی ہوں، سچ کہہ رہی ہوں۔ ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر تو دیکھو، دل کو ٹٹول کر تو دیکھو۔“



جبار پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے ذنوبیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”جو کچھ کہنا چاہتی ہو، صاف صاف کھل کر کہو تا کہ میں اس کا واضح اور صاف جواب دے سکوں۔“

ذنوبیہ نے پوچھا۔ ”تم مجھے حاصل کرنا چاہتے تھے؟“  
”بالکل بالکل۔ یہ بات تو کسی قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے۔“

ذنوبیہ نے کہا۔ ”اور تمہیں یہ بات بھی معلوم ہے کہ اس بہشت زار میں داخلہ شیخ الجبال کی خدمت کے عوض ہوتا ہے، اس کی ایک قیمت مقرر ہے۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں ان ساری باتوں سے واقف ہوں..... پھر؟“

ذنوبیہ نے منہ پھیر لیا، بولی۔ ”پھر میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اس بار تم نے بہشت زار میں داخلے کی کیا قیمت ادا کی؟ تم نے میرے لیے کیا کیا؟ تم کس طرح اور کن لوگوں کے ساتھ اس بہشت زار میں داخل ہوئے؟“

جبار نے پوچھا۔ ”کیا ان کا جواب ضروری ہے؟“  
ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، ان کا جواب بہت ضروری ہے۔“

جبار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں اسے ضروری نہیں سمجھتا۔“

ذنوبیہ بگڑ کر کھڑی ہو گئی، بولی۔ ”اگر تم اس کو ضروری نہیں سمجھتے تو میں بھی کسی بات کو ضروری نہیں سمجھتی۔ میں چلتی ہوں اور اگر اللہ نے چاہا تو آئندہ ہم دونوں کسی کو بھی یاد نہیں کریں گے، سب کچھ بھلا دیں گے۔“

جبار نے اس کا راستہ روک لیا، بولا۔ ”مگر یہ تم ناراض ہو کر چلی کہاں ہو؟“

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ”میں جہاں سے آئی ہوں، وہیں واپس چلی جاؤں گی۔“

جبار نے کہا۔ ”میں تم کو جانے کب دوں گا؟“  
ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ”تم میرا راستہ نہیں روک سکتے۔“

جبار کھسپا جا رہا تھا۔ ”میں راستہ روک سکتا ہوں۔“  
ذنوبیہ نے جبار کو اپنی راہ سے ہٹا دیا، بولی۔

”خدا حافظ، میں چلی۔“ جبار نے دوڑ کر پھر سے اس کا راستہ روک لیا، پوچھا۔ ”ذنوبیہ! یہ بتاؤ، کسی بات پر ہم دونوں کی صلح ہو سکتی ہے؟“

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ”صلح ہو سکتی ہے مگر میں جانتی ہوں کہ تم صلح نہیں کرو گے۔“

جبار نے نہایت نرمی اور لجاجت سے کہا۔ ”تم نہیں جانتیں ذنوبیہ! تم کچھ بھی نہیں جانتیں۔ میں تم سے صلح کر لوں گا، ہر اس شرط کو مان کر جو تم رکھو گی، جو تم پیش کرو گی۔“

ذنوبیہ نے بڑے غور سے جبار کو دیکھا اور مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا سچ؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”بالکل سچ۔ میں ہر کسی سے جھوٹ بول سکتا ہوں مگر تم سے نہیں بول سکتا۔“

ذنوبیہ نے کہا۔ ”دیکھو، ایک بار پھر سوچ لو، کہیں مگر نہ جانا بعد میں۔“

جبار کھسپا ہوا تھا، بولا۔ ”میں نے ایک بار جو کہہ دیا کہ نہیں مکر دوں گا۔“

ذنوبیہ نہایت احتیاط سے کام لے رہی تھی، بولی۔

”پھر بتاؤں میں اپنی شرط؟“

جبار نے کہا۔ ”بتاؤ، بیان کرو اپنی شرط۔“

ذنوبیہ نے کہا۔ ”میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم بہشت زار میں کس طرح داخل ہوئے اور تمہارے ساتھ اور کون کون تھا؟“

جبار نے کہا۔ ”لیکن یہ جو کچھ تم پوچھ رہی ہو، اس کا ہم دونوں کی محبت سے کیا تعلق؟“

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ”اس کا تو ہم دونوں کی محبت سے اتنا شدید اور گہرا تعلق ہے کہ کچھ میں ہی جانتی ہوں۔“

جبار نے بے بسی سے کہا۔ ”ذنوبیہ! اگر میں تمہارے اس سوال کا جواب دے بھی دوں گا تو اس کے بعد میرا کیا حشر ہوگا، شاید تم نہیں جانتیں۔“

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ”میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تمہارا کچھ نہیں ہوگا۔“

جبار نے کہا۔ ”ذنوبیہ! مجھے نہیں معلوم کہ تم مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہی ہو؟ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ میرے جواب سے تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ میرا جواب مجھے کیا نقصان پہنچائے گا۔ اللہ ہم دونوں پر رحم فرمائے۔“

ذنوبیہ نے کہا۔ ”جب تک مجھے میرے سوالوں کا جواب نہیں ملے گا، میں تم سے خوش نہیں ہوں گی۔“

جبار نے کہا۔ ”اپنا سوال ایک بار پھر دہرا دو۔“

ذنوبیہ نے اپنا سوال دہرا دیا۔ ”تم بہشت زار میں کس طرح داخل ہوئے اور تمہارے ساتھ اور کون کون تھا؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ یہ سوال تو نہیں کر رہی ہے کوئی اور کر رہا ہے، تو میرا جواب سن۔ میں اس بہشت میں خود سے آیا ہوں۔ مجھے یہاں کا راستہ معلوم ہو گیا



”ذوبیہ! میری خواہش تو یہی تھی کہ تو بھی میرے ساتھ چلتی لیکن میں جانتا ہوں کہ تو اس سفر میں میرا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ میں جلد ہی واپس آؤں گا اور تجھ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

ذوبیہ نے مایوسی سے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ رہ کر کیا کروں گی۔ میں تو تباہ و برباد ہو چکی اور پھر کون جانے کہ اس سوسا سوسالہ عکبوتی جال سے کبھی نجات بھی مل سکے گی یا نہیں۔ کم از کم میں تو مایوس ہی ہو چکی ہوں۔“

طاہرہ نے جبار کو ایک طرف لے جا کر سمجھایا۔ ”کیا تم نے میری بات نہیں سنی؟ تم جلد از جلد یہاں سے نکل جاؤ۔ اگر وہ لوگ آگئے تو تم یہاں سے مل بھی نہیں سکو گے۔“

جبار نے ذوبیہ اور طاہرہ کو الوداع کہا اور خاموشی سے برج کو چھوڑ دیا۔ وہ جس راستے سے اس بہشتِ اعلیٰ میں داخل ہوا تھا، اسی سے باہر نکل گیا اور بہشتِ عام میں داخل ہو گیا۔ وہ تیزی سے اس غار کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا جہاں داخلے کے وقت وہ چند دربانوں کو ہلاک کر چکا تھا۔ پہلے اس کے ساتھ دو ساتھی بھی تھے مگر اب وہ تنہا تھا۔

راستے میں اس نے حوروں کو نوواردِ احمق مہمانوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے دیکھا۔ جگہ جگہ اس نے گانے کی آوازیں سنیں۔ موسیقی میں شامل اور ڈوبی ہوئی آوازیں۔ سرخ و سفید دکتے انگاروں جیسے چہروں کو بد صورت نوجوانوں کے سفاکانہ سلوک کا نشانہ بنتے دیکھا۔ اس نے حسین ترین مغنیوں کو عاشقانہ بلکہ فاسقانہ کلام گاتے سنا۔ دکھ منظر اس کے پاؤں پکڑ رہے تھے مگر وہ کہیں رکنے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ اس نے اپنے پا جاے کے نیچے میں زہر میں بجھا ہوا خنجر چھپا رکھا تھا۔ حفظ ماتقدم کے لیے۔

جب وہ غار کے قریب پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ اس نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ دن کے اجالے میں اس غار میں نہیں داخل ہوگا۔ وہ غار کے قریب ایک چٹان کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا اور رات کا انتظار کرنے لگا۔ اس کو معلوم تھا کہ غار کے نئے دربان پہلے سے زیادہ مستعد اور چوکس ہوں گے اور ان کو دھوکا دے کر نکل جانا بہت مشکل ہوگا۔

شب کے اندھیرے میں اس نے پیچھے چھوڑی ہوئی بہشت پر نظر ڈالی۔ بہشت کے گھروں اور برجوں میں روشن چراغ اور شمعوں کا نور دور سے بہت اچھا لگ رہا تھا حالانکہ بہشت یہاں سے دور تھی۔ شب کی سیاہی میں وہ چٹان کی آڑ سے نکلنے کا منصوبہ بنا ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

میں یہاں تنہا نہیں آیا۔ میرے ساتھ کئی آدمی تھے۔ تو میرا جواب یہاں کے منتظمین تک پہنچا دے۔ وہ مجھے یہاں نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ سرزمین بہشت میں وہ خون نہیں بہا سکتے۔ اگر بہائیں گے تو وہ سادہ لوح بہشتی مہمان کیا سوچیں گے جو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت چند دنوں کے لیے یہاں داخل کیے گئے ہیں۔“

ذوبیہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، وہ کہہ رہی تھی۔ ”جبار! تم یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ بہشت نہیں جہنم ہے جہاں انسانی روحوں کو گناہ و معصیت کی آگ میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ یہاں عورت کی کوئی عزت نہیں۔ آزاد دنیا کی وہ عورت جو پازاری کہلاتی ہے، وہ اس بہشت زار کی عورت سے بہتر ہوتی ہے۔ اسے اپنے آپ پر اختیار تو ہوتا ہے لیکن بہشت زار کی عورت مجبور محض ہوتی ہے۔ تم نے اس گناہ کی سرزمین کو سمجھ لیا ہے اس لیے شیخ کے آگے کار تمہیں ہلاک کر دینا چاہیں گے۔ تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ خدا کے لیے اپنی دنیا میں واپس چلے جاؤ۔ اب میں تمہارے کام کی نہیں رہ گئی۔ میں اور یہاں کی ساری عورتیں شاہراہ کے ماتند ہیں۔ سادہ لوح، فریب خوردہ نوجوانوں کی گزرگاہ ہیں۔“

ذوبیہ ہچکچایاں لے لے کر رونے لگی۔ شاید طاہرہ اس کی باتیں سن رہی تھی، وہ بھی اندر آگئی، اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور ذوبیہ کو سلی دینے لگی۔ اس نے کہا۔ ”مت رو ذوبیہ۔ مجھے تجھ سے ہمدردی ہے۔“ اس کے بعد وہ جبار کی طرف گھوم گئی، بولی۔ ”میں نے تم دونوں کی باتیں سن لی ہیں۔ ذوبیہ نے تم سے جو کچھ پوچھا، وہ یہاں کے منتظمین کی طرف سے تھا۔ تم نے جو جواب دیا، وہ انہیں پہنچا دیا جاتا۔ میں ان کی ایک خاص کارکن ہوں۔ ابھی تک یہاں کی انتظامیہ کی وفادار تھی مگر میں تم دونوں کے معاملے میں انتظامیہ کا ساتھ نہیں دوں گی۔ ذوبیہ نے کیا پوچھا، تم نے کیا جواب دیا۔ تم دونوں یہ سمجھ لو کہ میں نے کچھ نہیں سنا۔“ جبار سے بطور خاص کہا۔ ”تم یہاں سے نکلنا چاہو تو خاموشی سے نکل جاؤ۔“

جبار نے شکر گزار نظروں سے طاہرہ کو دیکھا، کہا۔ ”میں اپنے ساتھ ذوبیہ کو لے جا سکتا ہوں؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”میری طرف سے اجازت ہے مگر میرا مشورہ یہ ہے جبار کہ تم تنہا جاؤ۔ تم ذوبیہ کو نکال لے جانے میں کامیاب نہیں رہو گے۔ خواجواہ مصیبت مول لینے سے کوئی فائدہ نہیں۔“

جبار نے طاہرہ کا مشورہ مان لیا اور ذوبیہ سے کہا۔



آسمان پر چاند نہیں تھا۔ گرد و غبار سے پاک آسمان پر بے شمار چھوٹے بڑے زیادہ روشن اور کم روشن ستارے جھلملا رہے تھے۔ ان کی روشنی میں ان دونوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ انہیں بہشت زار سے نکلنے کا بڑا دکھ تھا۔ بار بار یہی جی چاہتا تھا کہ وہ اس جنت ارضی میں واپس چلے جائیں، اگر انہیں موت کا خوف نہ ہوتا تو وہ وہاں سے اتنی جلدی نہ بھاگتے۔

صبح ہوتے ہوتے وہ ایک چٹان کے پیچھے چھپ گئے۔ کیونکہ انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ انہیں منزل مقصود تک پہنچنے پہنچنے کئی دن کیوں نہ لگ جائیں، وہ دن کی روشنی میں سفر نہیں کریں گے کیونکہ سورج کی روشنی میں انہیں بہت دور سے دیکھا جاسکتا تھا۔

وہ پہلی بار جس چٹان کے پیچھے چھپے تھے، وہ درختوں میں چھپی ہوئی تھی اور کہیں سے بھی انہیں دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ یہاں اسد نے جبار سے پوچھا۔ ”تو بہشت اعلیٰ سے فرار کس طرح ہوا؟“

جبار نے پوری تفصیل بتا دی، بولا۔ ”اگر ظاہرہ میرا ساتھ نہ دیتی تو میں وہاں سے نکل نہیں سکتا تھا۔“

اسد نے ذنوبیہ کا ذکر دلچسپی سے سنا، بولا۔ ”افسوس کہ میں اس سے نہیں مل سکا۔ تم نے اس کی بابت جو کچھ بتایا، اس سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ شاید وہ اپنا دامنی توازن کھو چکی ہے۔“ جبار نے کہا۔ ”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں مگر وہ بہشت زار میں لڑکیوں اور عورتوں کے کردار و اعمال سے بہت زیادہ دل برداشتہ ہے۔ شاید یہ روگ اسے گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔“

اسد نے کہا۔ ”اگر یہ بات تھی تو تم اسے اپنے ساتھ لے آتے۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”میں نے تو یہی چاہا تھا کہ ذنوبیہ کو اپنے ساتھ لے لوں مگر ظاہرہ نے مجھے منع کر دیا۔ اس نے کہا کہ ذنوبیہ تمہارے ساتھ ہوگی تو سفر مشکل ہو جائے گا۔ ہاں بس یہ کوشش کرو کہ جلد از جلد واپس آؤ اور اسے اپنالو۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی زندگی اور اپنے طور طریقے بدل دوں۔ گوکہ اس میں پریشانیوں کا منہ زیادہ دیکھنا پڑے گا۔“

جبار کی آنکھیں بھر آئیں، رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”اسد! سچ بتانا کبھی تم پر بھی ایسا وقت پڑا ہے کہ تم اپنی مرضی اور خواہش کے خلاف فیصلے کرنے پر مجبور ہو گئے ہو؟“ اسد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”ایسا کئی بار ہوا۔“

جبار کی جان ہی تو نکل گئی۔ وہ پیچھے مڑ کر اس شخص کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کو کچھ پتا نہ تھا کہ آنے والا کون ہے؟ بہر حال یہ شبہ تو پیدا ہوا ہوگا ہی کہ وہ پکڑا گیا اور شاید اب اس کو قتل کر دیا جائے گا اور اس کے بعد جو کچھ بھی ہوگا، وہ عزت و احترام سے ہوگا۔

کاندھے پر ہاتھ رکھنے والے نے پوچھا۔ ”تو کون ہے اور اس وقت کہاں جا رہا ہے؟“ جبار نے جواب دیا۔ ”تم کون ہو اور اس وقت یہاں کیوں آئے تھے؟“

پشت پر ہاتھ رکھنے والا دبی دبی ہنسی میں بولا۔ ”خوب خوب! میں جانتا تھا کہ تو ضرور آئے گا۔ اب ہم دونوں کی منزل آسان ہو جائے گی۔“

جبار اس آواز پر ہنسنے لگا اور اس کی اپنی آواز میں مردانگی آگئی۔ اس نے پوچھا۔ ”حسن کا کچھ پتا چلا؟“ دوسری طرف سے جواب ملا۔ ”نہیں، اس کو بھلا دو۔ حسن کو بھول جاؤ۔ اب ہم دونوں کو کسی نہ کسی طرح جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ہے کیونکہ بہشت کی انتظامیہ کو ہماری بابت معلوم ہو چکا ہے۔“

جبار نے کہا۔ ”اسد! سوچو تو سہی، غار کے دربانوں کو کس طرح راستے سے ہٹایا جائے؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”میں نے دربانوں کی تعداد اور ان کے طریقہ دربانی کو معلوم کر لیا ہے۔ دربان کل چار ہیں اور دو دو مخالف سمتوں میں چل کر ذرا سی دیر کے لیے ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے ہیں۔“

جبار نے پوچھا۔ ”پھر ہم انہیں دھوکا کس طرح دیں گے؟“ اسد نے جواب دیا۔ ”میں پتھروں کی آڑ میں غار میں داخل ہو جاؤں گا اور پھر ہم دونوں جس طرف کنارے کنارے آگے بڑھیں گے، اس کے سامنے دوسری طرف پتھروں کی بارش کر دیں گے۔ دربان دوڑ کر ادھر جائیں گے اور ہم دونوں اس عرصے میں آگے بڑھ جائیں گے اور شاید اتنے آگے بڑھ جائیں گے کہ ہمیں ان دربانوں کی پھر فکریں نہیں رہے گی۔“

اسد نے اس ترکیب پر عمل کر کے دکھا دیا۔ اس نے غار کے باہری حصے میں پتھروں کی اتنی زور کی بارش کر دی کہ چاروں دربان غار سے باہر نکل گئے اور ادھر ادھر کھڑوں اور چٹانوں کے پیچھے تلاش اور جستجو میں لگ گئے۔ اس عرصے میں یہ دونوں غار میں داخل ہو کر کافی دور پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ وہ غار کی دوسری طرف نکل گئے۔



بہشتِ اعلیٰ میں میری توبہ بس یہی خواہش تھی کہ میں تم کو اپنے ساتھ لے لوں اور یہ راستہ ہم دونوں مل جل کر طے کریں مگر اس وقت خدا کو یہ بات منظور نہیں تھی اور ہم دونوں الگ الگ سفر کر کے بالآخر ایک جگہ ایک دوسرے سے مل گئے۔“

دن بھر چھپے رہنے کے بعد جب رات ہوئی تو وہ چٹان کے پیچھے سے نکل کر آگے بڑھے۔ انہوں نے نہایت احتیاط سے سفر شروع کر دیا اونچے نیچے راستوں نے انہیں تھکا ڈالا مگر ان کے اس احساس نے ان میں حوصلہ اور ولولہ برقرار رکھا تھا کہ وہ ہلاکو خان کو اس بہشتِ ارضی تک پہنچا کر اس سے غیر معمولی داد و تحسین حاصل کریں گے۔ انہیں اپنے آپ ہی یہ یقین بھی تھا کہ ہلاکو خان ان سے اتنا زیادہ خوش ہو جائے گا کہ ان کی سابقہ غلطیوں اور گناہوں کو اپنے دل و دماغ سے نکال دے گا۔

ان کے قریب ہی سے چشمے کا شور سنائی دے رہا تھا لیکن وہ کچھ بھی نہ سکتے تھے۔ یہ شور ان دونوں کو اپنی طرف بلا رہا تھا مگر یہ دونوں وہاں جا نہیں سکتے تھے کیونکہ چشمے کے پاس اس بات کا امکان تھا کہ شیخ الجبال کا کوئی آدمی یا چند لوگ وہاں موجود ہوں۔ اسد کو پیاس بھی لگ رہی تھی۔ اس نے جبار سے کہا۔ ”کیا تم میرے لیے تھوڑا تازہ پانی لا سکتے ہو؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”لا سکتا کیا معنی! میں پانی لا کر دکھاؤں گا۔ جان ہے تو جہان ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔“

جبار چشمے کی طرف پانی لینے چلا گیا۔ رات کے اندھیرے میں چشمے تک کا سفر کرنا بہت دشوار تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ چشمے تک پہنچا تو اس نے وہیں کہیں قریب ہی کسی کے گنگنانے کی آواز سنی۔ وہاں چند آدمی آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ جبار سمجھ گیا کہ یہ لوگ شیخ الجبال کے تازہ شکار ہوں گے جنہیں کسی بھی طرح ہلاک کر دینا شاید ثواب کی بات ہو کیونکہ یہی شکار جب بہشت سے نکل کر اپنے شکار کی تلاش میں نکلیں گے تو اس وقت ان سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہوگا۔ اچانک گنگنانے کی آواز گانے میں بدل گئی اور ایک دلکش اور حسین آواز نے پورے ماحول پر ایک سحر سا طاری کر دیا۔ وہ اس آواز کے سحر میں گرفتار ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جب گانا موقوف ہوا تو وہ چپکے چپکے چشمے تک گیا اور پانی بھر کر واپس آ گیا۔

اسد پریشان ہو رہا تھا، اس نے پوچھا۔ ”ویر کہاں لگ گئی تھی؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”چند دہقان بہشت زار لے

جائے جا رہے ہیں، میں ان کا گانا سننے لگا تھا۔“

اسد نے جی بھر کے پانی پیا اور رب کا شکر ادا کیا، کہنے لگا۔ ”اللہ انہیں غارت کرے۔ ہمیں جلد از جلد ہلاکو خان کے پاس پہنچنا چاہیے تاکہ اللہ کے بندے ان کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ جائیں۔“

وہ رات سفر میں گزار کر صبح ہوتے ہوتے ایک بار پھر چٹان کے پیچھے چھپ گئے۔ اسی طرح کئی دن بعد وہ ان کو ہستانی سلسلوں سے نکل کر کھلے میدان میں داخل ہو گئے۔ دونوں نیچے کی طرف چل پڑے کیونکہ انہیں راستے ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ ان دنوں شیخ الجبال اور ہلاکو خان کے درمیان نامہ و پیام بڑی شدت سے جاری ہے۔

گر دو غبار میں اٹے ہوئے چہرے جب ہلاکو خان کے لشکر میں پہنچے تو ان کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ جبار نے نور محمد حداد سے ملاقات کی۔ نور محمد حداد ان دونوں کو اپنے در پر کھڑا کر کے ہلاکو خان کے پاس چلا گیا۔ جبار اور اسد کو اس بات پر حیرت تھی کہ نور محمد حداد نے کچھ زیادہ دلچسپی اور عقیدت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

دوسری طرف نور محمد حداد ہلاکو خان سے عرض کر رہا تھا۔ ”حضور والا! دونوں درویش میری خوش قسمتی سے ایک بار پھر میرے پاس آگئے ہیں، ان کی بابت جو حکم ہو اس پر عمل کیا جائے۔“

ہلاکو خان کو حداد کی بات پر یقین نہیں آیا، بولا۔ ”حداد! کیا تو جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر یقین بھی رکھتا ہے؟“

حداد نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں مجھے اس کی سچائی پر پورا یقین ہے۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”کیا تو جانتا ہے کہ ان دونوں پر کون سا جرم عائد ہے؟“

حداد نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں یہ بھی جانتا ہوں۔ قتل کا جرم۔“

ہلاکو خان نے اپنے چند سر پھرے سپاہیوں کو حداد کے ساتھ کر دیا۔ بولا۔ ”ان دونوں کو اسی وقت میرے پاس لایا جائے۔“

ہلاکو خان کے سپاہیوں نے اسد اور جبار کو گرفتار کر لیا۔ حداد انہیں گرفتار ہوتے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

جبار نے پوچھا۔ ”نور محمد حداد! یہ تو نے کیا کیا؟“

دوسری طرف سے اسد نے کہا۔ ”حداد! تو نے شاید ہمیں پناہ دی تھی؟“

نور محمد نے جواب دیا۔ ”میں نے تمہیں پناہ نہیں دی



الجبال ہم سے یہی کام لینا چاہتا تھا۔ جب ہم آپ کو قتل نہیں کر سکے، تو کھسیا کر آپ کے ایک سردار ہی کو قتل کر دیا۔ جب ہم قتل کا جرم کر کے چھپتے پھر رہے تھے تو ہماری ملاقات ایک ایسے نوجوان سے ہو گئی جو شیخ الجبال کے چکر میں نیا نیا آیا تھا۔ اس نے شیخ الجبال کی بہشت ارضی میں چند دن گزارے تھے اور جب اسے واپس لایا گیا تھا تو اس نے جنت ارضی کا راستہ یاد کر لیا تھا۔ اس نے ہنس کر ہمیں یہ بتایا کہ شیخ الجبال حشیش پلوا کر اپنے ماننے والوں کو جس بہشت کی سیر کراتا ہے، وہ کہیں اوپر آسمانوں میں نہیں، اسی زمین پر ہماری دسترس میں موجود ہے۔“

ہلاکو خان نے یہ سب بڑی دلچسپی سے سنا، پوچھا۔ ”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگر تم دونوں کو بہشت زار کا راستہ معلوم ہو گیا ہے، تو ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”آپ کو اس سے یہ فائدہ پہنچے گا کہ آپ چشم زدن میں اس بہشت میں داخل ہو جائیں گے جہاں پہنچنے کی بڑے بڑے حکمراں خواہش کیا کرتے ہیں۔ آپ انسانی ہاتھوں کی تعمیر کردہ بہشت میں سے اپنی پسند اور خواہش کی لڑکیاں حاصل کر سکیں گے۔ آپ اس اہم اور پیچیدہ معاملے کو سرسری نہ سمجھیں، نہایت اہم اور خاص معاملہ ہے یہ۔“

ہلاکو خان کے سخت پتھر لیے دل پر اثر ہو چکا تھا۔ وہ پہنچ چکا تھا، پوچھا۔ ”پھر میں اس جنت میں کب اور کتنے آدمیوں کے ساتھ داخل ہو سکوں گا؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”اگر خان محترم کو میری بات گراں نہ گزرے تو میں ایک حقیر سا مشورہ دینا چاہوں گا۔“

ہلاکو خان نے منہ بنایا۔ ”دے مشورہ، میں سنوں گا۔“

جبار نے عرض کیا۔ ”خان محترم! آپ کا دبدبہ چہار دانگ عالم میں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ شیخ الجبال کو ایک سخت خط لکھیں۔ اس میں شیخ الجبال کو صاف صاف لکھ دیجیے کہ وہ اپنے تمام قلعے برباد کر دے، گرا دے اور آپ کو اپنی بہشت ارضی تک پہنچا دے۔“

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”اس کا فائدہ؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”خان محترم تو جانتے ہی ہیں کہ ہمیں شیخ الجبال نے آپ کو قتل کر دینے کی غرض سے بھیجا تھا۔ اب آپ ہم دونوں کو اپنا قاصد بنا کے شیخ الجبال کے پاس بھیج دیجیے۔ اس طرح آپ شیخ الجبال کو خود اس کی نظر میں ذلیل و خوار کر دیں گے۔“

ہلاکو خان مسکرایا۔ ”جاودانی نیلے آسمان کی قسم! تم

تھی۔ ہاں تم مجھ سے یہ ضرور پوچھ سکتے ہو کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ میں تمہارے اس سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔“

منگول سپاہی انہیں فوراً ہلاکو خان کے پاس لے جانا چاہتے تھے مگر حداد نے کچھ دیر کے لیے انہیں روک لیا۔ وہ ان دونوں کی زبان سے کچھ سننا چاہتا تھا۔

حداد نے پوچھا۔ ”تم دونوں نے بتایا نہیں کہ تم نے پچھلے دنوں اپنے آقاؤں کے ساتھ انسانیت سوز نازیبا سلوک کیوں کیا تھا؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”وہ ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ اگر ہم انہیں نہ مارتے تو وہ ہمیں مار دیتے۔“

”منگول سردار نے تمہارا پیچھا کیا تھا یا تم دونوں کو...“

برعافیت شہر کے باہر تک پہنچانے کی خواہ مخواہ ذمے داری قبول کر لی تھی؟ میں یہ سب کچھ پہلے ہی معلوم کر چکا ہوں، تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔“ حداد بہت زیادہ خفا تھا۔

اسد نے جواب دیا۔ ”حداد! تم جس طرح چاہو سوچو، بات صرف اتنی سی ہے کہ اگر ہم اس منگول سردار اور مسلمان تاجر کو اپنے ہاتھ سے نہ مارتے تو وہ دونوں ہمیں قتل کر دیتے اور اگر ہم دونوں قتل کر دیے جاتے تو ذرا تم سوچ کر بتاؤ کہ اس وقت میرا خون بہا کون لیتا، ہماری طرف سے یہ مقدمہ کون لڑتا؟“

اسد نے خاموشی اختیار کر لی تو منگول سپاہی نے کہا۔ ”میں ان دونوں قاتلوں کو اپنے آقا، ہلاکو خان کے پاس لے جا رہا ہوں، جس کو ان دونوں سے ہمدردی ہو وہاں پہنچ جائے۔“

وہ ان دونوں کو لے کر ہلاکو خان کے پاس پہنچ گیا۔ ہلاکو خان بڑی بے چینی سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ جب ان دونوں کو اس کے سامنے پہنچایا گیا تو ہلاکو خان غصے سے دانت پیسنے لگا، پوچھا۔ ”ناخبرارو! تم کس امید پر دوبارہ یہاں چلے آئے؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”محترم ایل خان! ہم آپ کے پاس ایک خوشخبری لے کر آئے ہیں۔ آپ اگر ہمیں قتل کرنا دینا چاہتے ہیں تو بشوق اسی وقت قتل کرادیں اور اگر وہ خوشخبری جس کا میں نے ذکر کیا، سننا چاہتے ہیں تو ہمیں زندہ رکھیں اور اسے ہماری زبان سے سن لیں۔“

ہلاکو خان نے جبار کی طرف دیکھا، جبار نے کہا۔ ”خان محترم! ہم نے اب تک جو کچھ بھی کیا ہے، خلوص سے کیا ہے۔ پہلے ہم دوبار یہاں آچکے ہیں۔ اس وقت ہم شیخ الجبال کے نمائندے ہوتے تھے اور آپ کے پاس آنے کی غرض و نہایت یہ ہوا کرتی تھی کہ آپ کو قتل کر دیں کیونکہ شیخ



دونوں بہت چالاک معلوم ہوتے ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس طرح تم دونوں میرے چنگل سے نکل جانے کی تدبیر کر رہے ہو؟“

اسد نے کہا۔ ”محترم خان! آپ یہ تو جانتے ہیں کہ ہم دونوں آپ کے لشکر میں اپنی مرضی سے آئے ہیں۔ ہم اگر یہاں نہ آنا چاہتے تو ہمیں یہاں کون لاسکتا تھا۔“

ہلاکو خان کے دل پر یہ دلیل اثر کر گئی، پوچھا۔ ”تم دونوں بہشتِ ارضی کی سیر کر آئے؟“

دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔ ”جی محترم خان!“

”تمہیں اس کا راستہ معلوم ہے؟“

”معلوم ہے۔“

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”اور وہ نوجوان کہاں ہے جس نے تم دونوں کو اس بہشت تک پہنچایا تھا؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”حضور والا! ہم اسے بہشت زار سے اپنے ساتھ واپس نہیں لاسکے۔“

ہلاکو خان سوچتا رہا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ کچھ دیر بعد ان دونوں سے مخاطب ہوا۔ ”بہر حال میں تم دونوں پر اعتبار کرنے کو تیار ہوں لیکن یہ یاد رکھنا کہ اگر تم نے مجھے دھوکا دیا تو میں تمہارا جہنم تک پیچھا کروں گا۔“

جبار نے عرض کیا۔ ”میں آپ کو کس طرح دھوکا دوں گا۔ ذرا آپ اس نازک پہلو پر غور تو فرمائیں۔ جب ہم دونوں آپ کے اپنی بن کر شیخ الجبال کے روبرو حاضری دیں گے، اس کے دل پر کیا اثر ہوگا..... دوپہ پاگل ہو جائے گا۔“

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”شیخ الجبال کی کوئی کمزوری؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”عورت ہی اس کی کمزوری ہوگی۔“

ہلاکو خان نے کافی دیر تک غور و خوض کرنے کے بعد حکم دیا۔ ”ان دونوں کو آزاد کر دیا جائے۔“

جب ان دونوں کو آزاد کر دیا گیا تو اس نے ان دونوں کو اپنے دربار میں دائیں جانب بٹھا دیا۔ ان دونوں کی شراب اور گھوڑی کے دودھ سے تواضع کی گئی۔ کھانے کے لیے خشک میوہ دیا گیا۔ ان دونوں نے ہلاکو خان سے کہا۔ ”کیا ہمیں کھانا بھی مل سکتا ہے؟“

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”تواضع کے بعد کھانا؟ یہ تو بڑی بے سگلی بات ہے۔“

جبار نے عرض کیا۔ ”حضور والا! ہمیں حکمین چیز درکار ہے۔“

ہلاکو خان نے حکم دیا۔ ”ان بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے۔“

کچھ دیر بعد وہیں کھانا پیش کر دیا گیا۔ ان دونوں کی

بھوک نے جیسے معدے میں دراڑیں پیدا کر دی تھیں۔ دونوں نے ہاتھ دھوئے بغیر ہی کھانا شروع کر دیا۔ وہ کچھ دیر خوب چبا چبا کر کھانا کھاتے رہے۔ اس کے بعد کھڑے ہوتے ہوئے ہلاکو خان سے کہا۔ ”خان محترم! ہم دونوں نے آپ کا نمک کھالیا ہے اس لیے اب بھی ہم نمک حرامی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔“

ہلاکو خان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ کوئی شخص کسی کا کھانا کھا کر کس طرح غلام بن سکتا ہے۔

☆☆☆

ہلاکو خان نے شیخ الجبال کو فرمان جاری کیا۔

”میں ہلاکو خان، تولى خان کا بیٹا اور خانِ اعظم چنگیز

خان کا پوتا تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو اپنے تمام قلعے مسمار کرادے

کیونکہ ان قلعوں سے قاتلوں کو بھیج کر تو اپنے مخالفین کو قتل

کر دیتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تو سادہ لوح دہقانوں کو

حشیش پلا کر اپنی بہشتِ ارضی میں پہنچا دیتا ہے جہاں حسین

ترین لڑکیوں کو حوریں اور نوجوان لڑکوں کو غلمان کہا جاتا

ہے۔ تو سادہ لوح نوجوانوں کو بہشت کی جاٹ لگا دیتا ہے

اور وہ اسی کے خمار میں بڑے بڑے کام کر گزرتے ہیں۔

میں اس بہشت کو دیکھنا چاہتا ہوں جو تیری ہے۔ میں نے یہ

بھی سنا ہے کہ تو اپنے قلعوں پر بہت نازاں ہے۔ اس لیے

میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ تو اپنے تمام قلعوں کو مسمار کرادے

اور بھاگ کر میری خدمت میں آجاتا کہ تو میری قدم بوسی کی

عزت حاصل کر سکے۔

”دیکھنا خبردار، جو میری حکم عدولی کی کیونکہ جس نے بھی

میرا حکم نہیں مانا، پریشان اور خوار ہوا۔ اسی طرح جس نے

خود کو بڑا عظیم اور طاقتور سمجھا ذلیل ہوا۔ اگر تو نے اپنے آپ

کو طاقتور اور ناقابلِ تسخیر سمجھا تو پھر پتا نہیں کیا ہوگا۔ اس کا

علم نہ تو ہمیں ہے نہ تمہیں۔ بس جاودانی نیلے آسمان کو ہے۔“

جبار اور اسد۔۔۔ ہلاکو خان کا فرمان لے کر الموت کے

قلعے کی طرف روانہ ہو گئے جہاں شیخ الجبال رہتا تھا۔ یہ ایک

دشوار گزار قلعہ تھا۔ ان دونوں کو یہ سوچ سوچ کر بڑا مزہ آرہا

تھا کہ جب شیخ الجبال ان دونوں کو ہلاکو خان کے اپنی کے

حلیے میں دیکھے گا تو کیا کہے گا اور کیسا جڑ بڑ ہوگا۔ دونوں ہی شیخ

الجبال کو سنانا اور ذہنی اذیت پہنچانا چاہتے تھے۔

جب وہ دونوں شیخ الجبال کی حدود میں داخل ہو گئے تو

پہچاننے والوں نے ان دونوں کو پہچان لیا۔ ان میں سے

بعض نے انہیں بہت برا بھلا کہا اور یہ گر کی بات بتائی کہ

وفاداری شریفوں کا وصف ہے اور جو وفادار نہیں، وہ ذلیل و



جبار نے جواب دیا۔ ”شیخ الجبال کی خدمت میں مجھ کو پیش کر دیا جائے یا میرے ساتھی اسد کو..... اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں بھی وہی کہوں گا جو میرا ساتھی اسد کہتا۔“

معتد پہلے خود شیخ الجبال کے پاس گیا اور اس کو سفارت کی پوری تفصیل بتادی، بعد میں کہا۔ ”پہلے اس سفارت پر منہاج سراج کو مقرر کیا گیا تھا مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا اور جب ایک بار پھر منہاج سراج سے یہ کہا گیا کہ وہ ہلاکو خان کے پاس جائے اور اس کو شیخ الجبال کی خواہش اور شرائط صلح سے مطلع کر دے تو منہاج سراج نے ہلاکو خان کے دربار میں دوبارہ جانے سے انکار کر دیا اور ہم نے منہاج سراج کو قید خانے میں ڈال دینے کا فرمان جاری کر دیا۔ آج کل منہاج سراج قید خانے کی ہوا کھا رہا ہے۔“

شیخ الجبال نے نہایت دھمی آواز میں پوچھا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ ہلاکو خان کے بھیجے ہوئے قاصد کبھی ہمارے فدائی رہ چکے ہیں؟“

معتد نے جواب دیا۔ ”جی جناب والا! دونوں ہماری وفاداری اور جاں نثاری سے منحرف ہو چکے ہیں۔ یکسر منحرف ہو چکے ہیں۔“

شیخ الجبال نے پوچھا۔ ”وہ کیا کہتے ہیں؟“

معتد نے جواب دیا۔ ”وہ منگولوں کے بادشاہ ہلاکو خان کی طرف سے یہ فرمان لے کر آئے ہیں کہ آپ اپنے جملہ قلعے زمین یوس کر دیں اور..... اور.....“

شیخ الجبال نے پوچھا۔ ”اور..... اور کیا؟“

معتد نے عرض کیا۔ ”آگے جو کچھ ہے، غلام اپنی زبان سے نہیں ادا کر سکتا۔“

شیخ الجبال نے پوچھا۔ ”پھر وہ بات کون بتائے گا؟“

معتد نے جواب دیا۔ ”سورج کی سرزمین کا بادشاہ ہلاکو خان سیدنا سے وہی خواہش کر رہا ہے جو سیدنا کو اپنے مریدوں سے ہو سکتی ہے، یعنی قدم بوسی کی سعادت۔“ پھر دریافت کیا۔ ”اگر اجازت دی جائے تو میں ان دونوں کو یہیں بلواؤں؟“

شیخ الجبال کی اجازت سے دونوں کو بلوایا گیا۔ ان دونوں نے اندر داخل ہوتے وقت سلام کیا اور سامنے کھڑے ہو گئے۔

شیخ الجبال نے ان دونوں کو پہچان لیا، پوچھا۔ ”کیا تم دونوں نے اپنی وفاداریاں بدل دیں؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”ہاں، صرف اس لیے کہ ہم کو ایسے حالات سے گزرنا پڑا جن سے ہمارے اعتماد اور

خوار ہے۔ شیخ الجبال کے پرستاروں نے ان دونوں کو شرم دلائی اور انہیں خوب برا بھلا کہا انہوں نے ان دونوں کو منع کیا کہ وہ اپنا ارادہ بدل دیں اور شیخ الجبال کی خدمت میں ہلاکو خان کے قاصد بن کر نہ جائیں لیکن یہ دونوں کسی کی پروا کیے بغیر شیخ الجبال کی خدمت میں پہنچ گئے۔ شیخ الجبال کے آدمیوں نے ان دونوں کو حیرت سے دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ تم دونوں ہلاکو خان کے قاصد بن کر آئے ہو؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”ہاں، ہم ہلاکو خان کے قاصد بن کر آئے ہیں۔“

شیخ الجبال کے معتد نے پوچھا۔ ”کیا تو اپنے شیخ کے حلقہ اطاعت سے نکل گیا؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”ہاں، اطاعت اس کی کی جاتی ہے جو اس کا مستحق ہوتا ہے۔“

معتد نے اسد سے پوچھا۔ ”پچھلے دنوں بہشت زار میں چند مفسدوں نے بڑی افراتفری پھیلائی۔ سننے میں آیا ہے ان میں تم دونوں بھی شامل تھے؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”ہاں، ان میں ہم دونوں بھی شامل تھے اور ہمیں اس وقت بہت فسوس ہوا جب ہمیں شیخ کی بہشت کی حقیقت معلوم ہوئی۔ ہمیں ایک ایسی بہشت میں بھیجا گیا تھا جہاں حوریں مردوں کے لیے شاہراہ بنی ہوئی ہیں۔ جہاں نوجوان حوروں کی گزرگاہ عبور کر کے واپس آجاتے ہیں۔“

معتد نے پوچھا۔ ”اب تم دونوں یہاں کیا لینے آئے ہو؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”دنیا کے فاتح اور خان اعظم کے پوتے ہلاکو خان کا یہ پیغام لے کر کہ اپنے قلعے مسمار کر دو اور ہلاکو خان کی خدمت میں حاضر ہو کر قدم بوسی کی سعادت حاصل کرو۔“

معتد نے کہا۔ ”جہاں تک قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنے کا تعلق ہے، شیخ الجبال کے سامنے ایسی بات نہیں کہی جاسکتی۔ دنیا شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر قدم بوسی کی سعادت حاصل کرتی ہے۔ میں یا یہاں کا کوئی شخص شیخ الجبال سے ایسی ریک اور ہنگ آمیز بات نہیں کر سکتا۔“

اسد نے کہا۔ ”تب پھر ہمیں شیخ الجبال کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ ہم یہ خط خود پیش کر دیں گے اور جو بات شیخ الجبال سے کہی نہیں جاسکتی، وہ خود پڑھ لیں گے۔“

معتد نے جبار کی طرف دیکھا، بولا۔ ”میرا خیال ہے تو زیادہ سمجھ دار ہے کیوں نہ تجھ کو شیخ الجبال کی خدمت میں پیش کر دیا جائے؟“



معتمد نے جواب دیا۔ ”مکتوب بنام ہلاکو خان میں یہ سب لکھ دیا گیا ہے۔“

جبار نے کہا۔ ”میں مکتوب کی بابت نہیں پوچھ رہا کہ اس میں کیا کچھ لکھ دیا گیا ہے۔ ہم تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا شیخ الجبال خود بنفس نفیس قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنے پر آمادہ ہو چکے ہیں؟“

معتمد نے کہا۔ ”تم دونوں اپنی حیثیت کو نہ بھولو۔ ایک حکمران نے دوسرے حکمران کو جو لکھنا چاہا، لکھ دیا اور پھر یہ کہ ہمارے سیدنا ہلاکو خان کو شرف میزبانی ضرور بخشیں گے۔“

جبار نے کہا۔ ”میں نہیں جانتا کہ شرف میزبانی کے کہتے ہیں لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ ہلاکو خان کے دربار میں جو بھی جاتا ہے، اسے شرف قدم بوسی خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔“

معتمد نے ان دونوں کو ڈانٹا۔ ”تم دونوں کو سیدنا کا ادب ملحوظ رکھنا چاہیے۔ دو حکمران چکی کے دو پاٹ کی طرح ہوتے ہیں، ان کے بیچ میں جو آئے گا پس جائے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ تم دونوں کا شاید یہی حشر ہوگا۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”ہمیں معلوم ہے کہ تمہارا سیدنا کیا ہے اور ہلاکو خان کیا ہے۔ ہمیں تو یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا شیخ الجبال ہلاکو خان کی خدمت میں حاضری دے کر قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنے پر آمادہ ہے یا نہیں؟“

شیخ الجبال نے کہا۔ ”مجھے جو کچھ کہنا تھا، ہلاکو خان کے جوابی مکتوب میں لکھوا دیا ہے۔“

اسد نے جبار کو سمجھایا۔ ”ہمارا کام ختم ہوا۔ اس کے بعد کا کام منگول قاجح کا ہے۔“

شیخ الجبال خاصا سہا ہوا تھا، وہ جبار اور اسد کی خوشامد پر اتر آیا، بولا۔ ”تم دونوں کو مذہبی اور وطنی عصبیت سے کام لینا چاہیے۔ یہ وحشی، جو ہزاروں میل دور سے یہاں آئے ہیں ہمارے ہمدرد نہیں ہو سکتے۔ آج جو لوگ ان وحشیوں کا ساتھ دے رہے ہیں، کل پچھتائیں گے کیونکہ ان کے ہاں غداروں کو معاف نہیں کیا جاتا۔ تم دونوں معلوم نہیں کیوں اس وحشی کی اطاعت اور وقاداری میں سرگرم عمل ہو..... خدا تمہیں معاف کرے۔“

معتمد نے شیخ الجبال کو مشورہ دیا۔ ”سیدنا کا رحم اور مروت قابل ستائش ہیں، اگر یہ معاملہ میرے اختیار میں ہوتا تو میں نتائج کی پروا کیے بغیر ان دونوں کو قتل کرا دیتا۔ جو کام کل ہلاکو خان انجام دے گا، میں اسے آج ہی کر گزرتا۔“

جبار کو غصہ آ گیا، معتمد کو برا بھلا کہنے لگا۔ ”میں تیرا یہ

تصورات کو نقصان پہنچا۔ ہمیں یہ جان کر بڑا دکھ پہنچا کہ ہم سے سچ نہیں بولا گیا۔“

شیخ الجبال نے اسد کی طرف دیکھا، گویا اپنا سوال دہرا رہا ہو۔

اسد نے کہا۔ ”میں بھی انہی میں سے ہوں جن کا اعتماد مجروح ہوا اور تصورات ٹوٹ پھوٹ گئے۔“

شیخ الجبال نے پوچھا۔ ”ہلاکو خان کیا چاہتا ہے؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”آپ اپنے قلعوں کو زمین بوس کرا دیں اور خود منگول قاجح کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کریں۔“

شیخ الجبال نے اپنے معتمد سے پوچھا۔ ”کیا تو یہی قدم بوسی والا حصہ ادا کرنے سے شرماتا تھا؟“

معتمد نے اثبات میں سر ہلا دیا کیونکہ وہ اس کا اپنی زبان سے اقرار کرنا اپنے سیدنا کی تذلیل سمجھتا تھا۔

شیخ الجبال نے کہا۔ ”کبھی کبھی آفتاب کو بھی گہن لگ جاتا ہے کیونکہ خدا کی شان، برتری، بڑائی اور عظمت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب دوسری فانی بڑی چیزیں حالات وقت اور اپنی بد قسمتی سے کمتر یا کم شان ہو جاتی ہیں۔ خدا

لا فانی اور لازوال ہے۔ ہم سب فانی اور زوال پذیر ہیں۔“

اس کے بعد شیخ الجبال نے اپنے معتمد سے ہلاکو خان کے نام جواب لکھوا دیا۔

”منجانب بندۂ خدا رکن الدین خورشاہ بنام ہلاکو خان بن تولی خان بن چنگیز خان قاجح شرق و غرب۔ میں آپ کی خوشنودی کے لیے ایک قلعے کے سوا کبھی کو مسما کر اداوں گا اور یہ ایک قلعہ، قلعہ آتمونت ہے، میرا اپنا قلعہ، جہاں میں رہتا ہوں۔ آپ کی قدم بوسی کے لیے میں نے پہلے اپنے بیٹے کو آپ کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ مزید اصرار پر میں نے اپنا بھائی بھی آپ کے پاس روانہ کر دیا اور جب یہ محسوس کیا گیا کہ آپ اس سے بھی مطمئن نہیں ہیں تو میں نے اپنا دوسرا بیٹا بھی آپ کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ اب آپ اصرار فرما رہے ہیں کہ میں خود حاضر ہو جاؤں لیکن میری خواہش یہ ہے کہ مجھ کو اس حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ مجھے میزبانی کا شرف

بخشیں۔ ورنہ بصورت دیگر میں خود حاضر ہو جاؤں گا لیکن اس صورت میں جبکہ مجھے یہ یقین دلایا جائے کہ مجھے وہاں زیادہ دنوں تک نہیں روکا جائے گا اور یہ کہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ میں محفوظ و مامون رہوں گا۔“

اسد نے پوچھا۔ ”کیا آپ حاضری دینے کے لیے تیار ہیں؟“

اسد نے پوچھا۔ ”کیا آپ حاضری دینے کے لیے تیار ہیں؟“

اسد نے پوچھا۔ ”کیا آپ حاضری دینے کے لیے تیار ہیں؟“

اسد نے پوچھا۔ ”کیا آپ حاضری دینے کے لیے تیار ہیں؟“

اسد نے پوچھا۔ ”کیا آپ حاضری دینے کے لیے تیار ہیں؟“

اسد نے پوچھا۔ ”کیا آپ حاضری دینے کے لیے تیار ہیں؟“



جبار نے جواب دیا۔ ”شاید نہیں کیونکہ وہ آپ کو اپنا مہمان بنانا چاہتا ہے۔“

ہلاکو خان نے اسد کی طرف دیکھا، پوچھا۔ ”تو کیا کہتا ہے؟“ اسد نے جواب دیا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے کیونکہ وہ زبان کو اینٹھا اینٹھا کر باتیں کر رہا تھا جبکہ اس کے معتمد نے ہمیں دھمکی دی کہ اگر ہم دونوں آپ کی بے جا طرف داری سے باز نہ آئے تو وہ ہم دونوں کو قتل کر دے گا۔“

ہلاکو خان کو غصہ آ گیا۔ اس نے اسی وقت حکم دیا کہ اس کے نامی گرامی فوجی سردار قط بوغا کو بلوایا جائے۔ ذرا دیر بعد قط بوغا حاضر ہو گیا۔ ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”قط بوغا! تو نے اب تک کتنی جنگوں کی سرداری کی ہے؟“

قط بوغا نے جواب دیا۔ ”تقریباً اڑتیس جنگوں کی اور مجھے فخر ہے کہ میں نے آج تک شکست نہیں کھائی۔“

ہلاکو خان نے اسے حکم دیا۔ ”خورشاہ سر اطاعت خم کرنے میں پس و پیش سے کام لے رہا ہے۔ میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ تو میمون دژ کا محاصرہ کر لے کیونکہ خورشاہ اسی قلعے میں مقیم ہے۔“

قط بوغا نے جھک کر ہلاکو خان کو اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا یقین دلایا اور اسی وقت میمون دژ کے محاصرے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

خط کتابت کے ایک ہفتے کے اندر اندر خورشاہ شیخ الجبال نے اپنے قلعے کے برج سے منگول لشکر کو اپنے قلعے کی طرف بڑھتے دیکھا یا کہ کی نو دموں کا پرچم ان کے آگے آگے تھا اور ان کے گھڑسوار اپنے ہتھیاروں کو دھوپ میں چھماتے نشیب و فراز کو عبور کرتے میمون دژ کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔

شیخ الجبال کو یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ اردو اس کے قلعے کا محاصرہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہلاکو خان نے اس کی درخواست کو شرف قبولیابی بخشا اور شیخ الجبال کا مہمان بن کر بڑھا چلا آ رہا ہے۔

اس نے اپنے معتمد سے پوچھا۔ ”کیوں تیرا کیا خیال ہے؟ شاید ہلاکو خان میری مہمان نوازی کو اپنی خوش قسمتی تصور کرے گا کیونکہ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ہلاکو خان کا پرچم کشور کشائی آگے آگے ہے اور اس کا حفاظتی دستہ فتح مندی کے نشے میں چور نشیب و فراز کو عبور کرتا اور منزلوں کو روندتا پکھلتا ہمارے قلعے کے سائے کی تلاش میں بڑھتا چلا آ رہا ہے۔“

معتمد نے بھی منگولوں کے اس لشکر کو اچھی طرح دیکھا

پیغام ہلاکو خان کو زبانی پہنچا دوں گا۔ شیخ الجبال! جب کسی پر برا وقت آتا ہے تو اس کے اعضا تک ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ معتمد جو آپ کا ایک بازو ہے، آپ کا ساتھ چھوڑ چکا ہے اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا اثر آپ پر پڑے گا۔“

اسد نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”ہمارا کام ختم ہوا، ہم یہاں جتنی دیر رکھیں گے، تلخیاں بڑھتی جائیں گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اب واپس چلیں۔“

دونوں اسی وقت شیخ الجبال کے قلعے سے نکل کر نیچے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی شیخ الجبال اپنے معتمد پر برس پڑا۔ ”میں بات بنانے کی کوشش کر رہا تھا، تم نے اپنے ایک جملے سے سارا معاملہ بگاڑ دیا۔ معلوم نہیں کب تمہیں عقل آئے گی۔ اگر ہماری ساری باتیں ہلاکو خان کے علم میں آئیں تو ہمیں اس سے رحم اور مروت کی شہتہ بھر توقع نہیں رکھنا چاہیے۔ تو نے ہماری موت کے محضر نامے پر کتنی آسانی سے دستخط کر دیے۔“

معتمد نے کہا۔ ”سیدنا اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری خوشامد درآمد سے بات بن جائے گی تو یہ ہماری بھول ہے۔ ہماری خوش فہمی یا غلط فہمی ہے۔ ہماری قسمتوں کا فیصلہ کب کا لکھا جا چکا ہے۔ ہلاکو خان وہ فیصلہ جب چاہے گا، سنا دے گا۔“

شیخ الجبال کو اچانک اپنے وزیر نصیر الملک طوسی کا خیال آ گیا۔ معتمد سے پوچھا۔ ”یہ نصیر الملک طوسی کہاں چلا گیا؟ میں اس سے چند مشورے کرنا چاہتا ہوں۔“

معتمد مسکرایا، بولا۔ ”جیسا کہ ابھی ذرا دیر قبل سیدنا نے فرمایا تھا کہ جب انسان پر برا وقت آتا ہے تو اس کے اعضا تک اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ نصیر الملک بھی آپ کا ایک بازو تھا۔ اس نے بساط شطرنج پر بچھائے گئے مہروں کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ کزور پڑ چکی ہے اور مات کے سوا کسی بات کا امکان ہی نہیں رہ گیا تو اس نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا اور ہلاکو خان کے سایہ عاطفت میں چلا گیا۔“

☆☆☆

جبار اور اسد، شیخ الجبال کا جواب لے کر ہلاکو خان کی خدمت میں پہنچ چکے تھے۔ ہلاکو خان کو شیخ الجبال کا جواب بالکل ناپسند ہوا۔ ”اس سے بہتر تو یہ تھا کہ خط کا جواب ہی نہ دیا جاتا۔“

جبار اور اسد نے ہلاکو خان کی مدح سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے مگر ہلاکو خان کو ان دونوں کی کسی بات سے بھی دلچسپی نہیں تھی۔ بس یہی پوچھا۔ ”مجھ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ خورشاہ یہاں میرے پاس آئے گا یا نہیں؟“



نہ ایک دن منگول فاتح کی قدم بوسی کی سعادت ضرور حاصل کرنا ہوگی۔“

خورشاہ نے اپنی سواری رکوا دی اور جبار کو اپنے قریب بلوا کر پوچھا۔ ”ابھی ابھی تو کچھ کہہ رہا تھا؟“  
جبار نے جواب دیا۔ ”میں یہ کہہ رہا تھا کہ منگول فاتح ہلاکو خان ذرا مڑ مزاح واقع ہوا ہے اور وہ جو کچھ اپنے دل میں طے کر لیتا ہے، کر کے رہتا ہے چنانچہ آپ کو اس کی قدم بوسی کے لیے آنا ہی پڑ گیا۔“

خورشاہ نے پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”جبار.....“

خورشاہ نے پوچھا۔ ”جبار! خدا تجھے خوش رکھے، ذرا یہ تو بتا کہ میری گزرگاہ کے آس پاس یہ لوگ کیوں کھڑے کیے گئے ہیں؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”شاید آپ کے استقبال کی خاطر اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لوگ آپ کو دیکھنے کے لیے اپنی مرضی سے کھڑے ہو گئے ہوں۔“

خورشاہ منگول عورتوں اور لڑکیوں کو نہایت شوق اور انہماک سے دیکھ رہا تھا، جبار سے پوچھا۔ ”ان عورتوں اور لڑکیوں کا دین کون سا ہے؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”شاید یہ لوگ نیلے آسمان کو جاودانی مانتے ہیں۔“

خورشاہ نے ایک خوب صورت منگول عورت کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ جب وہ پاس آگئی تو اس سے پوچھا۔ ”کیا تجھے فارسی زبان آتی ہے؟“

منگول عورت کے چہرے پر لاعلمی کی وحشت اور پریشانی کے آثار پیدا ہوئے۔ اس نے اپنے آس پاس موجود مردوں کی طرف دیکھا۔ گویا پوچھ رہی ہو کہ یہ عجیب و غریب شخص کیا پوچھ رہا ہے؟

ایک مسلمان نے اس عورت کو بتایا کہ چھری بندوں کا بادشاہ پوچھ رہا ہے کہ کیا تجھ کو فارسی زبان آتی ہے؟  
منگول عورت نے نفی میں گردن ہلا دی۔

خورشاہ نے پوچھا۔ ”کیا تو شادی شدہ ہے؟“  
منگول عورت نے ایک بار پھر مسلمان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

مسلمان نے جواب دیا۔ ”یہ شخص پوچھ رہا ہے کہ کیا تو شادی شدہ ہے؟“

منگول عورت کو ہنسی آگئی، اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور عرض کیا۔ ”سیدنا! میں نے اس لشکر کے عزائم میں سرکشی و تباہ کاری کے آثار دیکھے ہیں۔ مجھ کو تو ان کے ارادوں میں نیکی اور خیر سگالی کی جھلک تک نہیں نظر آ رہی۔“

قط بوغانے اپنی فوج میمون دژ کے چاروں طرف لگا دی اور اس کے بعد چند آدمیوں کو ہلاکو خان کے خط کے ساتھ قلعے کی طرف روانہ کر دیا۔ اس خط میں نہایت اختصار سے کام لیا گیا تھا۔ اس خط کے ذریعے ہلاکو خان نے پوچھا تھا۔

”شیخ الجبال کو آخری موقع دیا جا رہا ہے۔ کیا وہ ہماری قدم بوسی کے لیے نہیں حاضر ہوگا؟“

شیخ الجبال اتنا گھبرایا کہ اس نے فوراً ہی قط بوغانا کو لکھ دیا۔  
”تو اپنے بادشاہ ہلاکو خان کو مطلع کر دے کہ میں اس کی ملاقات کو عنقریب اس کے پاس پہنچنے والا ہوں اور جیسا کہ اس نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ مجھے کسی قسم کا گزند نہیں پہنچائے گا اور یہ کہ وہاں میری حیثیت ایک مہمان، معزز مہمان کی ہوگی۔“

چھ سو پچون (654ھ) کے ذی قعدہ کی پہلی تاریخ کو (20 نومبر 1256ء) خورشاہ اپنے قلعے سے باہر نکلا۔ شہم و خدم ساتھ تھا، قط بوغانا کے ایک مخصوص دستے نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا اور یہ لوگ ہلاکو خان کے پاس روانہ کر دیے گئے۔ خورشاہ اور اس کے آباؤ اجداد نے اپنے چھری بند فدائیوں کی وجہ سے جو شہرت حاصل کی تھی، اس نے ہلاکو کی سیاہ میں شوق دید اور تجسس پیدا کر دیا تھا۔ یہ لوگ خورشاہ کی گزرگاہ کے دونوں طرف کھڑے اس عجیب و غریب شخص کو دیکھ رہے تھے جس نے اپنے آباؤ اجداد کی سنت پر عمل کر کے مشرق کو لرزہ بر اندام کر رکھا تھا اور جس کے چھری بند فدائیوں کی ضرب سے کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی محفوظ نہ تھا۔ خورشاہ بھی منگولوں سے بہت متاثر تھا۔ اس نے کئی بار در پردہ یہ کوشش کی تھی کہ اپنے فدائیوں کے ذریعے ہلاکو خان کا کام تمام کرادے مگر ناکام رہا تھا۔ خورشاہ اپنی ناکامی کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے آس پاس کھڑے ہوئے منگولوں کو دیکھ کر یہ اثر لیا کہ شاید ہلاکو خان نے اس کے استقبال اور پیشوائی کی خاطر انہیں خورشاہ کی گزرگاہ پر کھڑا کر دیا ہے۔ منگول عورتیں اور لڑکیاں نوجوان خورشاہ کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ انہی میں جبار اور اسد بھی موجود تھے۔ جب خورشاہ ان دونوں کے پاس سے گزرا تو یہ دونوں باطنی بادشاہ کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ جبار نے کہا۔ ”کیا ہم نے آپ کو یہ نہیں بتا دیا تھا کہ ہلاکو خان آپ کو بلائے بغیر نہیں رہے گا اور آپ کو ایک



جبار نے خورشاہ کو سمجھایا۔ ”جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس لشکر میں آپ کی حیثیت ایک قیدی سے زیادہ نہیں ہے۔ پتا نہیں منگول فاتح آپ سے کیا سلوک کرے۔ آپ منگول عورتوں اور دوشیزاؤں پر اپنی حریص نظریں ڈال کر اپنے گناہوں اور خطاؤں میں اضافہ نہ کیجیے۔“

خورشاہ کو جبار پر غصہ آگیا۔ تیوریوں پر بل ڈال کر جواب دیا۔ ”میں یہاں معزز مہمان کی حیثیت سے آیا ہوں۔ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ شاید منگول فاتح نے تیری عزت افزائی ضرورت سے زیادہ ہی کر دی ہے اسی لیے تو بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے لگا ہے۔ میں ہلاکو خان سے تیری شکایت کروں گا اور تجھے تیری گستاخیوں کی سزا دلواؤں گا۔“

جبار نے خورشاہ کی باتیں صبر و تحمل سے سنیں اور مسکرا کر جواب دیا۔ ”آپ لوگ چونکہ ایک سو اکتھتر سال تک قلعوں سے باہر نہیں نکلے اس لیے آپ کو کچھ نہیں معلوم کہ رزم و بزم میں دوست اور دشمن کس طرح پیش آتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ منگول فاتح آپ سے کس طرح پیش آئے گا لیکن آپ کے اپنے اور آبائی اعمال نامے کی روشنی میں یہ اندازہ ضرور لگا سکتا ہوں کہ وہ چونکہ بہت برا ہے اس لیے اس کا عوض بھی اچھا نہیں ہوگا۔“

خورشاہ اس کم حیثیت شخص کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا، اس نے جبار کی طرف سے منہ پھیر لیا اور شاہراہوں کے دونوں طرف کھڑی ہوئی عورتوں اور لڑکیوں کو ہوس انگیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ چوڑے جبروں اور چھوٹی چھوٹی بھوس کھنٹی ہوئی منگول دوشیزاؤں پر تمبرہ کرتے ہوئے خورشاہ نے کہا۔ ”یہ بھی دنیا کا عجیب حسن ہے۔ اپنی دنیا سے یکسر مختلف، لیکن حسن ان میں بھی ہے، وہی دلکشی وہی رعنائی۔“ خورشاہ کی نظریں ایک منگول دوشیزہ پر جم گئیں، یہ پندرہ سولہ سالہ لڑکی خورشاہ کو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے اشارے سے اس کو اپنے قریب بلایا۔ لڑکی اس کے پاس چلی گئی۔

خورشاہ نے پوچھا۔ ”لڑکی! کیا تو شادی شدہ ہے؟“

لڑکی دوسروں کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ خورشاہ کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔ کسی نے ہجوم میں سے لڑکی کو خورشاہ کا مطلب سمجھا دیا۔ لڑکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

خورشاہ اس جواب سے خوش ہو گیا، پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

لڑکی کو خورشاہ کے سوال کا مطلب سمجھا دیا گیا۔ لڑکی نے جواب دیا۔ ”یا کی۔“

خورشاہ نے کہا۔ ”صورت شکل کی طرح تیرا نام بھی عجیب اور خوب صورت ہے۔“

لڑکی کو جب اس کا مطلب سمجھایا گیا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ خورشاہ نے پوچھا۔ ”تیرا باپ کیا کرتا ہے؟“

لڑکی نے ترجمان کے ذریعے جواب دیا۔ ”میرا باپ ہلاکو خان کے ذاتی اصطبل کا نگراں ہے۔“

خورشاہ نے لڑکی سے درخواست کی۔ ”یا کی! میں تیرے خان، ہلاکو کا معزز مہمان ہوں۔ کیا تو میرے ساتھ ہلاکو خان کے دربار تک چلے گی؟“

خورشاہ کے معتمد نے اسے سمجھایا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اتنی چھوٹی حرکت پر ہلاکو خان آپ کی بابت کیا سوچے گا؟“

خورشاہ نے معتمد کو ڈانٹ دیا۔ ”تو چپ رہ۔ بادشاہ بادشاہوں کو تحائف دیا کرتے ہیں، میں ہلاکو خان سے اس تحفے کو مانگ لوں گا۔“

جبار نے اپنے آپ پر نفرت کی کہ وہ کتنا احمق تھا، جس نے اس شیخ البجالی کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ معتمد نے خورشاہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”سیدنا، ابھی ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم ہلاکو خان کے معزز مہمان ہیں یا قیدی۔ اس لیے آپ محتاط رہیے اور ایسی چھوٹی چھوٹی حرکتیں نہ کیجیے۔“

لیکن خورشاہ کو یا کی بہت زیادہ پسند آگئی تھی۔ اس نے یا کی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو اپنے پاس بٹھالیا، بولا۔ ”تو بھی میرے ساتھ چل کیونکہ اگر تو اس وقت مجھ سے بچھڑ گئی تو میں تجھ کو کہاں تلاش کروں گا؟“

خورشاہ کی اس حرکت سے ایک ہلچل سی مچ گئی اور چند منگولوں نے اس لڑکی کو خورشاہ سے چھین لیا۔ خورشاہ بے بس ہو گیا۔ وہ منگولوں سے لڑ تو نہیں سکتا تھا، مجبوراً اپنی قسمت پر قانع ہو گیا۔ اس نے اپنے معتمد سے کہا۔ ”میں ان گستاخوں کی ہلاکو خان سے شکایت کروں گا۔ انہیں اپنے مہمان کی بے عزتی نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

معتمد نے رکے ہوئے قافلے کو چلنے کا حکم دیا۔ سفر جاری ہو گیا۔ ہلاکو خان کے خیمے کی طرف۔ ہلاکو خان استقبال کے لیے اپنے خیمے سے باہر نہیں نکلا۔ اس کے منگول سرداروں نے خورشاہ کو آگ کے دو طرفہ الاؤ کے بیچ سے گزارنا شروع کر دیا۔ انہوں نے خورشاہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔ ان کی گرفت اتنی مضبوط اور سنگدلانہ تھی کہ خورشاہ تڑپ گیا۔ اس نے حکم دیا کہ گرفت ڈھیلی کر دی



ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”تو وہاں جا کے کیا کرے گا؟“  
شیخ الجبال نے جواب دیا۔ ”وہاں میرے آدمی میرا  
انتظار کریں گے۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”کوئی کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ تیری  
ذمے داریاں میرے آدمیوں نے سنبھال لی ہیں۔ اب تجھ  
کو کسی کی بھی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“  
شیخ الجبال ہلاکو خان کا مطلب سمجھ چکا تھا۔ مایوسی سے  
کہا۔ ”حالانکہ مجھ سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ مجھ کو کسی قسم کا  
گزنند نہیں پہنچایا جائے گا۔“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”میں اپنے وعدے پر قائم  
ہوں۔ تجھ کو کوئی گزنند نہیں پہنچے گا۔ تجھ کو مطمئن رہنا چاہیے۔“  
شیخ الجبال نے سوچا، اگر ہلاکو خان کے روبرو کوئی  
ایسی ویسی بات اس کے منہ سے نکل گئی تو یہ وحشی معلوم نہیں  
اس سے کیسا سلوک کر گزرے۔ شیخ الجبال دیر تک ان سب  
کی توجہ کا مرکز بنا رہا اور خود شیخ الجبال متکول دو شیزہ یا کی کے  
تصور میں کھویا رہا۔

یہاں اسد اور جبار بھی موجود تھے لیکن ہلاکو خان نے  
ان دونوں کو شیخ الجبال کی نظروں سے اوجھل رکھا تھا۔ ہلاکو  
خان نے ان دونوں کو شیخ الجبال کے سامنے کھڑا کر دیا۔ شیخ  
الجبال سے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔  
”کیا تو اپنے ان پرستاروں کو پہچانتا ہے؟“  
شیخ الجبال نے ان دونوں کو پہچاننے سے انکار کر دیا،  
بولاً۔ ”انہیں میں نہیں جانتا۔“  
ہلاکو خان نے کہا۔ ”لیکن یہ دونوں تمہیں اچھی طرح  
جانتے ہیں۔“

شیخ الجبال ان دونوں سے پریشان ہو رہا تھا، اس  
نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ”میرا معتمد کہاں رہ گیا۔  
میں اس کے بغیر خود کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہوں۔“  
ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”تیرا کوئی معتمد نہیں، تجھ کو  
تہا رہنے کی عادت ڈالنا پڑے گی۔“ ہلاکو نے ایک بار پھر  
اسد اور جبار کو شیخ الجبال کے روبرو کھڑا کر دیا۔ ”انہیں  
پہچان۔ میں چاہتا ہوں تو ان دونوں کو پہچان لے کیونکہ ان کو  
پہچانے بغیر کام نہیں چلے گا۔ اگر تو پسند کرے تو میں ان  
دونوں کو حکم دوں کہ تجھ سے اپنا تعارف کرادیں۔“

شیخ الجبال نے کہا۔ ”میں انہیں پہچان کر کیا کروں  
گا۔ ہو سکتا ہے میں نے ان دونوں کو کہیں دیکھا ہو مگر پہچان  
اس لیے نہیں پارہا ہوں کہ انہیں میں نے ہزاروں کے جھوم

ہلاکو خان کے خیمے میں سرداروں کا جھوم تھا۔ ہلاکو  
خان کے بیٹے اور دوسرے کئی قریبی رشتے دار بھی ہلاکو خان  
کے دائیں بائیں موجود تھے۔ یہ لوگ اس عجیب و غریب  
شخص کو قریب سے دیکھنا چاہتے تھے جو لوگوں میں شیخ الجبال  
کہلاتا تھا اور جس کے آباؤ اجداد نے تقریباً پونے دو سو سال  
سے اپنے چھری بند فدائیوں کے ذریعے بادشاہوں،  
وزیروں، امیروں اور عالموں کو خوفزدہ کر رکھا تھا۔

ہلاکو خان نے اس کے لیے سب سے آگے اپنے تخت  
کے سامنے ایک چوکی بچھوادی تھی۔ اس چوکی پر بھوری پوسٹین  
بچھی ہوئی تھی۔ ہلاکو خان نے حکم دیا کہ شیخ الجبال اس چوکی پر  
اس طرح بیٹھ جائے کہ اس کی پشت ہلاکو خان کی طرف نہ ہو۔  
چوکی پر ابھی تک گاؤں کیے نہیں رکھے گئے تھے لیکن شیخ  
الجبال جیسے ہی چوکی پر بیٹھا، اس کے دائیں اور سرہانے  
چھوٹے بڑے چار گاؤں کیے بھی رکھ دیے گئے۔  
شیخ الجبال اپنے آس پاس جیسی شکلیں دیکھ رہا تھا، وہ  
اس کو مرعوب کرنے کے لیے کافی تھیں۔ وہ ہلاکو خان کو نظر  
بھرنے نہیں دیکھ رہا تھا۔

ہلاکو خان نے شیخ الجبال سے شکایتا کہا۔ ”مجھے افسوس  
ہے کہ تو نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا اور جب بھی میں نے تجھ کو طلب  
کیا تو نے خود آنے کے بجائے اپنے بیٹے یا بھائی کو بھیج دیا۔“  
شیخ الجبال نے جواب دیا۔ ”میں خود بھی آ سکتا تھا مگر  
ایک حکمراں کی ذمے داریاں دوسروں کے مقابلے میں کچھ  
زیادہ ہی ہوتی ہیں..... یہی ذمے داریاں میرے پاؤں  
پکڑے رہیں اور میں یہاں آنے میں تاخیر سے کام لیتا رہا۔“  
ہلاکو خان نے کہا۔ ”تجھ کو طلب کرنے میں میرا مقصد  
بھی یہی تھا کہ میں تجھ کو تیری ذمے داریوں سے بری الذمہ  
کر دوں کیونکہ تم لوگ بہت تھک چکے ہو۔ تقریباً پونے دو سو  
سال سے تیرے آباؤ اجداد نے یہ ذمے داریاں سنبھال  
رکھی تھیں۔ مجھ کو تم لوگوں پر رحم آیا اور یہ فیصلہ کیا کہ تمہیں  
آرام کرنے کا موقع دوں۔“

شیخ الجبال پریشان ہو رہا تھا، اس نے پوچھا۔ ”میں  
یہاں کتنے دنوں تک مہمان رہوں گا؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”جب تک تو مہمان رہنا  
پسند کرے میرا بڑا بھائی منگو خان قراقرم میں تیرا انتظار کر رہا  
ہے۔ وہ بھی تجھ کو مہمان بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ میں عنقریب  
تجھ کو قراقرم روانہ کر دوں گا۔“

شیخ الجبال نے سہمے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ”میں



مگر ان سب کو حراست میں لے لیا گیا۔ جبار کو ذنوبیہ کی تلاش تھی۔ وہ منگولوں کو بہشتِ اعلیٰ میں لے گیا اور وہاں طاہرہ کو پالیا۔ اس نے طاہرہ سے ذنوبیہ کی بابت دریافت کیا۔ طاہرہ نے جواب دیا۔ ”ذنوبیہ ان عورتوں اور لڑکیوں میں شامل ہوگی جنہیں منگولوں نے حوروں کی حیثیت سے گرفتار کیا ہے۔“

حوروں کے گھروں سے سرکہ، شہد اور دودھ کے ذخائر برآمد ہوئے۔ ان میں کوئی چیز خراب نہیں ہوئی تھی۔ قط بوغانے یہ ساری چیزیں، حوریں اور غلمان ہلاکو خان کی خدمت میں روانہ کر دیے۔ دودھ کے خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لیے اسے فوج نے پی ڈالا۔

جب یہ چیزیں ہلاکو خان کے معائنے سے گزاری گئیں تو وہ انہیں دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اس نے اس موقع پر شیخ الجبال کو اپنے ساتھ لیا۔ بہشت زار کی لڑکیاں، عورتیں اور غلمان قطاروں میں کھڑے کر دیے گئے۔ ہلاکو خان، شیخ الجبال، جبار، اسد اور کئی دوسرے منگول سردار اس بہشتی مخلوق کا معائنہ کر رہے تھے۔

ہلاکو خان نے شیخ الجبال سے کہا۔ ”تیرے آباؤ اجداد کی بہشت اجاڑی جا چکی ہے اور وہاں کی مخلوق اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ کیا تو نے بھی کبھی اپنی جنت کی سیر کی ہے؟“

شیخ الجبال نفسیاتی طور پر پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اس نے کمال ڈھٹائی سے کام لیا اور اپنے آباؤ اجداد کی قائم کردہ جنت اور اس کی مخلوق کو جاننے سے انکار کر دیا، بولا۔ ”مجھے اس جنت کا کوئی علم نہیں، کیونکہ اگر ایسی کوئی جنت ہوگی تو مجھے اس کا علم نہیں۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”تجھ کو اس کا علم کیوں نہیں؟ کیا تو باطنیوں کا بادشاہ نہیں تھا؟“

خورشاہ نے جواب دیا۔ ”بے شک میں ان کا بادشاہ تھا لیکن بادشاہ کو اپنے ملک اور رعایا کی بہت سی باتوں کا علم نہیں ہوتا۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”تو درست کہتا ہے، میں تیرے عذر کو قبول کر لوں گا مگر تجھ کو یہ ضرور بتانا پڑے گا کہ اتنا بڑا نظام اور اتنی شاندار تنظیم چلاتا کون تھا؟“

خورشاہ نے جواب دیا۔ ”منگول فاتح! ہمارے بادشاہ نام کے بادشاہ ہوتے ہیں، ان کا سارا نظم و نسق وزراء کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے میرا وزیر اس تنظیم کا پورا علم رکھتا ہوگا۔“

میں دیکھا ہوگا اس لیے یہ تو مجھے پہچان سکتے ہیں مگر میں انہیں نہیں پہچان سکتا۔“

ہلاکو خان نے اسد کو اشارہ کیا، پوچھا۔ ”کیا تو اس شخص کو پہچانتا ہے؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”خوب پہچانتا ہوں، یہ شیخ الجبال ہیں، اپنے پرستاروں کے سیدنا۔ کبھی میں بھی ان کا پرستار تھا۔“

ہلاکو نے جبار سے پوچھا۔ ”اور تو..... تو بھی اس شخص کو پہچانتا ہے؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”میں شیخ الجبال سے اچھی طرح واقف ہوں، میں اس کا پرستار رہ چکا ہوں۔ شیخ الجبال نے مجھے بہشت کی سیر کرائی تھی اور پھر وہاں سے نکال کر شیخ الجبال نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب میں منگولوں کے فاتح ہلاکو خان کو قتل کر دوں گا تو مجھے مستحق بہشت میں بھیج دیا جائے گا۔“

شیخ الجبال نے سختی سے تردید کی۔ ”یہ جھوٹا ہے، میں اسے نہیں جانتا۔ میں اسے نہیں پہچانتا۔“

جبار نے کہا۔ ”ظاہر ہے کہ یہاں آپ مجھے نہیں پہچانتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اور میرے جیسے بہت سے لوگ انہیں نہیں بھول سکے۔“ جبار نے اپنے عہدِ فدائی کا چہرا اور لباس شیخ الجبال کے سامنے رکھ دیا، بولا۔ ”کیا آپ ان چیزوں کو بھی نہیں پہچانتے؟“

شیخ الجبال نے پھر سختی سے تردید کی۔ ”تو جھوٹا ہے، میں نے تجھ کو کبھی دیکھا تک نہیں۔ تو میرے اور منگول فاتح کے درمیان اختلاف اور منافرت کی خلیج نہ حائل کر۔“ پھر ہلاکو خان سے کہا۔ ”منگول فاتح! یہ شخص جھوٹا ہے اور پتا نہیں یہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔“

ہلاکو خان نے اپنے چہرے یا کسی بات سے یہ نہیں ظاہر ہونے دیا کہ وہ شیخ الجبال کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔ اس نے غیر متوقع طور پر دربار برخواست کر دیا۔ شیخ الجبال کے لیے ایک نیا خیمہ نصب کر دیا گیا تھا۔ اس کو اس نئے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔

☆☆☆

قط بوغانے میمون دڑ کا قلعہ زمین بوس کر دیا اور شیخ الجبال کے محل کو لوٹ لیا۔ بہشت تک پہنچنے کے لیے جبار اور اسد کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ دونوں منگولوں کی فوج کے ساتھ بہشت میں داخل ہو گئے اور ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ حوروں اور غلمانوں کو پناہ کے لیے ادھر ادھر بھاگنا پڑا



آخر کار ایک دن ان خدمت گاروں کا مصرف بھی اس کی سمجھ میں آ گیا۔ جب ایک خدمت گار نے اس سے پوچھا۔ ”میرے لائق کوئی خدمت؟“

خورشاہ نے اسے روک لیا، بولا۔ ”تم رکو، ابھی جانا مت۔ تم مجھ سے باتیں کر دتا کہ میرا جی پہلے۔“

خدمت گار رک گیا، بولا۔ ”جیسی آپ کی مرضی۔“  
خورشاہ نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تو بتا سکتا ہے کہ میں ہلاکو خان کا کب تک مہمان رہوں گا؟“

خدمت گار نے جواب دیا۔ ”کچھ پتا نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہاں سے آپ کو قراقرم بھیج دیا جائے گا۔ کیونکہ وہاں خان کا بڑا بھائی منگو خان آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔“

خورشاہ نے پوچھا۔ ”قراقرم یہاں سے کتنی دور ہے؟“  
خدمت گار نے جواب دیا۔ ”ہزاروں میل دور۔“

خورشاہ نے پوچھا۔ ”راستہ کیسا ہے؟“  
خدمت گار نے جواب دیا۔ ”بہت ہی دشوار اور پُرخطر۔“

خورشاہ کچھ سوچنے لگا، پوچھا۔ ”کیا تجھے منگول زبان آتی ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہاں آتی تو ہے مگر کیوں؟“  
خورشاہ نے رک رک کر تذبذب سے پوچھا۔ ”ایک بات اور بتا۔“

خدمت گار نے جواب دیا۔ ”پوچھیے، ضرور بتاؤں گا۔“  
خورشاہ کچھ دیر خدمت گار کی شکل دیکھتا رہا پھر پوچھا۔  
”ہلاکو خان کے ذاتی اُصطبل کے نگراں کا نام کیا ہے؟“

خدمت گار نے پوچھا۔ ”کیا آپ یا کی کے باپ کو تو نہیں پوچھ رہے؟“

خورشاہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بے تابی سے جواب دیا۔ ”ہاں، میں یا کی کے باپ ہی کو پوچھ رہا ہوں۔“  
خدمت گار نے جواب دیا۔ ”اس کا نام ہے یسار۔“

مگر آپ اس کو کیسے جانتے ہیں؟“  
خورشاہ اپنے دل کی بات کہہ نہیں سکا، بولا۔ ”اب تو ہلاکو خان نہ تو مجھ سے خود ملتا ہے اور نہ ہی مجھے اپنے پاس بلاتا ہے۔“

خدمت گار کو شبہ گزرا کہ شاید قیدی بادشاہ کا دامنی توازن جاتا رہا ہے جیسی یہ بھکی بھکی باتیں کر رہا ہے۔  
خورشاہ نے اپنے خدمت گار کو خاموش دیکھا تو پوچھا۔ ”تو چپ کیوں ہو گیا؟“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”اگر تو کہے تو تیرے وزیر نصیر الملک کو بھی یہیں بلالوں؟“

خورشاہ نے جواب دیا۔ ”نصیر الملک کچھ عرصے کے لیے میرا وزیر رہا ہے پتا نہیں وہ آپ کے سوالوں کے جواب دے بھی سکے گا یا نہیں۔ ویسے آپ کی جیسی مرضی۔“

ہلاکو خان نے ایک حور سے پوچھا۔ ”کیا تو اس شخص سے واقف ہے؟“ اس نے خورشاہ کی طرف اشارہ کیا۔  
حور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“  
حور نے جواب دیا۔ ”ہمارا سیدنا۔ دوسروں کا شیخ البجال۔“

ہلاکو خان مسکرایا۔ خورشاہ سے پوچھا۔ ”اب تو کیا کہے گا؟“  
شیخ البجال نے جواب دیا۔ ”میں کیا کہوں گا۔“

میرے برگشتہ مقدر نے جہاں تک مجھے پہنچا دیا ہے، وہاں میرا سایہ تک میری مخالفت ہی کرے گا۔“  
ہلاکو نے خورشاہ کو اس بہشتی مخلوق کے سامنے دیر تک گھمایا پھر ایا۔ محل کے آرام و آسائش کا پروردہ شیخ البجال تھک کر چور چور ہو گیا۔ اس نے ہلاکو سے درخواست کی کہ اسے اور نہ گھمایا جائے، وہ آرام کرنا چاہتا ہے۔

ہلاکو نے اس کی درخواست قبول کر لی اور خورشاہ کو اس کے خیمے میں بھیج دیا گیا۔ جبار کو بہشتی جہنم میں ڈنوبیہ مل گئی۔ اس نے ہلاکو خان سے درخواست کی۔ ”ڈنوبیہ کو مجھے بخش دیا جائے۔“

ہلاکو نے اسے تسلی دی۔ ”ان ساری عورتوں اور لڑکیوں کی تقسیم جب عمل میں آئے تو ڈنوبیہ تیرے حوالے کر دی جائے گی۔“

خورشاہ کو پہلے تو امید تھی کہ اسے مہمان نوازی کے بعد واپسی کی اجازت دے دی جائے گی لیکن ہلاکو خان نے اسے روک رکھا۔ اس قید تہائی میں بھی منگول دو شیزہ یا کی اسے برابر یاد آتی رہی۔ کئی بار اس نے یہ ارادہ کیا کہ ہلاکو خان سے یا کی کو مانگ لے مگر ہمت نہیں پڑی۔ وہ سارا سارا دن اپنے خیمے میں تنہا پڑا رہتا۔ ہلاکو کی طرف سے چند خدمت گار متعین کر دیے گئے تھے مگر وہ ہر وقت اس کے پاس نہیں رہتے تھے۔ صبح اور شام حاضری دے کر وہ خورشاہ سے یہ پوچھ لیتے تھے کہ ان کے لائق کوئی خدمت ہو تو بتا دی جائے چونکہ یہاں خورشاہ حشم و خدم سے محروم تھا اس لیے ان خدمت گاروں کے لیے کوئی کام بھی نہیں تھا۔



دوست کہا ہے؟“  
خورشاہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے تجھ کو اپنا  
دوست کہا ہے۔“

خدمت گار نے کہا۔ ”تب پھر میرا بھی یہ وعدہ ہے کہ  
میں یا کی سے مل کر اس سے آپ کی بات کروں گا اور کوشش  
کروں گا کہ وہ کم از کم ایک ہی بار سہمی، آپ سے ملنے ضرور  
آجائے۔“

خورشاہ نے فرط خوشی میں خدمت گار کو اپنے سینے سے  
لگا لیا، بولا۔ ”اگر تو نے میرا یہ کام کر دیا تو میں زندگی بھر تیرا  
احسان مند رہوں گا۔“

خدمت گار پھولا نہ سایا۔ شیخ البجال، باطنیوں کے  
سیدنا نے اس کو اپنے گلے لگا لیا تھا۔ اس کے لیے یہ بڑا  
اعزاز تھا۔ خدمت گار گیا تو دوسرے نے اس کی جگہ لے لی  
اور خورشاہ نے اس سے بھی بڑی باتیں کیں اور اس دوسرے  
خدمت گار نے بھی کسی کے مشورے اور ایما پر ایسا کیا تھا۔  
اس دوسرے خدمت گار نے پوچھا۔ ”سیدنا! میں آپ کی کیا  
خدمت کر سکتا ہوں؟“

خورشاہ نے کہا۔ ”باتیں، صرف باتیں۔ تم لوگ مجھ  
سے باتیں کیا کرو۔ میں بولنا چاہتا ہوں، میں بات کرنا چاہتا  
ہوں کیونکہ میں گونگا نہیں ہوں۔“ دوسرا منگول شاید شیخ  
البجال کا زرخیز غلام تھا کیونکہ وہ شیخ کی بڑی خوشامد کرتا رہتا  
تھا لیکن خورشاہ نے اس سے بے تکلف ہونا پسند نہیں کیا۔  
جب اس کا وقت ختم ہو گیا تو تیسرے خدمت گار نے اس کی  
جگہ لے لی۔

☆☆☆

پہلے خدمت گار نے اپنا وعدہ پورا کیا اور یا کی کو  
خورشاہ کی خدمت میں لے آیا۔ یا کی اس قیمتی اور معزز قیدی  
کو مسکرا مسکرا کر دیکھتی رہی پھر منگول زبان میں کچھ کہا جسے  
خدمت گار نے بتایا۔ ”یا کی پوچھ رہی ہے کہ تم یہاں اس  
خیمے میں کیا کرتے رہتے ہو؟“

خورشاہ نے یا کی سے کہا۔ ”میں تجھ سے محبت کرنے  
لگا ہوں کیا تو میرے پاس رہنا گوارا کرے گی؟“  
جب اس لڑکی کو شیخ کے دل کی بات بتائی گئی تو وہ کسی  
قدر مغموں ہو گئی، بولی۔ ”یہ کام نہ تو میرا ہے اور نہ ہی اس  
قیدی کا۔ کیا یہاں کا کوئی شخص اتنی ہمت کر سکتا ہے کہ  
ہلاکو خان کی پروا کیے بغیر خاموشی سے اپنا کام کرتا رہے۔“  
خدمت گار نے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسا نہیں  
ہو سکتا۔“

خدمت گار نے کہا۔ ”معزز مہمان! میں یا کی کے  
باپ یسار کو اچھی طرح جانتا ہوں، اس کو آپ سے ایک  
شکایت ہے۔“

خورشاہ کا دل ایک بار پھر زور زور سے دھڑکنے لگا۔  
پوچھا۔ ”اس کو مجھ سے کیا شکایت ہے؟“

خدمت گار نے جواب دیا۔ ”وہ کہتا ہے آپ نے  
اس کی بیٹی یا کی کو زبردستی اپنے ساتھ بٹھالیا تھا۔“

خورشاہ نے ایک سرد آہ بھری، بولا۔ ”ہاں! مجھے وہ  
لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ میں اب بھی اس کو یاد کرتا رہتا  
ہوں، وہ بڑی حسین اور جاذب نظر لڑکی ہے۔“ اس نے  
ایک بار پھر سرد آہ بھری۔ ”خدمت گار! کل جب میں بادشاہ  
تھا تو لڑکیاں میری نظر التفات کی بھوکی رہتی تھیں لیکن  
آج..... آج جبکہ میں اس چھوٹے سے خیمے میں قیدی کی  
زندگی گزار رہا ہوں تو کم حیثیت یسار یہ کہتا پھر رہا ہے کہ میں  
نے اس کی بیٹی کو زبردستی اپنے ساتھ بٹھالیا تھا۔“

خدمت گار نے کہا۔ ”صرف یسار ہی نہیں، دوسرے  
لوگ بھی کچھ اس قسم کی باتیں کرتے پھر رہے ہیں۔“

خورشاہ نے جواب دیا۔ ”میں لوگوں کی پروا نہیں  
کرتا۔ میں یسار سے بھی نہیں ڈرتا۔ اگر تو میرا ایک کام  
کر دے تو میں تیرا شکر یہ ادا کروں گا۔“

خدمت گار نے کہا۔ ”کون سا کام؟ بتائیے شاید میں  
کر سکوں۔“

خورشاہ نے جواب دیا۔ ”تو یا کی کے پاس چلا جا اور  
میری جانب سے یہ کہہ دے کہ خورشاہ تیرے فراق میں  
مجھیف و نزار ہوا جا رہا ہے۔ میں اس منگول دو شیرہ سے محبت  
کرنے لگا ہوں۔“

خدمت گار نے معذوری ظاہر کی۔ ”لیکن یہ باتیں  
یا کی سے میں کس طرح کہہ سکتا ہوں؟“

خورشاہ نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتا کہ تو میرا یہ  
پیغام یا کی تک کس طرح پہنچائے گا لیکن تجھے پہنچانا ضرور  
ہے میرا یہ پیغام۔ اگر ہلاکو خان مجھ کو اپنے پاس بلاتا تو میں  
اس سے یا کی کو مانگ لیتا۔“

خدمت گار نے ایک بار پھر معذرت کی، بولا۔ ”خدا  
کے لیے یہاں اس قسم کی باتیں نہ کیجیے۔ ان باتوں کا  
میرے دل پر بڑا گہرا اور شدید اثر ہوتا ہے۔“

خورشاہ نے جواب دیا۔ ”مت گھبرا میرے دوست!  
تیرا کچھ بھی نہ ہوگا۔“

خدمت گار نے پوچھا۔ ”کیا آپ نے مجھے اپنا



ایک تجویز پر غور کر رہا ہوں۔“

خورشاہ نے ڈرتے ڈرتے آہستہ سے پوچھا۔ ”کس تجویز پر؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”جس طرح میں نے تجھ کو تیرے خاندان سے جدا کر دیا تھا، اسی طرح میں چاہتا ہوں کہ تجھے ایک خاندان فراہم کر دیا جائے۔“

خورشاہ کو امید پیدا ہو چلی کہ شاید اب اس کو معاف کر دیا جائے گا اور اس کو اس کے کنبے سے ملا دیا جائے گا۔ خورشاہ نے کہا۔ ”میرا دل بار بار یہی کہتا تھا کہ اتنا بڑا فاتح کوئی معمولی انسان نہیں ہو سکتا۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”دنیا میں تخریب اور تعمیر کا عمل جاری ہے۔ ایک حکمران جاتا ہے، دوسرا آتا ہے، ایک شہر برباد ہو جاتا ہے، دوسرا نیا آباد ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک خاندان مٹ جاتا ہے، دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ میں تیرے برباد خاندان کو دوبارہ آباد نہیں کر سکتا لیکن اس کی جگہ ایک نیا خاندان ضرور پیدا کر سکتا ہوں۔“

خورشاہ مجو دید، دم بخو، ہلاکو خان کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہلاکو خان نے مزید کہا۔ ”یا کی تجھے بخش دی گئی۔ تو نے اپنے دو پرستاروں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ مجھے اپنی چھریوں سے ہلاک کر دیں گے تو تو انہیں بہشت زار میں داخل کر کے حوروں کا مالک بنا دے گا۔ جبار کو ذنوبیہ پسند تھی، میں نے اسے بخش دی۔ اسد نے طاہرہ کو مانگ لیا۔ ایک بادشاہ کا وعدہ دوسرے بادشاہ نے پورا کر دیا۔ میں ان دونوں خاندانوں کو تیرے پاس بھیج رہا ہوں۔ اب تم تینوں مل جل کر رہو گے اور تینوں کے مرتبے برابر ہوں گے۔ ان میں نہ کوئی بڑا ہوگا، نہ چھوٹا۔“

خورشاہ کے احساس برتری کو چوٹ لگ رہی تھی، بولا۔ ”کیا میرے خدمت گار ان دونوں کے مقابلے میں مجھ کو نمایاں اور بڑا ثابت نہیں کریں گے؟“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”تو نے اپنے لیے ایک معمولی داروغہ اصطبل کی بیٹی کا انتخاب کیا ہے اس لیے خدمت گاروں کو واپس بلا لیا جائے گا۔“

خورشاہ نے عاجزی سے درخواست کی۔ ”منگول فاتح! مجھ کو یا کی کے ساتھ تنہا رہنے دیا جائے۔ جبار اور اسد کو مجھ سے دور ہی رکھا جائے تو کرم ہوگا کیونکہ میں اپنے غلاموں کو اپنے کنبے کا ایک حصہ نہیں بنا سکتا۔“

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”ان دونوں کو تیرے خاندان کا ایک جزو میں بنا رہا ہوں، تو کب بنا رہا ہے؟“

یا کی نے کہا۔ ”تب پھر اس قیدی کو بنا دے کہ ہلاکو خان کو بتائے بغیر مجھ سے نہ ملے۔“

خورشاہ نے یا کی سے کہا۔ ”معلوم نہیں کیوں، ہلاکو خان نہ تو مجھے بلاتا ہے اور نہ ہی میرے پاس آتا ہے اور ان حالات میں، میں نے اپنے دل میں یہ عہد کر رکھا تھا کہ میں ہلاکو خان سے کچھ نہیں کہوں گا۔ وہ جو چاہے کرے، میں اب اس کا کوئی احسان نہیں لوں گا لیکن میں سوچتا ہوں کہ شاید تیری خاطر..... یا کی تیری خاطر مجھے اپنا عہد توڑنا پڑے گا اور میں ہلاکو خان سے تجھ کو مانگ لوں گا۔“

یا کی رونے لگی۔ خورشاہ نے خدمت گار سے کہا۔ ”یا کی سے پوچھو، یہ کیوں رو رہی ہے؟“

خدمت گار نے یا کی سے پوچھ کر بتایا۔ ”یا کی خورشاہ سے محبت کرنے لگی ہے اس لیے اگر ہلاکو خان نے قیدی بادشاہ کی درخواست قبول کر لی تو وہ خورشاہ کے پاس خوش و خرم رہے گی۔“

قیدی بادشاہ یا کی کا جواب سن کر بہت خوش ہوا اور خدمت گار سے کہا۔ ”اگر تو ہلاکو خان تک رسائی حاصل کر سکے تو اس سے کہہ دے کہ یا تو مجھے اپنے پاس بلا لے یا وہ میرے پاس آنے کی زحمت کرے۔ میں اس سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

خدمت گار وعدہ کر کے چلا گیا، اس کے ساتھ یا کی بھی چلی گئی۔ کئی دن بعد ہلاکو خان قیدی بادشاہ کے خیمے میں داخل ہوا۔ خورشاہ احتراماً کھڑا ہو گیا۔ ہلاکو خان نے طنزاً پوچھا۔ ”کل مجھے بتایا گیا تھا کہ ماضی کے بادشاہ نے مجھے یاد فرمایا ہے؟“

خورشاہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آواز بھر گئی۔ ”خوش قسمت اور اقبال مند فاتح! مجھے مزید ذلیل نہ کیجیے۔ میں دنیا کی نظروں سے تو کب کا گر چکا، آج میں اپنی نظر سے بھی گر گیا۔“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تجھ کو میرے داروغہ اصطبل یسار کی بیٹی یا کی پسند آگئی ہے؟“

خورشاہ نے نظریں جھکائیں اور اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ کر سکا۔

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تو یا کی کو خوش رکھ سکے گا؟“

خورشاہ نے جواب دیا۔ ”اس وقت تو میں خود کو بھی خوش نہیں رکھ سکتا۔ یا کی کو کیا خوش رکھوں گا؟“

ہلاکو خان نے کہا۔ ”آج کئی دن سے میں تیری بابت



وہ ہمیں قراقرم بھیج دے۔“  
جبار نے کہا۔ ”لیکن قراقرم جا کے ہم کیا کریں گے؟“  
خورشاہ نے کہا۔ ”وہاں ہمیں اتنی بہت ساری نگراں  
آنکھیں گھوریں گی نہیں۔“

اس نے کہا۔ ”ہمیں ان نگراں آنکھوں سے کیا لینا  
دینا۔ ہم یہیں خوش ہیں اور قراقرم جانا ضروری نہیں سمجھتے۔“  
خورشاہ نے بگڑ کر کہا۔ ”یہ میں کہہ رہا ہوں، یہ میرا حکم  
ہے۔ آخر میں بادشاہ رہ چکا ہوں۔ تمہیں میرا حکم ماننا چاہیے۔“  
اسد نے جواب دیا۔ ”حکم کا زمانہ لہ گیا، اگر میں تمہارا  
کہنا مانوں گا تو کسی دوسرے وقت تم کو میرا کہنا ماننا ہوگا۔“

خورشاہ خاموش ہو گیا۔ اس کو اپنی بد قسمتی کا اندازہ  
اور زیادہ ہو گیا۔ جبار کہیں سے گھوم پھر کر واپس آیا تو اپنے  
خیمے میں خورشاہ کو دیکھا۔ خیمے میں جبار کی بیوی ذنوبیہ بھی  
تھی۔ جبار ان دونوں کو یکجا اور تنہا دیکھ کر برہم ہو گیا، بولا۔  
”تو یہاں کیوں آیا تھا؟“

خورشاہ اس طرزِ مخاطب کی چوٹ کو برداشت نہ  
کر سکا۔ بگڑ کر بولا۔ ”جبار! یہ تو بات کس طرح کر رہا ہے؟  
کیا تجھ کو میری حیثیت اور مقام کا علم نہیں ہے؟“

جبار نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ ”تو یہاں کیوں آیا تھا؟“  
یہ لہجہ اور یہ انداز گفتگو اس کے دل و دماغ پر ضربیں  
لگا رہا تھا۔ پھر کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں کہتا ہوں تو اپنا لہجہ درست  
کر۔ میں یہ سب نہیں برداشت کر سکتا۔“

جبار نے ذنوبیہ کو گلدی سے پکڑ لیا، بولا۔ ”تو ہی بتا کہ  
یہ شخص تیرے پاس کیوں آیا تھا؟“

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ”یہ میرے پاس نہیں آپ  
کے پاس آیا تھا لیکن آپ خیمے میں موجود نہیں تھے اور یہ  
واپس جانے ہی والا تھا کہ آپ آگئے۔“

خورشاہ نے ذنوبیہ سے کہا۔ ”تو بھی جبار کی طرح تحقیر  
آمیز لہجے میں بات کر رہی ہے، آخر کیوں؟“

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ”میں اسی لہجے میں تجھ سے  
مخاطب ہوں جس کا تو مستحق ہے اور جس کا تو اہل ہے۔“

خورشاہ نے کہا۔ ”لوگو! خدا کے قہر سے ڈرو اور ایک  
شریف اور عزت دار انسان کو اتنا ذلیل نہ کرو۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”شریف اور عزت دار انسان  
سے تیری کیا مراد ہے؟ کیا ہم لوگ ذلیل ہیں؟ بتا.....  
جواب دے، اب خاموش کیوں ہو گیا؟“

خورشاہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کچھ دیر دم بخود کھڑا  
سوچتا رہا پھر جبار کی طرف بڑھا اور عاجزی سے کہا۔ ”جبار!

خورشاہ نے کہا۔ ”یہ میری موت ہوگی۔“  
ہلا کوخان نے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔“  
ہلا کوخان نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ کئی دن بعد یا کی کو  
خورشاہ کے حوالے کر دیا گیا اور اس کا خیمہ وہاں سے اکھاڑ  
کر عام لشکریوں میں نصب کر دیا گیا۔ یہیں پر اسد اور جبار  
کے خیمے بھی نصب کر دیے گئے۔ اب ذنوبیہ اور طاہرہ ان کی  
بیویاں بن چکی تھیں۔ جبار اور اسد کو ہلا کوخان نے یہ حکم دیا  
کہ وہ اپنے سابق بادشاہ اور نئے خاندانی سربراہ سے ہر روز  
ملاقاتیں کیا کریں اور خورشاہ کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ بھی دونوں  
کے خیموں میں حاضر یاں دیتا رہا کرے۔

تینوں نے اس حکم کی پابندی کی لیکن خورشاہ دعا مانگ رہا  
تھا کہ خدا یا اس کو قراقرم روانہ کر دے تاکہ وہ قراقرم کے  
شہنشاہ منگوخان کے دل کو اپنی جہ زبانی سے جیت سکے۔

ہلا کوخان نے اپنے فرستادے چین کی طرف بھی دوڑا  
دیے جہاں اس کا ایک اور بھائی قبلائی خان حکومت کر رہا  
تھا۔ کچھ دنوں بعد ہلا کوخان نے اپنے بھائی منگوخان کے نام  
ایک خط بھیجا۔ اس میں اس نے لکھا تھا۔

”شاہوں کے شاہ، خان اعظم کے جانشین منگوخان  
کی خدمت میں اس کا چھوٹا بھائی ہلا کوخان سلام عرض کرتا  
ہے۔ شہبازوں کے مسکن میں رہنے والا خورشاہ اب میری  
قید میں ہے۔ اس کے آباؤ اجداد کی بنائی ہوئی بہشت برباد  
کر دی گئی ہے۔ اس کے چھری بند فدائی جانوروں کی طرح  
ذبح کر دیے گئے اور اس کے پرستار منتشر کر دیے گئے۔  
اب یہ مرقع عبرت انسان آپ کی خدمت میں بھیجا رہا ہے۔  
اس کے آباؤ اجداد نے جو کچھ کیا ہے، وہ ایسا نہیں ہے کہ...  
یہ آسانی بھلا دیا جائے اور معاف کر دیا جائے مگر خورشاہ کو قتل  
کر دینے کا یہ مطلب ہوگا کہ اس کو معاف کر دیا گیا۔ میں  
نے اس کو زندہ رکھا ہے اور اس کے ارد گرد، آس پاس ایسے  
حالات پیدا کر دیے ہیں کہ ان میں یہ ہر روز پیدا ہوگا اور ہر  
روز مرے گا۔“

☆☆☆

خورشاہ کا خیمہ اور خود خورشاہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن  
گیا۔ اس کو ایک نظر دیکھنے کا شوق رکھنے والے آزادی سے  
اس کے پاس آنے جانے لگے۔ وہ کسی کو آنے سے منع بھی  
نہیں کر سکتا تھا۔ اسد اور جبار اپنا زیادہ وقت خورشاہ کے  
پاس ہی گزارتے۔ اسی طرح خورشاہ بھی ان دونوں کے  
پاس آتا جاتا رہتا تھا۔ اس نے ان دونوں کو سمجھایا۔ ”تم  
دونوں ہلا کوخان کے پاس جاؤ اور اس سے درخواست کرو کہ



میں تجھ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں تیرے خیمے میں تیری عدم موجودگی میں کسی بری نیت سے نہیں آیا تھا۔“

خورشاہ نے اپنا سر پیٹ ڈالا بولا۔ ”میں کیا کروں یا کی! میں کیا کروں؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”میں تیری بات پر اس لیے یقین کر لوں گا کہ ذنوبہ اس کی تصدیق کر رہی ہے کہ اگر اس کی گواہی شامل نہ ہوتی تو میں تیری کسی بات پر یقین نہ کرتا۔“

خورشاہ نے جواب دیا۔ ”تو قرآرم نہ جا، یہیں رہ جا۔“

خورشاہ نے کہا۔ ”کیا میں قابل اعتبار نہیں ہوں؟ کیا تجھ کو میری بات پر یقین نہیں رہا؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”ہاں بات سچی یہی ہے۔“

خورشاہ نے پوچھا۔ ”تو سچ کہہ رہا ہے؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔“

خورشاہ نے نہایت عاجزی سے درخواست کی۔ ”کیا میں اپنے خیمے میں واپس جاؤں؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”نہیں جاتی تو نہ جائے۔ اس پر جبر کیوں کیا جائے۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”ہاں! تو اپنے خیمے میں واپس جاسکتا ہے مگر خبردار جو آئندہ ایسی حرکت کی۔“

خورشاہ نے بڑی حسرت سے جبار کی طرف دیکھا، بولا۔ ”جبار! میرے پاس چلنے کا یہی ایک سہارا ہے۔ تو چاہتا ہے کہ میں اس سے بھی محروم ہو جاؤں۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کر۔“

خورشاہ نے نظریں جھکا لیں اور چپ چاپ اپنے خیمے میں واپس چلا گیا۔ خورشاہ اپنے ماحول کی یکسانیت سے تنگ آچکا تھا۔ اس نے ہلا کو خان سے درخواست کی کہ یا تو اسے اپنے محل میں واپس جانے کی اجازت دی جائے یا اسے قرآرم بھیج دیا جائے۔ ہلا کو خان بھی اس سے بیزار ہو چکا تھا۔ اس نے خورشاہ کو قرآرم جانے کی اجازت دے دی۔ جبار اور اسد کو حکم دیا گیا کہ وہ بھی خورشاہ کے ساتھ قرآرم جائیں گے۔

اسد نے جبار کی طرف سے جواب دیا۔ ”ہم خود بھی قرآرم نہیں جانا چاہتے مگر تیری وجہ سے نہیں بھی جانا پڑ رہا ہے۔ اگر یا کی قرآرم نہیں جانا چاہتی تو اس کو اس کے باپ کے پاس چھوڑ دے۔“

خورشاہ نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ”اب میں کیا کروں؟ کوئی بھی میری بات تک سننے کو تیار نہیں۔“ اس کے بعد یا کی کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ ”یا کی! مجھے بے سہارا نہ کر۔“ وہ پیچھے ہٹا اور کہیں سے ایک خنجر نکال لیا اور اس کو یا کی کے ہاتھ میں تھما دیا، بولا۔ ”تو اس خنجر سے میرا کام تمام کر دے کیونکہ تیری مفارقت اور جدائی پر میں موت کو ترجیح دوں گا۔“

یا کی نے خنجر لے کر اسد کی طرف پھینک دیا، بولی۔ ”یہ کیسا مرد ہے جو عورت کے لیے روتا ہے۔ ہماری قوم کے مرد تو عورتوں کے لیے بالکل نہیں روتے۔“ پھر بطور خاص خورشاہ کو مخاطب کیا۔ ”میں کہتی ہوں تو یہ عورتوں کی طرح آنسو کیوں بہانے لگتا ہے۔“

خورشاہ نے روتے ہوئے کہا۔ ”میرا ساتھ نہ چھوڑنا یا کی! اگر چھوڑ دیا تو میں مرجاؤں گا۔“

اسد نے خنجر ایک بار پھر پھینک دیا۔ ”یہ خنجر مردوں کے لیے نہیں عورتوں کے لیے ہوتا ہے۔“

خورشاہ بری طرح سہم کر ایک ایک کو پرامید نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ طاہرہ نے آگے بڑھ کر خورشاہ کی ہمدردی کی، بولی۔ ”اب انہیں زیادہ نہ ستاؤ۔ انہیں دیکھو اور عبرت

میں سو جنگجو، منگولوں کا ایک دستہ خورشاہ، جبار اور اسد کو لے کر قرآرم روانہ ہو گیا۔ یا کی کا باپ بے سہارا اپنی بیٹی سے ملنے آیا اور اس کو مجبور کیا کہ وہ قرآرم نہ جائے۔ یا کی متذبذب ہو گئی۔ خورشاہ نے جب دیکھا کہ یا کی ڈانوں ڈول ہو رہی ہے تو وہ ڈر گیا۔ اس نے یا کی کی خوشامد شروع کر دی۔ ”یا کی! میری آخری آرام جان، اگر تو نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا تو میں جیتے جی مرجاؤں گا۔“

یا کی نے کہا۔ ”تو قرآرم جانے کے بجائے یہیں رہ جا، کیونکہ میں اپنے باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

خورشاہ کا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ آہستہ سے بولا۔ ”یا کی! زمین گھوم رہی ہے، خیمے کپکپا رہے ہیں۔ اگر مجھے تنہا قرآرم جانا پڑا تو میں راستے ہی میں مرجاؤں گا۔“

یا کی نے خورشاہ کو سمجھایا۔ ”اگر تو قرآرم چلا گیا تو وہاں تجھے زیادہ دن زندہ رہنا نصیب نہیں ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ منگو خان تجھ میں کوئی دلچسپی ہی نہ لے اور قتل کر دے۔“

یا کی نے کہا۔ ”تو قرآرم جانے کے بجائے یہیں رہ جا، کیونکہ میں اپنے باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

خورشاہ نے روتے ہوئے کہا۔ ”میرا ساتھ نہ چھوڑنا یا کی! اگر چھوڑ دیا تو میں مرجاؤں گا۔“

یا کی نے کہا۔ ”تو قرآرم جانے کے بجائے یہیں رہ جا، کیونکہ میں اپنے باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

یا کی نے کہا۔ ”تو قرآرم جانے کے بجائے یہیں رہ جا، کیونکہ میں اپنے باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

یا کی نے کہا۔ ”تو قرآرم جانے کے بجائے یہیں رہ جا، کیونکہ میں اپنے باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

یا کی نے کہا۔ ”تو قرآرم جانے کے بجائے یہیں رہ جا، کیونکہ میں اپنے باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

یا کی نے کہا۔ ”تو قرآرم جانے کے بجائے یہیں رہ جا، کیونکہ میں اپنے باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

یا کی نے کہا۔ ”تو قرآرم جانے کے بجائے یہیں رہ جا، کیونکہ میں اپنے باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

یا کی نے کہا۔ ”تو قرآرم جانے کے بجائے یہیں رہ جا، کیونکہ میں اپنے باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

یا کی نے کہا۔ ”تو قرآرم جانے کے بجائے یہیں رہ جا، کیونکہ میں اپنے باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

یا کی نے کہا۔ ”تو قرآرم جانے کے بجائے یہیں رہ جا، کیونکہ میں اپنے باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

یا کی نے کہا۔ ”تو قرآرم جانے کے بجائے یہیں رہ جا، کیونکہ میں اپنے باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

یا کی نے کہا۔ ”تو قرآرم جانے کے بجائے یہیں رہ جا، کیونکہ میں اپنے باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

یا کی نے کہا۔ ”تو قرآرم جانے کے بجائے یہیں رہ جا، کیونکہ میں اپنے باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

یا کی نے کہا۔ ”تو قرآرم جانے کے بجائے یہیں رہ جا، کیونکہ میں اپنے باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

یا کی نے کہا۔ ”تو قرآرم جانے کے بجائے یہیں رہ جا، کیونکہ میں اپنے باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“



پکڑو۔“ پھر یا کی سے کہا۔ ”یا کی! تو انہیں مایوس نہ کر اور ان کے ساتھ قرآرم چلی چل۔“

یا کی نے جواب دیا۔ ”میں نے اس خوف زدہ عاشق کا ساتھ دینے کا عہد کر لیا ہے، میں اس کے لیے قرآرم جاؤں گی۔“

خورشاہ فرطِ خوشی میں آگے بڑھا اور طاہرہ کے روبرو دوڑا نو ہو گیا۔ ”معزز خاتون! میں کس زبان سے تیرا شکریہ ادا کروں؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“

سامان سفر تیار تھا۔ ہلا کو خان نے سفر شروع کرنے کا حکم دیا اور یہ لوگ شاہراہِ ریشم پر رواں دواں ہو گئے۔ خورشاہ کو طاہرہ کی عادت بہت اچھی لگی تھی۔ وہ اس سے ربط ضبط رکھنا چاہتا تھا مگر اسد سے ڈرتا تھا۔ اس کی نظریں ذنوبیہ پر بھی پڑنے لگی تھیں اور اسے ذنوبیہ میں بھی دلکشی نظر آنے لگی تھی۔ اس چالاک انسان نے اسد اور جبار کو رام کرنے کے لیے ایک چال چلی۔ سو میل سفر طے کرنے کے بعد اس قافلے نے ایک پہاڑی کے دامن پر پڑاؤ کیا۔ خورشاہ بہت خوش خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے اسد، طاہرہ، جبار اور ذنوبیہ کی اپنے خیمے میں دعوت کر دی اور ان کے لیے کئی قسم کے کھانے تیار کرائے۔

خورشاہ نے جواب دیا۔ ”میں نے آپ کی بہشت میں بہت آرام پایا ہے۔ اس آرام اور لذت کو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”میں نے آپ کی بہشت میں بہت آرام پایا ہے۔ اس آرام اور لذت کو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔“

خورشاہ نے کہا۔ ”اور بھولنا بھی نہیں چاہیے۔ شاید تو نہیں جانتی کہ میں قرآرم کیوں جا رہا ہوں؟ منگولوں کے شہنشاہ منگول خان نے مجھ سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ جب میں ہزاروں میل کا سفر کر کے اس سے ملوں گا تو وہ میرے جذبے اور سابقہ حیثیت کے پیش نظر میری حکومت مجھ کو واپس کر دے گا۔ اگر تو میرا ساتھ دے گی تو میں ایک بار پھر ویسی ہی بہشت تعمیر کروں گا اور تجھ کو اس بہشت میں واپس بھیج دیا جائے گا۔“

طاہرہ نے پوچھا۔ ”میں آپ کا کس طرح ساتھ دوں گی؟“

خورشاہ نے ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ ”اسد کا کام تمام کر دے، رات کو سوتے میں۔“

طاہرہ نے کہا۔ ”پھر میں کہاں جاؤں گی؟“

خورشاہ نے جواب دیا۔ ”میرے خیمے میں، میں تجھ کو اتنی شان اور اتنی آن بان سے رکھوں گا کہ لوگ تجھ پر رشک کرنے لگیں گے۔“

طاہرہ متذبذب ہو گئی۔ بولی۔ ”میں اس پر سوچوں گی۔“

خورشاہ نے کہا۔ ”تو بھی سوچ اور ذنوبیہ کو بھی اس انداز فکر پر آمادہ کر لے لیکن خبردار! جو اس کا کسی اور کو علم ہوا۔“

خورشاہ اسد سے خوفزدہ بھی تھا۔ اسد کی آمد کا دھوکا اس کو برابر پریشان کرتا رہا۔ جب وہ باہر نکلا تو ایک منگول نے خورشاہ کو مطلع کیا کہ اسد کافی دیر سے اس کے خیمے میں

سورج اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا اور دھوپ میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ خورشاہ اپنے خیمے سے نکل کر اسد کے خیمے میں گھس گیا۔ اس وقت اسد اپنے خیمے میں نہیں تھا۔ خورشاہ نے تہا طاہرہ کو بیٹھے جو دیکھا تو اٹھنے لگے قدموں واپس آ جانا چاہا لیکن طاہرہ نے آواز دے کر خورشاہ کو روک لیا۔ جب خورشاہ ٹھنک کر کھڑا ہو گیا تو طاہرہ نے پوچھا۔ ”اب تو یا کی نے کسی قسم کا شور و غل نہیں کیا؟“

خورشاہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، اب وہ نہیں ستاتی۔“ پھر ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”تیرا کیا نام ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”طاہرہ!“

خورشاہ نے جواب دیا۔ ”اسد کے پاس آنے سے پہلے تو کیا میری بہشت میں تھی؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”ہاں! مگر یہ آپ نے کیوں پوچھا؟“

خورشاہ نے سرد آہ بھری۔ ”افسوس کہ میں نے تجھ کو وہاں نہیں دیکھا تھا۔“ پھر ذنوبیہ کی بابت پوچھا۔ ”کیا ذنوبیہ بھی وہیں تھی؟“

طاہرہ نے جواب دیا۔ ”ہاں! وہ بھی آپ ہی کی



جائے؟ مجھے صاف صاف بتا دو۔“  
طاہرہ نے جواب دیا۔ ”اگر بہشت میں ہم دونوں کا داخلہ یقینی ہو جائے تو ہم دونوں وہ کام فوراً ہی کر گزریں گے۔“

خورشاہ نے کہا۔ ”میں جو تم دونوں کو یہ یقین دلا رہا ہوں کہ بہشت ارضی دوبارہ وجود میں آنے والی ہے۔“

طاہرہ نے کہا۔ ”ہمارے پاس زہر موجود ہے۔ وہ کام اسی منزل میں ہو جائے گا لیکن مجھے اور ذنوبیہ کو یہ یقین دلا یا جائے کہ ہمیں بے سہارا تو نہیں چھوڑ دیا جائے گا؟“

خورشاہ نے جواب دیا۔ ”تم دونوں کو بے سہارا نہیں چھوڑا جائے گا۔ تم دونوں میرے پاس یا کی کے ساتھ رہو گی۔“

طاہرہ نے کہا۔ ”تب پھر یہ کام کل صبح تک ضرور ہو جائے گا۔“

خورشاہ اپنے دل میں اسد کو خوب برا بھلا کہہ رہا تھا۔ اس وقت وہ بہت خوش تھا کہ بالآخر وہ ان دونوں سے انتقام لے لے گا۔ دوسرے دن خورشاہ، اسد اور جبار نے ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھایا۔ یہ کھانا طاہرہ نے تیار کیا تھا۔ خورشاہ روٹی کا ایک آدھ لے کر رہ گیا جبکہ بقیہ دونوں دیر تک کھاتے رہے۔

سہ پہر کو مشرق کی طرف سے دس بارہ گھڑسوار نمودار ہوئے اور یہ خورشاہ کے منگول ساتھیوں سے انہی کی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں قرقرم کے خاقان منگو خان نے بطور خاص اس وفد کے پاس بھیجا ہے جو خورشاہ کو لے کر قرقرم کی طرف جا رہا تھا۔

ہلاکو خان کا مقرر کردہ سردار قافلہ بنگ جی نئے آنے والوں سے مل کر بہت خوش ہوا۔ پوچھا۔ ”ہمارے لیے کوئی خاص پیغام۔“

خاقان نمائندے نے اعلان کیا۔ ”خاقان منگو خان نے کہا ہے کہ انہیں باطلیوں کے بادشاہ خورشاہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ خاقان خورشاہ سے نہیں ملنا چاہتا اس لیے وہ جہاں تک پہنچ چکا ہے، وہیں پر روک دیا جائے۔“

بنگ جی نے اسی وقت خورشاہ، اسد اور جبار کو اپنے خیمے میں طلب کر لیا۔ اسد اور جبار اپنے اپنے خیموں میں زندگی کی آخری ساتیں لے رہے تھے، خورشاہ تنہا بنگ جی کے سامنے پیش ہو گیا۔

بنگ جی نے پوچھا۔ ”وہ دونوں کہاں ہیں، اسد اور جبار؟“

موجود جانے کیا کر رہا ہے؟ یہ خبر تگور کے گھاؤ کی طرح دل میں اترتی چلی گئی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے خیمے کے در پر پہنچ گیا اور باندا ز چار حانہ اس نے سوال کیا۔ ”یا کی! اندر کون ہے؟“

یا کی نے ذرا تامل سے جواب دیا۔ ”اندر میں ہوں اور تیرا دوست اسد۔ یہ بڑی دیر سے تیرا انتظار کر رہا ہے۔“

خورشاہ تیزی سے اندر داخل ہوا اور اسد کی گویا بوسہ لگتا ہوا یا کی کے پاس چلا گیا۔ یہاں اسد خورشاہ کے قالین پر بیٹھا ہوا تھا۔ خورشاہ کو دیکھتے ہی اسد مسکرایا، بولا۔ ”میں بڑی دیر سے تیرا انتظار کر رہا ہوں۔ تو کہاں چلا گیا تھا؟“

خورشاہ نے اسد اور یا کی کو نہایت غور سے دیکھا اور وہ جو کچھ جانتا چاہتا تھا، جان گیا۔ اس کو غصہ تو بہت آیا مگر برداشت کر گیا کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ وہ طاقت میں اسد کی برابری نہیں کر سکتا۔ اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

”اسد! جب میں خیمے میں نہیں ملا تھا تو تجھے بھی یہ زیب نہیں دیتا تھا کہ یا کی کے پاس بیٹھ کر میرا انتظار کرے۔“

اسد نے جواب دیا۔ ”پھر میں تیرا کہاں انتظار کرتا؟“  
خورشاہ نے پوچھا۔ ”کیا مجھ سے تیرا کوئی کام انک کیا تھا؟“

اسد نے کہا۔ ”ہاں! میں اور جبار، دونوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ایک وقت کا کھانا ہم تینوں ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھا سکیں۔“

خورشاہ ہنسنے لگا۔ ”خوب! یہی دعوت دینے تو میں نکلا تھا۔“  
اسد نے پوچھا۔ ”کیا تو میرے خیمے میں گیا تھا؟“

خورشاہ نے جواب دیا۔ ”ہاں گیا تھا، وہاں صرف تیری بیوی تھی بس اس سے مل کر چلا آیا۔“

اس کو خورشاہ کی بات گراں تو گزری مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ ان تینوں نے تین وقت کا کھانا ایک ساتھ کھایا۔ ایک وقت کا کھانا خورشاہ کے ساتھ، دوسرے وقت کا اسد کے ساتھ اور تیسرے وقت کا جبار کے ساتھ۔ تینوں دسترخوانوں پر ان تینوں کی بڑی چرلطف باتیں ہوئیں۔

یہاں سے کوچ کیا تو ہفتہ بھر بعد وہ تھیان شیان کے کوہستانی سلسلوں میں داخل ہو گئے۔ یہاں بھی خیموں کا ایک قصبہ آباد ہو گیا۔ تھیان شیان کے مناظر بہت پیارے تھے۔ اسد اور جبار ان مناظر سے لطف اندوز ہونے چلے گئے۔ خورشاہ سیدھا طاہرہ کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ ”تو نے کچھ کیا نہیں؟ میں نے بہشت کی دوبارہ تعمیر کی منصوبہ بندی شروع کر دی ہے۔ کیا تجھ کو اور ذنوبیہ کو اس میں نہ داخل کیا



تو زندہ ہوں۔“

ینگ چھی نے جواب دیا۔ ”کہو، فی الحال زندہ ہوں۔“  
خورشاہ کو قبر کھودنے میں تامل تھا لیکن ینگ چھی اور اس کے دونوں ساتھیوں نے خورشاہ سے قبر کھدوالی۔

ینگ چھی نے خورشاہ کو حکم دیا۔ ”خورشاہ! قبر میں کھڑا ہو جا تا کہ یہ اندازہ ہو جائے کہ وہ تیرے ناپ کی ہے یا نہیں۔“

خورشاہ قبر میں کھڑا ہوا تو اوپر اس کا سر نظر آ رہا تھا۔ ینگ چھی نے خاقان کا فرمان پڑھ کر سنا دیا۔

”خورشاہ کو لانے والوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اب خاقان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی اور جب خاقان کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہتی تو اس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ زمانے کے لیے بیکار ہو چکی ہے۔ خورشاہ کسی کام کا بھی نہیں اس لیے اس کی مشکل آسان کر دی جائے۔“

ینگ چھی نے خورشاہ کو حکم دیا۔ ”بس تو اسی طرح چپ چاپ کھڑا رہ تا کہ ہمیں اپنے کام میں دشواری پیش نہ آئے۔“

ینگ چھی نے شمشیر بردار منگول کو گردن کے اشارے سے حکم دیا کہ خورشاہ کا کام تمام کر دیا جائے۔

شمشیر بردار آگے بڑھا اور خورشاہ کے رونے دھونے اور چیخنے چلانے کی پروا کیے بغیر ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر کے فارغ ہو گیا۔ خورشاہ کا سر اور دھڑ دونوں ہی قبر کے اندر خود بخود گر گئے۔

ینگ چھی نے شمشیر بردار سے کہا۔ ”چلو، یہ اچھا ہوا کہ ہمیں اس کی لاش ٹھکانے نہیں لگانا پڑی۔“

بقیہ دونوں قبروں میں جبار اور اسد کو دفن کر دیا گیا۔ یا کی، طاہرہ اور ذنو بیہ کو بس ایک ہی شخص کا انتظار تھا، خورشاہ کا۔ یہ قافلہ جب راستے ہی سے واپس ہو گیا تو ان تینوں خواتین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے مردوں کی عدم موجودگی میں یہ قافلہ واپس کیوں جا رہا ہے؟

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا انہیں کبھی بھی جواب نہیں مل سکا کیونکہ جن کے پاس اس سوال کا جواب تھا، وہ ہمیشہ خاموش رہے اور خورشاہ اپنے دونوں ساتھیوں سمیت دیار غیر میں، وطن سے دور آسودہ خاک ہو گیا۔۔۔

بے نام و نشان!

منگول ہر کارے نے جواب دیا۔ ”ابھی ابھی جب میں انہیں بلانے گیا تھا، وہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے۔“

ینگ چھی نے نہایت اطمینان سے کہا۔ ”چلو، کوئی بات نہیں۔“

پھر خورشاہ کو خاقان کے فیصلے سے مطلع کر دیا گیا۔ خورشاہ کے چہرے پر خوشی کی لہریں نمودار ہوئیں۔ اس نے کہا۔ ”معزز منگول سردار! اسد اور جبار کی بیوائیں میرے حوالے کی جائیں کیونکہ ان دونوں کے بعد میں ہی ان کا اصل وارث ہوں۔“

ینگ چھی نے جواب دیا۔ ”نہیں، ان دونوں کا اصل وارث میں ہوں کیونکہ جب میں شہر سے چلا تھا تو منگول قلعہ نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب خورشاہ، اسد اور جبار زندہ نہ رہیں تو ان کی خواتین پر میرا حق ہوگا، ان کا وارث میں ٹھہروں گا۔“

خورشاہ نے مردہ سی زبان میں کہا۔ ”لیکن میں تو ابھی زندہ ہوں۔“

ینگ چھی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”بے شک تو تو ابھی زندہ ہے۔“

اس کے بعد اس منگول سردار نے دو طاقتور منگولوں کو اپنے ساتھ لیا، ان دونوں کے ہاتھوں میں گڑھا کھودنے کے آلات تھے۔ از قسم کدال، ایک کدال ینگ چھی نے اپنے ہاتھ میں تمام رکھی تھی۔ ان تینوں کے ساتھ چوتھا ایک شمشیر بردار تھا۔

ینگ چھی انہیں ایک ایسی زمین پر لے گیا جو نسبتاً کچی تھی..... ینگ چھی نے دونوں منگولوں کو حکم دیا ”دو قبریں کھودی جائیں۔“

پھر اس نے اپنے ہاتھ کی کدال خورشاہ کے ہاتھ میں تھام دی اور حکم دیا۔ ”ایک قبر تو بھی کھود لے!“  
خورشاہ نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیسی قبر؟ کس کی قبر؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

ینگ چھی نے جواب دیا۔ ”جناب! آپ کی اپنی قبر کیونکہ جس کو قبر میں دفن ہونا ہے، وہی اپنی قبر بھی کھودے۔“  
خورشاہ نے گھمبائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں

## تاریخ دولت فاطمیہ، رئیس احمد جعفری، تاریخ فاطمین مصر، ڈاکٹر زاہد علی، طبقات ناصری، منہاج سراج، الفخری، محمد علی ابن علی، نظام الملک طوسی، مولوی عبدالرزاق کانپوری، تاریخ اسلام، اکبر شاہ خان



# محبت اور فاصلے

طاہر جاوید معشل

عشقیہ داستان... کسی کی بھی ہو، اگر سچ پر مبنی ہو تو دل پر اثر کرتی ہے۔ اس نے بھی ایک ایسی ہی داستان سنا کر ناممکن کو ممکن کر دکھایا... فقط اس مماثلت پر کہ ایک محبوب کے حصول کی خاطر دونوں کی جدوجہد اور نارنگٹ ایک مگر... نتائج مختلف... لہذا ایک عاشق نے دوسرے کو حسرت و مایوسی کے گڑھے میں گرنے سے بچانے کے لیے اپنی قیمتی متاع بھی قربان کر دی۔

محبت کو پانے کے لیے فاصلوں کو مٹانے والی ایک عظیم

## قربانی کا احوال

کبھی کبھی تو شہزاد کو لگتا تھا کہ وہ ایک میرا تھن دوڑ میں حصہ لے رہا ہے۔ کسی بھی وقت اس کا دم ٹوٹ جائے گا اور وہ پھرا کر گر جائے گا، کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ اس کے پاس وقت بہت کم تھا، شاید زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سال اور اس کم عرصے میں اسے بہت کچھ کرنا تھا۔ وہ ایک کنسٹرکشن کمپنی میں جونیئر اسسٹنٹ مینجر تھا۔ کمپنی کے پاس شاد سہگل صاحب بڑے موڈی آدمی تھے اور نت نئے تجربے کرتے رہتے تھے۔ آج کل ان کے دماغ میں سمایا ہوا تھا کہ پرانا

Downloaded From  
Paksociety.com



”ہاں، میں ہی بجاتا ہوں۔“ سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔

”مجھے..... یہ سب بہت اچھا لگتا ہے۔ یقین کریں میں کئی دفعہ رک کر سنتا ہوں۔ ایک دن آپ ایک پرانا ہندوستانی گیت بجا رہے تھے۔ اک پیار کا نغمہ ہے، موجوں کی روانی ہے.....“

”ہاں، شاید یہ غلطی مجھ سے ہی ہوئی ہوگی۔ اب آپ کیا چاہتے ہیں.....؟“ خشک لہجے میں پوچھا گیا۔

”کچھ بھی نہیں جی، بس تعریف کرنے اور آپ کو دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔“

”چلو، اب یہ دونوں کام ہو چکے۔ اب جائیے یہاں سے۔“

”دراصل میں چاہتا تھا.....“

اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ ”دراصل آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے پچھواڑے پر اتنی زور سے لات ماروں کہ آپ اس سامنے والی دیوار پر جا کر لگیں۔ آپ کو شرم آنی چاہیے جھوٹ بولتے ہوئے۔ میں اتنا بدحوہ نہیں ہوں، جان گیا ہوں کہ تم اس فرم سے آئے ہو جس کے دو تین مشنڈے پہلے بھی میرا دماغ چاٹتے رہے ہیں۔“

شہزاد سنانے میں رہ گیا۔ ہکلا کر بولا۔ ”سس..... سوری سر۔ میں تو بس.....“

”جاتے ہو، یا دوں ایک۔“ وہ شخص چنگھاڑا اور شہزاد کو دھکا دیا۔ وہ ڈھلوان پر کھڑا تھا۔ سنبھلنے کی کوشش میں بجلی کے پول سے ٹکرایا۔ مالک مکان نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔

جانے کیوں، شہزاد کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ دروازے سے تو ہٹ گیا لیکن کچھ دور جا کر ایک نو تعمیر شدہ بلڈنگ میں واقع چائے خانے میں بیٹھ گیا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر اس شخص سے مزید بات کر کے دیکھے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ جو لوگ میوزک میں دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے دل میں کہیں نہ کہیں نرم گوشے ضرور موجود ہوتے ہیں اور یہ ادھیڑ عمر شخص تو شکل صورت سے بھی رومان پسند لگ رہا تھا۔

سہ پہر ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی۔ سردیوں کی مختصر شام جلد ہی رات کی تاریکی میں بدلنے والی تھی اور اندرون شہر کے اس علاقے میں سہ منزلہ اور چہار منزلہ عمارتوں میں جلد ہی روشنیاں جگمگانے والی تھیں۔ شہزاد نے قریبی دکان سے قلم اسکیپ کے چار کاغذ لیے۔ ایک اور چائے کا آرڈر دیا، سگریٹ سلگایا اور وہیں بیٹھ کر اس تند مزاج مالک مکان

لاہور اپنی تمام تر قدیمی خوب صورتی کے ساتھ ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ اندرون شہر کی کلاسیکل عمارتیں گرائی جا رہی ہیں اور ان کی جگہ نئی عمارتیں اور پلازے تعمیر ہو رہے ہیں۔ آج کل سہنگل صاحب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا کہ اندرون شہر کی ایک قدیم گلی کو مسمار ہونے سے بچایا جائے اور آنے والے زمانے کے لیے محفوظ کر لیا جائے۔ اس گلی کے دس بارہ مکان تو وہ خرید چکے تھے۔ گلی کے آخری سرے پر ایک سہ منزلہ مکان ایسا تھا جس کا خطی مالک اسے بچنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ کہنی کے دو تین نمائندے تو کوشش کر چکے تھے لیکن وہ مالک کو رضامند نہیں کر سکے تھے۔ اب شہزاد کا امتحان تھا۔ باس نے اسے بلا کر سرزنش کی تھی اور کہا تھا کہ ایسے اگلے ہوئے کاموں کو وہ بخونی کر لیا کرتا تھا لیکن پچھلے آٹھ دس ماہ سے اس کی کارکردگی بالکل صفر ہو کر رہ گئی ہے۔ لہذا اب وہ جائے اور مالک کو اس ڈیل کے لیے رضامند کرے۔

باس نے مزید تو کچھ نہیں کہا مگر ان کی چپ بھی بے معنی نہیں تھی۔ انہوں نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا تھا کہ وہ ثابت کرے کہ وہ کس مرض کی دوا ہے۔ اگر وہ ناکام ہوا تو اس کی نوکری پر بھی سوالیہ نشان لگ سکتا ہے۔

اپنے اس مشن پر روانہ ہونے سے پہلے شہزاد نے اپنے ان دو ساتھیوں سے معلومات حاصل کیں جو اس سے پہلے مالک مکان کو قائل کرنے میں ناکام رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ بہزاد نامی یہ چالیس پینتالیس سالہ شخص اس گھر میں اکیلا رہتا ہے۔ اسے ستار بجانے کا شوق ہے، کہیں کسی گاؤں میں تھوڑی سی زمین بھی ہے۔ اسی کی آمدن سے اس کی گزر بسر ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ جیتے جی یہ گھر فروخت نہیں کرے گا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت شہزاد ایک تنگ گلی میں مطلوبہ مکان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا۔ لمبے بالوں، اونچی ناک اور چہرے کے جسم والا مالک مکان اس کے سامنے آیا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ اس نے ایک لمبا کوٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں چپل تھی۔

شہزاد نے پہلے سے سوچے ہوئے پلان کے مطابق کہا۔ ”سوری جناب! میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا.....“

دراصل..... میں روز ہی یہاں سے گزرتا ہوں۔ گھر کے اندر سے ستار بجنے کی آواز آتی ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ یہ ستار آپ بجاتے ہیں۔“

شہزاد نے پہلے سے سوچے ہوئے پلان کے مطابق کہا۔ ”سوری جناب! میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا.....“

دراصل..... میں روز ہی یہاں سے گزرتا ہوں۔ گھر کے اندر سے ستار بجنے کی آواز آتی ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ یہ ستار آپ بجاتے ہیں۔“

شہزاد نے پہلے سے سوچے ہوئے پلان کے مطابق کہا۔ ”سوری جناب! میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا.....“

دراصل..... میں روز ہی یہاں سے گزرتا ہوں۔ گھر کے اندر سے ستار بجنے کی آواز آتی ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ یہ ستار آپ بجاتے ہیں۔“

شہزاد نے پہلے سے سوچے ہوئے پلان کے مطابق کہا۔ ”سوری جناب! میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا.....“

دراصل..... میں روز ہی یہاں سے گزرتا ہوں۔ گھر کے اندر سے ستار بجنے کی آواز آتی ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ یہ ستار آپ بجاتے ہیں۔“

شہزاد نے پہلے سے سوچے ہوئے پلان کے مطابق کہا۔ ”سوری جناب! میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا.....“



کے نام ایک تحریر لکھنے لگا، اس نے لکھا۔

ہے جناب..... میں آپ سے التجا کرتا ہوں اگر آپ تھوڑا سا بھی دردمند دل رکھتے ہیں تو میری حالت پر رحم فرمائیے۔“  
آخر میں شہزاد نے اس ڈیل کا ذکر کیا تھا جو وہ مالک مکان سے کرنا چاہتا تھا۔ اس نے وہ تمام نکلتے بیان کیے جو مالک مکان کے فائدے کو ظاہر کرتے تھے۔ کمپنی مارکیٹ ریٹ سے قریباً 20 فیصد زیادہ دے رہی تھی۔ یہ تین مرلے کا گھر تھا۔ موقع کے لحاظ سے اس کی قیمت تقریباً تیس لاکھ بنتی تھی، مالک مکان کو چھتیس لاکھ تک کی آفر کی جا چکی تھی۔ یہ مفصل خط شہزاد نے عجیب جذباتی کیفیت میں لکھا تھا۔ خط مکمل کر کے اس نے لفافے میں ڈالا اور اس لیٹر باکس میں ڈال دیا جو مطلوبہ گھر کے مین دروازے پر موجود تھا۔

☆☆☆

تین دن تک شہزاد نے بڑی شدت سے جواب کا انتظار کیا۔ اس نے اپنا ایڈریس اور سیل فون نمبر، دونوں خط میں لکھ دیے تھے۔ چوتھے دن وہ مایوس ہو گیا لیکن جب وہ مایوس ہوا اسی روز شام کو اس کے سیل فون پر وہ کال آگئی جس کا اسے انتظار تھا۔ مالک مکان بہزاد قدسی صاحب نے اسے اپنے گھر پر بلا یا تھا۔

اس نے نہادھو کر بہترین کپڑے پہنے اور موٹر سائیکل پر سوار ہو کر اندرون شہر کی تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا بہزاد صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا کیونکہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس سکی شخص کا رویہ کیا ہوگا تاہم اس کے خدشات غلط نکلے۔ اسے مسٹر بہزاد نسبتاً اچھے موڈ میں ہی دکھائی دیے۔ اپنے حال میں گمن رہنے والے آرٹسٹوں کی طرح ان کے بال چہرے پر بکھرے تھے اور وہ مسلسل سگریٹ پھونک رہے تھے۔ ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے، ان کے بیڈروم کا منظر خشکی اور بے سرو سامانی کا عجیب نمونہ پیش کرتا تھا۔ فرش پر گدا بچھا ہوا تھا جس کے اسپرنگ فوم کے اندر سے جھانک رہے تھے۔ ایک دقیانوسی ٹیپ ریکارڈر کے قریب درجنوں آڈیو کیسٹ رکھے تھے۔ ایک طرف بے کواڑ کی الماری میں گرد آلود کتابیں اور رسالے وغیرہ تھے۔ اگر کوئی چیز قدرے صاف ستھری نظر آتی تھی تو وہ وہی ان کا محبوب ستار تھا۔ اس کی پالش چمکیلی اور تار تار تھے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک چمکی گدی رکھی تھی جس پر بیٹھ کر وہ ستار نوازی کرتے تھے۔ ستار کے قریب ہی وہ ”جذباتی خط“ کھلا پڑا تھا جو چار روز پہلے شہزاد نے اس گھر کے مالک کے نام یعنی بہزاد صاحب کے نام لکھا تھا۔

”محترم! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے یہ لگتا ہے کہ کبھی آپ نے بھی کسی سے پیار کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اپنی روداد بیان کرنے کا حوصلہ مل رہا ہے۔ میں ایک بڑی مشکل میں ہوں محترم! میں لاہور کے نواح میں ایک چھوٹے قصبے کا موٹو کار بننے والا ہوں۔ میں نے گریجویشن کیا ہوا ہے اور کچھ ڈپلوماز بھی لے رکھے ہیں لیکن یہ سب کچھ میری اس ضرورت کو پورا نہیں کرنے میں اس کو پورا کرنے کے لیے میرے پاس ایک محدود وقت ہے..... میری دن رات کی کوشش بھی مجھے اپنی منزل کے قریب نہیں پہنچا پارہی۔ دراصل میں نے ایک لڑکی سے پیار کیا اور اتنی شدت سے کیا کہ اس کے سوا میرے لیے اس دنیا میں کچھ باقی نہیں رہ گیا۔ میں دنیا میں اکیلا ہوں، والدین بہن بھائی کوئی نہیں۔ کسی وقت تو مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ لڑکی ہی میری کل کائنات ہے اور اگر اسے حاصل نہ کر سکا تو پھر میرے لیے زندہ رہنا یا مرنا ایک برابر ہو جائے گا۔ وہ بھی مجھے بے انتہا چاہتی ہے۔ ہمارے راستے کی اصل رکاوٹ لڑکی کے والد محترم ہیں۔ وہ ایک دنیا دار شخص ہیں۔ ان کی مالی حیثیت مجھ سے بہت بہتر ہے۔ انہوں نے شرط رکھی ہے کہ اگر میں ان کی بیٹی شاپینہ کو حاصل کرنا چاہتا ہوں تو میرے پاس کم از کم دس مرلے کا ایک گھر اچھے علاقے میں ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ ذاتی کار اور پچاس لاکھ کے لگ بھگ حق مہر کے لیے۔ اس کے لیے انہوں نے مجھے تین سال کا وقت دیا تھا۔ میں پچھلے ڈیڑھ برس سے لاہور میں ہوں اور ہر طرح سے جان مار رہا ہوں۔ دو جگہوں پر جا ب کر رہا ہوں اور رات ایک بجے تک جاگتا ہوں۔ مجھے تم ویش ڈیڑھ کروڑ روپيا اکٹھا کرنا ہے مگر آدھا وقت گزر چکا ہے اور میں 20 فیصد بھی جمع نہیں کر سکا..... اور آج کل تو یوں لگ رہا ہے محترم کہ میں پوری طرح لڑے بغیر ہی یہ لڑائی ہارنے والا ہوں۔ مجھے سہل صاحب والی نوکری کے لالے پڑ رہے ہیں ان کے لیے پر چیزنگ کا کام کرتا ہوں۔ پاس مجھ سے بہت خفا ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر میں آپ کو مکان کی فروخت پر قائل نہ کر سکا تو شاید میری چھٹی ہو جائے اور میرے پاس صرف پارٹ ٹائم جا ب ہی رہ جائے گی۔ یہ میرے لیے ایک ایسا ”سیٹ بیک“ ہوگا جس کے بعد میں شاید سنبھل ہی نہ سکوں۔“

”میرے سنے مجھ سے چمن رہے ہیں جناب! میری سہیلی مجھ سے دور جا رہی ہے۔ مجھے سہارے کی ضرورت



بہزاد قدسی صاحب کی آنکھیں سو جتی سو جتی اور سرخ تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ پچھلی ایک دوراتوں سے نیند پوری نہیں کر پائے اور شدید قسم کی کشمکش کا شکار رہے ہیں۔ ٹیپ ریکارڈر پر دھیمی آواز میں میوزک پلے ہو رہا تھا۔ یقیناً یہ خود بہزاد صاحب کا بجایا ہوا ستار ہی تھا۔ ایک پرانا گیت گونج رہا تھا۔ تیری الفت میں ضم، ہم نے بہت درد ہے..... پر ہم چپ ہی رہے۔

بہزاد صاحب نے میوزک کا ولیم کچھ اور کم کر دیا اور سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولے۔ ”میں نے تمہارا خط دو تین بار پڑھا ہے۔ کہتے ہیں کہ جو بات دل سے نکلتی ہے وہ اثر رکھتی ہے، تمہاری بات میں بھی اثر ہے۔“

جانے کیوں شہزاد کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ وہ بولا۔ ”مجھے ایسی ہی امید تھی، بہت شکریہ.....“

وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ سگریٹ کا دھواں ان کے ارد گرد چکراتا رہا۔ ستار کی آواز گونجتی رہی۔ عجیب افسانوی سا ماحول بنا ہوا تھا۔ اچانک انہوں نے پوچھا۔ ”اب وہ لڑکی شاہینہ کہاں ہے؟“

”اپنے والدین کے گھر..... اس کی سگائی کی بات چل رہی ہے مگر اس کے والد نے چونکہ مجھ سے مہلت کا وعدہ کیا ہوا ہے اور والدہ بھی اس مہلت کے حق میں ہیں، اس لیے ابھی یہ بات کسی نتیجے پر نہیں پہنچی۔“

”یہ سلسلہ..... میرا مطلب ہے تمہارا اور شاہینہ والا معاملہ کب شروع ہوا؟“

شہزاد نے خط میں کافی کچھ لکھ دیا تھا۔ پھر بھی اس نے ساری تفصیل سے بہزاد صاحب کو آگاہ کیا۔ اس میں کوئی بات بھی جھوٹ نہیں تھی۔ اس نے جیسے اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔

ان کے سامنے چائے کی پیالیاں پڑی تھیں۔ یہ چائے پڑوس سے آئی تھی۔ پڑوس کے لوگوں سے بہزاد صاحب کے تعلقات اچھے تھے۔ ان کا کھانا وہیں سے آتا تھا..... کپڑے وغیرہ بھی وہیں سے دھلتے تھے، البتہ اس کے لیے وہ ماہانہ مقبول رقم دیتے تھے۔

بات کرتے کرتے بہزاد صاحب گہری سوچ میں چلے جاتے تھے۔ جیسے ارد گرد کو بالکل بھول ہی جاتے ہوں۔ ایک ایسے ہی طویل وقفے کے بعد انہوں نے شہزاد کی آنکھوں میں دیکھا اور بولے۔ ”میں تمہیں یہ مکان بیچنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس کی ایک شرط ہے۔“

”جی فرمائیے۔“ شہزاد نے اپنی بے ترتیب

دھڑکنوں کو یہ مشکل سنھالتے ہوئے کہا۔

”بلکہ یہ دو شرطیں ہیں۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ میں یہ مکان کسی فلانی ڈھمکانی کمپنی کو نہیں، تمہیں بیچوں گا۔ دوسری شرط یہ کہ تم اس مکان کو سنبھال کر رکھنے کے لیے نہیں خریدو گے بلکہ گرانے کے لیے خریدو گے۔“

”مم..... میں سمجھا نہیں جناب۔ میرا مطلب ہے آپ کی دوسری شرط.....“

”پہلی شرط تمہارے فائدے کی ہے اور دوسری بھی تمہارے ہی فائدے کی ہے۔ اس مکان کو اس حالت میں سنبھال کر رکھنے سے تمہیں وہ فائدہ نہیں مل سکتا جو اس کو گرانے سے مل سکتا ہے۔“

”میں معذرت چاہتا ہوں جناب! مگر میں آپ کی بات سمجھ نہیں پا رہا۔ گرانے سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”وہی مراد جو سب کی ہے۔ لوگ ان پرانے گھروں کو گرا کر نئے گھر بنا رہے ہیں۔ تم بھی ایسا ہی کر سکتے ہو۔“

”میں پھر معافی چاہتا ہوں۔ ایسا کیوں ضروری ہے جناب؟“

”زیادہ سوچ بچار کرو گے تو پھر یہ سودا تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا اور اس کے ساتھ ہی شاید.....“

انہوں نے فقرہ مکمل نہیں کیا لیکن ان کی بات سمجھ میں آرہی تھی۔ یقیناً وہ افسردہ انداز میں یہی کہہ رہے تھے کہ اس مکان کے ساتھ شاید شاہینہ بھی تمہارے ہاتھ سے نکل جائے۔

شہزاد کو اندازہ ہوا کہ سکی مزاج کے بہزاد صاحب سے زیادہ بحث کرنا درست نہیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ کسی بات پر ناراض ہو کر اچانک اپنا ارادہ بدل دیتے اور وہی لب و لہجہ اختیار کر لیتے جو انہوں نے پچھلی ملاقات میں کیا تھا۔ اس نے

ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں خود یہ مکان خریدتا ہوں تو اس کے لیے مجھے آپ کو کیا ادا کرنا ہوگا؟“

”وہی مارکیٹ ریٹ۔ 30 لاکھ کے لگ بھگ.....“

اور جو کچھ میں سمجھا ہوں، تم اتنی رقم تو آسانی سے دے ہی سکتے ہو۔“

وہ واقعی سکی تھے۔ 36 کی آفر ٹھکرا کر 30 پر آمادہ ہو رہے تھے۔ شہزاد نے کہا۔ ”آپ یقیناً میرے لیے کچھ اچھا ہی سوچ رہے ہوں گے۔ آپ کی آفر قبول کر کے مجھے خوشی ہوگی لیکن درمیان میں کمپنی کا مسئلہ ضرور آئے گا۔ وہ لوگ کہیں گے کہ میں ان کے لیے پر چیزنگ کرنے گیا اور اپنے لیے سودا کر کے آ گیا۔“

”تو پھر؟“ بہزاد صاحب نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

”نن..... نہیں..... کوئی ایسی بات تو نہیں۔ میں اس کا



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✧ ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



کہ ایک بندہ تمہارے پاس آئے۔ وہ تمہیں تمہارے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا۔ بہت زیادہ امکان ہے کہ وہ تم سے یہ گھر خریدنا چاہے لیکن تم نے صاف انکار کرنا ہے۔ وہ قیمت بڑھائے گا۔ ممکن ہے کہ تمہاری خرید سے کوئی یا کئی قیمت بھی دے لیکن تم نے لالچ میں نہیں آنا۔ وہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہر قیمت پر یہ مکان خریدنا چاہے گا۔ اس بندے سے ایک ڈیڑھ کروڑ تک وصول کر لینا تمہارے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ یہ سب کچھ ایسا ہی ہو جیسا میں نے سوچا

حل نکال لوں گا۔ میرے ایک دو بہت بااعتماد دوست ہیں۔ میں ان میں سے کسی ایک کے نام پر رجسٹری کرا لوں گا اور ساتھ ہی مختار نامہ یا دستبرداری وغیرہ لکھوا لوں گا۔ انہوں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ”جو کچھ بھی ہے، یہ تمہارے مسائل ہیں۔ ہاں، میں اتنا یقین تمہیں ضرور دلاتا ہوں، یہ مکان تمہیں تمہاری توقع سے کہیں زیادہ فائدہ دے گا۔ ہو سکتا ہے کہ پانچ چھ گنا تک۔“

شہزاد، بہنراد صاحب سے کئی سوال پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کسی بھی سوال پر ہتھے سے اکھڑ سکتے ہیں اور بنی بنائی بات بگڑ سکتی ہے۔ اسی لیے اس نے کہا۔ ”آپ میرے بزرگوں کی طرح ہیں، آپ جو کہہ رہے ہیں مجھے منظور ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔ تم کاغذ تیار کروالو، ہیمنٹ کا انتظام بھی کرو۔ ہم اگلے جمعے کو ملیں گے۔ اس وقت میں تمہیں ایک دو اور ضروری باتیں بھی بتاؤں گا۔“

رات نو بجے کے قریب شہزاد اس ناقابل فہم شخص سے رخصت ہو کر اپنے گھر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

تقریباً سب کچھ بخیر و خوبی انجام پا گیا تھا۔ جمعے کے روز کاغذات پر بہنراد صاحب کے سائن انگوٹھے ہو گئے اور شہزاد نے 30 لاکھ روپے کا پے آرڈر ان کے حوالے کر دیا۔ بہنراد صاحب نے اداس لہجے میں کہا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر مکان خالی کر دیں گے۔ شہزاد کو معلوم تھا کہ انہوں نے کوئٹہ شفٹ ہونے کا پروگرام بنایا ہے اور وہاں کسی فلیٹ کا بیع نامہ بھی دے دیا ہے۔ وہ جو کچھ کر رہے تھے اپنی مرضی و منشا سے کر رہے تھے اور اپنے معاملے میں وہ کسی کا مشورہ قبول کرنے والے شخص ہرگز نہیں تھے۔

پانچ دن بعد جب وہ لاہور سے رخصت ہو رہے تھے، ان کی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ وہ درود یوار کو حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا انداز دیکھ کر شہزاد کا دل کٹ سا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ بہنراد صاحب اور اس مکان کے پیچھے کوئی کہانی ہے لیکن اس کہانی کے بارے میں کوئی سوال کرنے کی جرأت شہزاد کو ہرگز نہیں تھی۔ شاید کسی کو بھی نہیں تھی۔ بہنراد صاحب کا حلقہ احباب بہت محدود تھا۔ اکثر پرانے لوگ تو یہ محلہ چھوڑ کر ہی جا چکے تھے، جو چند ایک موجود تھے وہ بھی ان کے بارے میں کسی اچھی یا بری رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔

جاتے وقت بہنراد صاحب نے شہزاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”جب تم اس گھر کو گرا نا شروع کرو گے تو ہو سکتا ہے

## قارئین متوجہ ہوں

# پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

**شمارے عباس** 0301-2454188

جاسوس ڈائجسٹ بکس کیشز

سپینس جاسوسی پاکیزہ، سرگزشت

C-63 فیڈل ایکسپینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی ہن کنگی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com



ہے۔ اور تم اپنی مراد پانے میں کامیاب ہو جاؤ۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے بہنراد صاحب کی آواز تم ناک اور بوجھل سی ہو گئی تھی، ہاتھوں کی پکیپا ہٹ بڑھ گئی تھی اور آنکھوں میں گہری اداسی کی دھند نظر آتی تھی۔ شہزاد حیران تھا۔

کمپنی والوں کو پتا نہیں چل سکا کہ یہ مکان شہزاد نے خریدا ہے۔ باس کو یہی معلوم ہوا کہ شہزاد اس ”پرچیزنگ“ میں ناکام رہا ہے۔ وہ اس سے ناراض تھے۔ اس کی ترقی کا امکان ختم ہو گیا تھا اور خدشہ تھا کہ تنخواہ میں بھی بے قاعدگی آنے والی ہے۔ بہر حال پتا نہیں کیوں وہ زیادہ پریشان نہیں تھا۔ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ بہنراد صاحب کے کہنے پر اس نے جو کچھ کیا، اس کا کچھ نہ کچھ پھل اس کو ضرور ملے گا۔

مالک مکان بننے کے بعد اس نے اڑوس پڑوس والوں سے بہنراد صاحب کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ فقط اتنا پتا چل سکا کہ بہنراد صاحب کے والدین کوئی پندرہ سال پہلے وفات پا چکے تھے۔ بہنراد صاحب سے بڑا ایک بھائی انگلینڈ میں مقیم تھا اور اپنے بال بچوں سمیت وہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ بہنراد صاحب کے حصے میں اندرون شہر کا یہ مکان آیا تھا اور وہ اس پر مطمئن تھے۔ بہنراد صاحب کو کالج کے زمانے سے ستار کا شوق پیدا ہوا۔ اس فن میں انہوں نے کافی نام کمایا اور ایوارڈ وغیرہ بھی حاصل کیے۔ جوانی میں ہی انہوں نے کافی شہرت انجوائے کی۔ اسی دوران میں انہیں کسی سے پیار بھی ہوا جو ناکامی پر ختم ہو گیا۔ اس وقت تک والدین زندہ تھے۔ انہوں نے مجبور کر کے ان کی شادی کر دی۔ بہنراد آرٹسک مزاج رکھتے تھے۔ بیوی بالکل اور طرح کی تھی۔ نباہ نہ ہو سکا۔ شادی کے صرف دو سال بعد ہی طلاق ہو گئی۔ بچہ وغیرہ کوئی نہیں تھا۔ بہنراد صاحب تنہائی کی زد میں آئے۔ والدین کیے بعد دیگرے دنیا سے گئے تو اس گھر میں صرف بہنراد اور ان کا ستار ہی رہ گئے۔ وہ دھیرے دھیرے سوشل لائف سے بالکل کٹ گئے۔ لوگ ان کے پرستار تھے۔ محفلوں میں ان سے سنا چاہتے تھے۔ کبھی کبھی ریڈیو اور ٹی وی سے بھی آفر آتی تھی لیکن وہ صرف اپنے لیے بجاتے اور خود ہی سنتے تھے۔

شہزاد اپنی جمع پونجی اس کھنڈر مکان کی خرید پر صرف کر چکا تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ اس کا کیا کرے گا۔ یہ بات تو کچھ افسانوی سی ہی لگتی تھی کہ جب وہ اس مکان کو گرانا شروع کرے گا تو کوئی بندہ یہاں پہنچے گا اور اسے روکنے کے لیے اور مکان خریدنے کے لیے منہ مانگے دام دے گا۔ اگر کوئی ایسی بات تھی تو پھر بہنراد صاحب نے خود یہ کام کیوں نہ

کر لیا؟ ایک دن فقط تجربے کے طور پر اس نے دو مزدور لگائے اور اس سے منزلہ مکان کی چھت پر واقع مٹی کو گرانا شروع کیا۔ مٹی دو دن میں گر گئی۔ چھت پر چاروں طرف ملبا بکھر گیا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا جیسا بہنراد قدسی نے بتایا تھا۔ شہزاد نے ایک ہفتے تک سوچ بچار کی پھر اس کے دماغ نے مشورہ دیا کہ وہ اس ایڈ وچر میں پڑھ کر کہیں خود کو خواری نہ کر لے یہ جگہ اس لائق ہرگز نہیں تھی کہ اسے مسمار کر کے یہاں کوئی پلازا وغیرہ بنایا جاتا۔ تین ساڑھے تین مرلے میں اور اس تنگ گلی میں بھلا کیا بن سکتا تھا۔ بہت ہوتا تو سات آٹھ لاکھ کا فائدہ ہو جاتا اور وہ بھی سخت بھاگ دوڑ اور انویسٹمنٹ کے بعد۔ یہ انویسٹمنٹ کہاں سے آتی؟ اور تعمیر کون کرواتا؟ اس طرح کے کئی سوالات تھے۔ آخر اس نے سوچا کہ خود پس پردہ رہتے ہوئے یہ گھر باس کو ہی فروخت کر دیا جائے مگر جب اس نے ٹوہ لگائی تو اسے پتا چلا کہ باس نے اس سلسلے میں جو بجٹ بنایا تھا، وہ ختم ہو چکا ہے اور اس نے جو آٹھ دس مکان خرید رکھے ہیں وہ انہی پر اکتفا کرنا چاہ رہا ہے۔ ویسے بھی وہ انگلینڈ روانہ ہو رہا تھا اور اپنے سیریس کام یعنی کنسٹرکشن کے سلسلے میں اسے چار پانچ ماہ وہیں پر قیام کرنا تھا۔

ایک بار پھر شہزاد کا ذہن بہنراد صاحب والی بات کی طرف منتقل ہونے لگا۔ اس کے دماغ میں ایک اور بات بھی آئی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ کبھی کبھی پرانے مکانوں کے گرانے والوں کو کوئی غیر متوقع فائدہ بھی ہو جایا کرتا ہے۔ چھت میں سے کوئی نہایت قیمتی لکڑی نکل آتی ہے۔ کہیں دبایا ہوا روپیا یا زیور وغیرہ مل جاتا ہے۔ کہیں بہنراد صاحب کی مراد کوئی ایسا ہی فائدہ تو نہیں تھا؟

آخر ایک روز اس نے پھر مزدور لگا کے اور تیسری منزل کے ایک ایسے جھرو کے کوگرانے کا ارادہ کیا جس کے گرانے سے باقی عمارت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا۔ مکان میں سامنے کی طرف ایسے ہی تین جھرو کے اور تھے۔ قدیم طرز تعمیر کے مطابق ان میں سامنے کی طرف لکڑی کی منقش محرابیں تھیں۔ جھرو کے کے زیریں حصے میں سرخ پتھر کی حفاظتی جالی تھی۔ ایسے ہی جھرو کے اور بالکونیاں نیچے والی دو منزلوں میں بھی تھیں۔ مکان کی دیواریں موٹی اور لکڑی کی چھتیں قریباً سولہ فٹ بلند تھیں۔ بل کھاتی ہوئی تاریک سیڑھیاں نیچے سے اوپر تک آتی تھیں۔ ان سیڑھوں میں روشنی اور ہوا کے لیے چھوٹے چھوٹے روزن تھے۔ کبھی کبھی شہزاد کو محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کی ہر شے میں



ایک طرح کی اداسی اور موسیقیت رہی ہوئی ہے۔ وہ اداسی اور موسیقیت جس کا تعلق بہزاد صاحب سے تھا، جنہوں نے پہلے اپنے خاندان کے ساتھ اور پھر تنہا قریباً چالیس پینتالیس برس اس گھر میں گزارے تھے۔

شہزاد نے جبر و کاروانے کا کام بڑی احتیاط سے شروع کر دیا۔ گنجان علاقوں میں تعمیر اور مسامری کا کام کافی مشکل اور احتیاط طلب ہوتا ہے۔ یہ دوسرے روز دوپہر کی بات ہے۔ شہزاد دفتر میں تھا۔ اسے میل فون پر ایک کال آئی۔ یہ کال اسی مستری کی طرف سے تھی جو ایک مزدور کے ساتھ گھر میں جبر و کاروانے کا کام کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”سرجی! ایک صاحب آئے ہیں۔ انہوں نے کام رکوا دیا ہے۔ کہا ہے کہ مالک کو بلاؤ.....“

ایک دم شہزاد کے سینے میں جیسے نقارہ سانج اٹھا۔ شہزاد نے پوچھا۔ ”کون ہے؟ کسی جگہ کا بندہ ہے؟“ ”نہیں جی۔ جگہ کا تو نہیں لگتا۔ بڑی عمر کا ہے۔ چھوٹی چھوٹی سفید ڈاڑھی ہے۔ ساتھ میں ایک دوسرا بندہ بھی ہے، شاید گاڑی کا ڈرائیور ہے۔“

”ٹھیک ہے، تم ان کو روکو بلکہ کمرے میں بٹھاؤ۔ میں پندرہ بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“

شہزاد نے موٹر سائیکل پکڑی اور دھڑکتے دل کے ساتھ حتی الامکان تیزی سے موقع پر پہنچ گیا۔ نیم سفید ڈاڑھی والے شخص کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے کلف لگی سفید شلوار نہیں پہن رکھی تھی مگر وہ کچھ زیادہ رعب داب والا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا، ہاں آنکھوں میں ذہانت کی گہری چمک تھی۔ ساتھ ہی ڈرائیور ٹائپ شخص تھا۔ سلام دعا کے بعد نیم سفید ڈاڑھی والے نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام فضل احمد ہے۔ تین گلیاں چھوڑ کر چوک میں جو پیلے رنگ کی حویلی ہے، میں وہاں رہتا ہوں۔“

”جسے چٹی حویلی کہتے ہیں؟“ شہزاد نے تصدیق چاہی۔ ”ہاں، پہلے وہ چٹی حویلی ہی کہلاتی تھی۔ اب رنگ بدل چکا ہے مگر نام وہی ہے۔“ فضل احمد نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”مجھے ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ بہزاد یہ مکان آپ کو بیچ کر چلا گیا ہے اور آپ اسے گرا کر یہاں نئی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔“

”جی ہاں۔ کچھ ایسا ہی ارادہ ہے۔“ شہزاد نے جواب دیا۔

فضل احمد نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ باہر چلا

گیا۔ مستری بھی پاس ہی کھڑا اس گفتگو کو دلچسپی سے سن رہا تھا، شہزاد کے اشارے پر وہ بھی باہر نکل گیا۔

سفید ڈاڑھی والے فضل احمد نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”شہزاد صاحب! اب تم اس جگہ کے مالک ہو، جو چاہو کر سکتے ہو لیکن میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ اس مکان کو جیسے کا تیسرا رتنے دو۔ میرا نہیں خیال کہ آپ اسے گرا کر اور نئی تعمیر کر کے کچھ زیادہ فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ یہ جگہ پلازے والی تو ہے نہیں۔ ایک بے ڈھنگی سی رہائشی عمارت ہی بنے گی۔“

”آپ کے مشورے کا شکریہ۔“ شہزاد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”لیکن آپ اس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟“

فضل احمد نے پھر تھوڑا سا توقف کیا اور گہری سانس لے کر بولا۔ ”دراصل..... اس گھر سے کسی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں اور وہ یہی چاہتا ہے کہ یہ مکان ایسے ہی رہے۔“

”کون ہے وہ شخص؟“ شہزاد نے پوچھا۔ ”سمجھیں کہ میرا مالک ہے۔ میں اس کی ملازمت کرتا ہوں۔ اسی کے کہنے پر میں یہاں آیا ہوں۔“

”آپ کی باتیں کچھ ابھی ہوئی ہیں..... میں سمجھ نہیں پارہا..... ویسے آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ مکان گرایا جا رہا ہے؟“

”میں نے نہیں بتایا ہے نا کہ میں جس چٹی حویلی میں رہتا ہوں اس حویلی کی دوسری منزل سے مجھے تمہارا یہ گھر نظر آتا ہے۔ چند دن پہلے بھی شاید تم نے تھوڑی بہت توڑ پھوڑ کی تھی..... لیکن اس وقت مجھے پتا نہیں چلا۔ اب جب تم نے دوبارہ کام شروع کرایا تو میں نے دیکھ لیا۔“

”تو آپ کے مالک نے آپ کو بھیجا کہ آپ یہ کام رکوائیں؟“ شہزاد نے قدرے روکھے انداز میں کہا۔ ”ایسا ہی سمجھ لو۔“

”آپ کی منطق کچھ سمجھ میں نہیں آرہی۔ آپ کے مالک کو اس مکان میں اتنی دلچسپی کیوں ہے اور کیا اس دلچسپی کی وجہ سے میں آپ کی مرضی کے مطابق چلنا شروع کر دوں؟“

”نہیں..... نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔ نہ اس میں کسی طرح کی زبردستی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر بندے کو اپنا مالی فائدہ سوچنے کا حق ہوتا ہے لیکن اس سلسلے میں، میں ایک چھوٹی سی درخواست کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی فرمائیں۔“ شہزاد کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ”تم یہ مکان فروخت کر دو۔ تم بغیر تعمیر کے ہی اپنی



توقع سے زیادہ فائدہ حاصل کر لو گے۔“

وہی کچھ ہو رہا تھا جس کا ذکر بہنراد صاحب نے کیا تھا۔ بہنراد صاحب کی کہی ہوئی ساری باتیں شہزاد کو یاد آنے لگیں۔ اس نے فضل احمد کو تکبھی نظروں سے دیکھا اور شہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”چلیں، آپ بتائیں..... آپ کیا دے سکتے ہیں اس گھر کا؟“

فضل احمد نے ایک طائرانہ سی نگاہ درو دیوار پر ڈال کر کہا۔ ”مارکیٹ ریٹ کے مطابق اس کی قیمت تیس بیس سے اوپر ہرگز نہیں لیکن اگر تم اپنا ذہن بنا لو، تو میں تمہیں اس کا چالیس لاکھ تک دلوں سکتا ہوں۔“

شہزاد کی دھڑکن بڑھ گئی۔ اس نے یہ تیس لاکھ میں خریدا تھا۔ قریباً ایک لاکھ کاغذات وغیرہ پر لگا تھا۔ دو تین ہفتوں بعد نو دس لاکھ کا منافع بہت بڑی بات تھی مگر پھر اسے فوراً بہنراد صاحب کی گفتگو یاد آئی۔ اس نے روکھے لہجے میں کہا۔ ”فضل، صاحب! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں لیکن فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں یہاں کچھ بنانا چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے چار چھ سال میں یہ جگہ سی کمرشل بن جائے گی۔“

”اس گلی میں سی کمرشل؟“ فضل احمد نے استہزائیہ انداز میں سر ہلایا۔ ”تمہاری کم از کم یہ بات تو ماننے والی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے، آپ جو بھی سمجھیں لیکن میں ابھی اس جگہ کو بیچنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ آئی ایم سوری۔“ شہزاد کا لہجہ خستہ ہو گیا۔

چائے آگئی تھی۔ دونوں نے بوجھل سے ماحول میں چائے کے کپ ختم کیے اور پھر یہ ملاقات ٹیلی فون نمبرز کے تبادلے کے ساتھ ختم ہو گئی۔

شہزاد نے یہ پُرکشش آفر ٹھکرا دی تھی لیکن اسے امید تھی کہ جلد ہی دوبارہ آفر آئے گی اور واقعی یہی ہوا۔ اگلے ہی روز شام کو شہزاد اور فضل احمد میں پھر گفتگو ہوئی۔ فضل احمد نے کال کر کے شہزاد کو بتایا کہ وہ لوگ اس گھر کے لیے اسے پورے پچاس لاکھ روپے دینے کو تیار ہیں۔ شہزاد نے دل پر جبر کر کے یہ آفر بھی بے رخی سے ٹھکرا دی۔ بہر حال بارش اور خراب موسم کی آڑ لے کر اس نے جھروکے کو سمار کرنے کا کام وقتی طور پر روک دیا تھا۔

اب اس سلسلے میں اس کی دلچسپی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ فضل احمد کون تھا؟ وہ اپنے کس مالک کے لیے یہ گھر خریدنا چاہ رہا تھا اور اس مالک کو اس گھر سے ایسی کیا گہری

دلچسپی تھی؟ اس نے اپنے طور پر کھوج لگایا۔ ایک ہیئر ڈریسر آفتاب عرف آفتابی سے اسے ”چٹی حویلی“ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ اسے پتا چلا کہ یہ حویلی انگریزوں کے دور سے کسی سٹیٹس فیملی کے استعمال میں ہے۔ آفتابی نے کہا۔ ”شاید آپ نے ٹی وی کی مشہور اداکارہ سلیمہ عیسیٰ کا نام سنا ہو۔ وہ آج کل بھی ڈراموں میں درمیانی عمر کے پارٹ کرتی ہیں۔“

شہزاد کی آنکھوں کے سامنے نہایت دلکش نقوش والی پُروقا ر خاتون کا چہرہ گھوم گیا۔ اس نے کہا۔ ”ہاں..... سلیمہ عیسیٰ کو دیکھا ہوا ہے۔ کیا وہ بھی اس حویلی میں رہتی ہیں؟“

”اب نہیں رہتیں جی، دس پندرہ سال پہلے رہا کرتی تھیں۔ آج کل تو ڈیفنس میں ان کی بڑی شاندار کوشی ہے۔“

”اب حویلی میں کون رہتا ہے؟“

”خستہ حال حویلی ہے جی۔ سلیمہ صاحبہ کا ایک پرانا ملازم ہی اپنی فیملی کے ساتھ وہاں رہ رہا ہے۔ فضل احمد نام ہے۔ اچھا بندہ ہے ویسے۔ میل جول والا ہے۔“

شہزاد کو اب اس معاملے کی کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی۔ فضل احمد کی مالکن ایک نہایت دلکش اور امیر خاتون تھی.....

اور شاید یہی خاتون تھی جو اس مکان کو بکنے سے روکنا چاہتی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ماضی میں اس حسین ٹی وی آرٹسٹ اور ستارہ نواز بہنراد صاحب میں کوئی گہرا تعلق رہا ہے۔ اس تعلق نے کچھ ایسی یادوں کو جنم دیا ہے، جو ایک مدت گزرنے کے باوجود بکھری نہیں تھیں، اپنا وجود رکھتی تھیں۔

شہزاد نے باتوں باتوں میں ہیئر ڈریسر آفتابی سے بہنراد صاحب کے بارے میں بھی پوچھنے کی کوشش کی۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا تھا جو شہزاد کو پہلے سے معلوم ہو چکا تھا۔ اب شہزاد بے چینی سے فضل احمد سے اگلی ملاقات..... اور اگلی آفر کا انتظار کرنے لگا۔ حسب توقع اس ملاقات میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

وہ ایک ابر آلود شام تھی۔ قریب کی کشادہ گلی میں گاڑی رکنے کی آواز آئی اور پھر فضل احمد نمودار ہوا۔ شہزاد نے اسے اس مختصر گھر کی بیٹھک میں بٹھایا اور رکی انداز میں چائے کا پوچھا۔

”ہاں چائے کا موڈ تو ہے۔“ فضل احمد نے صوفے سے نیک لگاتے ہوئے کہا۔

چائے کے دوران میں ہی فضل احمد اصل موضوع پر آ گیا۔ وہی مکان کی خرید والی موضوع۔ شہزاد نے اپنے چہرے پر سخت بیزاری پیدا کر رکھی تھی اور یہ جتا رہا تھا کہ



جیسے وہ اس موضوع سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔

آخر فضل نے کہا۔ ”دیکھو شہزاد! میں نے تمہیں تین چار آفرزدی ہیں۔ اگر میں تم سے پوچھوں کہ تم یہ مکان بیچنے کے لیے کیا لینا چاہو گے تو پھر؟“

شہزاد کے سینے میں جیسے ایک شادیانہ سانچ اٹھا لیکن وہ ایک ماہر سودے باز تھا۔ اپنے تاثرات چھپانا بخوبی جانتا تھا۔ اس نے سگریٹ کا کش لے کر فضل کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا۔ ”ڈیڑھ کروڑ دے سکو گے؟“

فضل سنانے کی سی کیفیت میں اس کی جانب دیکھتا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر چند سیکنڈ کے اندر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ پھر اس نے بغیر کچھ کہے اپنی واسکٹ کی جیب میں سے ایک چیک نکالی۔ ایک چیک علیحدہ کر کے شہزاد کے سامنے رکھا۔ چیک پر سائن موجود تھے۔ فضل ڈرامائی انداز میں بولا۔ ”تم نے میری توقع سے بھی زیادہ بتایا ہے۔ ایک بار اس پر نظر ثانی کر لو پھر جو بھی دل چاہے اس میں بھر لیتا۔“

”نظر ثانی کوئی نہیں جی۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔  
”ایک روپیہ کم نہ زیادہ۔“  
فضل ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔  
”اوکے..... شناختی کارڈ کی کاپی دے دو۔ میں کل تک کاغذات تیار کروالوں گا۔“

شہزاد کو اپنی سماعت پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا لیکن جو وہ سن رہا تھا وہ حقیقت تھی اور حقیقت یہی تھی کہ ایک انہونی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

شہزاد نے اچھے علاقے میں دس مرلے کا ایک سنگل اسٹوری گھر خرید لیا۔ مہران کار لے لی۔ اس کے کئی سپنے پورے ہو گئے۔ مگر اپنے محسن یعنی بہزاد صاحب سے دوبارہ ملنے والا سپنا پورا نہیں ہوا۔ ان کا فون نمبر اس کے پاس موجود تھا۔ اس نے سیکڑوں مرتبہ ٹرائی کی مگر وہ شاید ”سم“ ختم کر چکے تھے۔

شہزاد نے اب چھوٹے پیمانے پر کنسٹرکشن کا اپنا کام شروع کر دیا تھا..... تقریباً ڈیڑھ سال بعد کی بات ہے، ایک کام کے سلسلے میں شہزاد کا ”بتی“ جانا ہوا۔ ایک روز ایک سڑک سے گزرتے ہوئے وہ اچانک ٹھنک گیا۔ اسے ایک دروازے سے بہزاد صاحب نکلنے نظر آئے۔ ان کا حلیہ اور لباس کافی بدل چکا تھا۔ بال تو اسی طرح لمبے تھے مگر اب چہرے پر کچھڑی ڈاڑھی بھی نظر آرہی تھی۔ ماتھے پر ہلکا سا حراب تھا۔ وہ شلواریں میں تھے۔ شہزاد نے گاڑی کو

## ہنی مون

ایک شادی شدہ جوڑا ہنی مون ختم ہوتے ہی اپنے گھر پہنچ گیا اور دوسرے دن ہی دلہن نے خرچ کی تنگی کا گلہ شروع کر دیا۔ ”تم تو کہا کرتے تھے، میں بڑا اکھا تا پیتا اور مالدار شخص ہوں۔“  
”درست ہے۔ مگر یہ میں ہنی مون منانے سے پہلے کہا کرتا تھا۔“

## عاشق

ایک عاشق نے ماہر نفسیات کو خط لکھا۔

محترم جناب.....

مجھے ایک ایسی بد صورت لڑکی سے، جسے دیکھ کر بچے ڈر جاتے ہیں۔ سچی محبت ہو گئی ہے جبکہ ایک خوب صورت لڑکی جسے دیکھ کر بیویاں ڈر جاتی ہیں، مجھ سے سچی محبت کرتی ہے۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ دونوں میں سے کس کا انتخاب کروں۔

فقط..... پریشان حال

ماہر نفسیات نے جواب لکھا۔

جناب پریشان حال۔

اپنی سچی محبت کا گلانا گھونٹنے اور پہلی والی سے شادی کر لیجئے اور دوسری لڑکی کا نام و پتا مجھے ارسال کر دیں۔

فقط..... جواب کا منتظر

## دعوت نامہ

امریکی مزاحیہ اداکار باب ہوپ نے اپنے دوستوں کو ایک شاندار پارٹی دی جس میں سیکڑوں افراد نے شرکت کی۔ ایک ایسا نوجوان بھی خوب بن ٹھن کر پارٹی میں پہنچ گیا جسے دعوت نامہ نہیں دیا گیا تھا۔ جب پارٹی ختم ہوئی اور لوگ رخصت ہونے لگے تو باب ہوپ نے اس سے آکر پوچھا۔

”کیسے جناب پارٹی کیسی رہی.....؟“

”بے حد شاندار.....“ نوجوان نے اپنی چالاکي پر پھونے نہ سماتے ہوئے کہا۔

باب ہوپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”برائے مہربانی، آپ اپنا پتادے جائیں تاکہ آئندہ آپ کو بھی دعوت نامہ بھیج دیا جائے۔“

مرسلہ۔ ریاض ہٹ، حسن ابدال



بریک لگائے اور پھر اتر کر ان کی طرف بھاگا۔ وہ ان سے لپٹ گیا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر ششدر رہ گئے..... اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ پریشان بھی۔

شہزاد نے انہیں بتایا کہ وہ کس کس طرح انہیں تلاش کرتا رہا ہے۔ شہزاد نے نیم پلیٹ پڑھی تو اسے پتا چلا کہ یہ بہنراد صاحب کا ہی گھر ہے۔ بہنراد صاحب نے اسے بتایا کہ وہ کونٹے سے یہاں آگئے ہیں۔ وہاں کا موسم انہیں بالکل راس نہیں آ رہا تھا۔

اگر کہیں سرراہ ان سے ملاقات ہوئی ہوتی تو شاید وہ کئی کترا جاتے مگر وہ اب گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ انہیں شہزاد کو اندر لے جانا پڑا۔

لاہور کی طرح وہ یہاں بھی تنہا تھے بلکہ اب تو ستار بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ شہزاد کا خیال تھا کہ وہ سب سے پہلے اس سے گھر کی فروخت کے بارے میں سوال کریں گے۔ پھر شاہینہ کے بارے میں اور اس سے شادی کے بارے میں پوچھیں گے..... لیکن وہ تو اپنی طرز کے انوکھے بندے تھے، ان کی سوچ اپنی اور ننگو کا انداز منفرد تھا۔ شہزاد کے منع کرنے کے باوجود وہ خود ہی چائے بنا کر لائے اور سامنے لکڑی کی میز پر رکھ دی۔ وہ ایک پارٹی شام تھی۔ کھڑکی سے باہر بوندیں تو اتر سے گر رہی تھیں۔ دسمبر کا آغاز تھا۔ دسمبر ہو، بارش ہو تو پھر آتش دان بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ یہاں آتش دان تو نہیں تھا لیکن لوہے کی چھوٹی سی انٹیمٹی ضرور سلگ رہی تھی۔ بہنراد صاحب چائے کی پیالی کو گھور رہے تھے۔ اچانک ہی انہوں نے کھوئے کھوئے انداز میں بولنا شروع کیا۔ "اس کا نام تو سلیمہ تھا لیکن گھر میں اسے پیار سے سلی کہا جاتا تھا۔ کھاتا پیتا امیر گھرانہ تھا۔ اسے ریڈیو بی وی پر کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ صرف شوق تھا یہی شوق اسے پہلے ریڈیو اور پھر بی وی پر لے گیا۔ ان دنوں آج کل کی طرح چینلز کی بھرمار تو نہیں تھی۔ بڑا اعلیٰ کام ہوتا تھا....."

بہنراد صاحب بولنا شروع ہوئے تو پھر سحر انگیز انداز میں بولتے چلے گئے۔ وہ اپنی اور سلیمہ سیمٹی کی کہانی سنا رہے تھے۔ شہزاد کا خیال تھا کہ ان سے ان کے ماضی کے بارے میں جاننے کے لیے اسے شاید بہت تنگ و دو کرنا پڑے مگر اس کے دیگر خیالوں کی طرح یہ خیال بھی غلط ثابت ہو گیا تھا۔ اس بوند باندی والی سب سے شام میں بہنراد صاحب نے اسے اپنے ماضی کے بارے میں جو کچھ بتایا، وہ مختصر الفاظ میں یوں تھا۔

سلیمہ اپنے کیریئر کے جو بن پر تھی۔ اسے ایک ڈراما

سیریل میں ایک ایسی لڑکی کا کردار ملا جو بہت اچھا ستارہ بن چکی تھی۔ اپنے کردار میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے سلیمہ نے باقاعدہ ستارہ سیکھنا چاہا۔ ان دنوں بہنراد صاحب کا بھی ستارہ نوازی میں نام تھا۔ ان کی عمر چھبیس سال اور سلیمہ کی تیس چوبیس سال ہوگی۔ بہنراد صاحب کی اپنی ایک فنکارانہ آن بان تھی۔ جب ان سے کہا گیا کہ وہ چنی ہو چکی ہیں جا کر تیسویں سٹی کی لڑکی کو ستارہ بنانا سکھائیں تو انہوں نے کہا، پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے.....

نتیجہ یہ نکلا کہ معروف اداکارہ سلیمہ برقع اوڑھ کر اور قریباً نصف فرلانگ فاصلہ پیدل طے کر کے ستارہ سیکھنے، چنی ہو چکی تھی۔ بہنراد صاحب کے گھر آنے لگی۔ بہنراد صاحب کی خودی اور بے نیازی سلیمہ کے دل میں گھر کر گئی اور اس سے بھی زیادہ ان کی شرافت۔ پتا نہیں وہ کون سا جادو کی لمحہ تھا جب وہ ان کے عشق میں گرفتار ہو گئی۔ دوسری طرف بہنراد صاحب بھی خود کو اس کی سحر انگیز شخصیت کی کشش سے نہ بچا سکے۔ جلد ہی دونوں کو یوں لگنے لگا جیسے ایک دوسرے کے بغیر جینا اب "ناممکن" ہے لیکن یہ معاشرہ ایسے ہی ناممکنات کو ممکن بنانے کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ سلیمہ کو اس کے دادا فرمان سیمٹی نے پالا تھا۔ وہ پوتی سے بہت محبت کرتے تھے اور اتنے ہی سخت مزاج بھی تھے۔ وہ سلیمہ اور بہنراد کے درمیان ایک ایسی آہنی دیوار بن گئے جس کی دونوں جانب دو پیار کرنے والے تڑپ تڑپ کر رہ گئے لیکن دیوار کو توڑ نہ سکے۔ ایک موقع ایسا بھی آیا جب خوبرو سلیمہ نے سب کچھ چھوڑ کر بہنراد صاحب کے ساتھ کہیں بھی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بالکل تیار ہو چکی تھی مگر بہنراد صاحب اپنی محبت کو اس طرح حاصل کرنے کے حق میں نہیں تھے..... اور پھر وہی کچھ ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ ان دونوں کی جدائی پر مہر لگ گئی تھی۔ سلیمہ سیمٹی کی شادی اس کی فیملی میں ریحان سیمٹی سے کر دی گئی اور غریب مگر خود دار اور با کردار ستارہ نواز بہنراد قدسی اپنے تین مرلے کے گھر میں مہینوں کے لیے بند ہو کر رہ گیا۔ ہاں، یہ وہی گھر تھا جہاں چپے چپے پر ان دونوں کی محبت کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہاں کی دیواریں، جھروکے، بالکونیاں..... سیڑھیاں..... کون سی جگہ ایسی تھی جہاں سے ان کی محبت کی خوشبو نہیں پھوٹتی تھی۔ ان دونوں کا ساتھ صرف ایک سال کا رہا تھا مگر اتنی یادیں دے گیا تھا جو سنبھالنے نہیں سنبھلتی تھیں۔ اس ناکام محبت کی روداد علاقے کے نئی پرانے لوگ جانتے تھے۔



تم کس حال میں ہو۔ شاہینہ کو حاصل کر چکے یا نہیں.....؟“  
شہزاد نے تھوڑا تو وقف کیا پھر ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”نہیں جناب! باقی تو سب کچھ آپ کی عنایت سے حاصل ہو گیا مگر شاہینہ ابھی تک نہیں مل سکی۔“

”یہ کیا بات کہہ رہے ہو؟“ وہ حیرت زدہ اور دنگی نظر آئے۔  
”شاہینہ کے والد محترم کی تقریباً ساری شرطیں پوری ہو گئی ہیں لیکن وہ ابھی تک پس و پیش کر رہے ہیں۔ کبھی کوئی بہانہ بھی کوئی۔ اب یہ کہہ رہے ہیں کہ پہلے شاہینہ ماسٹرز مکمل کرے گی۔ بہر حال شاہینہ کی والدہ امید کی کرن کی طرح ہیں۔ وہ پوری طرح ہماری طرف داری کر رہی ہیں.....  
آپ نے دوا تو کر دی ہے جناب، اب دعا بھی کریں.....“  
شہزاد نے عجیب لہجے میں کہا۔

بہزاد صاحب ایک تک اس کی طرف دیکھتے رہے پھر بولے۔ ”اچھا فقرہ کہا تم نے۔ دوا تو کر دی اب دعا بھی کریں۔ اچھا کہا۔ ویل سیڈ۔“  
”کریں گے دعا؟“ شہزاد نے ان کے ہاتھوں کو عقیدت سے چھوتے ہوئے کہا۔

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور دو سچے موتی محبت کا حسین اشارہ بن کر ان کی آنکھوں سے چمک گئے۔

اب پتا نہیں کہ یہ اتفاق تھا، حسن اتفاق تھا یا دعا کا اثر تھا (کئی دعائیں ایسی بھی تو ہوتی ہیں جو ہونٹوں تک پہنچنے سے پہلے ہی خدا کی بارگاہ میں قبول ہو جاتی ہیں اور ایسی دعائیں بہزاد صاحب جیسے لوگوں کی ہی ہوتی ہیں) بہزاد صاحب کی آنکھوں سے آنسو گرے ہوئے یہ مشکل دس پندرہ منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ اچانک شہزاد کے سیل فون پر کال کے سنگٹل آئے۔ دوسری طرف شاہینہ ہی تھی۔ اس کی آواز جیسے خوشی سے کانپ رہی تھی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔  
”ہمارے لیے ایک اچھی خبر ہے شہزاد!“

”کیا؟“ شہزاد نے اپنے سر پٹ دل کو بہ مشکل سنبھالتے ہوئے کہا۔

”تمہیں سن کر خوشی ہوگی..... لیکن..... لیکن..... مجھے بتاتے ہوئے شرم آئے گی..... میں تمہاری بات امی سے کروا رہی ہوں۔“ اس نے شوخی سے کہا۔

پھر اس کے بھاگتے چپقل قدموں کی آواز آئی۔ وہ امی کی طرف جا رہی تھی۔ گویا سینے پورے ہونے کا اعلان ہو رہا تھا۔ ایک گمشدہ محبت کے طفیل ایک روتی سسکتی محبت کو نئی زندگی مل رہی تھی۔

بانی کی کہانی کچھ زیادہ طویل نہیں تھی۔ سلیمہ جب کبھی کبھار اپنے میکے یعنی چٹی حویلی آتی تھی تو دور سے بہزاد صاحب کے گھر کو دیکھتی تھی۔ کبھی کبھار اسے اپنے نامراد محبوب کی کوئی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہوگی۔ وہ ایک ٹی وی آرٹسٹ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک باکردار مشرقی لڑکی بھی تھی۔ شادی شدہ ہونے کے بعد اس نے کوئی معاشرتی حد پھلانگنے کی کوشش نہیں کی۔ صرف..... اور صرف اتنی ہی رعایت اپنے لیے حاصل کی کہ کبھی کبھی چٹی حویلی آتی تو آنسوؤں کی اوٹ سے بہزاد صاحب کے گھر کو دیکھا کرتی۔ دھیرے دھیرے اس کا یہ معمول پختہ ہو گیا۔ مہینے میں کم از کم ایک بار ضرور وہ چٹی حویلی آتی تھی۔ ہاں محبت سے وابستہ چیزیں بھی محبوب ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کچھ لوگ خاص مکانات اور گلی کوچوں سے بھی محبت کرتے ہیں۔ اس کا شوہر سات آٹھ سال پہلے فوت ہو چکا تھا۔ اس کے دو بیٹے تقریباً سترہ اور پندرہ سال کے تھے۔ ترکے میں اس کو ایک چلی چلائی شاندار گارمنٹ فیکٹری بھی ملی تھی۔ اب وہ ہر طرح خود مختار تھی۔ اگر کبھی کبھی کسی ڈرامے یا شو میں دکھائی دیتی تھی تو وہ صرف ایک شوق ہی تھا جو ماشی سے اس کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔

بہزاد صاحب کی کہانی نے ایک عجیب سے درد میں جتلا کر دیا تھا۔ خود ان کا اپنا چہرہ بھی اندوہ کی تصویر تھا۔ کھڑکی سے باہر تارکی پھیل گئی تھی لیکن بارش کی صدا آ رہی تھی۔

ایک اداس وقفے کے بعد شہزاد نے کہا۔ ”بہزاد صاحب! گستاخی معاف۔ آپ نے سب کچھ بتایا لیکن اس بندے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جس نے آکر مجھ سے مکان کا سودا کیا اور آپ کی پیش گوئی کے عین مطابق ایک بھاری رقم ادا کی۔ اسے یقیناً آپ کے اور سلیمہ صاحبہ کے بارے میں سب معلوم ہوگا۔“

”شاید تم فضل احمد کی بات کر رہے ہو؟“ شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولے۔ ”ہاں..... وہ سلیمہ کا راز دار ملازم تھا۔ دراصل وہ سیٹھی فیملی کے جدی پشتی ملازموں میں سے تھا۔ بچپن میں اس نے سلیمہ کو گود کھلایا اور جب وہ قدرے بڑی ہوئی تو اس کے دوستوں کی طرح ہو گیا۔ جو بات وہ اپنے دادا یا ماں کے ساتھ نہیں کر سکتی تھی، وہ فضل کے ساتھ کر سکتی تھی اور وہ بھی وفاداری اور پُر خلوص محبت میں اپنی مثال آپ تھا..... اور اب بھی ہے۔ خیر اس طرح کی تو اتنی باتیں ہیں کہ شروع کریں تو رات نہیں بیت جائے۔ تم بتاؤ،



# Downloaded From Paksociety.com

قسط: 11

## شیش محل

اسماء توری

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے رب جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گہری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین و فطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امید کی خواب لے رہے ہیں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کر دیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امید کی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کڑی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی پرستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بزار قیب کوئی نہ نکلا۔

ہزاروں کے پرووں میں ملوث ہر سطر تک برقی دارکات کی جگہ کی دلچسپ داستان

جولائی 2016ء

پینس ڈائجسٹ







## گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ قیام پاکستان سے نسل کا زمانہ ہے۔ جو لیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلانی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور نگاہ فیلو عارف بھی اس کا کوئی ایک ہے۔ مذہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی شامی بھی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جو لیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیر دار و سیاست داں ولد آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ ولد آغا کا گریس سے تعلق رکھتا ہے۔ جو لیٹ اپنے اخبار کی طرف سے ولد آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ ولد آغا اسے کراہتا ہے کہ اس کا کام نہیں ہوتا۔ اس کے انٹرویو کے بعد جو لیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جو لیٹ کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالت بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جو لیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شامی کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ لٹی پٹی جو لیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جو زمین حرکت قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جو زلف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جو لیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح وارثی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جو لیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بد معاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق رہن دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جو لیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جو لیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک فنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ ولد آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جلسے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا مکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ تکفیش کے اس عرصے میں اس کے باپ جو زلف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جو لیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جو زمین نے اس کے لیے ایک صندوقچی میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جو لیٹ صندوقچی کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جو زمین اور ایک انجینیئر مرد کی جوانی کی ہے۔ جو زمین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں شامی میں ایک نواب خاندان کی گورنرس کے طور پر ملازمت کرتی تھی دوران ملازمت جو زمین اور نواب زادہ اسد اللہ کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ادھر فاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر فاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہیں ان کی ملاقات سینٹھ بھائیہ سے ہو جاتی ہے۔ سینٹھ رہن دادا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق فاروق کو آپ ہوا کی تبدیلی کے لیے شملہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں سینٹھ بھائیہ کی رہائش گاہ پر بطور مہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھائیہ کی بیٹی سلا سے ہوتی ہے جو بیوہ ہے۔ سلا اور فاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ ادھر طوائف زادی چاند بانو جو فاروق سے محبت کرتی ہے اور فاروق کے دل میں چاند بانو کی محبت نہ سہی مگر وہ چاند بانو کا دل سے احترام کرتا تھا، وہ شوٹنگ کی فرض سے شملہ جاتی ہے اور فاروق سے ملنے بھائیہ کی رہائش گاہ پہنچتی ہے۔ تاہم سلا اسے فاروق سے ملنے نہیں دیتی اور دل میں رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے مگر فاروق کی پابندی بانو سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ادھر رہن دادا جو لیٹ کی بربادی کے ذمے دار شخص کی کمونج میں رہتا ہے۔ تاہم جو لیٹ اسے کچھ نہیں بتاتی۔ رہن دادا محلے کی ایک بیوہ شریا بانو کی شادی کے انتظامات کرتا ہے شریا بانو کے چچھے جو دادا نامی فنڈا لگا ہوتا ہے جسے رہن دادا پہلے ہی سبق سکھا چکا ہوتا ہے۔ جو دادا اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے دو فنڈوں کو برات کے چچھے لگا دیتا ہے۔ برات بھینگی سے بذریعہ ٹرین دوسرے شہر جا رہی ہوتی ہے۔ اس کے آدی بھی برات کی حفاظت کے لیے موجود ہوتے ہیں تاہم لڑائی کے دوران رہن کا ایک آدی مارا جاتا ہے۔ رہن کے آدی بدلہ لینے کے لیے ایک مکان میں داخل ہوتے ہیں۔ تاہم اس جگہ پہ پہلے سے ہی مجھ کے آدی ہوتے ہیں اور وہ سب اس مکان میں آئے۔

## اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

بالکل غیر متوقع صورت حال نے کچھ لمحوں کے لیے ان کے حواس ہی تھم کر دیے تھے اور حملہ آوروں کو گمان ہونے لگا تھا کہ انہوں نے بازی ماری ہے لیکن پھر رامو اور اس کے ساتھیوں نے ابتدائی جھٹکے سے نکل کر سنبھلنا شروع کر دیا۔ وہ عام لوگ نہیں تھے کہ اپنے جسموں پر چاقو کا ایک آدھ وار کھا کر ہی لیے لیٹ جاتے۔ انہیں ایسے حال میں بھی لڑنے کی تربیت دی گئی تھی، چنانچہ لمحوں میں اپنے زخموں سے بے نیاز ہو کر آنے والوں کو ان کی جرأت کا جواب دینے لگے۔ اس

آنے والے کچھ ایسی تیزی سے اندر آئے تھے کہ رامو اور اس کے ساتھی فوری طور پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کر سکے اور آنے والوں نے انہیں زد پر لینا شروع کر دیا۔ ان کے تیز دھار چاقو بلا تخصیص ہر طرف گھوم رہے تھے، نتیجے میں کئی چبھیں اور آہیں بلند ہوئیں۔ کسی کے شانے پر زخم آیا تو کسی کے بازو پر چھ کا لگا، کسی کے پہلو سے خون کا فوارہ چھوٹا تو کوئی اپنی گلائی پکڑ کر رہ گیا۔ وہ جو جوش انتقام سے بھرے حملہ کرنے آئے تھے، خود ہی شکار ہونے لگے۔



خطرہ تھا۔ وہاں جتنا ہنگامہ ہوا تھا پولیس کو اطلاع ہونا لازمی تھا۔ اطلاع پا کر پولیس پہنچی اور انہیں گھیرنے میں کامیاب ہو جاتی تو بہت مشکل ہو جاتی۔ وہ اپنے علاقے سے دور تھے اور ان کی حیثیت حملہ آوروں کی سی تھی، اس لیے پولیس کے ہاتھ آ جانا برا اعتبار سے سخت نقصان دہ ہوتا اور اشوک بچن جیسے ماہر وکیل کی قابلیت بھی کام نہ آتی۔ واپسی کا سفر بے حد تیزی سے طے کیا گیا۔ وہ لوگ واپس اڈے پہنچے تو وہاں ڈاکٹر اپنے ایک مددگار کے ساتھ پہلے ہی موجود تھا۔ سب سے پہلے پہلو میں زخم کھائے اسے عرف اٹو کو ڈاکٹر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کا خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا اور وہ آنکھیں بند کیے دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے زخم کا معائنہ کیا اور اس کی آنکھوں میں توشیح دکھائی دینے لگی۔

”اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے دادا۔ خون زیادہ بہہ گیا ہے۔ زخم بھی گہرا ہے، اس کو اسپتال بھیجنا پڑے گا۔“ آخر کار اس نے اعلان کر دیا۔

”ٹھیک ہے، بھجوادیتے ہیں۔“ ربن نے پل بھر کے لیے سوچا اور فیصلے پر پہنچ گیا۔ بازو نوٹھے والے کے بارے میں بھی ڈاکٹر کی یہی رائے تھی کہ اگرچہ اس کا زخم جان لیوا نہیں ہے لیکن مناسب علاج اسپتال میں ہی ہو سکتا ہے۔ ربن نے فوری طور پر ان دونوں کو دو آدمیوں کے ساتھ اسپتال کے لیے روانہ کر دیا۔ اس نے ہدایت کر دی تھی کہ پولیس کے تفتیش کرنے کی صورت میں انہیں کیا بیان دینا ہے۔ وہ پولیس والوں کو یہی بتاتے کہ دونوں افراد فلم کالیٹ ٹائٹ شوڈ کچھ کر واپس آ رہے تھے کہ ایک تارک گلی میں کچھ افراد نے انہیں گھیر لیا اور لوٹ مار کی کوشش کی۔ وہ چونکہ اڈے کے لوگ تھے اس لیے آسانی سے لیٹروں کو کامیاب ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے چنانچہ ان سے بھڑ گئے۔ نتیجے میں دونوں طرف کے افراد کا نقصان ہوا لیکن چونکہ لیٹروں کی تعداد زیادہ تھی اس لیے وہ غالب رہے اور ان دونوں کو شدید زک اٹھانی پڑی۔ وہ زخمی حالت میں گرتے پڑتے اڈے پر پہنچے اور وہاں سے ان کے ساتھی علاج کے لیے انہیں اسپتال لے آئے۔ پولیس اس کہانی پر یقین کرتی یا نہ کرتی لیکن انہیں جھٹلانے کے لیے بھی ان کے پاس کوئی ثبوت نہ ہوتا۔

ان دو افراد کو اسپتال روانہ کرنے کے بعد ڈاکٹر اپنے مددگار کے ساتھ باقی زخمیوں کو دیکھنے لگا۔ کچھ کے زخموں کو نائکے لگا کر بند کرنا پڑا اور کچھ کا صرف مرہم پٹی سے ہی

سارے ہنگامے نے رات کے سکوت و سکون کو یکسر توڑ ڈالا۔ جوشیلی آوازیں، بلند چیخیں، گندی گالیاں اور بڑی بڑی بھڑکیں مل کر اچھے خاصے شور شرابے میں تبدیل ہو گئیں۔ اس شور کو سن کر اپنے بستروں پر خوب استراحت اہل محلہ جاگ گئے، اندھیرے گھروں میں روشنیاں جلنے لگیں، کچھ جی دار حالات کا اندازہ کرنے دروازے کھول کر باہر بھی نکلے لیکن کس میں جرأت تھی کہ ایک دوسرے سے ختم گھٹا چاقو برداروں سے کوئی سوال کر پاتے یا انہیں اس وحشیانہ لڑائی سے روک پاتے۔ لڑنے والوں میں سے کچھ مکان کے اندر تھے اور کچھ باہر تک آ گئے تھے۔ دو ڈھائی منٹ میں ہی وہاں گویا قیامت آ گئی تھی۔ لڑنے والوں کو تو کوئی ہوش نہیں تھا لیکن دیکھنے والے خون اور خاک میں لتھڑے انسانی جسموں کو دیکھ کر تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ان کا پتے لوگوں ہی نے سب سے پہلے یہ منظر دیکھا کہ ایک تانکا قریب آ کر رکا ہے اور اس میں سے کچھ لوگ کھلے چاقوؤں کو لہراتے ہوئے بھاگ کر لڑنے والوں میں شامل ہوئے ہیں۔ نئے آنے والے یہ لوگ ربن دادا اور اس کے آدمی تھے۔ ان کے آتے ہی لڑائی کا نقشہ تیزی سے بدلنے لگا۔ رامو اور اس کے ساتھیوں پر حملہ آور ہونے والوں کا زور ٹوٹنے ٹوٹنے بالکل ختم ہو گیا اور وہ خاک میں اومتے دکھائی دینے لگے۔

”ایک دو مشنڈوں کو باندھ کر ساتھ لو اور سارے ادھر سے نکل چلو۔“ صورت حال قابو میں آتے ہی ربن کی پاٹ دار آواز وہاں گونجی تو تیزی سے اس حکم پر عمل ہونے لگا۔ رامو اور وجے نے مزید دو افراد کے ساتھ مل کر نسبتاً کم زخمی ہونے والے دو افراد کو ان ہی کی قمیصوں کے کٹڑے پھاڑ کر باندھا اور تانگوں میں لا دیا۔ باندھے گئے ان دو افراد کے منہ بھی کپڑا ٹھونس کر بند کر دیے گئے تھے۔ ان افراد کو پائیدان پر ڈال کر وہ لوگ خود بھی تانگوں پر چڑھنے لگے۔ زیادہ تر کی حالت بہتر تھی بس ایک دو افراد ذرا زیادہ زخمی ہوئے تھے جنہیں ان کے ساتھیوں نے سہارا دے کر سوار کروایا۔ زیادہ زخمی افراد میں سے ایک کے پہلو میں زخم آیا تھا جس سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا جبکہ دوسرے کا شاید بازو ٹوٹ گیا تھا۔ فوری طور پر اس کے بازو کو ایک کٹڑی کے کٹڑے کے ساتھ باندھ دیا گیا جبکہ دوسرے کے پہلو پر کپڑے کی گدی سی بنا کر رکھنے کے بعد سختی سے پٹی باندھ دی گئی کہ خون کے بہاؤ کی رفتار کم ہو سکے۔ یہ سب کام چلتے تانگے میں ہی انجام دیے گئے کیونکہ رکنے میں



کہ تمہاری کیا مرضی ہے۔ اپن سمجھائیں اور دوسری غلطی یہ کیا کہ سارا کمینڈ لوگ ایک ساتھ مکان میں کود گیا، اسے کو دو چار آدمی باہر نگرانی کے لیے چھوڑنے کا تھا پر پتا نہیں کیسے بدھی ماری گئی۔ اگر تم نہ آتے تو آج سب سالامارا جاتا۔ مر ہی جاتا تو اچھا تھا۔ ایسے تمہارے کو یہ پھنکار برستی شکل تو نہیں دکھانا پڑتا۔“ رامو میں ربن سے نظر ملانے کا یارا نہ تھا لیکن وہ اس سے اپنی شکل چھپا کر جاتا بھی تو کہاں۔ دیر سویرا سے ربن کا سامنا تو کرنا ہی تھا، اس لیے ڈاکٹر کے روانہ ہوتے ہی اپنی ہمت مجتمع کر کے اس کے قریب جا پہنچا اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے پیروں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اپنی بات کے انتقام پر اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہنے لگے تھے۔

”کاہے کو اپنا سچ (مغز) کھاتا ہے۔ جا، جا کر آرام کر اور یہ جو ہیں جن کا منہ تھما پھوٹا ہوا ہے، ان کو ادھر سے اپنا شکل تم کرنے کا بول۔ وہ سالے پولیس والے کتوں کی طرح بوسو گھستے ہوئے پوچھتا چھ کے لیے ادھر ہی ضرور آئیں گے۔ کوئی ایسا بندہ پولیس کی نظر میں نہ آنے پائے جس کا زخم دکھائی پڑتا ہو۔“ ربن نے ڈپٹے والے انداز میں اس سے کہتے ہوئے ایک اور کام کا نکتہ بھجایا تو رامو تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ ذرا ہی دیر میں وہ افراد جن کے زخم کپڑوں میں پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے، اڈے سے روانہ کر دیے گئے۔ اب پولیس والے اڈے پر آ بھی جاتے تو ان کا ایسے کسی بندے سے سامنا نہ ہوتا جس کی موجودگی شکوک و شبہات پیدا کر پاتی۔ اس کام سے فارغ ہو کر رامو ایک بار پھر ربن کے قدموں میں آ بیٹھا۔ وہ ربن کا نائب تھا اور ربن کے بعد اڈے پر اسے خاص اہمیت حاصل تھی لیکن اپنی ایک غلطی کا ادراک ہو جانے پر وہ سب کے سامنے ربن کے آگے جھکنے اور معافی طلب کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کر رہا تھا۔

”اپن تیرے کو بولا تھا کہ جا کر آرام کر پھر کیوں ادھر آ کر بیٹھ گیا ہے۔“ ہونٹوں سے حقے کی نے جدا کرتے ہوئے ربن نے بیزاری کا اظہار کیا۔

”تم اپنے کو شائیں نہیں کریں گا تو اپنے کو چین کدھر سے آئے گا۔ ماں کی سوگند اپن تو تمہیں ناراج (ناراض) چھوڑ کر آرام کرنا تو دور کی بات، سکھ سے مر بھی نہیں سکے گا۔“ رامو بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔

”اپن کسی سے ناراض نہیں ہے۔ تم لوگوں کو ایک سبق سکھانے کا تھا، سکھا دیا۔ اب کاہے کی ناراضگی.....؟“ سختی سے بولتے بولتے آخر میں ربن کا لہجہ نرم ہو گیا تو رامو کو

گزارہ ہو گیا۔ جنہیں ضرورت تھی، انہیں انجیکشن بھی لگائے گئے۔ ڈاکٹر کا مددگار اپنے ساتھ لائے گئے ڈبے میں سے گولیاں نکال نکال کر حسب ضرورت ایک ایک کو تھماتا رہا۔ اس دوران یرغمالی کی حیثیت سے ساتھ لائے گئے دونوں افراد بندھی ہوئی حالت میں ایک طرف پڑے رہے۔ ربن بے نیازی سے ساری کارروائی دیکھتا ایک طرف بیٹھا حقہ گزگڑاتا رہا۔ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ اس سے مخاطب ہوتا۔ گھاؤ کھا کر آنے والے اس کے سامنے نظر اٹھاتے ہوئے شرمندہ ہو رہے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ ربن... بہ زبان خاموشی ان سے کہہ رہا ہے کہ انہوں نے اس کی ساری محنت اور تربیت خاک میں ملا دی۔ شرمندگی کا شکار ان افراد میں رامو بھی شامل تھا۔ اس کے بازو پر گہرا زخم آیا تھا اور ڈاکٹر کو چار ٹانگے لگانے پڑے تھے۔ دوسرے پر بھی دو تین زخم تھے لیکن وہ معمولی نوعیت کے تھے۔ حملہ آوروں کی اچانک آمد نے اسے بھی پہلے لمحے پر بوکھلا دیا تھا لیکن پھر وہ بہت جی داری سے لڑا تھا۔ حملہ آوروں میں سے کس کس نے اور کتنا اس کے چاقو کی دھار کا مزہ چکھا تھا، اس کا شمار وہ خود بھی نہیں کر سکا تھا لیکن اس ساری کارکردگی کے باوجود اس کی نظریں شرمساری کے احساس سے ربن کے سامنے جھکی ہوئی تھیں۔ حالات نے اسے ربن کے ہر عمل اور رد عمل کی وضاحت خود پیش کر دی تھی۔ مجھ کے ایک ٹھکانے کا علم ہونے پر اس نے ان لوگوں کی طرح اندھا دھند وہاں چڑھ دوڑنے کی تجویز نہیں دی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو جوش میں حملہ کرنے جا پہنچے تھے اور بغیر کوئی منصوبہ بندی کیے سیدھے اس مکان کے اندر جا کودے تھے۔ وہ مکان جو ان کے لیے اصل میں چوہے دان تھا۔ اگر ربن پیچھے سے کمک لے کر نہ پہنچتا تو انہیں موجودہ صورت حال کے مقابلے میں بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا۔ ربن کی زیرک نگاہوں نے پہلے ہی گڑبڑ کو بھانپ لیا تھا لیکن ان لوگوں کو اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ جوش انتقام سے بھرے اس کے ساتھی اس کے کہنے پر رک تو بے شک جائیں گے لیکن ان کے دل غیر مطمئن رہیں گے۔ نہ روکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ انہیں ان کی کمزوریوں اور خامیوں کا احساس دلانے کے لیے عملی سبق دینا چاہتا ہو۔ زبانی سمجھانے بھجانے کا شاید ان پر اتنا اثر نہ ہوتا جتنا چوٹ کھا کر انہوں نے سیکھا تھا۔

”اپنے کو شائیں کر دو دادا! اپن کے پاس تمہارے جیسی نظر نہیں ہے۔ اپن کو تمہاری خاموشی سے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا



”جو تھا اپن نے بول دیا۔“ اس نے ربن کے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں لیا اور اسی بے نیازی سے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے جیسی تیری مرضی۔“ ربن نے ٹھنڈے لہجے میں کہا اور پھر جو کو پکارنے لگا۔ جو فوراً بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔

”تیری رسوئی میں مرچی نمک کی کمی تو نہیں ہے نارے؟“ ربن نے اس سے دریافت کیا۔

”نہیں دادا! ساری برنیاں ایک دم فل بھری ہوئی ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”لا پھر تھوڑی ادھر لا کر دے۔ سالے ڈاکٹر نے ان بے چاروں کی مرہم پٹی نہیں کی۔ اپن ان کے زخموں پر تھوڑا دوا لگا دے گا۔“ جو کو دیے جانے والے اس حکم پر پنچو کے چہرے پر رنگ سا دوڑ گیا تاہم اس نے زبان بند ہی رکھی۔ جو جا کر فٹ نمک اور مرچ کی برنیاں لے آیا۔

”لگا رے وے، ذرا مہمان کو تھوڑی دوا تو لگا۔“ ربن نے وے کو پکارا تو وہ فوراً حرکت میں آ گیا اور نمک کی برنی میں سے نمک نکال کر پنچو کی پنڈلی کے زخم پر مل دیا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا اور خون جم کر خود ہی رک گیا تھا لیکن نمک لگنے سے وہ تڑپ اٹھا۔

”جلدی جلدی ہاتھ چلا رے۔ دیکھ تو بے چارے کے جسم پر کتنے گھاؤ ہیں، سب پر دوا لگا۔“ ربن نے سرد لہجے میں ہدایت جاری کی۔ اس بار وے نے سرخ مرچ نکال کر اس کے بازو پر لگے چھوٹے سے کٹ میں بھر دی۔ وہ مانی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کے تڑپنے کو خاطر میں نہ لا کر وے نے اس کے جسم پر ایک اور زخم دریافت کیا اور اس میں نمک اور مرچ دونوں ملا کر بھرنے لگا۔ اس تکلیف پر بلبللا کر پنچو چیخیں مارنے لگا۔

”زخموں کو تلاش کیوں کرتا ہے رے..... تیرے پاس چاقو ہے نا چار چھ چر کے تو خود کیوں نہیں لگا دیتا۔“ ربن کا انداز قطعی بے رحم تھا اور وے بھی ہر حکم پر فوری عمل کے لیے کمر بستہ نظر آ رہا تھا۔ لمبے بھر کی بھی تاخیر کیے بغیر اس نے پنچو کے رخسار پر بڑی نفاست سے دوا لگانے کا ایک کٹ لگا دیا۔ اس سے قبل کہ وہ اس زخم کے ساتھ کوئی کارروائی کرتا، پنچو کی مزاحمت دم توڑ گئی اور وہ ہاتھ پیر جوڑنے لگا۔ اس کی زبان کھلنے پر یہ باتیں سامنے آئیں کہ ربن کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہو کر اپنی گدی گنوا دینے والا جو اور من مانی پر بیچ چورا ہے پر جوتے کھانے والا فیکا، ربن

قدرے تسلی ہوئی اور اس کے پاؤں دباتے ہوئے لجاجت سے بولا۔

”سبق تو ایسا سیکھا ہے دادا کہ اب مرتے دم تک نہیں بھولنے کا ہے۔“

”یاد رکھنا ہی اچھا ہے رے۔ اپنی دنیا میں جو بھولتا ہے وہ نقصان اٹھاتا ہے۔ ادھر جنگل کا قانون چلتا ہے اور جنوروں (جانوروں) جیسی ہی ہوشیاری چاہیے ہوتی ہے ورنہ جو ذرا سا ڈھیلا پڑا، دوسرے اسے چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔“ اب ربن کا انداز پُر شفقت ہو گیا تھا۔

”ایک دم ٹھیک بولے دادا۔“ رامو نے اس سے اتفاق کیا پھر ساتھ لائے دونوں افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”ان کا کیا کرتا ہے؟ پولیس آگئی تو یہ لفظ ڈال دیں گے۔“

”پولیس کے آنے پر ان کا بندوبست بھی کر دینا۔ ابھی تو ان سے تھوڑی جانکاری لینے کی ہے۔ یہی تو اپنے سے بچو اور فیکے کا آگ پھینچا بھونکیں گے۔ کھولوان کے منہ۔“ ربن کا لہجہ ایک بار پھر جلالی ہو گیا۔ اس کا حکم پاتے ہی دو تین افراد بندھے ہوئے آدمیوں کی طرف لپکے اور ان کے منہ میں ٹھونے گئے کپڑے نکال کر ربن کے مقابل زمین پر لا پٹھا۔ ان میں سے ایک فوراً ہی فریادیں کرنے لگا۔

”اپنے کوشا کر دو دادا۔ اپن کو کچھ کھبر نہیں ہے۔ اپن تو بس دھاڑی لگا یا تھا۔“ اس نے بغیر کسی سوال کے خود ہی بولنا شروع کر دیا اور ذرا دیر میں اپنی ساری کہانی سنا ڈالی کہ وہ گلیوں میں بھٹکنے والا ایک عام سا غنڈا ہے جسے رقم دے کر حملہ آوروں میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کی اس داستان گوئی کے درمیان دوسرا آدمی بالکل خاموش اور لالعلق رہا۔ اس کے خاموش ہونے کے بعد ربن نے اس سے مزید کوئی بات نہیں کی اور دوسرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”تیرا کیا نام ہے رے؟“

”پنچو۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”تو اپنا کچا چٹھا بول۔“ ربن نے اسے حکم دیا۔

”اپنی کہانی بھی اس کے جیسی ہی ہے۔“ اپنا نام پنچو بتانے والے نے پہلے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

”پر تیرے منہ پر تو کچھ اور لکھا ہے۔ خود سے بک دے ورنہ اگر اپن نے یہ کہانی پڑھنے کی کوشش کی تو تیرا بڑا نقصان ہو گا۔“



جھائی جاسکتی تھی۔ اصل مجرم فریقا اور مجوسے اور ان کا ہاتھ آنا ضروری تھا اور یہ آسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ صورت حال کو دیکھتے ہوئے یہ بات سمجھ آ رہی تھی کہ وہ دونوں چھپ کر وار کرنے کی حکمت عملی پر کاربند ہیں اور جب جب موقع ملے گا، انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش تو ضرور کریں گے لیکن خود سامنے آنے کے بجائے پنہو اور اس جیسے دوسرے کرائے کے آدمیوں سے کام لیتے رہیں گے۔ منظم گروہ کے نہ ہونے کے باعث یہ ان کی مجبوری بھی تھی اور حکمت عملی بھی۔

”دھنیو اد دادا۔ بہت بہت دھنیو اد۔ اپن تمہاری بات یاد رکھے گا اور کدھر بھی اپنا منہ نہیں کھولے گا۔“ آزادی کی خوش خبری سن کر پنہو اس کے قدموں میں بچنے لگا لیکن اب ربن اس سے بے نیاز ہو چکا تھا اور لا تعلقی سے اپنے حقے کو گڑ گڑاتے ہوئے کسی بہت گہری سوچ میں ڈوب چکا تھا۔

☆☆☆

”ٹھیک ہے سروری..... تم جاؤ، میں یہاں کچھ دیر گزاروں گی۔ تم اتنی دیر میں اپنے دوسرے کام نمٹا لو۔“ جوزفین کی خواہش پر سروری اسے اپنی راہنمائی میں نواب صاحب کی لائبریری تک لے کر آئی تو اس نے دروازے سے ہی سروری کو واپس بھجوا دیا اور خود دروازہ کھول کر بے پاؤں اندر داخل ہوئی۔ کمرے کے فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور چاروں طرف بڑی بڑی دیوار گیر الماریوں میں کتابیں بھی ہوئی تھیں۔ درمیان میں لکڑی کی ایک منقش میز تھی جن کے گرد کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کے قریب خوب صورت وئیش قیمت رانگ چیمیر رکھی ہوئی تھی جو یقیناً نواب سلیم اللہ کے زیر استعمال رہتی تھی۔ درمیان میں رکھی میز پر رانگ پیڈ اور قلم دان بھی موجود تھے اور خوب صورت شیڈ والا ٹیبل لیپ بھی۔ جوزفین کو اس کمرے کی ترتیب اور سکون آمیز خاموشی بہت اچھی لگی۔ یہاں آرائشی اشیا کی بھرمار نہیں تھی لیکن جتنا بھی سامان تھا، اس سے امارت اور خوش ذوقی دونوں کا اظہار ہو رہا تھا۔ پاؤں دھنسنے والے دبیز قالین پر چلتی ہوئی وہ الماریوں میں سبکی کتب کا جائزہ لینے لگی۔ یہ کتب بھی بڑے قرینے اور سلیقے سے رکھی گئی تھیں۔ مذہب سے متعلق کتب ایک جگہ تھیں اسی طرح انگریزی اور اردو ادب کے فن پاروں کو بھی بڑی ترتیب سے جمع کر کے رکھا گیا تھا۔ اس نے انگریزی ادب والے حصے سے ٹیکسپیئر کا ”بسملت“ نکالا اور درمیان میں رکھی میز کے گرد موجود کرسیوں میں سے ایک پر آئی تھی۔ یہ دوپہر کے

اور اس کے آدمیوں کے خلاف متحد ہو گئے تھے۔ انہوں نے ادھر ادھر سے کچھ لوگ جمع کر کے اپنا ایک گروہ سا بنالیا تھا جن کا خرچہ پانی فی الحال اس مال پر چل رہا تھا جو مجوسے اپنے اڈے پر راج کے زمانے میں خوب ہی بھر کر جمع کیا تھا۔ ربن نے اس کو اس لائق تو چھوڑا ہی نہیں تھا کہ اب وہ کبھی ہاتھ میں چا تو پکڑ سکتا اور کسی اڈے کی گدی پر بیٹھ سکتا، چنانچہ وہ دن رات انتقام کی آگ میں جلتا سازشوں کے جال بٹنارہتا تھا۔ ٹریا بانو کو کلکتہ جاتے ہوئے انہوں نے اپنی کوشش بھی اس کی انتقامی کارروائی کی ایک کڑی تھی لیکن اسے اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور کونے اپنی جان کا نذرانہ دے کر ٹریا بانو کو اغوا ہونے سے بچالیا۔ اس کام میں فیکے کے ساتھ شامل کرائے کے دونوں بندوں کو اصل میں چارے کے طور پر آزاد چھوڑا گیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ربن کے آدمی ہریا اور سلونیک لازمی پہنچ جائیں گے اور ہریا اور سلو اس ٹھکانے کی نشان دہی کر دیں گے جہاں ان کی مجوسے ملاقات ہوئی تھی۔ دور دور سے ان دونوں کی نگرانی کرتے مجو اور فیکے کے آدمیوں نے اس ٹھکانے کو ربن اور اس کے آدمیوں کے لیے چوہے دان بنانے کی سازش کر رکھی تھی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے اگر ربن بیدار مغزی سے کام نہ لیتا اور بین وقت پر اپنے آدمیوں کی مدد کے لیے نہ پہنچ جاتا۔

”اب کس بل میں چھپ کر بیٹھا ہے وہ منٹا۔“ پنہو سے ساری داستان سننے کے بعد ربن نے دریافت کیا۔

”ماتا جی کی سوگند اپنے کو نہیں معلوم۔ فریقا اسٹا این سے اپنے ٹھکانے پر آ کر ڈیل کیا تھا۔ اپن آج کل اس کے لیے کام جو رو کر رہا ہے، پر وہ اپن کو اپنے ٹھکانے پر بھی نہیں لے گیا۔ خود آ کر ملتا اور حکم دیتا ہے۔ اپن کو بھی مال پانی سے مطلب ہے اس لیے کبھی اس سے اس کا ٹھکانا نہیں پوچھا۔“ پنہو کی ساری طراری ختم ہو گئی تھی اور وہ ہولے ہولے کراہتے ہوئے بول رہا تھا۔

”ٹھیک ہے تو اپنے ساتھی کے ساتھ ادھر سے نکل جا۔ زبان ایک دم بند رکھنا اور پولیس کے پاس جانے کی غلطی مت کرنا ورنہ اپنا تو کچھ نہیں جائے گا پر تیری جان مصیبت میں آ جائے گی۔“ ربن کی زیرک نگاہوں نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کی سچائی کو بھانپ لیا تھا اس لیے اسے دھمکا کر جانے کی اجازت دے دی۔ خواجواہ کا خون خرابا نہ اس کے مزاج میں تھا اور نہ ہی مفاد میں۔ کرائے کے ان ٹٹوؤں کو نقصان پہنچا کر انتقام کی آگ نہیں



ناکامی پر اس کے ماتھے پر دھیرے دھیرے ایک بل ابھرنے لگا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے قدرے جھنجلاہٹ کے عالم میں الماری بند کی اور رخ موڑا۔ جوزفین نے بھی فوری طور پر اس کا جائزہ لینا بند کر کے نظریں پوری طرح کتاب پر مرکوز کر دیں۔

”ایکسکوز می مس جوزفین! کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ آپ کس کتاب کا مطالعہ کر رہی ہیں؟“ وہ جو کچھ رہی تھی کہ اب اسد اللہ وہاں سے باہر نکل جائے گا، انگریزی زبان میں اپنی سماعت سے نکرانے والے اس جملے کو سن کر چونکی پھر زبان سے کوئی جواب دینے کے بجائے کتاب کا سرورق اس کے سامنے کر دیا۔

”اوہ..... یہ آپ کے پاس ہے۔ ہم اتنی دیر سے اسی کتاب کو تلاش کر رہے تھے۔“ اسد اللہ نے گویا اطمینان کا سانس لیا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا ورنہ پہلے ہی بتا کر آپ کو زحمت سے بچا لیتی۔“ جوزفین نے کہتے ہوئے کتاب اس کی طرف بڑھائی۔

”پلیز نہیں۔ آپ اس کتاب کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ اسے اپنے ہی پاس رکھیے۔ ہم کسی اور وقت اس کا مطالعہ کر لیں گے۔ اس وقت تو فقط یہ ابجھن تھی کہ کتاب غائب کہاں ہو گئی ہے۔ ہمیں ڈر تھا کہ صفائی کرنے والی ملازمہ نے بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہیں ادھر ادھر نہ کر دی ہو۔“ اسد اللہ نے کتاب تھامنے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا اور وضاحت کرنے لگا۔

”اصل میں دوپہر کے کھانے کے بعد مجھے فرصت ہوتی ہے اس لیے میں نے نواب صاحب سے ان اوقات میں یہاں آکر مطالعہ کرنے کی خصوصی اجازت حاصل کر لی ہے۔ میری معلومات کے مطابق ان اوقات میں حویلی کے زیادہ تر افراد قیلولہ فرماتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں آتا۔“ جوزفین نے بھی اپنی یہاں موجودگی کی وضاحت پیش کرنا مناسب سمجھا۔

”آپ کی معلومات درست ہیں، بس آج اچانک ہمیں اس وقت ٹیکسپیئر کی اس کتاب کا خیال آ گیا تو ہم اسے لینے یہاں چلے آئے۔ اصل میں ہم ٹیکسپیئر کے شیدائی ہیں اور اس کی ہر کتاب کو کئی بار پڑھ چکے ہیں۔ لندن میں قیام کے عرصے میں تو ہم ہر ویک اینڈ پر خاص طور پر ٹھہر جا کر ٹیکسپیئر کا ڈراما دیکھا کرتے تھے۔ ہم مزاج دوستوں سے بھی اس پر کافی گفتگو رہتی تھی لیکن یہاں ہم سے اس موضوع پر

کھانے کے بعد ملنے والا آرام کا وقت تھا اور وہ اطمینان سے مطالعہ کر سکتی تھی۔ اس نے ناول پڑھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ اس میں گم ہوتی چلی گئی۔ اپنے اس انہماک میں اسے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا ہے اور اسے دیکھ کر بری طرح ٹھنک گیا ہے۔ گلابی رنگ کے کرتے پاچامے میں ملبوس، رخسار پر سرخی مائل براؤن بالوں کی جھونتی لٹ اور کتاب پر جھکی نظروں کے ساتھ وہ کچھ ایسی ہی دلکش لگ رہی تھی کہ آنے والے کا ٹھکننا بالکل جائز تھا۔ کچھ دیر تو وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اسے سمکتا ہی رہ گیا لیکن پھر اسے خود ہی احساس ہوا کہ اگر جوزفین نے نظر اٹھا کر دیکھ لیا تو اس کے اس انداز پر وہ برا بھی مان سکتی ہے۔ ایک لڑکی کو اس کی لاعلمی میں یوں گھورتے ہوئے کھڑے رہنا کافی معیوب سی حرکت تھی۔ اس نے ہولے سے گلا کھٹکھا کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ جوزفین کا انہماک ٹوٹا اور اس نے چونک کر کتاب پر سے نظریں اٹھا لیں۔

”ارے نواب زادہ صاحب آپ!“ وہ کچھ گڑبڑا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

”پلیز تشریف رکھیے۔ ہم یہاں ایک کتاب کی تلاش میں آئے تھے۔“ نواب زادہ اسد اللہ اپنی ابتدائی کیفیت سے سنبھل چکا تھا چنانچہ بڑے وقار سے بولتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے بھی انگریزی ادب کے ذخیرے والی الماری کا رخ کیا تھا۔ جوزفین کا انہماک اس کی موجودگی کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا اور اب وہ مطالعے پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کر پا رہی تھی لیکن اٹھ کر باہر نکل جانا بھی کچھ معیوب سا لگ رہا تھا کہ مبادہ نواب زادہ گمان کرے کہ اس کی یہاں موجودگی اسے شاق گزر رہی ہے وہ یہ ظاہر مطالعے میں مصروف اپنی جگہ بیٹھی رہی لیکن کن آنکھیوں سے نواب زادہ کی طرف بھی دیکھتی رہی۔ اس نے حسب معمول سفید کرتہ پاچامہ پہن رکھا تھا۔ جوزفین نے نوٹ کیا تھا کہ یہاں مرد حضرات حویلی میں موجودگی کے وقت عموماً کرتہ پاچامہ ہی پہنتے تھے جس کا رنگ بھی زیادہ تر سفید ہوتا تھا جبکہ حویلی سے باہر جاتے ہوئے شہروانی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ نواب زادہ اسد اللہ نے اس وقت جو سفید رنگ کا کرتہ پہن رکھا تھا، اس کے گلے پر سفید رنگ کے ہی دھاگے سے نہایت نفیس کڑھائی کی گئی تھی اور اس کرتے میں اس کی شخصیت کی وجاہت بے حد نمایاں ہو رہی تھی۔ وہ الماری کھولے بہت توجہ سے کتابوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ جوزفین نے محسوس کیا کہ اسے جس کتاب کی تلاش ہے، وہ مل نہیں رہی ہے اور اس



مجبور ہیں لیکن مجبوری کو سلیقے سے نبھانا بھی ایک فن ہوتا ہے جو کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں۔ آپ نے بے شک پھوپھی بیگم کے حکم پر اپنا پہناوا تبدیل کیا ہے لیکن جتنے قرینے سے اسے زیب تن کرتی ہیں اس سے آپ کی نفاست پسندی صاف ظاہر ہوتی ہے اور اس نفاست پسندی کی وجہ سے ہی یہ لباس آپ پر خوب چلتا بھی ہے۔“ نواب زادہ اسد اللہ کی اس تعریف پر جوزفین کے رخسار مزید دہک اٹھے اور وہ کچھ مجھوب سے لہجے میں بولی۔

”یہ سارا تو سروری کا کمال ہے۔ اس نے ہی اس لباس کو قرینے سے پہننے میں میری مدد کی ہے۔“

”بہت خوب، آپ کی انکساری بھی کمال کی ہے۔ آپ کسی بات کے لیے خود کریڈٹ لینے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں حالانکہ ہمارے ہاں تو خواتین تعریف کی شدید تمنائی ہوتی ہیں لیکن آپ کا تو یہ حال لگتا ہے کہ کوئی آپ کے حسن کی تعریف کرے گا تو آپ کہیں گی، تعریف اس خدا کی جس نے مجھے بنایا۔“ نواب زادہ کی بے ساختگی سے کبھی اس بات پر جوزفین کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی کی آواز نے نواب زادہ کو مسحور کر دیا۔ ممکن تھا کہ وہ جوزفین سے اس کی ہنسی کی تعریف کر ڈالتا لیکن عین وقت پر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اسے خیال آ گیا تھا کہ اس کے بار بار تعریف کرنے سے کہیں جوزفین کو یہ گمان نہ ہو کہ وہ کوئی عیاش طبع شخص ہے جو اپنی لہجے دار باتوں کے جال میں اسے الجھانا چاہتا ہے۔ وہ بات بدلتے ہوئے بولا۔ ”آپ شیکسپیر کو پڑھیے۔ جب پڑھ چکیں گی تو ہم آپس میں اس پر تبادلہ خیال کریں گے۔“

”جی بہت بہتر۔“ جوزفین اسے اتنا ہی جواب دے سکی۔

”نواب اجازت۔ ہم نے آپ کا بہت وقت ضائع کر دیا۔ اب آپ آرام سے بیٹھ کر مطالعہ کیجیے۔“ وہ جواب تک کھڑے کھڑے ہی اس سے گفتگو کر رہا تھا، سنجیدگی سے بولا اور مضبوطی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے رہ جانے والی جوزفین دوبارہ کتاب کی طرف اپنی توجہ مبذول نہ کر سکی۔ نواب زادہ نے تو بے شک اپنی زبان روک لی تھی لیکن وہ پھر بھی اس کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”اللہ بس کیجیے۔ آپ کے یہ آنسو ہمارے دل پر گر رہے ہیں۔ آپ یوں دکھی رہے تو ہمارا دل پھٹ جائے گا۔“

گفتگو کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ آپ کے ہاتھ میں یہ کتاب دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ایک ہم ذوق میسر آ گیا ہے۔ کیا آپ کو بھی شیکسپیر پسند ہے؟“ اس کے سوال نے جوزفین کو گڑبڑا دیا کہ وہ جو اپنے سامنے شیکسپیر کے دوسرے مداح کو پا کر اتنا خوش ہے، اس کے جواب سے مایوس نہ ہو جائے لیکن پھر صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

”معاف کیجیے گا، مجھے پہلے کبھی شیکسپیر کو پڑھنے کا موقع نہیں ملا ہے اس لیے پسند یا ناپسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نصاب میں شامل کچھ چیزوں سے بٹ کر میں پہلی بار شیکسپیر کی کوئی کتاب پڑھ رہی ہوں اور ابھی آغاز ہی کیا ہے اس لیے کوئی رائے نہیں دے سکتی۔“

”آپ پوری کتاب پڑھ لیں پھر رائے دیجیے گا۔ جس یقین ہے کہ آپ جیسی خوش ذوق اور نفیس خاتون شیکسپیر کو پسند کیے بغیر رہ ہی نہیں سکیں گی۔“ نواب زادہ کو اس کے جواب نے مایوس نہیں کیا اور اس نے بڑے یقین سے اپنی رائے دی جسے سن کر جوزفین کے رخسار سرخ ہو گئے۔

”اپنے بارے میں آپ کی رائے میرے لیے حیران کن ہے۔ آپ بھلا مجھ سے واقف ہی کتنے ہیں۔“ اس نے اپنی بکھرتی دھڑکنوں کو قابو میں کرتے ہوئے نواب زادہ سے کہا۔

”بعض اوقات انسان کو جاننے کے لیے زیادہ طویل عرصے کی ضرورت نہیں پڑتی اور مختصر آشنائی میں بھی وہ ہماری سمجھ میں آ جاتا ہے۔ آپ نے اس حویلی میں جتنی تیزی سے اپنی جگہ بنائی اور جیسی آسانی سے یہاں کے ماحول کو اپنایا، یہ کام ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ ہم جانتے ہیں کہ پھوپھی بیگم نے آپ کو بڑے اصول و قواعد میں جکڑ رکھا ہے اور وہ آپ کے کھانے پینے سے لے کر پہننے اوڑھنے تک پر اپنی مرضی مسلط کر رہی ہیں لیکن آپ نے جین پر شکن لائے بغیر ان کی ہر بات مانی ہے حالانکہ اس سے قبل جو محترمہ یہاں ملازمت کرتی تھیں، انہوں نے پھوپھی بیگم کی پابندیوں کی وجہ سے ہی یہ ملازمت چھوڑ دی تھی۔“ اسد اللہ نے اس پر انکشاف کیا۔

”پابندیوں کو قبول کرنے سے میری خوش ذوقی اور نفاست کا جیسے اندازہ لگایا جاسکتا ہے؟ مجھے جیسی لڑکی کو تو اپنی مجبوریوں کی وجہ سے بھی یہ سب اپنانا پڑا ہے۔“ جوزفین کا لہجہ یاس زدہ ہو گیا۔

”ہمیں معلوم ہے کہ آپ اپنے مسائل کے ہاتھوں



چاند بانو نے اپنی محرومی انگلیوں سے فاروق کا ہاتھ تھاما اور نہایت درد بھرے لہجے میں بولی۔ آج وہ ربن کی خواہش پر بھاریہ ہاؤس آئی تھی۔ ربن نے کیتھرائن سے معلوم کر لیا تھا کہ فاروق کی طبیعت اب بہتر ہے۔ اس کے چیک آپ کے لیے چندی گڑھ سے آنے والے ڈاکٹر نے بھی اس کی طرف سے تسلی دی تھی چنانچہ ربن نے اسے کمو کی موت کی اطلاع دیگر تفصیلات کے ساتھ پہنچا دی تھی۔ البتہ اس اطلاع کو دینے سے پہلے اس بات کا اہتمام کر لیا تھا کہ چاند بانو اس کا غم بانٹنے کے لیے وہاں موجود ہو۔ یوں تو گولو اور کیتھرائن بھی تھے لیکن اپنی تمام تر محبت کے باوجود گولو میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ فاروق کو سنبھال پاتا بلکہ وہ تو خود ہی کمو کے مرنے کا سن کر اتنا دکھی ہو جاتا کہ اسے سنبھالنے کے لیے کسی کی ضرورت تھی۔ کیتھرائن سے اس کی گہری وابستگی کی ربن کو خبر تھی اس لیے اسے تسلی تھی کہ وہ گولو کو سنبھال لے گی۔ فاروق کے لیے البتہ اس نے چاند بانو کو ہی مناسب سمجھا تھا۔ اس کی زیرک نگاہوں نے چاند بانو کے دل میں بھیڑکتی فاروق کی محبت کی آگ دیکھی ہوئی تھی اور وہ جانتا تھا کہ مرد کو ٹوٹ کر چاٹنے والی عورت اسے سینے کے ہنر سے واقف ہوتی ہے۔ اس کی خواہش پر چاند بانو نے یہ ذمے داری اپنے سر لے لی تھی لیکن کمو کی موت کی خبر سن کر فاروق جس طرح ٹوٹ کر رویا تھا خود اس کا اپنا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔

”دل تو میرا پھٹ رہا ہے چاند بانو! میں بدبخت یہاں اس پُر فضا مقام پر بیٹھا دنیا جہان کے مزے اڑا رہا ہوں اور وہاں میرے ساتھیوں پر قیامت گزر گئی۔ تم نہیں جانتیں کہ جب اڈے سے کمو کا جنازہ اٹھا ہوگا تو وہاں کیا عالم ہوگا۔ دلوں پر قیامت ہی تو ٹوٹ پڑی ہوگی لیکن وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کا غم بانٹا ہوگا۔ کمو کا آخری دیدار کرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے ہوں گے تو انہوں نے ایک دوسرے کے آنسو پونچھے بھی ہوں گے۔ اس کے جنازے کو کندھا دینے والوں نے ایک دوسرے کے شانوں پر آنسو بہا کر غم ہلکا کر لیا ہوگا لیکن میں..... میں کیسا بد نصیب ہوں کہ نہ تو اس کا آخری دیدار کر سکا اور نہ جنازے کو کندھا ہی دے سکا اور اب یہاں تنہا بیٹھا رہ رہا ہوں تو کون ہے ان آنسوؤں کو سینے والا؟“

وہ کرب و اذیت کا شکار تھا۔ ایک طرف کمو کے مرنے کا غم تھا تو دوسری طرف سب سے دوری کا احساس مار

رہا تھا۔ شدید غم میں انہوں کی قربت میسر نہ آئے تو انہیں بھلے انسان کے حواس غائب ہونے لگتے ہیں۔ اس کے حواس بھی اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ تھانے میں سر پر لگائی جانے والی چوٹ نے اس کا اڈے سے عملی رابطہ ختم کر دیا تھا اور وہاں کے حالات سے بس اسی حد تک واقفیت ہو پاتی تھی جتنی ربن مناسب سمجھتا تھا۔ اڈے کے ساتھ ساتھ وہ جولیٹ سے بھی دور تھا اور یہ دوری مسلسل اس کے اعصاب پر بوجھ بنی ہوئی تھی۔ کمو کی موت کی اطلاع نے جیسے اس کے ضبط کے بندھن توڑ ڈالے تھے اور وہ آنسوؤں کی صورت اپنے سارے بوجھ بہا رہا تھا۔

”ہم شاید آپ کو بہت زیادہ اپنے نہ لگتے ہوں لیکن یقین کیجیے ہم آپ کے دکھ کو بہت اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں اور کسی لائق نہ ہوتے ہوئے بھی آپ کو آنسو بہانے کے لیے اپنا شانہ پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔“ تہایت دل سوزی سے کہتے ہوئے چاند بانو نے اچانک ہی اس کا ہاتھ چھوڑا اور اس کے مضبوط جسم کو اپنی نرم و نازک ہانہوں کے حصار میں لے لیا۔ فاروق کو تو شاید ایسے ہی کسی سہارے کی تلاش تھی۔ چاند بانو کی ہانہوں کے حصار میں وہ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتا رہا اور وہ بڑی ہنرمندی سے اسے سینتی اور تھکتی رہی۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن عورت کو قدرت کی طرف سے ودیعت کی کئی ساری صفات اس میں موجود تھیں۔ باوصف عورت جانتی ہے کہ کب اسے مرد کے لیے محبوبہ بننا ہے، کب دوست بن کر اسے بہلانا ہے اور کب ماں کی طرح اس کے زخموں پر سر ہم رکھنا ہے۔ وہ اس وقت فاروق کو کسی ماں کی طرح ہی سمیٹ اور سنبھال رہی تھی۔ اس کے انداز میں بڑی شفقت، بڑا گداز تھا۔ وہ اپنی جاووکی انگلیوں کو کبھی فاروق کے بکھرے بالوں پر چلا کر انہیں سنوارتی تو کبھی اس کی پشت کو سہلا کر تسلی دینے کی کوشش کرتی۔ فاروق کے اشکوں کو چھتے ہوئے خود اس کی جھیل سی آنکھوں سے کتنے اشک خاموشی سے بہ رہے ہیں، اسے اس بات کا بھی ہوش نہیں تھا۔ اس کا محبت میں قناعت پسند دل تو بس صرف یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ فاروق کسی طور سنبھل جائے اور یہ کام بہر حال ہو رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے سمٹ رہا تھا۔ اس کی ہچکیاں تاپوں میں آنے لگی تھیں۔ آنکھوں سے برستی برسات بھی کم ہو گئی تھی اور دل سے یہ غم نکلتا جا رہا تھا کہ اتنے بڑے غم کو سہارنے کے لیے اسے کوئی سہارا میسر نہیں ہے۔ چاند بانو کی گداز ہانہوں سے بڑھ کر بھلا اور کون سا سہارا ہو سکتا تھا اور اس کے بے لوث خلوص سے تو کسی طور



تربیب تھے۔ فاروق کا سر اس کے شانے پر لگا ہوا تھا اور وہ اب بھی اس کے وجود کو اپنی نازک بانہوں کے حصار میں لیے ہوئے تھی۔ ان کی نکھری ہوئی روٹھیں بڑے خالص پن کے ساتھ ایک دوسرے کو محسوس کر رہی تھیں لیکن روجوں کا یہ خالص پن دیکھنے والی نظروں کو نہیں دکھائی دیتا۔ ان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بالکل اچانک ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور کھلے دروازے کے فریم میں بھلا کی تصویر جڑی نظر آئی۔ وہ دونوں ہی دروازہ کھلنے کی آواز پر اس طرف متوجہ ہو گئے تھے اور بے ساختہ ہی ایک دوسرے سے الگ بھی ہوئے تھے۔

”سوری۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں آپ دونوں کو ڈسٹرب کر رہی ہوں۔ مجھے تو کرنشن نے بتایا تھا کہ مسٹر فاروق کے کسی عزیز کی ڈیوٹی کی اطلاع آئی ہے اور وہ ڈسٹرب ہیں تو میں حال معلوم کرنے آئی تھی۔ اس رنگین اور سنگین سچویشن کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔“ سوری کا لفظ ادا کر کے وہ طنز کے زہر میں ڈوبے تیران دونوں پر برسائے کے بعد اونچی ایڑھی کی سینڈل پر ٹھک ٹھک کرنی وہاں سے واپس چلی گئی۔ آج اسے کسی پرانی شناسا نے اپنے گھر انوائٹ کر رکھا تھا۔ اس نے فاروق سے بھی ساتھ چلنے پر اصرار کیا تھا لیکن فاروق خود پر طاری اداسی اور پڑمردگی کی وجہ سے راضی نہیں ہوا تھا۔ وہ جاتے وقت فاروق کے انکار کی وجہ سے خاصی مایوس ہوئی تھی اور اب واپس آ کر اس نے چاند بانو کو جس طرح اس کے تربیب پایا تھا، وہ اس کے لیے اشتعال کا باعث بنا تھا۔

اس کے اس رویے پر فاروق اور چاند بانو دونوں ہی کچھ دیر کے لیے اپنی اپنی جگہ دم بخود رہ گئے تھے۔ پھر فاروق نے ہی سنبھالا لیا اور دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اسے دیکھنا چاند بانو۔ اس بے چاری کو معلوم ہی نہیں کہ اپنے اندر کی آگ میں دھیمے دھیمے سننے میں کیسی راحت ہوتی ہے۔ یہ آگ کا ایک تند بگولا ہے جو ایک دم سے بھڑک اٹھنے اور دوسروں کو اپنی لپیٹ میں لے کر بھسم کر ڈالنے کے سوا کوئی ہنر نہیں جانتا۔“

”اسے ایسا ہی ہونا چاہیے فاروق صاحب۔ وہ بھلا بھالیہ ہے۔ ایک امیر و کبیر صاحب اختیار باپ کی اکلوتی بیٹی جو دنیا کی ہر شے کو اپنی رسائی میں تصور کرتی ہے۔“ چاند بانو نے بڑی فراست سے حقیقت کا اظہار کیا۔

”جو اپنی حیثیت کو یاد رکھتے ہیں، وہ محبت نہیں کر سکتے۔ محبت کرنے والوں کو اپنی نہیں، اپنے محبوب کی

بھی انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آخر کار اسے احساس ہو گیا کہ وہ چاند بانو کی نازک جان پر بہت بوجھ ڈالے ہوئے ہے اور وہ جو اس سے بالکل غیر مشروط محبت کرتی ہے اس بات کی حق دار نہیں کہ اس کو اتنا دکھ دیا جائے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا دکھ چاند بانو کا دکھ ہے کہ جسے چاہا جائے اس کے ہر جذبے، ہر کیفیت کو بھی اسی کی طرح محسوس کیا جاتا ہے۔

”کیوں میرے لیے خود کو دکھ دیتی ہو چاند بانو! کیوں اس راہ پر چلتی ہو جس پر چلنے میں بربادی کے سوا تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آنے والا۔ کیوں ایسے شخص پر اپنا خلوص نچھاور کرتی ہو جو تمہارے اصول جذبے کی پذیرائی نہیں کر سکتا۔ تمہاری یہ عنایتیں اور نوازیں مجھے شرمسار کر دیتی ہیں۔ مجھے تمہی داماں کے پاس کچھ ہوتا تو میں بھی جواب میں تمہیں کچھ دے پاتا۔ اب تو بس اندر ہی اندر گھٹنا رہتا ہوں اور تمہارے لیے کڑھتا رہتا ہوں۔“ چاند بانو کے شانے پر سر ٹکائے وہ جو کچھ بول رہا تھا، وہ اس کے اندر کی سچائی تھی۔ اس نے خود کو چاہنے والے بہت دیکھے تھے لیکن چاند بانو کی بات سب سے جدا تھی۔ وہ ان خاص لوگوں میں سے تھی جنہیں محبت کرنے اور اس کے اطوار نبھانے کا ہنر ودیعت کیا جاتا ہے۔ جو جانتے ہیں کہ محبت پانے کا نہیں بلکہ دیے جانے کا نام ہے۔

”ہم نے کب کبھی آپ سے کچھ طلب کیا ہے۔ ہم تو اس پر بھی خوش رہتے ہیں کہ آپ بے شک ہمارے جذبے کی پذیرائی نہیں کر سکتے لیکن اس کے قدر دان تو ہیں۔ اگر آپ اتنا بھی نہ کرتے تو یقیناً جانے ہم تب بھی آپ سے شکوہ نہیں کرتے کہ ہم سمجھتے ہیں ہمارے دل کا معاملہ بس ہمارا ہی معاملہ ہے اور ہمیں خود اس معاملے کو نبھانا ہے۔ اپنے اس معاملے کو نبھاتے اب چاہے ہم برباد ہوں یا آباد، ہمیں اس کی پروا نہیں ہے۔ ہم بس اسی میں خوش ہیں کہ ہمارے خانہ دل میں جو شخص آباد ہے، وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ آپ گھٹ کر اور کڑھ کر ہماری اس خوشی کے زیاں کا سامان کیوں کرتے ہیں، جب ہم طلب گار ہی نہیں تو آپ نہ دینے پر شرمسار کیوں ہیں۔ آپ کی یہ شرمساری ہمارے لیے تکلیف دہ ہے۔ اگر آپ کو اس شرمندگی سے بچانے کے لیے آپ کی محبت سے دست بردار ہو جانا ہمارے بس میں ہوتا تو ہم یہ بھی کر گزرتے مگر واللہ ہم بالکل مجبور ہیں۔“ وہ اپنی رس گھولتی آواز میں دھیرے دھیرے اپنی نئی کیفیت کو فاروق کے گوش گزار کر رہی تھی۔ ان لمحات میں وہ ایک دوسرے کے بہت



حیثیت یاد رکھنی پڑتی ہے اور محبوب کو ہمیشہ سب سے اونچے سنگھاسن پر بٹھایا جاتا ہے۔ جس کو بلند مقام نہ دیا جائے، وہ محبوب ہی کیا۔“ فاروق نے اس کے جواب پر تبصرہ کیا۔  
”یہ تو آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔ ہم تو خود اس بات کے قائل ہیں۔“ اس کی ہاں میں ہاں ملاتی چاند بانو کی آنکھوں میں تحریر جذبے اس کی سچائی کی تصدیق کر رہے تھے۔

☆☆☆

”باہر پولیس والے آئے ہیں دادا۔“ سجونے ربن کو اطلاع دی۔  
”ٹھیک ہے، اندر بلا لے۔“ اس نے اجازت دی۔  
پولیس کا آنا اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا بلکہ ایک طرح سے وہ ان کی آمد کا انتظار ہی کر رہا تھا۔

”آئیے آئیے انسپکٹر وکرم۔ اپن خود بھی آپ کی طرف کا چکر لگانے کا سوچ رہا تھا۔ کو کے قاتلوں کا کچھ پتا چلا کہ نہیں۔“ تھانے اور اڈے کا چولی دامن کا ساتھ تھا چنانچہ دونوں ہی طرف کے لوگ ایک دوسرے سے آشنا تھے۔ اسی آشنائی نے کچھ بے تکلفی بھی قائم کر دی تھی اس لیے ربن نے ایک سنتری کے ساتھ اندر داخل ہونے والے انسپکٹر کو اس کے نام سے مخاطب کیا تھا۔

”وہ کارروائی چالو ہے لیکن ابھی میں تیرے پاس کسی اور کام سے آیا ہوں۔“ انسپکٹر وکرم نے بیٹھنے کے لیے پیش کیے گئے موزوں میں سے ایک پر نکتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں جواب دیا۔

”کام تھا تو اپن کو بلوایا ہوتا۔ کیا اپنے آدمیوں سے کوئی شکایت ہے؟ تھانے میں خرچہ پانی ٹھیک سے نہیں پہنچا رہے ہیں؟ اگر ایسی بات ہے تو بولو، اپن ابھی آپ کے سامنے سالوں کی چھڑی گرا دے گا۔“ ربن جان بوجھ کر تجاہل سے کام لے رہا تھا ورنہ اسے اچھی طرح علم تھا کہ تھانے اور اڈے کے درمیان حساب کتاب کیسا چل رہا ہے۔ وہ خود ان معاملات پر نظر رکھتا تھا۔

”اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے دادا! اپن کسی دوسرے چکر میں ادھر آیا ہے۔ ادھر پارسی محلے کے قریب رات بڑا ہنگامہ ہوا ہے۔ محلے والوں کا کہنا ہے کہ رات کی تاریکی میں کچھ غنڈوں کا آپس میں جھگڑا ہوا تھا اور اس میں خوب مارم ماری ہوئی۔ ایک خالی مکان کے سامنے اور اندر بہت خون پڑا ملا ہے لیکن ان افراد کا کوئی پتا نہیں جن کا خون ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سارے زخمی فرار ہو گئے

یا انہیں ان کے ساتھی اپنے سنگ اٹھالے گئے۔ پولیس کو ان خون بہانے والوں کی تلاش ہے۔ خیال ہے کہ ایسی مارم ماری اڈے کے لوگ ہی کر سکتے ہیں اس لیے سارے شہر کے اڈوں کو چیک کیا جا رہا ہے۔ تیرا اڈا یہاں اپن کے علاقے میں ہے اس لیے تیرے سے پوچھنے اپن کو آنا پڑا۔“ ربن کو اندازہ تھا کہ اسے کچھ سن گن ہے اس لیے یہاں آیا ہے لیکن جان بوجھ کر انجان بن رہا ہے۔ اس نے بھی یہی انداز اختیار کیا اور بولا۔

”پارسی محلہ تو ادھر سے بہت دور ہے۔ ادھر سے اپنا کوئی حساب کتاب بھی نہیں جتا تو اپنا آدمی لوگ ادھر کیا کرنے جائیں گا اور جب کوئی گیا ہی نہیں تو جھگڑے تو دے گا بھی کوئی گنجائش نہیں۔“

”کل رات اڈے کے دو آدمی زخمی حالت میں اسپتال میں داخل ہوئے ہیں۔ پولیس کو شک ہے کہ کہیں انہیں اسی جھگڑے میں تو زخم نہیں آئے ہیں؟“ وکرم نے معنی خیز لہجے میں اس سے پوچھا۔

”پولیس کو انہوں نے اپنا بیان دے دیا ہوگا انسپکٹر۔ وہ رات فلم کا آخری شو دیکھ کر آرہے تھے کہ کسی نے لوٹنے کے لیے ان پر حملہ کیا۔ حملہ کرنے والے تعداد میں زیادہ تھے اس لیے سالا اپن کا آدمی لوگ زخمی ہو گیا ورنہ تم دیکھتے.....“

”اس بیان کی مجھے بھی خبر ہے لیکن کیا ثبوت ہے کہ اپنے آدمیوں کو وہ بیان تم نے نہیں رٹوایا اور اصل میں وہ رات پارسی محلے کے قریب ہونے والے جھگڑے میں زخمی ہوئے ہیں۔“ انسپکٹر نے ربن کی بات کاٹ دی اور تیز لہجے میں بولا۔

”آپ ایسا بولتے ہو تو آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟“ ربن کے لہجے میں بھی تیزی آئی۔

”حالات و واقعات اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ تم پولیس کو ایسا بھی بے خبر نہ سمجھو۔ ہمیں سب معلوم ہے کہ تمہارا مجو دادا سے کیا پھندا چل رہا تھا اور تم نے کیسے اس کی سن پسند لڑکی کو کھڑے گھاٹ بیاہ کر بمبئی سے نکال دیا۔ اسی لڑکی کو رخصت کروا کر برات نکلتے جا رہی تھی نا جب ان کو لٹیروں نے لوٹنے کی کوشش کی اور اتفاقاً تمہارے دو آدمی موقع پر وہاں پہنچ گئے۔ تمہارا ساتھی کو اسی جھگڑے میں مارا گیا تھا نا؟ کل رات کا سارا ہنگامہ کمو کے خون کا بدلہ لینے کی کوشش بھی تو ہو سکتی ہے۔“ حسب توقع پولیس والوں نے کڑی سے کڑی جوڑ لی تھی لیکن ربن یہ بھی جانتا تھا کہ پولیس



”اپنے کو خبر ہے کہ اپن چھوٹا غنڈا ہے۔“ اس نے اس انداز میں جواب دیا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس کی نظر میں سرکاری لوگ زیادہ بڑے غنڈے ہوں۔ انسپکٹر وکرم نے بھی اس کے جملے کی معنویت کو پالیا اور اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا تاہم اس بار وہ زبان سے کچھ نہیں بولا اور جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ایسے کیسے انسپکٹر..... اپنے جیونے کبھی آپ کو ایسے یہاں سے لوٹنے دیا ہے کیا۔ وہ دیکھیں وہ آپ کی خاطر کا سامان لے کر آیا ہے۔“ ربن نے یکدم ہی اپنا لہجہ بدل لیا اور دوستانہ انداز میں بولا۔

”جانے دو دادا۔ تم نے اپنی باتوں سے زبان ہی کڑوی کر دی ہے۔“ پھیلی ہوئی توند والے انسپکٹر وکرم نے یہ بات کہتے ہوئے چور نظروں سے جو کی طرف دیکھا جو بڑے سے خون میں نہ جانے کیا کیا سجائے لیے چلا آ رہا تھا۔ خون میں سچے ذائقہ دار پکوانوں کی خوشبو ہر سو پھیل رہی تھی اور انسپکٹر کے بڑے بڑے نتھنے پھڑکنے لگے تھے۔

”اپنے جیو کے ہاتھوں میں ایسا سواد ہے کہ آپ اپنی ساری کڑواہٹ بھول جائیں گے، بس ذرا آزما کر دیکھیں۔“ ربن کا لہجہ ایک بار پھر ذومعنی تھا لیکن وکرم محسوس نہیں کر سکا۔ فی الحال اس کی ساری توجہ خون کی طرف مبذول ہو گئی تھی اور وہ لبوں پر زبان پھیرتے خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ربن نے ایک بار پھر اسے بیٹھنے اور کھانے پینے کی دعوت دی تو وہ اپنے انکار پر قائم نہیں رہ سکا۔

”اڈے والوں کے طور طریقوں کا پولیس کو بھی پتا ہے دادا۔ پولیس کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ اڈے کے معاملات سے الگ رہے لیکن ایسا تب تک ہی ہو سکتا ہے جب تک بات اڈے کے اندر تک رہے۔ مارا ماری اور خون خرابے پر ہمیں حرکت میں آنا پڑتا ہے۔ ہمارے اوپر بھی سرکار کا زور ہوتا ہے۔ ہمیں بھی جواب دہی کرنا پڑتی ہے۔ ایسے میں ہم تمہارے سے پڑتال کرنے نہیں آئیں گے تو کدھر جائیں گے۔“ گو وکرم ذرا اکڑا اکڑا سا ہی دسترخوان پر بیٹھا تھا لیکن جیو کے ہاتھ کے ذائقے نے آہستہ آہستہ اسے نرم کرنا شروع کر دیا اور آخر وہ آلو کی ترکاری اور پودنے کی چینی میں کچوری ڈبو کر کھاتے ہوئے ربن سے دوستانہ لہجے میں مخاطب ہوا۔ اس کی اس تبدیلی پر ربن دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اسے وکرم کی کمزوریوں کا علم تھا۔

تھانے میں پابندی سے بیٹھنے والے نذرانے کے علاوہ جو

کے پاس کوئی ثبوت اور گواہ موجود نہیں ہے اور محض واقعات کے تال میل سے ان پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکتا اسی لیے اسی پُر اعتماد لہجے میں بولا۔

”آپ بادشاہ لوگ ہو۔ جو چاہو وہ سوچ سکتے ہو، پر آپ کا سوچا سارا درست ہو، یہ ضروری تو نہیں ہے نا۔ اپن کو اپنے اور مجھ دادا کے جھگڑے سے انکار نہیں ہے لیکن اپن اس جھگڑے کو اپنی دنیا کے اصولوں کے مطابق نمٹا لیے تھے۔ آپ اتنی خبریں رکھنے والے ہو تو کیا آپ کو خبر نہیں ہوگی کہ جیو کے اڈے کی گدی اپنے پاس کیسے آئی؟“ آخر میں اس کا لہجہ قدرے طنزیہ ہو گیا تھا۔

”خبر ہے اسی لیے تو سوچتے ہیں کہ جیو اپنی رسوائی کا بدلہ لینے کی کوشش کر رہا ہے اور تم اسے منہ توڑ جواب دیتے جا رہے ہو۔“ انسپکٹر وکرم اپنی جگہ پُر یقین تھا۔

”تو پھر تو آپ پہلے جا کر جیو کو پکڑو۔ وہ آپ کی تفتیش کو آگے بڑھانے میں مدد کر دے گا۔“ ربن کا مشورہ بڑا بے ساختہ تھا جسے سن کر انسپکٹر وکرم بل کھا گیا اور خشک لہجے میں بولا۔

”مشورے دینے کی ضرورت نہیں دادا۔ پولیس اپنا کام کرنا جانتی ہے۔“

”تو پھر آپ ہی حکم کرو کہ اپن آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہے۔ آپ کے الزام پر اپنے آدمیوں کو بے قصور ہی پٹکا باندھ کر آپ کے ہاتھ میں تو تھما نہیں سکتا۔“ ربن نے بھی ردعمل میں بے زاری کا مظاہرہ کیا۔

”میں تمہاری چالوں کو اچھی طرح جانتا ہوں دادا۔ تم ایسی آسانی سے ہاتھ آنے والوں میں سے نہیں ہو۔ پولیس بھی اس وجہ سے زیادہ سخت ایکشن نہیں لے رہی کہ ابھی تک کسی نے تمہارا نام لے کر پرچہ نہیں کٹوایا ہے اور نقصان میں بھی تم ہی زیادہ رہے ہو لیکن یہ سلسلہ چالور ہا تو ہمیں سختی سے ایکشن لینا پڑے گا۔ سرکار شہر کا امن خراب کرنے کی پرمیشن بالکل نہیں دینے والی۔“ انسپکٹر وکرم اسے دھمکانے لگا۔

”وہ جو آئے دن جگہ جگہ ہندو مسلم فساد ہو رہا ہے، وہ کیا سرکار کی اجازت سے ہو رہا ہے۔ جاؤ اپنی سرکار سے بولو پہلے اس ہنگامے کو تو روک کے پھر اڈے والوں کی فکر کرے۔“ ربن نے بھی خراب موڈ کے ساتھ اسے دوہرا جواب دیا۔

”ذرا ہلکا ہاتھ رکھو دادا۔ تم سرکار سے ٹکر نہیں لے سکتے۔ تمہارا اور سرکار کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔“



اس میں زیادہ کمال آپ ہے، اسے مس جوزفین۔ آپ ایک اچھی استاد ہیں اسی لیے آپ سے پڑھنے والے زیادہ تیزی سے سیکھ جاتے ہیں۔ بچے بھی آپ کی تعریف کر رہے تھے۔ وہ اپنی سابقہ ٹیچر کے مقابلے میں آپ سے زیادہ خوش ہیں۔“

”یہ تو میرے لیے خوشی کی بات ہے لیکن میں اس کے لیے صرف خود کو کریڈٹ نہیں دے سکتی۔ استاد کا ہنر بھی تب ہی کام آتا ہے جب اسٹوڈنٹ شو قین اور محنتی ہو۔“ اس نے عالیہ کے ساتھ بیٹھی عشرت جہاں کی نوٹ بک اس کی طرف بڑھائی۔ جس صفحے پر اس نے کام کیا تھا، وہ سرخ روشنائی سے بھر گیا تھا۔ سرخ روشنائی والا قلم جوزفین نے اس کے کام کی جانچ کے لیے استعمال کیا تھا اور کام میں اتنی غلطیاں تھیں کہ سرخ روشنائی ٹیلی روشنائی پر نسبت لے گئی تھی۔ عشرت جہاں اول روز سے عالیہ کی ہم سبق ضرور بنی ہوئی تھی لیکن سیکھنے کی طرف اس کی توجہ بالکل نہیں تھی۔ جوزفین کو قدرتی طور پر بھی وہ کچھ کم ذہانت کی مالک لگی تھی لیکن اس نے بھی اس چیز کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ پڑھانے کے دوران عشرت جہاں کو بہت نرمی سے اس کی اغلاط سے آگاہ کرتی رہتی تھی لیکن عشرت جہاں نے کبھی دلچسپی سے اپنی کمزوریوں کو سمجھنے اور انہیں دور کرنے پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بس مارے باندھے ہی عالیہ کے ساتھ بیٹھتی ہے۔ جوزفین نے بھی یہ بات سمجھ لی تھی کہ اس کی اصل شاگرد عالیہ ہی ہے لیکن ظاہر ہے وہ زبان سے اس کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ عشرت کو کچھ کہہ کر وہ نوابی خون کو چھیڑنے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ نوابی خون بھی کوئی ایسا ویسا نہیں، عذرت جہاں کی کوکھ سے جنم لینے والا تھا اور اتنی صاحب اختیار ماں کی بیٹی کی شان میں گستاخی کر کے وہ اپنی اچھی بھلی ملازمت سے بالکل بھی ہاتھ نہیں دھو تا چاہتی تھی لیکن احتیاط کے باوجود اس وقت اس سے چوک ہو گئی ہے..... اس بات کا علم اسے عشرت کے ایک دم مشتاکا کر کھڑے ہونے پر ہوا۔

دوسری چیز اس کا موڈ خوش گووار رکھنے میں مدد دیتی تھی، وہ تھی لذیذ پکوان..... اور سب جیسے ماہر باورچی کی موجودگی میں وہ وکرم کی یہ ضرورت آسانی سے پوری کر دیتا تھا۔

”اپن کو سب خبر ہے انسپکٹر صاحب! ادھر ہراو پر والا اپنے نیچے والے پر ڈنڈا اتان کر کھڑا رہتا ہے پر نیچے والوں کو بھی تو اوپر والوں کو شانت رکھنے کا ہنر آتا ہے نا۔ آپ بھی چاہو تو سرکاری توجہ سب پر سے ہٹا سکتے ہو۔ آپ کے پاس دماغ ہے بھی تو سرکاری نوکری کر رہے ہو اور ہماری طرح جھک مارتے نہیں پھرتے۔ آپ چاہو تو سرکار سب بھول بھال جائے گی۔ سرکار کے پاس ویسے بھی اتنی فرصت نہیں کہ ایک بات کو پکڑ کر بیٹھی رہے۔ ادھر تو دسیوں قصبے چلتے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے حساب کتاب دیکھنے ہوتے ہیں سرکار کو۔ اڈے پاڑوں کی دنیا پر تو ذرا کی ذرا نظر پڑتی ہے اور آپ چاہو تو یہ نظر ٹھہرے بغیر یوں چٹکی بجا کر گزر بھی جائے۔ سب آپ کے ہاتھ میں ہے۔“ ربن نے بھی اپنا لہجہ بدلا اور وہ انداز اختیار کیا جو دنیا کے تقریباً ہر فرد کو بھاتا ہے۔ تھوڑی تعریف، تھوڑی خوشامد بڑے بڑے کام بنا دیتی ہے۔ اب بھی یہی ہوا اور انسپکٹر وکرم بڑا مدبر بنا بیٹھیں انداز میں اپنے سر کو ہلاتا رہا، منہ سے کچھ بولنے کی اسے فرصت تھی نہ مہلت۔ سب بڑی پھرتی سے اس کی پلیٹ میں کچھ نہ کچھ رکھتا جا رہا تھا اور انسپکٹر اسی پھرتی سے اسے اپنے منہ میں رکھ کر معدے میں منتقل کرتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ آیا سنتری بھی پوری تندہی سے اپنے انسر کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس کی آمد تو یوں بھی بس انسر کی انسرانہ شان کے اظہار کے لیے تھی۔ باقی معاملات کیسے طے پاتے ہیں، یہ نہ اس کا مسئلہ تھا نہ اسے اس سے کوئی غرض تھی۔ انسپکٹر مع سنتری جب ربن کے اڈے سے رخصت ہوا تو ایک مکمل طور پر بدلا ہوا انسان تھا۔ اس تبدیلی میں ریشمی کپڑوں کے آن سٹلے سوٹوں نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا جو وقت روائی ربن نے بطور تجدید اس کے ساتھ کر دیے تھے اور جنہیں وہ اپنی بیوی کو پیش کر کے اپنی انسری سے مزید مرغوب کر سکتا تھا۔

☆☆☆

”گلد۔ آپ نے سارے جملے بالکل ٹھیک بنائے ہیں۔ آپ ذہین ہیں اور بڑی محنت سے سیکھ رہی ہیں اس لیے مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلدی انگریزی زبان کو سمجھنے لگ جائیں گی۔“ جوزفین نے عالیہ کی نوٹ بک چیک کرنے کے بعد اسے واپس اوناتے ہوئے تہنہ کیا تو وہ خوش ہو گئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

سپیس ڈائجسٹ

سولانس نالالالال



رجہ بلند ہے۔ عشرت جہاں کو اس رتبے کا خیال رکھنا ہوگا اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تو بہتر ہے کہ وہ آپ سے پڑھنا چھوڑ دیں۔ بغیر شوق کے پڑھ کر وہ اپنا اور آپ کا وقت ہی ضائع کریں گی۔ کیوں عالی..... ہم ٹھیک کہہ رہے ہیں نا؟“ اپنی بات کے اختتام پر اس نے بہن سے تائید چاہی۔

”آپ کی بات درست ہے بھائی جان لیکن پھوپھی بیگم کا مزاج برا ہم نہ ہو جائے۔“ عالیہ نے تشویش کا اظہار کیا۔

”پھوپھی بیگم کے تہرے نمٹنا ہمیں خوب آتا ہے۔ وہ ابا جان کو اپنی مٹھی میں لے کر اپنی من مانی کرتی ہیں لیکن ہم ان کے کچھ کرنے سے عمل ابا جان کو اپنا حامی بنا لیں گے۔“ اس نے مضبوط لہجے میں اپنے ارادے کا اظہار کیا تو جوزفین کی پریشانی میں کمی واقع ہو گئی اور وہ محسوس کرنے لگی کہ اسے پردیس میں جیسے کوئی مضبوط سہارا میسر آ گیا ہے۔

”آپ بے فکر ہو کر اپنا کام جاری رکھیں مس جوزفین۔ آپ کی کارکردگی اطمینان بخش ہے اس لیے کوئی آپ کو آپ کی جگہ سے نہیں بلا سکتا۔“ اس بار اسد اللہ کی مخاطب جوزفین تھی جس نے اس کی بات سن کر سر کو تھیبی جنبش دی اور دھیسے سروں میں بولی۔

”تھینکس آلات نواب زادہ صاحب! آپ نے میری ساری فینشن دور کر دی۔“

”شکر یہ تو ہمیں آپ کا ادا کرنا چاہیے کہ آپ یہاں کے سخت ماحول کے باوجود یہاں رکی ہوئی ہیں۔ اگر آپ نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا تو اصل نقصان ہمارا ہوگا۔“ اسد اللہ کے اس جواب پر اس کے گندمی چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اسے بالکل ایسا لگا جیسے اسد اللہ نے حویلی کے دیگر افراد کا نہیں بلکہ اپنے ذاتی نقصان کا ذکر کیا ہو۔

☆☆☆

”طبیعت کیسی ہے آپ کی؟“ معمول کے مطابق وہ صبح سویرے ورزش سے فارغ ہو کر کچھ دیر تازہ ہوا میں بیٹھا تھا کہ بسلا چلی آئی اور اس کے مقابل بیٹھ کر اس سے دریافت کرنے لگی۔ اتنی صبح کے وقت بھی وہ بالکل تک سک سے تیار تھی۔ تنگ موری کے پاجامے پر اونچے دامن کی جسم پر کسی ہوئی قمیض جس کا گریبان بے حد کشادہ تھا، اسے چھپانے سے زیادہ دکھانے کا کام کر رہی تھی۔ لباس کا ہم رنگ چٹا ہوا دو پٹاری کی طرح گردن میں پڑا ہوا تھا اور وہ مہارت کے ساتھ کیے گئے میک اپ میں دعوت نظارہ دیتی شے لگ رہی تھی۔ فاروق کوئی زاہد خشک نہیں تھا لیکن اسے کبھی بھی خود کو اس طرح پیش کرنے والی عورت متاثر نہیں کرتی تھی پھر یہاں معاملہ بھی الگ

اور ہمارے ایک اشارے پر بڑے بڑے انگریزی دان ہمارے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔“ اس نے ہنکا ہنکا بیٹھی جوزفین کے سامنے تقریر جھاڑی اور پیر پختی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے اس انداز پر جوزفین کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ ہنکا ہنکا سی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

”تشریف لے آئیے۔“ عالیہ نے جو خود بھی اس صورت حال پر بھونچکی رہ گئی تھی، سنبھل کر دستک کا جواب دیا۔ فوراً ہی کھلے دروازے سے نواب زادہ اسد اللہ اندر داخل ہوا۔

”خیریت.....؟ یہ آئے عشرت جہاں کیوں آگ کے تند بگولے کی طرح آپ کے کمرے سے برآمد ہوئی تھیں۔ ہم نے انہیں بڑے غضب ناک تیوروں کے ساتھ برآمدہ پار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔“ وہ جوزفین کی وہاں موجودگی سے انجان نہیں تھا لیکن اس کی طرف توجہ دے بغیر بہن سے مخاطب ہوا۔

”ان کا تو مزاج ہی کچھ ایسا ہے۔ آپ کو معلوم ہے نا کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر بونہی بھڑک اٹھتی ہیں۔“ عالیہ کے لہجے میں بیک وقت بے چارگی اور کوفت موجود تھی۔

”یہ تو ان کا موروثی مسئلہ ہے۔ اپنی والدہ کی بالکل صحیح جانشین ہیں وہ۔“ اسد اللہ نے بے ساختگی سے تبصرہ کیا اور پھر مسکراتے ہوئے دریافت کرنے لگا کہ عشرت جہاں کے مزاج کی برہمی کی موجودہ وجہ کیا ہے۔ جواب میں عالیہ نے پورا قصہ کہہ سنایا۔

”بلیوی..... میرا مقصد ان کی انسلٹ کرنا نہیں تھا۔ میں تو بس ایسے ہی ایک جنرل بات کر رہی تھی۔“ جوزفین نے پہلی بار اس گفتگو میں مداخلت کی اور اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

”لیکن افسوس کہ آپ ایک سچ بولنے کی غلطی کر بیٹھیں اور سچ ہمارے ہاں کے لوگوں سے برداشت نہیں ہوتا۔“

”نواب میں کیا کروں؟ کیا مجھے نواب زاہدی عشرت جہاں سے ایکسکوز کرنا چاہیے؟“ وہ حقیقتاً پریشان تھی۔ اب جبکہ اس کی ملازمت کا عبوری دور ختم ہو رہا تھا اور وہ مستقل ملازمت کے حصول کے لیے بڑی پرامید تھی کہ یہ ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا تھا۔

”بالکل بھی نہیں۔ اول تو آپ نے کوئی غلطی کی ہی نہیں ہے اور اگر ایسا ہوتا تب بھی استاد کی حیثیت سے آپ کا



تھا۔ اس کی نظروں میں بھی جو لیٹ کی تصویر اسے کچھ اور دیکھنے بھی کہاں دیتی تھی، ورنہ چاند بانو کے بے تحاشا حسن نے اسے اپنا اسیر نہ بنا لیا ہوتا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے قدرے توقف سے بے رخی کے ساتھ بھلا کے سوال کا جواب دیا۔

”آپ کو چند ہی گڑھ کے اسپتال میں چیک اپ کے لیے کب جانا ہے؟“ اس کی بے رخی کو محسوس کرنے کے باوجود بھلا نے اپنا دوستانہ انداز برقرار رکھا۔

”دو چار دن میں اسپتال والے خود ہی فون کر کے بتا دیں گے۔ میں نے دادا کو انفارم کر دیا ہے کہ اب میں زیادہ دن یہاں نکلنے والا نہیں ہوں۔ مجھے جلد بھئی واپس لوٹنا ہے۔“

”ایسی بھی کیا جلدی ہے؟“ اس کا جواب سن کر بھلا بے قراری سے بولی۔

”جلدی کہاں..... اتنے بہت سارے دن گزر گئے ہیں۔ مجھے اپنوں کے درمیان پہنچنے کی بے قراری ہے۔ اپنے پیاروں کی قربت میں رہوں گا تو زیادہ تیزی سے صحت یاب ہو جاؤں گا۔“ وہ جواب ضرور دے رہا تھا لیکن لہجے میں اب بھی محسوس کی جانے والی بے رخی تھی۔

”یہاں بھی آپ بالکل تہا کب ہیں؟ آپ کے کچھ اپنے تو یہاں بھی کہنی دینے آپ کے پیچھے پیچھے چلے آئے ہیں۔“ بھلا اس کی بے رخی کو زیادہ دیر کہاں برداشت کر پاتی، چنانچہ تلملا کر بولی۔

”آپ کا اشارہ یقیناً چاند بانو کی طرف ہے۔ وہ واقعی بہت ہمدرد اور مسیحا صفت لڑکی ہے لیکن میرے زخموں پر برہم رکھتے خود اس کی انگلیاں ٹکار ہو جائیں، مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ وہ میری خاطر یہاں آتی ہے اور بے عزتی اٹھا کر واپس جاتی ہے تو میں اپنے آپ میں کٹ کر رہ جاتا ہوں۔ بہتر ہے کہ میں ایسی جگہ پر ہی نہ رہوں جہاں مجھ سے محبت کرنے والوں کو مجھ سے محبت نہ ہونے کے لیے زخم زخم ہونا پڑے۔“ اس نے بغیر کسی لگی لپٹی کے بھلا کے طنز کا کھل کر جواب دیا۔

”آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں فاروق! میرے جس رے ایکشن کو آپ چاند بانو کی انسلٹ سمجھ رہے ہیں، وہ بالکل نیچرل تھا۔ بند کمرے میں آپ کو ایک طوائف کی ہانہوں میں دیکھ کر میں اسی طرح کاری ایکشن دے سکتی تھی۔“

”پلیز سٹاپ۔ میں نے آپ کو پہلے بھی چاند بانو

کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرنے سے منع کیا تھا۔ رے آپ کے رے ایکشن کی بات تو آپ کو اس طرح رے ایکٹ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں آپ کا شوہر نہیں ہوں جو آپ مجھ سے میرے کسی عمل کے لیے باز پرس کر سکیں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر بھلا کو مزید بولنے سے روکا اور کھل کر بولتا چلا گیا۔ اس کی بات سن کر بھلا کا چہرہ تو بین کے احساس سے سرخ پڑ گیا لیکن اس نے خود پر قابو پالیا اور مفاہمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولی۔

”اچھا پلیز جانے دیں۔ میں مان لیتی ہوں کہ میں اور رے ایکٹ کر گئی تھی لیکن وہ میری بھی مجبوری تھی۔ آپ کو شاید اندازہ نہیں ہے کہ ہم عورتوں میں جیسی کچھ زیادہ ہوتی ہے، ہم کسی کو خود سے زیادہ اہمیت پاتا نہیں دیکھ سکتیں۔“

”آپ جیسی تعلیم یافتہ خاتون سے ایسے رویے کی کم از کم میں امید نہیں رکھتا تھا۔ ہر پاشعور انسان یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ اس سے وابستہ لوگ صرف اسی سے وابستہ نہیں

ہوتے۔ ان کے دوسرے بھی رشتے نانتے اور تعلقات ہوتے ہیں اور ہر تعلق کو نبھانا پڑتا ہے۔ ہر تعلق کی اپنی اہمیت اور وقعت ہوتی ہے۔ آپ یہاں میرے ساتھ تعلق رکھنے والے صرف تین افراد کو برداشت نہیں کر پار ہی ہیں جبکہ مجھ سے تو اور بھی بہت سے لوگ وابستہ ہیں۔ آپ کس کس سے

جیلس ہوں گی اور کس کس کو مجھ سے دور رکھنے کی کوشش کریں گی۔ اس مشکل سے بہتر تو یہ ہے کہ آپ خود میری دوستی سے کنارہ کشی اختیار کر لیں کیونکہ میں تو آپ کی خاطر سب سے نانتا توڑنے سے رہا۔“ فاروق کی صاف گوئی عروج پر تھی۔ وہ اس فطرت کا انسان نہیں تھا لیکن بھلا کے

رویے نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس حد پر جا کر اس سے بات کرے۔ اس امیر زادی کا دماغ ٹھکانے پر رکھا جائے، یہ بہت ضروری ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ نہ جانے کیا کیا نکل کھلاتی اور فاروق کو اپنے پیاروں کی بے عزتی گوارا نہیں تھی۔ بھلا پر اس کے اس رویے کا واضح اثر ہوا اور وہ غصے سے سرخ چہرہ لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تیز لہجے میں بولی۔

”آپ میری انسلٹ کر رہے ہیں۔“

”اگر آپ دوسروں کی انسلٹ کرنے کی عادت ترک کر دیں تو خود بھی اس چیز سے محفوظ رہیں گی۔“ فاروق نے اس کے لہجے کا اثر لیے بغیر اطمینان سے جواب دیا۔

”جو جس لائق ہو اس کے ساتھ میرا وہی بیہویر ہوتا ہے۔ آپ ایک طوائف کو میرے مد مقابل لا کر اس کی



ایسے شملہ جانے والے ڈاکٹر نے بھی اس کی طرف سے خاصا اطمینان دلایا تھا اس لیے اصولی طور پر اس کا اب شملہ میں رکے رہنا غیر ضروری تھا۔ کمو کے انتقال کے بعد سے تو فاروق نے ضد ہی باندھ لی تھی کہ وہ بمبئی واپس آنا چاہتا ہے اور ربن بھی اب اس کی واپسی کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن اس کے واپس آنے سے قبل کچھ معاملات نمٹ جاتے تو اچھا تھا۔ ان میں سے ایک کام انگریز افسر ولیم سے بدلہ لینے کا بھی تھا۔ زمر دبا کی کے کوشے پر چاند بانو کے سلسلے میں ہونے والے تنازعے میں مجبوراً داد کے ساتھ ولیم بھی ایک فریق تھا۔ فاروق نے تنہا اس سارے معاملے کو بخوبی نمٹا دیا تھا لیکن بعد میں ولیم نے اپنے اثر و رسوخ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نہ صرف فاروق کو تھانے میں بند کروا دیا بلکہ وہاں اس پر وہ وحشیانہ تشدد کیا گیا جس کے نتیجے میں اس کی زندگی خطرے میں پڑ گئی اور سر پر مہلک چوٹ آئی جو ابھی تک فاروق کے لیے تکلیف کا سبب بنی ہوئی تھی۔ ولیم کا یہ جرم ناقابل معافی تھا۔ اگر وہ اس واقعے کے فوراً بعد اپنے اہل خانہ کے ساتھ انگلستان نہ چلا گیا ہوتا تو اس کا حساب فوری طور پر برابر کر دیا جاتا لیکن تاک میں تو وہ لوگ بہر حال اب بھی تھے اور ولیم کے واپس پہنچنے کی خبر پر جوش انتقام پھر

خاطر میری انسلٹ نہیں کر سکتے۔ میں اسے اچھی طرح دیکھ لوں گی۔ وہ غصے سے بولی اور تنہائی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ پیچھے فاروق ماتھے پر ہل لیے اس صورت حال پر غور کرتا رہ گیا۔

☆☆☆

”گورا افسر ولیم واپس لوٹ آیا ہے دادا۔“ رامونے اطلاع دی تو ربن فوری طور پر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”کب.....؟ کب لوٹا وہ حرام کا جنا؟“

”پرسوں ہی واپس آیا ہے۔ اپنے کو آج خبر ملی ہے۔“ رامونے اسے بتایا۔

”بس تو پھر موقع دیکھ کر بجا ڈال اسے۔ ادھر وہ شہزادہ واپسی لوٹنے کے لیے اُتار دیا ہو رہا ہے۔ اس کے

لوٹنے سے پہلے یہ حساب برابر ہو جائے تو اچھا ہے۔ لونڈیا والا معاملہ تو اپن نمٹا نہیں سکے۔ وہ منہ سے کچھ نکالتی تو اپن

کچھ کر پاتے اور شہزادے کو دلا سا بھی دے پاتے کہ اس کی معشوقہ کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والے کا کتنا برا انجام کیا ہے

اپن نے۔“ ربن نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ اصل میں اس نے محسوس کر لیا تھا کہ فاروق کو اب مزید شملہ میں روکے رکھنا

ممکن نہیں ہوگا۔ اس کی طبیعت بہت بہتر تھی اور معائنے کے

گرماتے جون کی جنوں خیزی  
جاسوسی کے شمارے کی فرحت انگیزی

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

حق نمک اور حق دار کے درمیان فاصلوں اور قربتوں کے مراحل طے کرتی ایک  
پراثر داستان زندگی احمد اقبال کے قلم کی زور آوری  
شریف آدمی کو بد معاش بننے پر مجبور کر دینے والے قانون شکن عناصر کی یکجائی  
جنم لینے والا ہولناک سلسلہ طاہر جاوید سفیل کے قلم سے

- اولین سوغات
- انگارے
- آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا تنہا مسافر کی آبلہ پائی...  
عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی

سرورق کی کہانیاں

- پھلا رنگ ● محبت، ایفت اور نفرت کی ان دیکھی فیصل امجد رنیں کی تیکھی کہانی
- دوسرا رنگ ● دولت لوروس کا کھیل جنون بن چکا تھا۔ محمد فاروق انجم کا تیکھا سڑن



آپ کے تبصرے...  
مشوے... محبتیں... شکایتیں...  
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتنا میں



تازہ ہو گیا تھا۔

ہے۔ جانی نے بھی قدرے تاخیر سے اسے دیکھ لیا اور جلدی سے ہاتھ میں موجود بیڑی ایک طرف پھینک دی۔ ربن نے گردن کے خفیف سے اشارے سے اسے اپنے قریب بلا یا تو وہ تیزی سے اس تک پہنچ گیا۔

”سب ٹھیک ہے رے؟“ ربن نے یونہی اس سے رپورٹ لی۔

”ہاں دادا! سب ایک دم پر فیکٹ ہے۔“ جانی نے اسے جواب دیا۔

”جولی دفتر سے آجائے تو اپنے کو خبر کرتا۔“ ربن نے اسے حکم دیا۔

”سسز تو آج دفتر گیا ہی نہیں۔ گھر پر ہی ہے۔“ جانی نے اسے اطلاع دی۔

”چل تو پھر اپن ابھی اس سے مل لیتے ہیں۔“ ربن نے کہا اور جانی کو ساتھ لے کر جولیٹ کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ انہیں دروازے پر دو بار دستک دینی پڑی تب جولیٹ کی طرف سے رد عمل ظاہر ہوا اور کون ہے پوچھتے ہوئے اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے حلیے سے لگ رہا تھا کہ وہ بستر سے اٹھ کر آ رہی ہے۔ اس کا لباس شکن آلود اور بال الجھے ہوئے تھے۔ چہرہ بھی بغیر دھلا لگ رہا تھا لیکن ہاتھ میں موجود ٹنٹلیں جلد والی ڈائری کی موجودگی سے ظاہر تھا کہ وہ سو نہیں رہی تھی لیکن وہ تازہ دم بھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں میں شکن سی تھی۔ اصل میں وہ جوزفین کی ڈائری پڑھ رہی تھی اور اس ڈائری میں درج واقعات پڑھتے ہوئے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جو آج تک یہ سمجھتی رہی تھی کہ اس کے ماں باپ ایک دوسرے سے بے تماشاً محبت کرتے تھے اور انہوں نے لومیرج کی تھی تو یہ کوئی ایسی درست بات نہیں تھی۔ کم از کم جوزفین نے جوزف سے محبت نہیں کی تھی۔ وہ تو کسی نواب زادہ اسد اللہ کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی لیکن اس محبت کا کیا انجام ہوا اور جوزفین کی جوزف سے شادی کیسے ہوئی، اسے یہ جاننے کے لیے ابھی ڈائری کے بہت سے ابواب پڑھنے تھے۔ ربن اور جانی کی آمد نے اس کام میں خلل ڈال دیا تھا۔

”آپ لوگ.....“ ان لوگوں کو دروازے پر پا کر اس نے قدرے حیرت سے کہا۔

”ہم تیرا حال پوچھنے آئے تھے بٹیا! ہمیں اندر نہیں بلائے گی؟“ ربن نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ فاروق کے حوالے سے وہ اسے عزیز تھی۔ فاروق اس کی محبت حاصل کر پاتا یا نہیں، اس سے قطع نظر اس کی اہمیت کے لیے یہی کافی

”اپن کا آدمی لوگ گورے کا گمرانی کر رہا ہے۔ تمہاری طرف سے حکم ملتے ہی کام ہو جائے گا۔“ رامونے اسے صورت حال سے آگاہ کیا اور پھر مشورہ دینے کے انداز میں بولا۔

”میری ماں تو دادا، فاروق کو واپس بلانے سے پہلے ایک بار پھر جولی سے مل کر اس..... کا نام معلوم کرنے کی کوشش کرو جو اس کا مجرم ہے۔ اس..... کو ٹھکانے لگائے بغیر اپن فاروق استاد کا سامنا کرنے میں بڑی شرم محسوس کرے گا۔ اپن کو معلوم ہے وہ اس خبر کو سن کر بہت بری طرح تڑپے گا۔ اس کی تسلی کے لیے اس..... کو انجام تک پہنچانا ضروری ہے۔“ وہ ہر بار جولی کے مجرم کا ذکر کرتے ہوئے اپنے جملے میں ایک بڑی سی گالی ٹانک دیتا تھا۔

”تو ٹھیک کہتا ہے۔ چل آج ہی ایک کوشش اور کر ڈالتے ہیں۔“ ربن نے فوراً ہی اس کا مشورہ قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ موضوع گفتگو بدل کر اڈے کے دیگر معاملات پر بات کرنے لگے۔ اس وقت ربن مجبوراً دادا والے اڈے پر تھا۔ یہاں کا انتظام وانصرام دیکھنے کے لیے وہ چکر لگاتا رہتا تھا جبکہ رامونے زیادہ تر رہتا ہی وہیں تھا۔ پرانے اڈے پر اس کا آنا جانا حسب موقع ضرورت ہوتا تھا۔ جیسے کمو کی موت کے موقع پر وہاں زیادہ رہا تھا اور بعد میں اس کے خون کا انتقام لینے کے لیے بھی اس نے دیگر ساتھیوں کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ فی الحال کمو کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانے والا معاملہ بھی کھٹائی میں پڑا ہوا تھا۔ فیرکا اور جو گلدھے کے سر سے سینک کی طرح غائب تھے اور انہیں اصل بدلہ ان دونوں سے ہی چکانا تھا۔

ربن نے تقریباً آدھا گھنٹا مزید وہاں گزارا اور پھر واپس جانے کے لیے اٹھ گیا۔ رامونے باہر تک آ کر اسے رخصت کیا۔ داداؤں کی عادت ہوتی ہے کہ اپنے دو چار چیلوں کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں لیکن ربن عموماً اپنے ارد گرد بھیڑ بھاڑ لگانے سے گریز کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ تنہا ہی تھا۔ پرانے اڈے کے علاقے میں داخل ہوتے ہی اس کی عقابانی نظروں نے تیزی سے اطراف کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس کے آدمی اڈے کے اطراف کے علاقے میں پھیل کر اپنی ڈیوٹی دیتے رہتے تھے تاکہ کسی بھی غیر معمولی واقعے کی خبر رہے۔ باخبر رہنا علاقے پر اپنے کنٹرول کے لیے از حد ضروری تھا۔ بظاہر بے نیازی سے چلتے ہوئے اس نے دیکھ لیا کہ جانی ایک دکان کے قریب بیٹھا بیڑی پی رہا



تھا کہ وہ فاروق کی محبت تھی۔

”کس کو رہنا ہے اور کس کو جانا ہے، اس کا فیصلہ تو وہی کرنے والا ہے جس نے یہ سنسار بنایا ہے۔ یہ تو تو سوچتی ہے کہ تیرا سب کچھ ختم ہو گیا پر اصل میں جاننے والا تو وہ ہے کہ اس نے تیرے لیے کیا کیا رکھا ہوا ہے۔ اچھا برا وقت تو آدمی پر آتا ہی رہتا ہے۔ تو ہر وقت یہی سب سوچ کر اپنی جان مت گھلاتی رہا کر۔ لوگوں سے مل جل کر کہیں آ جا تو تیرا من پہلے گا۔ یہ سارے محلے والے تیرے اپنے ہیں۔ دوست رشتے دار بھی ہوں گے۔ ان کے پاس آیا جایا کر۔“ ربن نے اسے مشورہ دیا اور چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔ ساتھ آیا جانی بھی خاموشی سے چائے پی رہا تھا۔ فی الحال اسے اس گفتگو میں حصہ لینے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ربن صرف احتیاطاً اسے اپنے ساتھ لایا ہے کہ جوان اور تنہا لڑکی سے ملاقات کے لیے اکیلے جانا لوگوں کو انگلیاں اٹھانے کا موقع دے سکتا تھا۔

”جو مجھ پر بیٹی، اس کے بعد سب تعلق ختم ہو گئے ہیں۔ محلے والوں کو میری تنہائی بانٹنے سے زیادہ اس بات کی کھوج رہتی ہے کہ میں اپنے ساتھ بیٹی کو کھل کر بتاؤں۔ دوستیاں کوئی ایسی خاص تھی نہیں۔ بس ایک دوست بنا با تھا اور ساری زندگی اس کے ساتھ رہنے کا خواب دیکھا تھا لیکن وہ بولا کہ اب میں اس کے قابل نہیں رہی۔ رشتے دار کبھی دیکھے ہی نہیں۔ دونوں طرف کے گرینڈ فادرز اور گرینڈ مدرز کی مام ڈیڈ کی میرج سے پہلے ڈیڈ تھے ہو گئی تھی اور مام ڈیڈ دونوں ہی اپنے پیرنس کی انگوٹھی اولاد تھے تو رشتے دار کہاں سے آتے۔ اب آپ بولو کہ میں کہاں اور کس سے ملنے جایا کروں؟“ وہ آج ذرا مختلف موڈ میں تھی جو ربن سے اتنی تفصیل سے بات کر رہی تھی۔ ربن نے محسوس کر لیا کہ وہ بہت دکھی اور مایوس ہے لیکن وہ کوئی سراہا تھا میں دیتی، تب ہی تو وہ اس کے دکھ کا مداوا کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر جو لیت کا مجرم کیفر کردار کو پہنچ گیا تو وہ اپنی اس کیفیت سے باہر آ سکتی ہے۔

”کچھ دن چیچے ادھر موٹر میں ایک آدمی تیرے لیے پھول اور تحفے لایا کرتا تھا۔ وہ آدمی تو اپنے حلیے سے ڈریور (ڈرائیور) لگتا تھا اور معلوم پڑتا تھا کہ کسی اور کی طرف سے آتا ہے۔ ایک بار تو موٹر میں بیٹھ کر گھر بھی لوٹی تھی..... تو وہ موٹر والا کون ہے تیری پہچان میں؟ کیا اس نے بھی تجھ سے ناتا توڑ لیا؟“ ربن نے اتنا اچانک یہ ذکر چھیڑا کہ جو لیت شیٹا کر رہ گئی اور اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ربن نے اس کی اس تبدیلی کو فوراً محسوس کر لیا اور سمجھ گیا کہ بالکل

”آجائے۔“ جو لیت اس وقت تنہائی کی خواہاں تھی لیکن ربن کو انکار کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اڈے والوں کے لیے اس کے دل میں لاکھ ناپسندیدگی ہو، وہ یہ بات فراموش نہیں کر سکتی تھی کہ انہوں نے ہر مشکل گھڑی میں اس کی اور اس کے گھر والوں کی مدد کی تھی۔

”آج دفتر نہیں گئی تو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ وہ برآمدے میں رکھی میز کے گرد موجود کرسیوں پر آ بیٹھے تب ربن نے اس سے دریافت کیا۔

”جی بس ذرا سر میں درد تھا اس لیے چھٹی کر لی تھی۔ آپ لوگ بیٹھیں، میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ جو لیت نے کہا اور باورچی خانے کی طرف چل دی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے ہوئے تھے۔

”اپنا تیرے کو چائے بنانے سے منع کرنے کا سوچ رہا تھا پھر اس لیے نہیں روکا کہ بنیا کے ہاتھ کا سوا وہی چکھ لیں گے۔“ وہ ان لوگوں کے ساتھ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تو ربن نے اس سے کہا۔

”مجھے اچھی لکنگ نہیں آتی۔ می نے خود ہی کچن سنبھالا ہوا تھا۔ میں تو بس کبھی کبھی ہی کچھ بنا لیتی تھی۔“ جو لیت نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ جوزف اور جوزفین کی زندگی میں اس میز پر ایسی رونق ہوتی تھی۔ جوزفین کے ہاتھ کا ڈانقتہ ان دونوں باپ بیٹی کو بے حد بھاتا تھا اور وہ فرمائشیں کر کر کے اس سے خاص کھانے بنواتے تھے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے جوزفین نے اس کا پسندیدہ لوکی کا حلوا بنایا تھا۔ اب کون تھا جو اس کا ایسا خیال کرتا اور اسے اس کی من پسند چیزیں بنا کر کھلاتا۔ اب تو بس جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ زہر مار کر لیتی تھی۔ زبان نے ذائقوں کو محسوس کرنا کب سے چھوڑ دیا تھا۔

”تو پڑھنے لکھنے والی، نوکری کرنے والی لڑکی ہے۔ تیرے پاس چولہا چوکی سنبھالنے کا ٹائم ہی کدھری تھا۔ تو جو کر رہی ہے تیرے لیے وہ ہی اچھا ہے۔ چولہا چوکی تو دنیا کی بہت عورتیں سنبھالتی ہیں۔ تیری جیسی ذہین اور پڑھی لکھی لڑکیاں کم ہوتی ہیں۔“ ربن نے جیسے اس کی دل جوئی کی۔

”مجھے جیسی ان کئی لڑکیاں بھی تو کم ہوتی ہیں۔ کیا بچا ہے میرے پاس۔ ماں باپ، عزت سب چلے گئے۔ میں پتا نہیں کیوں پٹی ہوں.....“ وہ یاسیت کا شکار تھی۔



ہے تیری سہیلی تو تو اسی سے ملنے چلی جایا کر۔“ ربن نے جیسے اس کی بات کو تسلیم کر لیا جس پر جو لیٹ کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور وہ ذرا سا مسکراتے ہوئے بولی۔  
 ”آپ میری اتنی فکر مت کریں۔ میں ٹھیک ہوں۔  
 کچھ دن اور گزریں گے تو اور بھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ بری یادوں کو بھلانے میں کچھ ٹائم تو لگ ہی جاتا ہے۔“  
 ”یہ بھی آدمی کے اپنے اوپر ہوتا ہے کہ وہ کتنا ٹائم لیتا ہے۔ اپنے زخموں کو بیٹھ کر ادھیڑتے رہنے والے کو کبھی کبھی نہیں بھولتا اور زخم تازہ ہی رہتا ہے۔“ ربن کا لہجہ ناصحانہ ہو گیا۔

”کبھی کبھی آدمی کو نہ بھرنے والا زخم بھی لگ جاتا ہے۔“ جو لیٹ کے اس جملے نے واضح کر دیا کہ کچھ دن بعد ٹھیک ہو جانے کی بات اس نے محض ربن کو ٹانے کے لیے کہی تھی ورنہ وہ کچھ بھی بھلانے پر راضی نہیں تھی۔  
 ”آدمی کسی کو اپنے زخم پر مرہم رکھنے ہی نہ دے اور بولے کہ میرا زخم نہ بھرنے والا ہے تو یہ بڑی جیازتی..... (زیادتی) کی بات ہے۔ پر ٹھیک ہے جیسا تو صحیح سمجھے۔ اپن کو اب اجازت دے۔ اپن بس تیرا حال معلوم کرنے آئے تھے۔ کوئی بھی کام یا ضرورت ہو تو اپنے پاس پیغام بھیج دینا۔ اپن اب چلتا ہے۔“ ربن نے بالکل اچانک ہی بات ختم کر دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ جانی اور جو لیٹ نے بھی اس کی تھلید کی۔ وہ تینوں آگے پیچھے چلتے ہوئے بیرونی دروازے تک پہنچے۔ دروازے پر پہنچ کر ربن نے جو لیٹ کے سر پر ہاتھ رکھا اور جانی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ان کے پیچھے دروازہ بند کر کے جو لیٹ نے بے ساختہ ہی ایک گہرا سانس لیا۔ اسے پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ ربن کس قدر بیدار مغز آدمی ہے۔ اپنے طور پر اس نے اسے ٹال تو دیا تھا لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ اپنی اس کوشش میں کتنے فیصد کامیاب رہی ہے۔ ادھر ربن بھی سوچ رہا تھا کہ جو ایک معمولی سا سرا ہاتھ آیا ہے، اسے تمام کر کس طرح حقیقت تک پہنچے۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے میں لگا ہوا تھا۔

☆☆☆

”ٹیکسپیٹر کی تحریر زندگی سے بہت قریب ہے۔ اس کا لکھا ایک ایسے شخص کا لکھا ہے جو زندگی کو سمجھتا تھا۔ آپ اس کی اس مشہور زمانہ بات کو ہی لے لیجئے کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہر شخص اس اسٹیج پر اپنا کردار ادا کر کے واپس چلا جاتا ہے۔ یہ بات حقیقت سے کتنی قریب ہے۔ آپ دیکھیے کہ

صحیح نشانے پر تیرا مارا ہے۔ اڈے کے اطراف میں بکھرے اپنے آدمیوں کے ذریعے اسے محلے میں ہونے والی ہر سرگرمی کی خبر رہتی تھی لیکن چونکہ وہ محلے داروں کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی نہ کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھا اس لیے کبھی جو لیٹ کے اس معاملے پر بھی زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اب بالکل اچانک خیال آ گیا تھا کہ اس سلسلے کی کڑی کے ساتھ ہی کہیں جو لیٹ کے اغوا کی کڑی بھی نہ جڑی ہوئی ہو۔ اغوا کے واقعے کے بعد ایک بار بھی اس موٹر اور ڈرائیور کو محلے میں نہیں دیکھا گیا تھا۔  
 ”تو نے جواب نہیں دیا اپن کو.....؟“ جو لیٹ کو خاموش پا کر ربن نے اسے ٹوکا۔

”وہ..... میں سوچ رہی تھی کہ آپ کس بارے میں بات کر رہے ہیں۔“ جو لیٹ سنبھلی اور وضاحت پیش کرنے کے انداز میں بولی۔ ”وہ موٹر تو میری ایک فرینڈ کی تھی۔ وہ میرج کے بعد پنجاب چلی گئی تھی۔ کچھ دن پہلے اس کا بیٹی آنا ہوا تھا تو اس نے مجھے ملنے کے لیے بلا لیا اور بعد میں اپنے ڈرائیور سے واپس گھر بھی بھجوایا۔ وہ امیر لڑکی ہے اس لیے مجھے کنٹریس بھیجتی رہتی تھی لیکن میں اس لیے واپس کروا دیتی تھی کہ میں بدلے میں اسے کوئی قیمتی گفٹ نہیں دے سکتی تھی۔“ وہ سمجھ گئی تھی کہ جہاں اتنا سب کچھ ربن کے علم میں ہے تو یہ بات بھی وہ جانتا ہوگا کہ وہ ان تحائف کو شرف قبولیت نہیں بخشتی تھی اس لیے اس کی بھی وضاحت دے دی۔

”کیا نام ہے تیری اس سہیلی کا؟“

”شنا.....“ اس نے تھوک نلگتے ہوئے جواب دیا اور ثنا کا مکمل نام بتانے سے گریز کیا۔ ”تو نے بتایا کہ بڑی امیر لڑکی ہے تو اس کا سسرال بھی کچھ کم نہیں ہوگا۔ اس کے گھر والوں نے اتنی دور بیٹی یوں ہی تو اٹھا کر دے نہیں دی ہوگی۔ داماد بھی کوئی بڑا آدمی ہوگا، تجھے کچھ نام پتا معلوم ہے اپنی سہیلی کے شوہر اور اس کے خاندان کا؟“ ربن بالکل ٹھیک لائن پر چل رہا تھا جس کی وجہ سے جو لیٹ کی گھبراہٹ میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ تاہم اس نے ایک بار پھر خود پر قابو پایا اور بے نیازی کا منظر ابرہ کرتے ہوئے بولی۔

”یہ سب تو مجھے یاد نہیں۔ شنا نے نام بتایا تو ہوگا لیکن میرے ذہن میں نہیں رہا اور پتا میں نے اس لیے نہیں پوچھا کہ میں اس سے ملنے کے لیے پنجاب تو جانے سے رہی۔“  
 ”ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔ اتنی دور کون کسی سے ملنے جاتا ہے۔ اپن تو اس لیے پوچھ رہا تھا کہ اگر کہیں قریب رہتی



حویلی سے اس کا بوریا بستر ہی گول نہ کروادے لیکن فی الحال ایسی کوئی بات ہوئی نہیں تھی۔

”آپ بھی تو کچھ بولیے۔“ بولتے بولتے اسد اللہ کو احساس ہوا کہ وہ خود ہی بولے جا رہا ہے اور جوزفین اپنی کوئی رائے نہیں دے رہی تو چونک کر اسے ٹوکا۔ جوزفین جو سننے سے زیادہ اس کے دل آویز نقوش کو دیکھنے میں مصروف تھی، اس کے ٹوکے پر گڑ بڑائی اور اکتاتے ہوئے بولی۔

”آپ بولتے رہیں نا۔ مجھے آپ کو سننا اچھا لگ رہا ہے۔“

”ہمیں تو لگ رہا ہے کہ آپ کو سننے سے زیادہ ہمیں دیکھنا اچھا لگ رہا ہے۔“ نواب زادہ اسد اللہ اس کی کیفیت سے ایسا بے خبر نہیں تھا چنانچہ موقع پاتے ہی اسے جتا بھی دیا۔ اس کے جتانے پر جوزفین مزید گڑ بڑا گئی اور شرم سے اس کے رخسار سرخ ہو گئے۔

”جب کوئی اچھا لگے تو اسے بتا دینے میں کوئی ایسا حرج نہیں ہوتا جیسا کہ ہم آپ سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ زرد رنگ آپ پر بہت خوب لگ رہا ہے اور اس رنگ کو زیادہ پسند نہ کرنے کے باوجود ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آپ کو زرد رنگ کا لباس پہنے دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ رنگ بنا ہی آپ کے لیے ہو..... بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں سارے رنگ ہی آپ کے لیے تخلیق کر دہ لگتے ہیں۔ آپ کو جب جس جس رنگ میں دیکھا خوب ہی پایا۔ رنگوں سے ایسی دوستی پہلے کبھی ہم نے کسی کی نہیں دیکھی۔“ نواب اسد اللہ بولنے پر آیا تو بولتا ہی چلا گیا اور جوزفین کی آنکھوں میں بیک وقت حیا اور حیرت کے رنگ دوڑنے لگے۔ اتنی واضح تعریف سے تو ظاہر تھا کہ نواب زادہ اسد اللہ کی اس پر خصوصی نظر رہتی ہے اور یہ امر اس کے لیے خوشی کا باعث تھا۔ وہ خود تو پہلی نظر میں ہی اس سے متاثر ہو گئی تھی لیکن یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اسد اللہ بھی اس کے لیے ایسے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہوگا۔

”اتنی حیران کیوں ہو رہی ہیں۔ آپ کو تو پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا کہ ہم یہاں ڈسکشن کرنے سے زیادہ آپ کو دیکھنے کی خاطر آتے ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی ہاک نہیں ہے کہ ہم آپ سے متاثر ہیں حالانکہ ہم نے بہت سی ذہن اور خوب صورت لڑکیوں کی سنگت میں وقت گزارا ہے۔ لندن میں دوستوں کی فہرست میں کئی لڑکیوں کے نام بھی شامل تھے لیکن ان میں سے کسی نے ہمارے دل کو یوں اپنی طرف نہیں کھینچا جیسے آپ کھینچتی ہیں۔ آپ میں کچھ خاص

ہماری زندگی اس مقولے سے کتنی زیادہ قریب ہے۔ میں، آپ اور ہم سب یہاں اپنے مخصوص کردار ادا کر رہے ہیں اور دیکھنے والے نہیں بس ہماری اس دنیا کے اسٹیج پر موجودگی کی حد تک ہی جانتے ہیں۔ ہماری اس پر فارمنس سے پہلے اور بعد میں کیا ہے، کسی کو نہیں معلوم ہوتا جیسا کہ اسٹیج پر موجود فنکار کے بارے میں نہیں معلوم ہوتا کہ وہ پردے کے پیچھے سے نمودار ہونے سے پہلے کیا تھا اور پردے کے پیچھے واپس چلے جانے کے بعد کیا ہوگا۔ ہم سب اپنے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس دنیا میں آنے سے قبل کیا تھے اور کن حالات سے گزر رہے تھے اور جب یہاں سے جائیں گے تو کس حال میں ہوں گے اور ہمارا ٹھکانا کہاں ہوگا۔“

جوزفین اور نواب زادہ اسد اللہ لائبریری میں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے تھے اور اسد اللہ ٹیکسیڈ کے بارے میں اپنی رائے سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔ لائبریری میں پہلی بار ہونے والے ٹکراؤ کے بعد کبھی بھی اسد اللہ اس کی موجودگی کے اوقات میں بھی وہاں آنے لگا تھا۔ وہ مطالعے کے سلسلے میں جوزفین کو مشورے دیتا تھا کہ کون سی کتاب پڑھنا زیادہ بہتر رہے گا اور پھر ان کتابوں پر اس کے ساتھ ڈسکشن کرتا تھا۔ اتنے دنوں میں جوزفین کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ٹیکسیڈ کا زبردست مداح ہے اور اس موضوع پر بلا تکان بول سکتا ہے۔ جوزفین خود یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ اسے ٹیکسیڈ نے کس حد تک متاثر کیا تھا۔ وہ تو بس نواب زادہ اسد اللہ کی وجہ سے ہی اسے پسند کرنے لگی تھی اور اس کی خاطر ٹیکسیڈ کو توجہ سے پڑھنے لگی تھی۔ وہ دیکھتی تھی کہ ٹیکسیڈ پر بات کرنے سے اسد اللہ خوش ہوتا ہے اور اسے اسد اللہ کو خوش دیکھ کر اچھا لگتا تھا۔ حویلی کے نئے بندھے ماحول میں نواب زادہ اسد اللہ سے لائبریری میں ہونے والی یہ ملاقات تازہ ہوا کے خوشگوار جھونکے کے مانند تھی۔ لاشعوری طور پر وہ منتظر رہا کرتی تھی کہ کس دن اسد اللہ لائبریری میں وارد ہوتا ہے اور اس کے سامنے بیٹھ کر اس سے گفتگو کرتا ہے۔ اسد اللہ کے علاوہ اسے اس حویلی میں عالیہ کے ساتھ وقت گزارنا بھی اچھا لگتا تھا۔ وہ سادہ طبیعت کی خوش مزاج لڑکی تھی اور جوزفین کو اپنی ذاتی ملازمہ سمجھنے کے بجائے اس کے ساتھ عزت سے پیش آتی تھی البتہ عشرت جہاں انا کا مسئلہ بنا کر اس سے انگریزی سیکھنے کا سلسلہ ختم کر چکی تھی اور کہیں بھی سامنا ہو جانے پر اسے معاندانہ نظروں سے دیکھا کرتی تھی۔ جوزفین کو اس سے ڈر بھی لگتا تھا کہ کہیں وہ اپنی باختیار ماں کو اس کے خلاف بھڑکا کر



بات ہے جوزفین۔ "نواب زادہ اسد اللہ نے وہی بات کہی جو ہر چاہنے والا اپنے محبوب کے بارے میں سوچتا اور کہتا ہے۔ حقیقت میں دنیا میں حسن، ذہانت اور دیگر خوبیوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی لیکن ان گنت لوگوں میں سے کوئی ایک ہوتا ہے جسے دل اپنے لیے چن لیتا ہے اور بغیر کسی منطق کے خاص الخاص قرار دے دیتا ہے۔

"یہ سب آپ کی نظر کا کمال ہے نواب زادہ صاحب ورنہ میں تو بہت عام سی لڑکی ہوں۔ خاص تو آپ ہیں۔ گاؤ نے ہر طرح سے آپ کو بے حد نوازا ہے۔ اونچا نسب، اعلیٰ تعلیم، اچھی شکل اور بے حد وحساب دولت..... سب ہی کچھ تو ہے آپ کے پاس۔ اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے آپ کو اپنے مقام سے اتنے نیچے کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ یہ دنیا آپ کو اور مجھے دونوں کو معاف نہیں کرے گی۔ خاص طور پر میں مجرم قرار دی جاؤں گی کیونکہ یہاں کمزور کو ہی سب سے پہلے نشانہ بنایا جاتا ہے۔" جو آپ کو اچھا لگے وہ بھی آپ کی طرف ملتفت ہو، دنیا میں اس سے بڑھ کر خوشی کیا ہوسکتی ہے۔ جوزفین کو بھی پہلے لمحے پر یہی خوشی محسوس ہوئی تھی لیکن پھر وہ اپنے اور نواب زادہ کے درمیان موجود فرق کو دیکھ کر ہم گئی اور شکستہ لہجے میں اس سے بولی۔

"ہم بھی اس حقیقت سے واقف ہیں لیکن آپ فکر نہ کریں، کوئی آپ کو نشانہ بنائے گا تو ہم ڈھال بن کر آپ کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔" اسد اللہ نے اسے تسلی دی اسی پل دروازہ کھلا اور کوئی لائبریری میں داخل ہوا۔ ان دونوں نے رخ موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ صفیہ جہاں عرف نواب بیگم چلی آ رہی تھیں۔ اسد اللہ ماں کے سامنے پا کر تیزی سے کھڑا ہوا۔ جوزفین نے بھی اس کی تقلید کی۔

"امی جان..... آپ اور یہاں۔ کوئی کام تھا تو ہمیں حکم دیا ہوتا۔" اسد اللہ نے احترام سے کہا لیکن ساتھ ہی وہ حیرت میں بھی مبتلا تھا کہ صفیہ جہاں کا لائبریری میں کیا کام، پہلے بھی اس نے انہیں یہاں کا رخ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

"ہمیں آپ سے گفتگو کے لیے یہی مقام اور موقع مناسب لگا۔" صفیہ جہاں نے بے حد سنجیدہ تاثرات کے ساتھ اس کی بات کا جواب دیا۔

"آپ تشریف رکھیے۔" اسد اللہ نے خود کرسی کھینچ کر انہیں بیٹھنے کے لیے پیش کی۔ جوزفین کو اس جگہ اپنی موجودگی غیر ضروری محسوس ہوئی، نواب بیگم نے اس کی

یہاں موجودگی کو مکمل نظر انداز کر دیا تھا اور صرف اپنے بیٹے سے مخاطب تھیں جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ صرف بیٹے سے ہی بات کرنا چاہتی ہیں۔ جوزفین نے اجازت طلب کی تو اسے فوراً جانے کی اجازت دے دی گئی۔

"جی امی جان! فرمائیے۔" اسد اللہ، صفیہ جہاں کی طرف رخ کر کے ہمدن گوش ہو گیا۔

"ہمیں آپ کے معمولات پر تشویش ہے اسد اللہ۔ ہم نہیں چاہتے کہ آپ کی کوئی حرکت آپ کے ابا جان کے غیظ کا سبب بنے اور آپ ان کی نظروں میں معتوب ٹھہریں۔" صفیہ جہاں نے بات کا آغاز کیا تو اسد اللہ نے دیکھا کہ ان کے چہرے کے تاثرات میں پریشانی درج ہے۔

"ہم آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھے امی جان! ہم تو بڑی پابندی سے ابا جان کی عائد کردہ ذمے داریاں نبھا رہے ہیں۔ ہمیں نہیں یاد پڑتا کہ ہم سے اس سلسلے میں کبھی کوئی کوتاہی ہوئی ہو۔"

"ہم اس سلسلے میں بات نہیں کر رہے۔ ہمارا اشارہ آپ کے معمول میں آنے والی نئی تبدیلی کی طرف ہے۔ آپ کی جوزفین کے ساتھ طویل نشستیں شکوک و شبہات کو جنم دے رہی ہیں اور اس سلسلے میں چھ میگوئیاں کی جارہی ہیں۔" آخر انہوں نے کھل کر اپنی تشویش کا اظہار کر رہی دیا۔

"ان شکوک و شبہات کا اظہار یقیناً پھوپھی بیگم نے کیا ہوگا۔" اسد اللہ کے منہ میں کڑواہٹ کھل گئی اور اس نے قدرے تند لہجہ میں اپنا خیال ظاہر کیا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے بیٹا کہ کون کہہ رہا ہے۔ ہاتھ تو بہر حال بن رہی ہیں نا۔" صفیہ جہاں کے لہجے میں بے بسی تھی۔ نواب سلیم اللہ کی بیوی کی حیثیت سے انہیں نواب بیگم کا اعلیٰ خطاب تو ضرور مل گیا تھا لیکن وہ کبھی اس حویلی پر حکمرانی نہیں کر سکی تھیں۔ شادی کے ابتدائی دور میں ان کی ساس حیات تھیں اور تمام معاملات ان ہی کے ہاتھ میں تھے۔ ساس کے انتقال کے بعد آپا بیگم بیوی کی چادر اوڑھ کر ایسی حویلی میں وارد ہوئیں کہ ہر طرف چمکائیں۔

نواب سلیم اللہ نے بیوہ بہن کی دل جوئی کی خاطر انہیں اس قدر اہمیت دی کہ بیوی کی حیثیت بالکل ختم ہو کر رہ گئی اور آپا بیگم حاوی ہوتی چلی گئیں۔ صفیہ جہاں کچھ اس وجہ سے بھی مقابل کھڑی نہ ہو سکیں کہ ندرت جہاں سسرالی رشتے کے اعتبار سے ضرور ان سے چھوٹی تھیں لیکن عمر میں بڑی تھیں اور وہ بچپن سے انہیں آپا بیگم کہہ کر ان کا احترام کرنے کی



عادی تھیں۔ ”آپ ان باتوں کا اثر کیوں لیتی ہیں امی جان! ہم کوئی مس جو زینین سے خفیہ ملاقاتیں تو نہیں کرتے ہیں کہ کسی کو اعتراض ہو۔ ہم یہاں لائبریری میں ان کے ساتھ علمی مباحث کیا کرتے ہیں۔ حوصلی میں کوئی اور فرد تو ایسا ہے نہیں کہ ہم سے ان موضوعات پر گفتگو کر سکے۔ بھائی کو اپنی لاء کی کتابوں سے ہٹ کر کسی دوسرے موضوع پر کتب بینی کا شوق نہیں۔ ابا جان کی دوسری بے شمار مصروفیات ہیں۔ اختر کو ولایت سے واپس آنے میں ابھی خاصا وقت درکار ہے اور ان تین افراد کے علاوہ حویلی میں کوئی انگریزی زبان سے واقف نہیں۔ ایسے میں اگر ہمیں مس جو زینین کی صورت میں ایک ہم ذوق میسر آ گیا ہے تو ہمیں اس خوشی سے محروم رکھنا کہاں کا انصاف ہے؟“ نواب زادہ اسد اللہ کو بھی اپنی ماں کی حویلی میں حیثیت سے آگاہی تھی چنانچہ لہجے کو نرم کر کے وضاحت پیش کرنے لگا۔

”ہم آپ کی ہر بات کو درست تسلیم کر لیتے ہیں لیکن آپ یہ بھی تو سمجھیے کہ ہم دوسروں سے اسے تسلیم کروا لینے پر قادر نہیں ہیں۔“ صفیہ جہاں کے لہجے میں وہی بے بسی کی کیفیت تھی۔

”تو آپ ایسی کوشش ہی کیوں فرمائیں؟ آپ اس معاملے کو ایسے ہی چھوڑ دیجیے۔ ابا جان ہم سے اس سلسلے میں باز پرس کریں گے تو ہم خود انہیں جواب دے لیں گے۔“ اسد اللہ نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

”آپ بے شک تعلیمی قابلیت کے اعتبار سے ہم سے بہت آگے ہیں اسد اللہ لیکن آپ یہاں کے معاملات کو اس طرح نہیں سمجھ سکتے جیسے ہم سمجھتے ہیں۔ ایک ماں کی حیثیت سے ہم آپ کو کسی بڑے نقصان سے بچانا چاہتے ہیں لیکن ہم اتنے مضبوط نہیں ہیں کہ ہر طوفان کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں۔ ہماری نظریں اس طوفان کو دیکھ سکتی ہیں جو آپ کی طرف بڑھ رہا ہے اور پیش بندی کے طور پر ہی آپ سے احتیاط کا مطالبہ کر رہے ہیں۔“

”ہم آپ کے اشاروں کو سمجھ نہیں پا رہے امی جان۔ برائے مہربانی ذرا وضاحت فرمائیں۔“ اسد اللہ ان کے اس قدر خوف زدہ ہونے پر حیرت اور ابھمن کا شکار ہو گیا۔

”ہم آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جو زینین کے ساتھ آپ کے زیادہ میل ملاپ کو بے راہ روی کی طرف پیش قدمی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور اس کے نتیجے میں فیصلہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو فوری طور پر شادی کے بندھن میں باندھ کر پابند کر دیا جائے۔ اس وقت اگر آپ کی شادی

کا فیصلہ کر لیا جاتا ہے تو لامحالہ آپ کی دلہن کے طور پر عشرت جہاں کا نام لیا جائے گا اور ہم آپ کو اس بے جوڑ رشتے سے بچانا چاہتے ہیں۔ بات صرف شکل و صورت کی ہوتی تو تب بھی ہمیں زیادہ اعتراض نہیں ہوتا لیکن عشرت جہاں کی دیگر صفات بھی ایسی نہیں ہیں کہ ہم انہیں آپ کی دلہن بنا کر زندگی بھر کے لیے آپ کے سر پر ایک عذاب مسلط ہوتا دیکھ سکیں۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ کی شادی کا ذکر اس وقت چھڑے جب عشرت جہاں اپنے گھر کی ہو چکی ہوں یا کم از کم ان کی کہیں نسبت طے پا جائے۔ آپ خود سوچیے کہ آپ کو ولایت سے واپس آئے اتنے دن ہو گئے لیکن ہم نے ایک بار بھی آپ کی شادی کی خواہش ظاہر نہیں کی جبکہ آپ کے بھائی جان رضی اللہ عنہم نے تعلیم مکمل ہوتے ہی شادی کے بندھن میں باندھ دیا تھا۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم جیسے ہی آپ کی شادی کا ذکر چھیڑیں گے فوراً عشرت جہاں کا نام تجویز کر دیا جائے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم یہ تذکرہ ہی اس وقت چھیڑیں جب عشرت جہاں کسی ٹھکانے لگ چکی ہوں۔ ہم چپکے چپکے ان کی کہیں نسبت طے کر دوانے کی کوشش بھی کر رہے ہیں لیکن اس کے لیے ہمیں کچھ وقت درکار ہے۔ آپ کی ذرا سی بھی بے احتیاطی ہماری ہر تدبیر پر پانی پھیر دے گی اور ہم آپ کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر پائیں گے۔“ صفیہ جہاں نے پوری وضاحت سے اسے اپنے خدشات، احساسات اور خواہشات سے آگاہ کیا تو وہ بھی متشکر ہو گیا۔ اسے حویلی میں اپنی پھولی ندرت جہاں کی حیثیت کا علم تھا۔ فی الحال تو انہوں نے بیٹی کی ماں ہونے کی حیثیت سے وضع داری نبھاتے ہوئے اپنی زبان سے یہ خواہش ظاہر نہیں کی تھی لیکن اگر اس کی شادی کا قصہ چھڑتا تو وہ کسی نہ کسی ترکیب سے نواب سلیم اللہ کے ذہن میں عشرت جہاں کا نام ڈال سکتی تھیں اور ایک بار عشرت جہاں کا نام نواب صاحب کے ذہن میں آجاتا تو وہ اپنی بھانجی ہونے کی خصوصیت کے آگے اس کی ہر خامی اور کجی کو نظر انداز کر دیتے۔

”امید ہے آپ نے ہماری بات اچھی طرح سمجھ لی ہوگی اور اس پر غور فرمائیں گے۔ اب ہم چلتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہر طرف پھیل چکے جائے کہ آخر اتنی دیر سے ہم یہاں آپ سے کس گفتگو میں مصروف ہیں۔“ صفیہ جہاں نے اسے سوچ میں ڈوبا پایا تو آہستہ سے بولیں اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ نواب زادہ اسد اللہ بھی فوراً کھڑا ہو گیا اور پورے احترام سے انہیں دروازے تک جا کر رخصت کیا۔



کا اظہار کر دیا تھا لیکن واپسی کو اس بات سے مشروط رکھا تھا کہ وہ چند گزڑھ کے اسپتال میں اپنا تفصیلی چیک اپ کروائے اور وہاں سے تشفی بخش جواب ملنے کے بعد ہی بمبئی کا رخ کرے۔

چندی گڑھ اسپتال میں اس کے چیک اپ کے لیے اپائنٹمنٹ لی جا چکی تھی اور وہ شدت سے منتظر تھا کہ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد بمبئی کے لیے روانہ ہو سکے۔ اب اس کے لیے شملہ میں وقت کا ٹنا مشکل ہو گیا تھا۔ بملا بھائیہ کی شملہ آمد کے نتیجے میں اسے جو ایک اچھی رفاقت میسر آئی تھی، اس سے بھی وہ بملا کے بدلتے ہوئے رویوں کی وجہ سے بیزار ہو گیا تھا۔ وہ پڑھی لکھی اور ذہین عورت تھی اور فاروق کو اس سے گفتگو کر کے اچھا لگتا تھا لیکن پھر بملانے سے اپنی جاگیر سمجھنا شروع کر دیا اور ایسے رویوں کا مظاہرہ کرنے لگی جو اس کے لیے ناگوار تھے چنانچہ اس کی رفاقت کا لطف بھی ختم ہو گیا۔ آدھا گھنٹا قبل کی بات تھی کہ وہ بملا سے جان چھڑانے کے لیے آرام کا کہہ کر اپنے لیے مخصوص کمرے میں بند ہو گیا تھا لیکن پھر کمرے کے درود یوار سے کاٹنے کو دوڑنے لگے تو وہ وحشت زدہ ہو کر باہر نکل آیا اور چہل قدمی کرتا ہوا بھائیہ ہاؤس سے کافی دور نکل گیا۔

احساس ہونے پر پلٹا اور واپسی کی راہ اختیار کی۔ واپسی میں اس نے اس عام گزرگاہ کو استعمال کرنا ضروری نہیں سمجھا جس پر سے گاڑیاں وغیرہ گزرتی تھیں اور بھائیہ ہاؤس کی بالکونی میں کھڑا ہو کر اس گزرگاہ اور اس پر چلنے والی گاڑیوں سمیت انسانوں کو بھی واضح طور پر دیکھا جاسکتا تھا۔ اپنے تئیں وہ ایک شارٹ کٹ کو استعمال کرتا ہوا اونچے نیچے ناہموار راستے پر چل پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ اس راستے سے وہ کم وقت میں بھائیہ ہاؤس واپس پہنچ جائے گا لیکن آہستہ آہستہ اسے اپنے اندازے کی غیر درستگی کا احساس ہوتا چلا گیا۔ عام گزرگاہ سے بھائیہ ہاؤس پہنچنے میں جتنا وقت لگتا تھا، اس سے اوپر وقت گزر جانے کے باوجود اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی تھی اور وہ اب گھنے درختوں کے بیچ بھٹکتا پھر رہا تھا۔ موسم اگرچہ گرم نہیں تھا لیکن اونچائی کی سمت کافی دیر چلنے کی وجہ سے اس کا حلق خشک ہونے لگا تھا اور اب اس کا موقع بھی نہیں رہا تھا کہ وہ پلٹ کر نیچے چلا جائے۔ وہ بس اندازے سے ہی اس طرف آیا تھا اور اب اسے یاد بھی نہیں تھا کہ وہ کہاں کہاں سے گزرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ دن کا وقت ہونے کی وجہ سے فی الحال اسے کوئی خطرہ تو محسوس نہیں ہو رہا تھا لیکن اس بات کا بھی احساس تھا کہ اگر

ان کے جانے کے بعد وہ اپنی جگہ پر آن بیٹھا اور کھوئی کھوئی سی کیفیت میں اپنے سامنے رکھی خالی کرسیوں کو دیکھنے لگا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ ان کرسیوں پر اب بھی جوزفین اور صفیہ جہاں براجمان ہوں۔ ان دونوں کی وہاں موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے وہ باری باری دونوں سے ہونے والی گفتگو کو یاد کرنے لگا۔ جوزفین سے اس کی گفتگو کتنی پر لطف تھی۔ آج پہلی بار بڑی بے ساختگی میں وہ اظہار کے مراحل سے گزرے تھے لیکن اس مرحلے کے بعد حاصل ہونے والے کیف و نشاط کے لمحات کو محسوس کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا اور صفیہ جہاں اپنے بدترین خدشات کے اظہار کے ساتھ انہیں متنبہ کرنے آن پہنچی تھیں ان کا بیان کردہ خطرہ حقیقی تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اظہار کے مرحلے سے گزرنے کے بعد کیا وہ جوزفین سے فاصلہ قائم رکھ پائے گا.....؟ محبت کے پودے کو تو یوں بھی قربت کے پانی کی بڑی پیاس ہوتی ہے۔ اس پانی کو پا کر یہ پودا خوب پھلتا پھولتا اور لہلہاتا ہے اور دیکھنے والوں کی نظریں فوراً اس کی موجودگی کو بھانپ لیتی ہیں۔

☆☆☆☆

حد نظر تک پھیلا نیلا آسمان اور اس پر اٹھیلیاں کرتی بادلوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں، ہر طرف موجود سبزہ، فضا کی تازگی اور مہک، پرندوں کی سریلی آوازیں..... کیا تھا جو شملہ میں نہیں تھا۔ یہ وادی ان سارے لوازمات سے آراستہ تھی جو انسانی دل کو اپنی گرفت میں لے لیں۔ فاروق کو بھی شملہ کی سحر انگیز خوب صورتی نے متاثر کیا تھا لیکن جو دیکھنے میں پیارا لگے، وہ دل کو بھی پیارا ہو یہ ضروری تو نہیں ہوتا۔ اسے بھی شملہ دیکھنے میں بہت پیارا لگتا تھا لیکن دل کو وہی بمبئی پیارا تھا جس میں تنگ و تاریک گلیاں تھیں، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں تھیں، بے ہنگم ٹریفک تھا اور دھواں دھواں فضا تھی کیونکہ بمبئی وہ شہر تھا جس نے خانماں بربادی کے دور میں اسے اپنی بانہوں میں سمیٹا تھا۔ جہاں اس نے ربن کی شفقت پائی تھی اور گولو سمیت دوسرے تمام ساتھیوں کی بے تحاشا محبتیں سمیٹی تھیں۔ اسی بمبئی میں جو لیٹ بستہ تھی جو اپنی تمام تر بے رخی سمیت اس کے دل میں آباد تھی اور اسے زندگی برباد کرنے کے عوض بھی اپنے دل کی یہ آبادی پیاری تھی۔ اپنے اس بے حد پیارے بمبئی کی یاد میں ہڑکتے اس کے لیے شملہ کی خوب صورت بے معنی ہو گئی تھی اور وہ شدت سے اس بات کا منتظر تھا کہ کب ربن کی طرف سے اسے واپس آنے کی اجازت ملتی ہے۔ ربن نے بھی نیم رضامندی



وہ بھلا تھی، بھلا بھلا یہ... اگر پہلے وہ مرد کے جائزے میں نہ الجھا ہوتا تو پہلے ہی بھلا کو پہچان لیتا۔ فوری طور پر اسے نہ پہچان سکنے کی ایک وجہ اس کی یہاں اس غنڈے قسم کے آدمی کے ساتھ موجودگی بھی تھی۔ بھلا آخر اس جگہ اس آدمی سے کیوں مل رہی تھی؟ یہ وہ سوال تھا جس نے فاروق کو آگے نہیں بڑھنے دیا اور اس نے اپنے کان پوری طرح ان کی گفتگو کی طرف مرکوز کر دیے۔

وہ غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے گنیش! میں نے تمہیں جس طرح سمجھایا ہے، کام بالکل ویسے ہی ہونا چاہیے۔ بھلا کا لہجہ سخت اور حکمانہ تھا۔

”آپ کو پتا ہے میڈم اپن کتنا پرفیکٹ کام کرتا ہے۔ آپ اپن کو اتنا دور سمجھتی سے ایسے ہی تو نہیں بلوایا ہے نا؟ آپ کو یاد ہے نا کہ اپن نے آپ کے حکم پر آپ کے پتی کو بھی کتنی صفائی سے ٹھکانے لگایا تھا۔ کسی نے شک نہیں کیا تھا کہ یہ ایکسٹنٹ کے بجائے مرڈر ہے۔ اگر کسی کو شک ہوا بھی ہو تو آپ کے پتا جی یا کزن منوہر پر ہوا ہوگا۔ آپ کا تو کہیں نام تک نہیں آیا تھا۔“ بے ڈھنگے پن سے ہنس کر فخر سے بولتے گنیش نامی اس غنڈے کے انکشاف نے فاروق کو انگشت بدنداں کر دیا۔ بھلا کے حالات زندگی اس کے علم میں تھے۔ اسے معلوم تھا کہ بھلا نے اپنے باپ کی مرضی کے خلاف محبت کی شادی کی تھی اور اس کا شوہر ایک حادثے میں مر گیا تھا۔ بظاہر یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا لیکن فاروق کو تھوڑا تھوڑا شک ہوا تھا کہ اس حادثے کے پیچھے بھلا یا اس کے پیچھے منوہر کا ہاتھ ہو سکتا ہے لیکن یہاں تو بالکل ہی غیر متوقع بات سامنے آئی تھی۔ باپ کی مخالفت مول لے کر بھلا نے جس شخص کو اپنایا، خود ہی اس کو قتل بھی کروا ڈالا تھا۔

کیوں.....؟ اس بات کا جواب تو یقیناً اسی کے پاس تھا۔

”بے کار باتیں مت کرو۔ تم نے کام صفائی سے کیا تھا تو تمہیں منہ مانگا پیسا بھی ملا تھا اور یاد رکھو اب کبھی دوبارہ یہ بات تمہاری زبان پر نہیں آنی چاہیے۔“ بھلا نے بے حد سختی سے ٹوکا تو وہ صورت سے اچھا خاصا غنڈا نظر آنے والا فوراً بیگلی جی بن گیا اور گھگھاتی ہوئے بولا۔

”سوری میڈم۔ بھول ہو گئی۔ آئندہ ایسا مسئلہ نہیں ہوئے گا۔“

”اوکے۔ اب تم جاؤ۔ کام کرتے ہی یہاں سے نکل جانا اور ہاں، یاد رکھنا کہ تمہیں بھولے سے بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کرنی ہے۔ تم کسی کی نظر میں نہ آؤ اسی لیے

وہ راستہ تلاش کرتے ہیں کامیاب نہیں ہو سکا تو بڑی پریشانی میں پڑ سکتا ہے۔ یہاں رہتے ہوئے اسے اس بات کا تجربہ ہو چکا تھا کہ پہاڑی علاقوں میں شام ہوتے ہی اتنی تیزی سے رات میں ڈھلتی ہے کہ انسان اندازہ ہی نہیں لگا پاتا اور اندھیرا ہو جانے کی صورت میں راستہ تلاش کرنے کا کام اور بھی دشوار ہو جاتا لیکن فی الحال اس کے لیے کچھ دیر رک کر اپنی سانس بحال کرنا بھی ضروری تھا۔ سانس بحال ہوتی تو شاید پیاس کی شدت میں بھی کچھ کمی آجاتی۔

وہ ایک بڑے سے پتھر پر آرام کی غرض سے بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ اس کی طبیعت بحال ہونے لگی اور کچھ دیر سستا کر وہ ایک بار پھر چل پڑا۔ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ اسے لگا کہ اس کے کانوں میں کوئی انسانی آواز پڑی ہو۔ وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا اور سماعت پر کچھ اور زور دیا۔ کچھ توقف کے بعد اسے آواز پھر سنائی دی۔ الفاظ کا اندازہ نہ ہونے کے باوجود اس کو احساس ہو گیا کہ یہ نسوانی آواز ہے۔ اس نے سمت کا بھی تعین کر لیا اور دل میں خوشی محسوس کی کہ یہاں اس کے سوا بھی کوئی موجود ہے۔ اس نے جو آواز سنی تھی، اس سے لگتا تھا کہ بولنے والی عورت کسی سے گفتگو کر رہی ہے۔ یعنی وہاں دو یا دو سے زائد افراد موجود تھے جو منزل پر پہنچنے میں اس کی مدد کر سکتے تھے۔ وہ فوراً آواز کی سمت چل پڑا لیکن اس کا انداز محتاط تھا اور اس نے پوری کوشش کی تھی کہ اس کے قدموں کی آواز نہ پیدا ہونے پائے۔ ربن کی تربیت نے اسے بہت کچھ سکھایا تھا اور ان حالات میں بھی اس نے جلد بازی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ آگے موجود افراد کے سامنے پہنچنے سے پہلے اس بات کا تعین کر لے کہ وہ کس قماش کے لوگ ہیں کیونکہ ممکن تھا کہ مدد کی آس میں وہ ایسے لوگوں سے جا کر آتا جو ڈاکو اور لٹیرے ہوتے اور وہ الٹا مشکل میں پڑ جاتا۔

درختوں کی آڑ لیتا ہوا وہ ان کے نزدیک پہنچا تو ایک عورت اور مرد دکھائی دیے۔ مرد صورت سے شریف نہیں لگتا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کے نیچے ایک زخم کا نشان تھا اور چہرے پر سختی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بدرنگ سی پتلون کے ساتھ آدمی آستینوں کی قمیص پہن رکھی تھی اور قمیص کے اوپر بغیر آستین کی چمڑے کی جیکٹ تھی جس کے ہٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس کے مقابل کھڑی عورت نے سیاہ پتلون کے ساتھ تنگ سی جرسی پہن رکھی تھی۔ عورت کی پشت ہی نظر آرہی تھی لیکن فاروق کو وہ شناسا لگی اور پھر اس نے اسے پہچان لیا۔



نت نئے کرداروں کو الفاظ کے حسین  
متالب میں ڈھالتی پُراثر اور  
مسا سحر یروں کی حنائق  
ماہنامہ پیگنیز کی دیرینہ ساتھی

مایہ ناز مصنفہ محترمہ

# ذہنت سراج

کے مشاق مسلم کا ایک اور شاہکار ناول

عظیم شاعر مرزا اسد اللہ غالب

کی لازوال شاعری کے ایک

قطعے سے مستعار لیا عنوان



انشاء اللہ بہت جلد پائیزہ کے

صفحات کی زینت بننے جا رہا ہے

میں نے شہین ملاقات کے لیے یہاں بلا یا تھا۔ شہین  
لہجے میں بولتی بھلا نے اپنے پرس سے ایک خاصا پھولا ہوا  
لفافہ برآمد کیا اور کنیش کو تھما دیا۔ لفافہ پا کر کنیش کی باچھیں  
پھیل گئیں۔

”تھینک یومیڈم۔“ جواب میں بھلا کچھ نہیں بولی  
اور ہاتھ سے اسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے قدم آگے  
بڑھا دیے۔ کنیش بھی چل پڑا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی  
مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ دم سادھے کھڑے فاروق کو  
خیال آیا کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کا تعاقب کر کے  
اس جگہ سے نکل سکتا ہے۔ اس نے بھلا کے پیچھے جانے کا  
فیصلہ کیا کہ یقیناً اس کا رخ بھامیہ ہاؤس کی طرف تھا اور خود  
اس کی اپنی منزل بھی وہی تھی۔ بھلا کے تعاقب میں جانے  
کے لیے اس نے تھوڑا سا توقف کیا تا کہ فاصلہ رہے اور بھلا  
کو اس کی وہاں موجودگی کا علم نہیں ہو سکے۔ آج کے اس  
اتفاق نے اس پر بہت بڑا انکشاف کیا تھا۔ وہ بھلا جسے اس  
نے ابتدا میں جانا تھا، بالکل پس منظر میں چلی گئی تھی اور اس  
کی جگہ اس روایتی حاکمانہ مزاج رکھنے والی امیرزادی نے  
لے لی تھی جو جائز و ناجائز ہر طریقے سے بس اپنی مرضی  
چاہتی تھی۔ محبوب شوہر کو ٹھکانے لگانے کے بعد اب نہ جانے  
اسے کیا کام آ پڑا تھا کہ اس نے خاص طور پر بھینی سے کنیش کو  
یہاں بلوایا تھا۔ فاروق نے کیونکہ ادھوری گفتگو ہی سنی تھی  
اس لیے کنیش کے سپرد کیے جانے والے کام کی نوعیت نہیں  
جان سکا تھا لیکن اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی خطرناک کام ہے  
جس کو انجام دیتے ہی اس نے کنیش کو شملہ سے نکل جانے کی  
ہدایت کی ہے۔

ابھن اور جس میں جتلا وہ محتاط انداز میں بھلا کے  
پیچھے چلتا رہا۔ وہ بہت اعتماد سے آگے چلی جا رہی تھی۔ اسے  
اندازہ بھی نہیں تھا کہ یہاں کوئی ہے جو اس کے ایک اہم راز  
سے واقف ہو چکا ہے۔ راستے پر اٹھتے اس کے پُر اعتماد قدم  
بتا رہے تھے کہ وہ اس جگہ سے پوری طرح واقف ہے۔  
واقف کیوں نہ ہوتی۔ شملہ اس کی پسندیدہ ترین جگہ تھی اور  
اس نے یہاں کا چپا چپا دیکھ رکھا تھا۔ اب بھی وہ بہت آرام  
سے جنگل نما درختوں کے جھنڈے سے باہر نکل گئی اور آگے  
بڑھنے لگی۔ فاروق البتہ وہیں رکا رہا۔ درختوں کی آڑ سے  
نکل کر کھلے میں جانے کی سورت میں وہ بھلا کی نظر میں آ سکتا  
تھا۔ ویسے بھی اب آگے کا راستہ اس کے لیے دشوار نہیں تھا  
اور وہ آرام سے بھامیہ ہاؤس تک پہنچ سکتا تھا۔ اصل میں وہ  
جس جگہ ہنک رہا تھا، وہ بھامیہ ہاؤس سے زیادہ دور نہیں تھی



لیکن وہ درختوں کی وجہ سے صحیح سمت کا تعین نہیں کر پارہا تھا۔ درختوں کے سلسلے سے نکل کر اسے راستہ سمجھ آنے لگا تھا اور وہ کچھ اور بلندی پر سے نظر آتی بھامیہ ہاؤس کی ترچھی سرخ چھتوں کو دیکھ سکتا تھا۔

☆☆☆

”تیرا نام عارف ہے نا؟“ دستک کے جواب میں دروازہ کھولنے والے مناسب قدم و قامت کے قبول صورت لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے رہن نے سوال کیا۔

”جی ہاں۔ میں عارف ہوں لیکن آپ کون؟ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ عارف نے اس کے اندازے کی تصدیق کرتے ہوئے ابھین زدہ لہجے میں اس سے پوچھا۔

”اندر چل کر ذرا تسلی سے بات کر لیتے ہیں پھر اپنی پہچان بھی کروا دیں گے۔“ رہن نے اپنے مخصوص ٹھنڈے لہجے میں اسے جواب دیا تو عارف اسے انکار نہیں کر سکا اور ذرا سا ایک طرف ہٹتے ہوئے اسے اندر آنے کی جگہ دی۔ وہ رہن کو اپنے ساتھ بیرونی دروازے کے فوراً بعد بنے ہوئے ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرہ اچھوتا لیکن صاف ستھرا تھا۔ فرش پر سفید چاندنی بچھا کر اس پر نخل کے غلاف والے گاؤں کیے رکھے گئے تھے۔ رہن پاؤں میں پہنی سینڈل اتار کر کمرے میں داخل ہوا اور ایک گاؤں کیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

”آپ کی خاطر کے لیے کیا پیش کروں..... ٹھنڈے، گرم میں سے کیا پسند کریں گے؟“ رہن کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی کہ عارف اس کے اجنبی ہوتے ہوئے بھی اس کے ساتھ ادب اور اخلاق سے پیش آ رہا تھا۔

”کوئی تکلیف نہیں کر رہے۔ اپن تیرے پاس دو باتیں کرنے آئے ہیں۔ کر کے واپس چلے جائیں گے۔ اپن تیرا زیادہ ٹیم نہیں لیما چاہتے۔ اپن کو خبر ہے کہ تو چھٹی پر گھر آیا ہوا ہے اور شام میں تیرے کو واپس بھی لوٹنے کا ہے۔ یہ تھوڑا ٹیم ماں بہنوں کے ساتھ ہی گزرے تو اچھا ہے۔“ رہن کے ملاکت سے دیے جواب نے عارف کو ایک بار پھر حیران کر دیا۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک اجنبی کی اپنے بارے میں اس قدر معلومات پر حیران تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ بمبئی کے ایک ایسے دادا کے مقابل ہے جس کے آدمیوں نے اس کے ایک اشارے پر عارف کا سارا اتنا پتا کھوج نکالا تھا۔

”ادھر بیٹھ جا۔“ رہن نے اس کی حیرانی کو محسوس کر لیا لیکن بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکم دیا تو عارف

میکا کی انداز میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”اپن کو رہن دادا کہتے ہیں۔ اپن کو تو جولی کا چاچا سمجھ لے۔ وہ اپنی بیٹی کے مافق ہے۔ اپن اسی کے حوالے سے تجھے جانتا ہے۔“ آخر رہن نے اس سے اپنا تعارف کروایا جس پر عارف کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور اس کی تیوری پر ناگواری کی شکلیں نظر آنے لگیں۔

”جولیٹ سے میری ریلیٹیشن شپ ختم ہو گئی ہے۔ پھر آپ کی یہاں آمد کا مقصد؟“ اس نے کافی رکھائی کے ساتھ دریافت کیا۔

”تیرا اس کا تعلق تو ختم ہونا ہی تھا۔ تو اس ہیرے جیسی لڑکی کے لیول کا آدمی ہی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کو اوپر والے نے بہانہ بنا دیا ورنہ کل کو وہ خود سمجھ لیتی کہ تو اس کا غلط چناؤ تھا۔“ رہن نے لہجے کو ہموار رکھتے ہوئے اس کی بات کا اتنا کڑوا جواب دیا کہ عارف اندر سے تھملا کر رہ گیا اور تپتی سے بولا۔

”پھر آپ میرے پاس کیا لینے آئے ہیں؟“

”اپن کو بتا لگا ہے کہ تو جولیٹ کے ساتھ پڑھا ہے اور تم دونوں نوکری بھی ایک دفتر میں کرتے تھے۔ تو، تو اس کے بارے میں بہت باتیں جانتا ہوگا۔ اپن کو تجھ سے اس کی کسلی شنائے کے بارے میں پوچھنا تھا۔“ رہن فوراً اپنے مقصد پر آ گیا۔

”شنا موتی والا..... مگر آپ اس کے بارے میں کیا جانتا چاہتے ہیں؟“ عارف نے بے ساختہ شنا کا پورا نام لیا اور حیرت سے پوچھا۔

”جو، جو تو جانتا ہے سب بتا دے۔“

”شنا موتی والا بڑے خاندان کی لڑکی ہے اور بمبئی میں تقریباً ہر شخص جانتا ہے کہ یہ کتنا بڑا کاروباری خاندان ہے۔ شنا نے امیرزادی ہونے کے باوجود دوستی کے لیے ہمارا گروپ جو اُن کیا تھا۔ ایجوکیشن کپلیٹ ہونے سے پہلے ہی اس کی شادی ہو گئی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ پنجاب چلی گئی۔ اس کا شوہر ایک بڑا زمیندار صنعت کار اور سیاست دان ہے۔ کچھ عرصہ پہلے دونوں میاں بیوی یہاں آئے تھے تب جولیٹ نے شنا کی مدد سے اس کے شوہر کا انٹرویو لیا تھا۔ اتنے عرصے بعد بھی وہ جولیٹ سے بہت اچھی طرح پیش آئی تھی اور جولیٹ کی باقاعدہ دعوت کر ڈالی تھی۔“

عارف نے اس کے سوال کا تسلی بخش جواب دیا۔ مشکل وقت میں جولیٹ کو چھوڑ دینے پر خود اس کے دل میں بھی ایک چورسا تھا اس لیے اس نے رہن کی سچ بات پر آنے



والے غصے کو جلد قابو کر لیا تھا۔ اور بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔“ وہ جیسے دیکھے بولتے رہن کے لہجے میں جو سنگین دھمکی تھی اسے عارف نے پالیا اور اندر ہی اندر پھریری لے کر رہ گیا۔ اپنی بات کہہ کر رہن فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ عارف میں اتنی بھی سکت نہیں رہی تھی کہ اسے دروازے تک رخصت کرنے جاتا۔ رہن نے بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور عارف کے گھر سے نکلنے کے بعد گلی سے بھی سیدھا نکلتا چلا گیا۔ گلی کے کونے پر وہ اس کا منتظر تھا۔ وہ اسے عارف کے گھر تک اس لیے ساتھ نہیں لے گیا تھا کہ کہیں دو افراد کو دیکھ کر عارف بدک ہی نہ جائے اور وہ اس سے گفتگو کا موقع حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ وہ نے اس کا اشارہ پا کر ایک تانگے کو روکا اور دونوں تانگے میں سوار ہو کر مجودا والے اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اڈے پر رامو گویا ان کا منتظر ہی بیٹھا تھا۔ رہن کو سامنے پا کر وہ کھل اٹھا اور جوش سے بولا۔

”اپن تمہاری ہی راہ دیکھ رہا تھا دادا۔ ادھر اڈے پر بندہ بھجوا یا تھا پتا چلا تم کہیں نکلے ہوئے ہو لیکن کسی کو کوئی خبر نہیں تھی۔ اپن بولا شاید ادھر کے لیے ہی نکلے ہو پر راہ دیکھتے دیر ہو گئی تو سوچ رہا تھا کہ اب کدھری پتا کرواؤں۔“

”ایسی بھی کیا آفت آن پڑی جو تو اپنے لیے کنوؤں میں بانس ڈلوانے پر تل گیا تھا۔“ رہن نے بے نیازی سے کہتے ہوئے اپنی گدی سنبھالی۔

”آفت نہیں خوشی کی خبر تھی دادا۔ تمہارا مہمان پہنچ گیا ہے۔“ رامو نے باچھیں پھیلاتے ہوئے جواب دیا تو رہن کے چہرے کے تاثرات میں بھی تبدیلی واقع ہوئی اور وہ ماتھے پر ہل ڈال کر رامو کی طرف دیکھنے لگا۔

”اسے پورے خیال سے تو رکھا ہے نا؟ اصل کام مہمان کو خیال سے رکھنے کا ہے ابھی جو تو اسے لے آنے پر بیسی نکال رہا ہے نا، ذرا سی گڑ بڑی ہونے پر یہ بیسی منہ سے ہتھیلی پر بھی آسکتی ہے۔“

”فکر نہ کرو دادا۔ سب کام ایک دم فٹ ہوا ہے۔ کسی کو کانوں کا خبر نہیں ہوگی۔“ رامو نے دانت اندر کرتے ہوئے اس کی تسلی کروائی۔

”چل تو پھر مل لیتے ہیں اس سے۔ مہمان کو جازقی انتظار کروانا اچھا نہیں ہے۔“ رہن نے کہا تو رامو فٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس بار سفر کے لیے ٹیکسی کا انتخاب کیا گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی میں کوئی بات نہیں کی جاسکتی تھی، اس لیے سفر خاموشی میں کٹا۔

”اب کدھر صاحب؟“ ٹیکسی ان کے مطلوبہ علاقے

”شنا کے شوہر کا نام کیا ہے؟“ رہن نے پُرسوج انداز میں سوال کیا۔

”دلدار آغا۔ بڑا مشہور اور جانا پہچانا آدمی ہے۔“ عارف نے اس سوال کا بھی جواب دے دیا۔

”یہ دلدار آغا کیسا بندہ ہے؟ تجھے اس کے بارے میں کچھ جانکاری ہے؟“

”زیادہ نہیں، پر سنا ہے امیروں والے سارے شوق رکھتا ہے۔ شراب، کباب، شباب سب کا شوقین ہے۔“

عارف کے اس جواب نے رہن کے دماغ میں گھنٹی بجادی۔

”جو لیٹ نے تجھے آغا کے بارے میں کبھی کوئی بات

بولی تھی؟“

”نہیں لیکن وہ اس کے انٹرویو کے بعد کچھ پریشان

نظر آنے لگی تھی۔ آفس میں بھی اس کے لیے کسی کی فون کالز آنے لگی تھیں۔ ان کالز کو سن کر جو لیٹ کا موڈ خراب ہو جاتا

تھا لیکن میرے پوچھنے پر بھی اس نے کبھی مجھے کوئی صحیح جواب نہیں دیا تھا۔ بس یہی بولتی تھی کہ اس کے قادر کے کوئی رشتے

دار ہیں جن سے ان کا ملنا جلنا نہیں ہے لیکن اب وہ آگے ملنا چاہتے ہیں اس لیے فون کر کے بار بار اس سے اپنے والدین

کو راضی کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔“ عارف بے ساختہ بہت کچھ بولتا چلا گیا۔ جو لیٹ کے ساتھ پیش آنے والے

حادثے کے بعد اس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ ایک داغی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کر سکے لیکن لاشعوری طور پر

وہ اس بارے میں سوچتا رہا تھا اور اب رہن نے سوال جواب کیے تھے تو بہت کچھ خود بخود اس کے دماغ میں آتا چلا

گیا تھا۔

”کیا جو لیٹ کے ساتھ پیش آنے والے حادثے

میں دلدار آغا کا کوئی ہاتھ تھا؟“ عارف پڑھا لکھا نوجوان تھا اور تھا بھی صحافت کے شعبے سے وابستہ چنانچہ رہن کے سوال

جواب کے نتیجے میں اس کے ذہن کے درتے کچھ کھل گئے اور کڑی سے کڑی جوڑتا وہ بھی اس نتیجے پر پہنچ گیا جو شاید رہن

کے ذہن میں بھی تھا اس لیے سرسراتے لہجے میں رہن سے اپنے خیال کی تائید چاہی۔

”ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ابھی سب کچا پکا ہے۔ اپن سچائی کو خود کھوجے گا لیکن تو اس معاملے کو بھول جا۔ بالکل

ویسے ہی جیسے تو جو لیٹ کو بھول گیا ہے، کسی کے سامنے غلطی سے بھی تیری زبان پر یہ بات نہیں آنی چاہیے۔ کبھی منہ کھلنے

لگے تو اس بات کا خیال کر لیا کہ تو اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا



میں پہنچ گئی تو ڈرائیور نے پیچھے پلٹ کر پوچھا۔

رامو نے فرش پر بھی دری اٹھا کر کٹڑی کا تختہ بٹانے کے بعد دریافت کیا تھا۔ اس خلا سے ایک سیڑھی نیچے کی طرف جارہی تھی۔ ربن نے اس سیڑھی پر قدم جمائے اور نیچے اترنے لگا۔ رامو نے بھی اس کی تھلید کی۔ یہ خفیہ خانہ پہلے ہی سے اس مکان میں بنا ہوا تھا۔ ربن نے اس خانے کی وجہ سے ہی یہ مکان لیا تھا۔ خفیہ کاموں کے لیے اڈے سے ہٹ کر ایک محفوظ ٹھکانا بنانے کے لیے اسے یہ مکان بہت مناسب لگا تھا۔ اس ٹھکانے کو محفوظ رکھنے کے لیے وہ لوگ زیادہ اس طرف کارخ نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ہر ایک کو اس کے بارے میں علم تھا۔ اس پاس رہنے والوں کو بس اتنا ہی علم تھا کہ کسی سخی دل آدمی نے بوڑھے اچھو کو رہائش کے لیے یہ مکان دے رکھا ہے اور اچھو کے سارے اخراجات بھی وہی پورے کرتا ہے۔ کبھی کبھی یہاں آنے والوں کو اچھو کی خبر گیری کے لیے آنے والے سمجھا جاتا تھا۔ اچھو خود بھی سب کو یہی تاثر دیتا تھا۔

ربن اور رامو خانے کی سیڑھیاں ملے کر کے نیچے پہنچے تو ربن کی نظر سب سے پہلے چھت سے اٹنے لگے آدمی پر پڑی۔ اس آدمی کے جسم پر صرف ایک جانتا موجود تھا اور وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں اس حالت میں لٹکا ہوا تھا کہ جسم کا سارا خون سمت کر نیچے کی طرف آجانے سے اس کا چہرہ بے پناہ سرخ ہو رہا تھا اور چہرے کی اصل رنگت پتا نہیں چل رہی تھی۔ اس آدمی کو اس حالت میں لٹکے دیکھ کر ربن کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دل میں ٹھنڈ پڑتی جارہی ہے اور وہ ایک آگ جو وہ بہت دنوں سے خاموشی سے اپنے اندر لیے پھر رہا تھا اس کو بجھانے کا انتظام ہو گیا ہے۔ اس نے لٹکے ہوئے آدمی کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ تھپڑ کھا کر وہ شخص غنودگی سے لٹکا اور آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

”اچھی طرح دیکھ لے مجھے اور پہچان لے کہ میں موت کا فرشتہ ہوں، وہ بھی ایسا جو جان نکالنے کے بعد نہیں بلکہ جان نکالنے سے پہلے ہی تجھ سے سارا حساب کتاب لے گا۔ تو حساب دینے کے لیے تیار ہو جا۔“ اس کا لہجہ ایسا سنگین تھا کہ چھت سے لٹکا ہوا آدمی تو کیا، اس کے ساتھ آیا رامو بھی کانپ اٹھا۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور  
محبت کی فریب کاریوں کا مزید  
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

”ادھر مندر کے پاس روک دے۔“ رامو نے اشارے سے اسے بتایا تو ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی اس کے بتائے ہوئے مندر کے سامنے لے جا کر روک دی۔ اسے کرایہ وغیرہ دے کر فارغ کرنے کے بعد وہ دونوں پیدل ہی ایک سمت چل پڑے۔ یہ پتلی اور میڑھی میڑھی گلیوں والا بمبئی کا ایک قدیم علاقہ تھا جہاں راستوں پر جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور ننگے دھڑنگ بچے بے فکری سے کھیلتے پھر رہے تھے۔ کئی گھروں کے دروازوں کے آگے بنے چھوٹے چھوٹے چبوتروں پر ست الوجود اور صورت سے نشئی دکھائی دینے والے مرد پیر پیرے بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ ان مردوں کی موجودگی سے قطعی بے نیاز عورتیں گلی میں آ جا رہی تھیں۔ عورتوں کے لباس پھنے پرانے اور میلے تھے۔ مجموعی طور پر وہ علاقہ غربت اور جہالت کی منہ بولتی تصویر نظر آ رہا تھا۔ ربن اور رامو کے لیے ان میں سے کوئی چیز نئی نہیں تھی۔ وہ اس محلے سے اچھی طرح واقف تھے اور گندی متھن پیچ در پیچ گلیوں میں سے بڑے آرام سے گزرتے جا رہے تھے۔ اندرونی گلیوں میں سے ایک گلی میں بنے مکان کے سامنے پہنچ کر رامو نے لوہے کی کنڈی کی مدد سے دروازہ بجایا۔ فوراً ہی رد عمل ظاہر ہوا اور ایک خاصا بوڑھا آدمی دروازے پر نمودار ہوا۔

”سلام دادا۔“ ربن کو دیکھتے ہی اس کا ہاتھ ماتھے پر پہنچ گیا۔

”کیسا ہے رے اچھو! کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟“

ربن نے اس سے پوچھا۔

”اوپر والے کے بعد تمہاری ہی مہربانی ہے کہ اچھو کا بڑھا پاجین سے گزر رہا ہے۔“ بوڑھے نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ یہ بوڑھا ربن کو چند سال قبل بہت سخت حالت میں ملا تھا۔ وہ بیمار بھی تھا اور کئی وقت کا بھوکا بھی۔ اس لاوارث بوڑھے کو ربن نے اس مکان میں لا بٹھایا اور ایک لڑکے کو بھی اس کے پاس چھوڑ دیا۔ لڑکا سارے کام انجام دینے کے ساتھ اچھو کا خیال بھی رکھتا تھا۔ ”وہ کما کدھری ہے جو تمہیں دروازہ کھولنے آنا پڑا۔“ رامو کے ساتھ اندر داخل ہو جانے والے ربن نے اس لڑکے کے بارے میں دریافت کیا۔

”بازار سے سودا لینے گیا ہے۔ آتا ہی ہوگا۔“ اچھو نے بتایا تو ربن سر ہلاتے ہوئے اس خلا تک پہنچ گیا تھا جو



سرشت میں شامل نہیں تھا اور ویسے بھی وہ کافی باتونی اور ملنسار واقع ہوا تھا اس لیے اس کی بوریٹ کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ ایسے میں میری کی رفاقت اسے غنیمت لگی۔ وہ کینسر کی ایک ایسی قسم میں مبتلا تھی جو کسی کسی شخص کو لاحق ہوتی ہے اور جس پر اب بھی تحقیق ہو رہی ہے۔ وہ ایک ہفتے کی نگہداشت کے لیے اسپتال آئی تھی اور نہ جانے ایڈروڈ میں اسے کیا کشش محسوس ہوئی کہ ہر روز شام کو اپنی وہیل چیئر گھسیٹتی ہوئی اس کے بستر کے پاس چلی آتی۔

ایڈروڈ اور میری کی دوستی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی اس کے زیادہ عرصے تک چلنے کا امکان تھا کیونکہ دونوں ہی اسپتال میں لیٹے اپنی اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہے تھے لیکن یہ بات شاید انہیں معلوم نہ تھی۔ ایڈروڈ حقیقت کی دنیا میں رہنے والا شخص تھا اور خوش گمانی اس کی فطرت میں شامل نہ تھی۔ اسے ڈاکٹروں اور نرسوں کی سرگوشیوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک یاد دہانتوں کا مہمان ہے۔ مسکن دواؤں کی بدولت اس کی تکلیف میں تو کمی واقع ہو گئی تھی لیکن بستر پر لیٹنا اس کی

## دام

تنویر ریاض

بستر مرگ پر لیٹے اس مریض کی نگاہ بہت گہری تھی اور جسے ہر چہرے پر لکھی کہانی پڑھنے کا ہنر آتا تھا مگر اسے معلوم نہ تھا کہ دوسروں کی کہانیاں پڑھتے پڑھتے ایک دن خود بھی کسی داستان کا حصہ بن جائے گا۔

دوسروں کا غم ہلکا کرنے والے ایک بیمار کی جاندار ہوشیاری

Downloaded From  
Paksociety.com



اس شام بھی وہ اس سے ملنے آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی۔ وہ اسے لہراتے ہوئے بولی۔ "اس تصویر کو غور سے دیکھو..... ان میں سے ایک قاتل ہے۔"

ایڈورڈ نے اس بلیک اینڈ وائٹ تصویر پر ایک نظر ڈالی جس میں تین افراد ہاتھوں میں گلاس تھاے مسکرا رہے تھے۔ "یہ کون لوگ ہیں؟"

"میں تمہیں ایک اشارہ دیتی ہوں۔ ان میں سے ایک میرا بھائی ہے اور وہ قاتل نہیں ہے۔"

"میں اس تصویر کو غور سے دیکھتا ہوں۔" ایڈورڈ نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی وہیل چیئر کو اس کے قریب لے آئی اور بیٹھتے ہوئے تصویر اس کے آگے بڑھا دی۔ اس کے لباس سے پرفیوم کی مہک آرہی تھی اور اسے دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کیسٹر کی مرینہ ہے۔ وہ بہت ہی دلچسپ اور زندگی سے بھرپور عورت تھی اور اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کینیڈا میں گزارا تھا۔

"درمیان میں تو تمہارا بھائی ہے۔" ایڈورڈ نے میری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک گورٹ آرٹس تھا اور چربوں کو پہچاننے میں اسے کمال حاصل تھا۔ دونوں بہن بھائیوں کی ناک ایک جیسی تھی۔ "بقیہ دو کون ہیں؟"

"ان میں سے ایک کو ہم ڈاکٹر ایکس اور دوسرے کو ڈاکٹر وائی کہہ سکتے ہیں۔"

ایڈورڈ نے ایک بار پھر تصویر کو غور سے دیکھا۔ ڈاکٹر وائی لمبا اور سانولے رنگ کا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے باوجود سنجیدگی چھائی ہوئی تھی اور ایوں لگ رہا تھا جیسے وہ جبراً مسکرا رہا ہو جبکہ ڈاکٹر ایکس کا قد چھوٹا اور رنگ صاف تھا، اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور ہونٹ کچھ کہنے کے لیے بے تاب نظر آ رہے تھے۔

"کیا تم جانتی ہو کہ انہوں نے کسے قتل کیا تھا؟"

ایڈورڈ نے پوچھا۔

"ہاں۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ شاید اس واقعے کو پچیس یا تیس سال ہو گئے ہوں گے۔ ایک سرجن کو آپریشن تھیٹر میں کام کرنے والی نرس سے عشق ہو گیا تھا، جب اس کا نتیجہ سامنے آنے والا تھا تو اس ڈاکٹر نے اپنی شادی اور ساکھ کو بچانے کے لیے اس نرس کو مار ڈالا۔ اس کے ساتھیوں کو یہ بات معلوم تھی لیکن وہ بھی اس سازش میں شریک ہو گئے اور مجرماتہ خاموشی اختیار کر لی اور اس طرح اس نرس کی موت کا مہما کبھی حل نہ ہو سکا۔"

"تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"

"یہ بات میرے بھائی نے بتائی تھی۔ وہ بھی ان ڈاکٹروں میں سے ایک تھا جنہوں نے اپنے ساتھی کا جرم چھپایا۔ دو ماہ پہلے اس کا انتقال ہو گیا اور مرنے سے پہلے اس نے اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے یہ راز فاش کر دیا لیکن یہ پھر بھی نہیں بتایا کہ ان دونوں میں سے اصل قاتل کون ہے۔ جب لوگوں کو اپنی موت قریب نظر آنے لگتی ہے تو وہ سچ بولنے لگتے ہیں، فریڈ نے بھی ایسا ہی کیا لیکن اس کا آدھا سچ کس کام کا؟ اگر وہ قاتل کا نام بتا دیتا تو اس تک پہنچنے میں آسانی رہتی۔"

ایڈورڈ سے زیادہ کون جان سکتا تھا کہ زندگی کے آخری ایام میں انسان پر کیا گزر رہی ہوتی ہے تاہم اسے یہ اطمینان تھا کہ اس نے تمام ذمے داریاں بخوبی ادا کر دی تھیں اور اب اسے کوئی بچھتاوا نہیں تھا۔ اس نے بات ختم کرنے کے لیے کہا۔ "ممکن ہے یہ دونوں زندہ ہی نہ ہوں۔ اس لیے اب گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ۔"

"میں نہیں جانتی کہ فریڈ کو اس بارے میں معلومات تھیں یا نہیں۔ اس نے جو کہا وہ میں نے نہیں بتا دیا۔ صرف اتنا جانتی ہوں کہ ان میں سے ایک اس نرس کا قاتل ہے۔"

"کیا اس نے بتایا تھا کہ یہ قتل کیسے ہوا؟"

"وہ اپنے بستر پر مردہ پائی گئی تھی جبکہ وہ ایک صحت مند عورت تھی اور تمام زندگی میں ایک دن بھی بیمار نہیں پڑی۔ اس لیے اس کی موت کے بارے میں کوئی بات واضح طور پر نہیں کی گئی۔ اسپتال کی ڈسپنری میں ایسی کئی دوائیں ہوتی ہیں جن کے غلط استعمال سے کوئی بھی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ ویسے بھی اس زمانے میں دواؤں کے استعمال کا ریکارڈ رکھنے پر کوئی سختی نہیں تھی۔"

ایڈورڈ نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ "ہاں، آج کل تو اس کا پتا چلانا بہت آسان ہو گیا ہے۔"

"اگر پولیس اس کیس کو ری اوپن کرے تو بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔" میری پُر امید لہجے میں بولی۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں نے چونک کر اس جانب دیکھا۔ دروازے پر ایک موٹا سا میل نرس کھڑا تھا جسے ایڈورڈ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ میری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارے انجکشن کا وقت ہو گیا ہے۔"

میری نے اپنی وہیل چیئر گھمائی اور جانے لگی۔ "یہ تصویر تو لیتی جاؤ۔" ایڈورڈ نے کہا۔



لورا اس موقع پر باپ کے پاس رہنا چاہ رہی تھی لیکن کیس پیچیدہ ہو جانے کے سبب اسے بحالت مجبوری بیٹی کے پاس جانا پڑ گیا لیکن وہ ہر رات دس بجے فون کر کے باپ کی خیریت ضرور معلوم کرتی تھی۔

”لورا کا فون آیا تھا۔“ ایڈورڈ نے جواب دیا۔ ”وہ بے وقوف لڑکی میرے پاس آنے کے لیے بے چین ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ میلانی کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ میری تو بس اتنی خواہش ہے کہ اس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے پرانا بنا جاؤں۔“

”میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ تم اس کے بعد بھی کافی عرصہ زندہ رہو گے۔“

ایڈورڈ نہیں جانتا تھا کہ وہ مرنے سے پہلے اپنی بیٹی کو دیکھ بھی سکے گا یا نہیں لیکن جینیفر اچھی طرح جانتی تھی کہ اسے اپنی بیٹی کا کتنی شدت سے انتظار ہے لیکن دنوں میں سے کسی کی زبان پر یہ بات نہیں آئی۔ ایڈورڈ اپنے دلی جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”میرے لیے ملاقاتیوں کی کوئی کمی نہیں۔ کوئی نہ کوئی ملنے کے لیے آتا ہی رہتا ہے۔“

”مجھے اسٹاف سے معلوم ہوا ہے کہ آج کل میری کے ساتھ تمہاری خوب گاڑھی چھن رہی ہے۔“

”میں اتنا بد ذوق بھی نہیں کہ کسی خوب صورت عورت کو نہ دیکھ سکوں۔ اس سے پہلے کیتھرائن میری نظروں میں سمائی ہوئی تھی۔“

کیتھرائن اسپتال کی راہبہ تھی جو ہنستے میں چار مرتبہ آیا کرتی تھی۔ اس کا تعلق جرج آف انگلینڈ سے تھا۔

”میں سمجھتی تھی کہ تم جیسا باتونی بھی کسی راہبہ کو متاثر نہیں کر سکتا۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”مجھے ہر کسی سے باتیں کر کے خوشی ہوتی ہے۔ ویسے بھی ہم دونوں کے درمیان کبھی مذہب کے بارے میں گفتگو نہیں ہوتی۔ ہمیں جرائم کی کہانیوں سے لگاؤ ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے ان کہانیوں کا نیا مجموعہ لا کر دے گی۔“

وہ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر جینیفر نے محسوس کیا کہ ایڈورڈ کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں۔ اس نے نیچے سیدھے کیے اور ہنگامی گھنٹی اس کے قریب رکھ دی اور لائٹ بجھا کر واپس چلی گئی۔ اپنے دفتر کی طرف جاتے ہوئے وہ مریضوں کے کمروں میں جھانکتی جا رہی تھی۔ میری کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے محسوس کیا

”یہ میں چھوڑے جا رہی ہوں۔ یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ ان میں سے قاتل کون ہے، کیونکہ تم یہ کام کرتے رہے ہو دیکھنا یہ ہے کہ اس کیس میں تمہاری مہارت کیا رنگ دکھائی ہے۔“

وہ اسے جانتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس نے نیچے سے ٹیک لگائی۔ اسے حیرت اس بات پر گئی کہ ابھی تک کسی نے میری کو قتل کیوں نہیں کیا۔ وہ دروازہ کھلا چھوڑ گئی تھی اور یہ ایک طرح سے اچھا ہی تھا کیونکہ ایڈورڈ کو راہداری میں لوگوں کی آمد و رفت دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ اس کی نظروں وال کلاک پر جم گئیں۔ ابھی صرف نو بجے تھے۔ اس کی بیٹی کا فون آنے میں ایک گھنٹا باقی تھا۔ اس نے ایک بار پھر تصویر کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ وہ تینوں تقریباً ہم عمر تھے اور ان کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ کپڑوں اور شخصیت سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان میں سے کون قاتل ہو سکتا ہے۔ البتہ ڈاکٹر وائی نے شادی کی انگوٹھی پہن رکھی تھی جسے صرف محذب عدسے کی مدد سے دیکھا جاسکتا تھا۔ میلی فون کی گھنٹی بجی تو وہ چونک گیا۔ ایک گھنٹا گزرنے کا پتا ہی نہ چلا تھا۔

☆☆☆

جینیفر نے سر اٹھایا۔ اس کے کان رات کی خاموشی میں چھوٹی سے چھوٹی غیر معمولی آواز بھی سن سکتے تھے۔ وہ کبھی بھی گھبراہٹ کا شکار نہیں ہوئی اور رات کی ڈیوٹی کرنے کی عادی تھی لیکن اس آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے اپنے کاغذات سمیٹ کر ایک طرف رکھے اور راہداری میں چلی آئی جو خالی پڑی تھی لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے ابھی ابھی کوئی یہاں سے گزرا ہے۔ اس نے ایک بار پھر کان لگا کر سننے کی کوشش کی لیکن وہاں عمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایک بج رہا تھا۔ اس وقت وہ کچھ دیر کے لیے ایڈورڈ کے پاس جا کر بیٹھتی تھی کیونکہ تکلیف کی وجہ سے وہ ٹھیک طرح سو نہیں پاتا تھا اور جینیفر سے باتیں کر کے اسے سکون ملتا تھا۔ وہ اس کے لیے چائے بنا کر لائی اور اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ گوکہ یہ اس کے فرائض میں شامل نہیں تھا لیکن وہ سمجھتی تھی کہ ایک نرس ہونے کے ناتے مریض کی دیکھ بھال اس کا فرض ہے۔ ”بچے کے بارے میں کوئی خبر؟“ اس نے ایڈورڈ کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

ایڈورڈ کی اکلوتی بیٹی لورا نیوزی لینڈ میں تھی جہاں اس کی اپنی بیٹی میلانی کے ہاں بچے کی پیدائش متوقع تھی۔



کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ واپس مڑی اور اس کے کمرے میں چلی گئی۔ میری کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ اس نے نبض ٹولی۔ اس کا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ گزشتہ دو گھنٹوں کے دوران کسی بھی وقت میری خاموشی سے رخصت ہو گئی تھی۔ جینیفر نے اس کی آنکھیں بند کیں اور اس کی مغفرت کے لیے دعا کرنے لگی۔

ایڈورڈ کو اس کی موت کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے جینیفر سے کہا۔ ”کیا تمہیں امید تھی کہ وہ اتنی جلدی مر جائے گی جبکہ میں جانتا ہوں کہ وہ ایسا نہیں سوچتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کافی عرصے تک زندہ رہے گی۔“  
 ”وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے جس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی کسی نام ٹیمپل کے تحت ایسا ہوتا ہے۔“  
 ”مجھے یقین نہیں آ رہا۔ وہ زندگی سے بھرپور عورت تھی۔“  
 ”ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس کے دل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور ایسا کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔“  
 ”جانتا ہوں، اسپتال میں کسی کی موت واقع ہو جانا کوئی بڑی خبر نہیں لیکن.....“

جینیفر نے اس کا جملہ پورا نہ ہونے دیا اور بولی۔  
 ”ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ وہ کسی تکلیف اور شور شرابے کے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔“  
 ایڈورڈ نتھن پھلاتے ہوئے بولا۔ ”شاید نہیں کیونکہ یہ اس کا اسٹائل نہیں تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس نے کبھی کوئی آسان طریقہ اپنایا ہوگا۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گا۔“

”شاید اس کے گھر والوں کو بھی یہ امید نہ ہوگی۔“ جینیفر اعتراف کرتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری جیسی سے مجھے یاد آیا کہ اس کی جینیسی کسی بیگ کا تذکرہ کر رہی تھی جس میں اس کی خاندانی تصویریں تھیں۔ میں نے بہت تلاش کیا لیکن وہ بیگ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ کہیں وہ تمہارے پاس تو نہیں چھوڑ گئی؟“  
 ”پورا بیگ تو نہیں البتہ وہ یہ تصویر ضرور میرے پاس چھوڑ گئی تھی۔“ ایڈورڈ نے بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی دراز سے ایک تصویر نکالتے ہوئے کہا۔

جینیفر آگے کی طرف جھکی اور تصویر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ”یہ تو ڈاکٹر زنگ رہے ہیں؟“  
 ایڈورڈ پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ”تم انہیں پہچانتی ہو؟“  
 ”نہیں..... لیکن یہ بتا سکتی ہوں کہ یہ تصویر کس موقع پر لی گئی ہوگی۔ یہ ان کی پریکٹس کا پہلا دن ہے۔ نور سے

دیکھو تو تمہیں ان کے ناموں کی پلیٹ بھی نظر آ جائے گی۔“  
 ایڈورڈ نے سوچا کہ واقعی اس نے اس جانب دھیان نہیں دیا کیونکہ اس کی زیادہ توجہ چہروں پر تھی۔ اس نے غور سے نام پڑھنے کی کوشش کی لیکن حروف غیر واضح تھے اس لیے کامیاب نہ ہو سکا۔

”یہ کون لوگ ہیں؟“ جینیفر نے پوچھا۔  
 ایڈورڈ تھوڑا سا ہچکچایا لیکن اس نے بتانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔ میری کی زبانی اسے جو کچھ معلوم ہوا تھا، وہ اس نے جینیفر کو بتا دیا۔

”کیا تم نے وہ لطیفہ سنا ہے کہ ایک آدمی مرنے کے بعد جنت میں گیا تو اس نے ایک شخص کو سفید کوٹ پہنے گھومتے ہوئے دیکھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ خدا ہے جبکہ وہ اسے ڈاکٹر سمجھ رہا تھا۔ اسی طرح پرانے زمانے کے ڈاکٹر بھی اپنے آپ کو خدا سمجھتے تھے۔“

”آج بھی کچھ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔“ ایڈورڈ برا سامنے بناتے ہوئے بولا۔ ”گو یا تم یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہو کہ ایسا ہو سکتا ہے؟“

”ہم دونوں ہی جانتے ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے لیکن جب تک زبان سے کچھ نہ کہا جائے لوگ یہی ظاہر کرتے رہیں گے کہ انہیں کچھ معلوم نہیں۔“

”اور کچھ دنوں بعد سب سمجھ جائیں گے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا کیونکہ اگر کوئی ثبوت ہوتا تو پولیس اس پر ضرور غور کرتی لیکن قاتل کو یہ معلوم نہیں کہ جرم بھی نہیں چھپ سکتا۔ فن لینڈ میں جوئل ہوئے، ان کا مقدمہ چالیس سال بعد چلا۔ میری کے پاس یقیناً کوئی راز تھا جس کی وجہ سے قاتل نے اسے خاموش کر دیا۔“

”تم ایک بات بھول رہے ہو۔“ جینیفر بولی۔ ”اگر کوئی میری کوئل کرنا چاہتا تھا تو وہ اسپتال میں کس طرح داخل ہوا؟ تمام ملاقاتیوں کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے اور یہ کوئی بہت بڑا اسپتال نہیں ہے جہاں ملاقات کے دوران میں لوگوں کا جم غیر جمع ہو جائے۔ میں یہاں کام کرنے والے کبھی لوگوں کو جانتی ہوں کہ کوئی ڈاکٹر کا بھیس بدل کر اندر آ جائے۔“

”انہیں ڈاکٹر کا بھیس بدلنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ خود ڈاکٹر ہو سکتے ہیں۔ میں نے اپنے دوست سے رٹکن پنسلین منگوائی ہیں تاکہ اپنا کام مکمل کر سکوں۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے ٹیکے کے نیچے سے ایک اسکیج بک نکالی اور اسے کھولتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اس تصویر



مارفین کی زیادہ خوراک دی جائے ان کے دماغ میں ایسے ہی عجیب و غریب خیالات آتے ہیں۔

اس نے اپنا بیگ ٹولا اور ایڈورڈ کے بنائے ہوئے خاکے نکال کر دیکھنے لگی۔ انہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے بے چینی سی ہونے لگی۔ اسے ان تصویروں کا خیال آیا جو میری کی سبھی کے مطابق اسپتال سے گم ہو گئی تھیں پھر اس کی نگاہوں کے سامنے ڈیوٹی ڈاکٹر کا چہرہ گھوم گیا جو میری کو مردہ حالت میں دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔ اسے میری کے مرجانے کی بالکل بھی امید نہیں تھی۔ یہی غنیمت تھا کہ اس نے اپنی مرضی سے موت کے سرٹیفکیٹ پر دستخط کر دیے تھے۔ اس کے لیے بھی مشکل تھا کہ وہ اسپتال میں ہونے والے کسی قتل کے بارے میں سوچ سکتا۔ ویسے بھی جس مریض کو دن میں کئی انجکشن لگتے ہوں، وہاں ایک اور انجکشن کا نشان کے نظر آ سکتا تھا۔

اچانک اس کی نظر دیوار گیر گھڑی پر گئی۔ بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی بستر چھوڑ دیا اور بچوں کو لینے کے لیے روانہ ہو گئی۔ واپس آنے کے بعد وہ رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بچوں کا ہوم ورک کرواتی اور ان کی باتیں بھی سنتی رہی۔ میٹ کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ کسی اسپتال میں کمپیوٹر پر کام کرتا تھا اور اس کی ڈیوٹی نو سے پانچ ہوا کرتی تھی۔ کھانا ختم ہوتے ہوتے ساڑھے آٹھ بج ایک۔ اس نے بچوں کو بستر پر لٹایا اور خود میٹ کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ان کے پاس باتیں کرنے کے لیے یہی وقت ہوتا تھا۔ اس نے میٹ کو سارا قصہ سنایا اور ایڈورڈ کے بارے میں بتاتے ہوئے بولی۔

”مجھے تو یہ سب کچھ ایک پاگل پن لگتا ہے۔“  
 ”ان لوگوں کی شناخت ہو جائے تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ میٹ تصویر پر نظر میں جھانکتے ہوئے بولا۔  
 ”میں اس تصویر کو اسٹین کر کے بڑا کر دوں گا تاکہ نام پڑھے جاسکیں۔ کیا تم میری کے بھائی کا نام جانتی ہو؟“  
 ”میری کی شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ اپنے نام کے ساتھ جانسن لگا یا کرتی تھی۔ یقیناً اس کے بھائی کے نام میں بھی جانسن آتا ہوگا۔“

”ہم آن لائن ریکارڈ اور گوگل کے ذریعے بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔ لاؤ یہ تصویر مجھے دے دو۔“  
 ”اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ جینیفر منہ بنا تے ہوئے بولی۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر میں ان کے بارے میں

میں موجود تینوں افراد کی موجودہ عمر کے حساب سے خاکے بنانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر وائی کے بال پہلے ہی بہت باریک تھے جس کا اندازہ اس تصویر سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ اس لیے میرے تصور کے مطابق اسے سامنے سے گنجا ہونا چاہیے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھی پتلا ہو گیا ہوگا۔“

جینیفر بڑے غور سے اس کے بنائے ہوئے خاکوں کو دیکھ رہی تھی پھر ایڈورڈ نے ڈاکٹر ایکس کے خاکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا وزن تیزی سے بڑھتا ہے۔ اس کی وجہ صرف جسمانی ساخت نہیں بلکہ اس طرح کے لوگ کھانے پینے کے شوقین ہوتے ہیں۔ اس کے بال تھوڑے بہت جھڑ گئے ہوں گے اور ان میں سفیدی بھی جھلک رہی ہوگی۔ اس مضبوط ناک کی وجہ سے اس کا چہرہ خاصا امتیازی ہو گیا ہے۔“

”اب یہ لوگ کتنی عمر کے ہوں گے؟“ جینیفر نے پوچھا۔

”میرے حساب سے یہ ساٹھ کے پینے میں ہوں گے۔“

”ان میں سے کوئی تمہی ہمارے اسٹاف میں نہیں

ہے۔“ وہ اپنی آنکھیں سیٹھرتے ہوئے بولی۔

”لگتا ہے کہ تمہیں اس کا یقین نہیں ہے؟“

”میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتی۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔

قریبی کمرے سے گھنٹی بجنے کی آواز آئی تو وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہ تصویر اور خاکے لیتی جاؤ۔ شاید تم کسی نتیجے پر پہنچ سکو۔“

وہ تھوڑا سا ہچکچائی اور پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ دونوں چیزیں لے لیں۔ وہاں سے جانے کے بعد جینیفر کی مصروفیت میں اور اضافہ ہو گیا۔ سزاوشیا کی حالت اچانک ہی بگڑ گئی تھی۔ اس اسپتال میں وقت کی کوئی پابندی نہیں تھی لہذا رات بھر اس کے رشتے داروں کا آنا جانا لگا رہا۔ ایک کے بجائے دو پادری آگئے تاکہ اس کے لیے دعا کر سکیں لیکن جینیفر کی ڈیوٹی ختم ہونے تک وہ موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ گھر پہنچ کر اس نے بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرایا اور ان کے جانے کے بعد خود بستر پر دراز ہو گئی۔ اس کے ذہن میں ایڈورڈ کی باتیں گونج رہی تھیں۔ نہ جانے اس کے دماغ میں یہ بات کہاں سے آگئی کہ میری کو قتل کیا گیا ہے۔ ایڈورڈ کو جاسوسی کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا اس لیے وہ ان خطوط پر سوچ رہا تھا۔ ویسے بھی جن مریضوں کو



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



جاننے میں کامیاب ہو گیا اور اگر یہ دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں تو کم از کم تم اس بوڑھے کا شک تو دور کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔“

☆☆☆

ایڈورڈ کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ کیتھرین اس کے لیے جاسوسی کہانیوں کا نیا شمارہ لے آئی تھی لیکن وہ بھی اس کی توجہ بٹانے میں ناکام رہیں۔ وہ ہر ایک منٹ بعد گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لورا ہر رات دس بجے اسے فون کیا کرتی تھی لیکن اب گیارہ بج چکے تھے۔ وہ دل ہی دل میں دعا میں مانگ رہا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو اور زچگی کا مرحلہ بخیر و خوبی گزر جائے۔ جینیفر نے دروازے سے جھانکا اور بولی کہ وہ ایک بجے کے قریب اس کے پاس آنے کی۔ ہر ممکن کوشش کرے گی۔ وہ جانتا تھا کہ جینیفر جھوٹا وعدہ نہیں کرتی لیکن ایک بجنے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔

فون کی گھنٹی کی آواز سنتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے جلدی سے ریسیور اٹھایا اور لورا کی آواز سن کر جان گیا کہ سب خیریت ہے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”ڈیڈی! سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ میں اتنی مصروف رہی کہ وقت پر فون نہ کر سکی۔“

”میری فکر چھوڑو یہ بتاؤ کہ بچہ کیسا ہے؟“

”بچی بالکل ٹھیک ہے۔ انہوں نے اس کا نام ایلس رکھا ہے اور میلانی بھی خیریت سے ہے۔ وہ کل آپ سے بات کرے گی۔ میں نے ابھی ان لائن کو فون کیا تھا۔ مجھے تین گھنٹے بعد جانے والی پرواز میں نشست مل گئی ہے۔“

”اتنی جلدی کیوں جا رہی ہو؟“ ایڈورڈ نے پوچھا۔

”اب میری یہاں ضرورت نہیں رہی۔ جان مجھے لینے انرپورٹ پر آجائے گا۔ میں پرسوں تک آپ کے پاس آسکوں گی۔“

خوشی کی خبر سن کر اس کے چہرے پر رونق آ گئی اور اس کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ اس کے آنے کا سن کر ایڈورڈ کے دل میں اسے دیکھنے کی آرزو جاگ اٹھی۔ اسے وہ دن یاد آ گیا جب اس نے لورا کو پیدائش کے فوراً بعد اپنے بازوؤں میں لیا تھا اور یہ احساس کتنا خوشگوار تھا کہ وہ مرنے سے پہلے اسے ایک بار دیکھ سکے گا۔

☆☆☆

جینیفر کی میز پر کاغذوں کا انبار جمع ہو گیا تھا۔ وقت کی کمی کی وجہ سے وہ انہیں نہیں دیکھ پارہی تھی۔ کاش اسے کوئی ایسا دن مل جائے جب وہ اپنی میز صاف کر سکے۔ اس نے

اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ بارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ گویا اسے چائے پینے اور ایڈورڈ سے باتیں کرنے کے لیے مزید چالیس منٹ انتظار کرنا ہوگا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور دوبارہ کاغذوں میں کھو گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد کمپیوٹر پر اسے ہلکی سی آواز سنائی دی جو کسی امی میل کی آمد کا پتہ دے رہی تھی لیکن وہ اپنے کام میں اتنی تھوٹی کہ اس نے اس آواز کو نظر انداز کر دیا۔ دس منٹ بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس وقت بھی وہ ایک کاغذ کو بغور پڑھ رہی تھی۔ اس نے ریسیور کان سے لگایا اور میٹ کی آواز سنتے ہی گھبرا گئی۔ کہیں بچوں کو کچھ نہ ہو گیا ہو لیکن جب میٹ نے اسے بتایا کہ بچے خیریت سے ہیں تو اس نے سکون کا سانس لیا اور بولی۔

”تم اب تک کیا کر رہے ہو؟“

”میں کمپیوٹر پر کچھ کام کر رہا تھا۔ کیا تم نے میری امی میل نہیں دیکھی؟ میں نے اس تصویر میں موجود دونوں آدمیوں کے بارے میں معلومات حاصل کر لی ہیں۔ ان میں سے ایک چارلس ہیلنٹائن ہے۔ وہ ساؤتھمپٹن اسپتال میں تھا اور اس نے ایک شاندار کیریئر گزارا لیکن تمہیں اس کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ گزشتہ برس فوت ہو چکا ہے۔ دوسرا رابرٹ کلیور ہے جو آسٹریلیا چلا گیا تھا لیکن دس سال پہلے واپس آ گیا۔ وہ کینسر کے امراض کا ماہر ہے اور لندن کے ایک ٹیچنگ اسپتال سے وابستہ ہے۔“

جینیفر کو یوں لگا جیسے اس کے دروازے کے سامنے سے کوئی گزرا ہے۔ اس نے کالے سوٹ کی ایک جھلک دیکھی۔ وہ کوریڈور کی طرف جا رہا تھا۔ جینیفر نے میٹ کی امی میل کھولی اور اسے دیکھنے لگی۔ وہ ابھی تک بول رہا تھا۔

”اسپتال کی ویب سائٹ پر اس کی تصویر موجود ہے اگر دیکھنا چاہو تو مطلوبہ لنک پر کلک کرو۔“

اس نے ایسا ہی کیا۔ کمپیوٹر کی اسکرین پر جو چہرہ ابھرا، اسے دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ ایڈورڈ نے کتنا مکمل اسٹیج بنایا تھا بس ایک کسری باقی رہ گئی تھی۔

اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ کوریڈور کے سرے پر پہنچ کر قدموں کی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ اس وقت کون ملاقاتی آسکتا ہے؟ مسز اوشیا تو گزشتہ شب انتقال کر گئی تھی اور اس کی لاش اسپتال کے مردہ خانے میں رکھ دی گئی تھی۔ جینیفر نے فون رکھ دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ایڈورڈ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں لیکن



کے لیے شاید زندہ نہ رہوں۔“ اس نے یہ مشکل تمام اپنے سر کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن جو کچھ ہوا، وہ بالکل واضح ہے۔“

”وہ اس لحاظ سے بد قسمت رہا کہ میری کو بھی اسی قسم کا غیر معمولی کینسر تھا جس میں اس نے اسپیشلائزیشن کر رکھا ہے اور وہ اس کے پاس مشورے کے لیے جاتی رہتی تھی۔“

”جانسن تو ایک عام ساناٹام ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ میری کو اپنے دوست کی بہن کی حیثیت سے پہچان گیا ہو۔“

”لیکن میری سے یہ غلطی ہوئی تھی۔ وہ اس شخص کی اصلیت نہ پہچان سکی اور اس کی باتوں سے وہ یقیناً یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوگا کہ اسے نرس کے کل والی بات معلوم ہوئی ہے۔“

”اور اسے یہ شک بھی ہو گیا ہوگا کہ میری نے یہ بات ہسپتال میں کسی دوسرے شخص کو بھی بتادی ہے۔“

جینیفر کا اشارہ واضح طور پر ایڈورڈ کی جانب تھا۔ ایڈورڈ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہ رہا تھا کہ اس قاتل کی گرفتاری سے اسے ایک نئی زندگی ملی ہے لیکن جینیفر اس بارے میں کچھ زیادہ پُر امید نہیں تھی۔ اس کی بیماری بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور اسے اٹھنے بیٹھنے میں بھی بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شام کو ڈیوٹی پر واپس آنے کے بعد وہ اسے زندہ دیکھ سکے گی یا اس کی خواہش تھی کہ آخری وقت میں وہ شاید ہی اس کے پاس ہو۔ اس کے علاوہ، وہ لورا سے بھی ملنا چاہتی تھی۔

اس نے ایڈورڈ کا ہاتھ تھام لیا اور وہاں سے اٹھنا ہی چاہ رہی تھی کہ اس نے دیکھا کہ ایڈورڈ نے اپنی آنکھیں کھول دی ہیں اور وہ راہداری کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے سرگھما کر دیکھا۔ ایک درمیانی عمر کی خوب صورت عورت اس طرف چلی آ رہی تھی۔

”لورا۔“ ایڈورڈ اسے دیکھ کر بڑبڑایا۔ ”تم یہاں.....“

”ہاں ڈیڈ! میں تو اس سے بھی پہلے آجاتی لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں.....“

ایڈورڈ نے اس کا جملہ پورا نہ ہونے دیا اور بولا۔ ”یہ جینیفر ہے۔ اس نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔“

دونوں عورتوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ لورا کی مسکراہٹ بالکل باپ جیسی تھی۔ جینیفر نے باہر آ کر دروازہ بند کیا اور اس پر براہ کرم ڈسٹرب نہ کریں، کی سختی لگا دی۔ وہ چند ساعتوں کا مہمان تھا۔ اب وہاں کسی کو آنے کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے جینیفر کا انتظار تھا تاکہ پوچھ سکے کہ میلانی اور اس کی نومولود بچی کی تصویروں کے ساتھ کوئی ای میل آئی ہے۔ کاش وہ یہ خوش خبری میری کو بھی سنا سکتا۔ کیسی عجیب بات تھی کہ وہ ابھی تک اسے یاد کر رہا تھا۔ اس نے جو کہانی سنائی تھی، اس کا کوئی نہ کوئی تعلق اس کی موت سے بنتا تھا۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اس کی موت طبعی تھی۔

جب پادریوں جیسا لباس پہننے وہ شخص دروازے پر نمودار ہوا تو ایڈورڈ یہی سمجھا کہ وہ غلطی سے اس کے کمرے میں آ گیا ہے۔ جب وہ شخص اس کے قریب آیا تو اس کا دوسرا خیال یہ تھا کہ اس نے جو خاکہ بنایا تھا، اس شخص کی شکل اس سے لگتی ملتی ہے۔ ہاں اسے خاکہ بناتے وقت ڈاڑھی کا خیال نہیں آیا تھا۔ تیسری بات اس کے ذہن میں یہ آئی کہ شاید وہ اب کبھی لورا کو نہ دیکھ سکے لہذا اس کا ہاتھ بے اختیار سر ہانے رکھی ہوئی گھنٹی تک پہنچ گیا۔ جینیفر گھنٹی کی آواز سنتے ہی تقریباً دوڑتی ہوئی اس کے کمرے تک آئی۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ کوئی شخص ایڈورڈ کے بستر کے قریب کھڑا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک سرنج ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے بازو پھیلانے اور پیچھے سے جا کر اسے دیوچ لیا۔ اس شخص نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن جینیفر برسوں سے اپنے گھر پر مردوں والے کام کرتی آ رہی تھی اور ہسپتال میں بھی اسے مریضوں کو اٹھانے کی بڑی پریکٹس تھی جس کی وجہ سے اس کے بازو کافی سخت ہو گئے تھے۔ لہذا اس شخص کو اس کی گرفت سے نکلنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس کے ہاتھ سے سرنج چھوٹ کر زمین پر جا گری۔

عین اسی وقت ہسپتال کا سب سے تو مند اسٹاف پال دروازے پر نمودار ہوا اور اس نے اس شخص کو قابو کر لیا۔

”حیرت ہے کہ ایک اجنبی شخص سیاہ لباس پہنے کتنی آزادی سے ہسپتال میں چلا آیا اور کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔“ ایڈورڈ نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

جینیفر سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اس لباس میں وہ کسی بھی ہسپتال میں جا سکتا تھا۔ سب اسے پادری ہی سمجھتے اور کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔“

اگلے روز جینیفر اپنی ڈیوٹی ختم کرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر ایڈورڈ کے پاس گئی۔ وہ جو کچھ دیکھ چکی تھی اس پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا اور وہ ایڈورڈ سے اس بارے میں مزید گفتگو کرنا چاہ رہی تھی۔

”مجھے افسوس ہے کہ اس مقدمے کی کارروائی دیکھنے



## خبط

بابر نعیم

کبھی کبھی انسان اپنی پسند ناپسند، فطرت اور مختلف عادتوں کے ہاتھوں بڑا نقصان اٹھاتا ہے... وہ بھی ایک خبط میں مبتلا تھی مگر اسے احساس تک نہ تھا کہ اس معمولی سی عادت کی بنا پر کبھی اسے موت کو منہ لگانا پڑے گا...

محبت کی چاشنی میں ڈوبا ایک زیرک قاتل کا زہریلا منصوبہ

”اس عورت کی موت کی وجہ زہر خورانی ہے۔“  
ہومی سائینڈ کے کیپٹن فلسٹین نے کہا۔ ”آل رائٹ!“  
”زہر کون سا تھا؟“  
”سائینڈ!“

”لیکن کیا یہ قتل ہے؟“ سرائخ رساں جون میلون نے پوچھا۔ ”یہ خود کشی بھی تو ہو سکتی ہے۔“  
”یقیناً قتل ہی ہو سکتا ہے۔“ کیپٹن فلسٹین نے کہا۔  
”وہ عورت قدرے نجیبی تھی۔ اسی سلسلے میں وہ حال ہی میں





ہو۔ ایسا بھی کوئی امکان نہیں۔ جب اس عورت کی موت واقع ہوئی تو اس وقت وہ اپارٹمنٹ میں تباہی اور اندر سے کمرے کے دروازے کی چٹخنی بھی لگی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود بھی اس عورت کو زہر دیا گیا ہے۔ کس طرح..... یہ ایک معما ہے۔“ کیپٹن نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

سراخ رساں جون میلون اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک انگریزی، اپنا سا ردو پارہ سلگا یا اور بولا۔ ”آؤ، ڈاکٹر ہلٹن کے پاس چلتے ہیں۔ سہ معلوم نہیں کیوں لیکن مجھے ایک کسک سی محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے یہ اچانک ہی بھائی دیا ہے۔“

☆☆☆

سفید بالوں والے ممتاز ماہر نفسیات ڈاکٹر ہلٹن نے پوری سنجیدگی کے ساتھ ان کی تمام بات سنی پھر آخر میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں تم لوگوں کی مدد کر سکتا ہوں۔“ اس کا لہجہ دھیما تھا۔ ”میرا مشورہ ہے کہ ہم وہاں چل کر ایک نظر اس اپارٹمنٹ کا جائزہ لے لیتے ہیں۔“ وہ اپارٹمنٹ شکارگو کے جنوبی حصے میں واقع تھا۔ اپارٹمنٹ کی آرائش نہایت سلیقے سے کی گئی تھی اور وہ صاف ستھرا اور بے داغ نظر آ رہا تھا۔

کیپٹن فلینٹین اپنی راہنمائی میں انہیں اس کمرے میں لے گیا جہاں ایڈما میڈیسن کی لاش پائی گئی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا ڈائننگ روم تھا جس میں شوخ رنگ کا فرنیچر رکھا ہوا تھا۔ دیوار پر بھڑکیلا وال پیپر چسپاں تھا جس پر ٹراپیکل فروٹ کی تصویریں ایک خاص ترتیب سے بنی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر ہلٹن سیدھا وال پیپر کے پاس چلا گیا اور نزدیک سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے پولیس کیپٹن اور سراخ رساں کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ان دونوں کی توجہ وال پیپر پر نمایاں ان نم دھبوں کی جانب مبذول کرائی جو انگور کے بڑے سے خوشے کی تصویر پر دکھائی دے رہے تھے۔

”ان دھبوں کو ہاتھ مت لگانا۔“ ڈاکٹر ہلٹن نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ”ایسے اور بھی دھبے موجود ہو سکتے ہیں۔ ان پر تمہارا سائنائزڈ موجود ہے۔“

یہ سن کر سراخ رساں اور پولیس کیپٹن چونک پڑے۔ ”میرا خیال ہے کہ اگر تم لوگ مجھے اپنے ساتھ ڈاؤن ٹاؤن لے چلو اور مجھے اپنے مشتبه مجرم سے بات کرنے کا موقع دو تو میں تمہاری خاطر اس سے جرم کا اقرار کروا سکتا ہوں۔“

☆☆☆

ڈاکٹر ہلٹن نامی ایک ماہر نفسیات کے پاس بھی گئی تھی۔ ”میں اس ڈاکٹر کو جانتا ہوں۔“ سراخ رساں جون میلون نے بتایا۔

”تم تو ہر کسی سے واقف ہو۔“ کیپٹن فلینٹین نے کہا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ بات ہمیں اس کے شوہر ارنی میڈیسن نے بتائی ہے لیکن اس عورت کا خطبہ اس ٹائپ کا نہیں تھا کہ وہ خودکشی کر لیتی..... تم سمجھ رہے ہو نا کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟ خودکشی کرنے کا کوئی جواز موجود نہیں اور اگر وہ خودکشی کرنا چاہتی تب بھی وہ خودکشی نہیں کر سکتی تھی۔ تمام حقائق اس کے خلاف ہیں۔“

سراخ رساں جون میلون نے استفہامیہ نظروں سے پولیس کیپٹن کی طرف دیکھا۔

”اس پورے اپارٹمنٹ میں سائنائزڈ کا کوئی معمولی سا سراخ موجود نہیں ہے۔“ کیپٹن نے ناخوشگوار لہجے میں بتایا۔ ”کسی قسم کا بھی سائنائزڈ موقع پر ہی ہلاک کر دیتا ہے۔ وہاں پر کوئی گھاس یا ایسی کوئی شے موجود ہونی چاہیے تھی جس میں اس عورت نے سائنائزڈ لیا ہوگا لیکن ہمیں لاش کے پاس سے ایسی کوئی شے بھی نہیں ملی۔“

”تو تم نے اس عورت کے شوہر کو شک کی بنا پر حراست میں لیا ہوا ہے؟“ سراخ رساں میلون نے ایک نئے رنگارنگ رچر کھولتے ہوئے پوچھا۔

”اس کے پاس تمام جواز موجود ہیں۔“ پولیس کیپٹن نے کہا۔ ”تمام دولت اس عورت کی تھی۔ پھر زندگی کے بیسے کی رقم بھی خاصی بگڑی بنتی ہے۔ اس کے علاوہ ارنی میڈیسن نے کسی دوسری عورت کے ساتھ بھی ناجائز تعلقات استوار کیے ہوئے تھے۔“

یہ سن کر سراخ رساں جون میلون نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”لیکن اگر ہم یہ معلوم کرنے میں ناکام رہے کہ اس نے اپنی بیوی کو زہر کس طرح دیا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم بلا کسی جواز کے اسے کب تک حراست میں رکھے رہیں گے۔“

”زیادہ دیر تک تو نہیں رکھ سکتے۔“ سراخ رساں میلون نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

”اس پورے اپارٹمنٹ میں ایسی کوئی شے موجود نہیں جس میں سائنائزڈ کے ایک معمولی سے ذرے کا بھی سراخ ملا ہو۔ ہم نے تو یہاں تک بھی سوچا کہ بے ضرر گولیوں کی کسی بوتل میں زہر آلودہ ایک گولی شامل کر دی گئی



بعد میں وہ تینوں بیٹروں اور سگار پینے کے دوران آپس میں اسی معاملے پر گفتگو کر رہے تھے۔

”اس نے سائنائیزڈ وال پیپر پر لگا دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی سائنائیزڈ اپنی انگلیوں پر لگا لے گی اور اسے جاٹ لے گی۔“

کیپٹن فلینٹین نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن تمہیں کیسے پتا چلا کہ اس نے ایسا کیا ہوگا؟“

یہ سن کر ڈاکٹر مسکرا دیا۔ ”وہ جب مشورے کے لیے میرے پاس آئی تھی تو اس کا شوہر اس کے ہمراہ تھا۔ وہ باہر کے کمرے میں بیٹھا رہا جہاں وہ ہماری گفتگو کا ایک ایک لفظ آسانی سے سن سکتا تھا۔ اس وقت خاصی دیر ہو چکی تھی اور میرے کلینک میں ہم تینوں کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں تھا۔ حتیٰ کہ میری سیکریٹری بھی جا چکی تھی۔ صرف اس کے شوہر کے علم میں تھا کہ میرے اور اس کی بیوی کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی۔“

”لیکن اس کی بیوی نے تمہیں کیا بتایا تھا؟“ سراغ رساں میلون نے بے تابی سے پوچھا۔

”وہ ایک سادہ سے ذہنی مسئلے میں مبتلا تھی۔ اس نے مجھ سے کہا..... ڈاکٹر! میں اس لیے آپ کے پاس آئی ہوں کہ مجھے انگور کھانے کا جنون ہے۔ میں انگور کھانے کے خبط میں مبتلا ہوں۔ میں نے اس سے دیر تک مختلف قسم کے سوالات کئے۔ وہ ایک ذہین اور نوجوان عورت تھی اور بظاہر ایسی اور کوئی بات نہیں تھی کہ اس میں کسی قسم کی خرابی ہو۔“

ڈاکٹر نے اپنے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔ ”میں نے اپنی سی پوری کوشش کرتے ہوئے اسے بھرپور سلی دی کہ دنیا میں ایسے لاکھوں کروڑوں افراد ہیں جو انگور نہایت شوق سے کھاتے ہیں اور جنہیں انگور کھانے کا جنون ہے..... اور میں نے کہا کہ اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے اور وہ اس بارے میں قطعی طور پر فکرمند نہ ہو۔“

”تو پھر؟“

”وہ یہ سن کر مسکرا دی تھی۔ اس نے کہا..... ڈاکٹر! میں یہ بات بخوبی جانتی ہوں اور سمجھتی بھی ہوں۔ اس بات سے بھی واقف ہوں کہ دنیا میں لاکھوں کروڑوں لوگوں کو انگور کھانے کا جنون ہے لیکن بات یہ ہے ڈاکٹر کہ مجھے وال پیپر پر موجود انگور کھانا پسند ہیں اور میں انہیں شوق سے کھاتی ہوں۔“

## ہنی مون

عمر رسیدہ قاسم بھائی کراچی میں رہتے تھے لیکن ایک روز وہ مری میں مال پر ٹہلتے پائے گئے۔ ان کے ایک شناسا نے انہیں وہاں دیکھا تو گرم جوش سے بولے۔

”قاسم بھائی! آپ یہاں کیسے۔“

قاسم بھائی نے ذرا شرماتے ہوئے کہا۔ ”میں نے دوسری شادی کر لی ہے، یہاں ہنی مون پر آیا ہوں۔“

”بہت خوب! بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟“ شناسا نے پوچھا۔

”وہ تو کراچی میں ہیں، گھر میں کسی کو دیکھ بھال کے لیے چھوڑنا ضروری تھا۔“ قاسم بھائی نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

مرسلہ۔ مرچا گل، رمنگل، درازن کلاں

## معصوم مخبر

والدہ۔ ”بیٹا انسان کی جان کہاں سے نکلتی ہے؟“

بیٹا۔ ”کھڑکی سے۔“

والدہ۔ ”وہ کیسے؟“

بیٹا۔ ”امی جب آپ نے کال بیل دی تو پاپا نے آنٹی سے کہا جان کھڑکی سے نکل جاؤ۔“

مرسلہ۔ محمد جاوید خان، تحصیل علی پور

## دعوتِ خاص

آج شام آٹھ بجے ایک چھوٹی سی محفل رکھی ہے۔ آپ سے ضرور بالضرور آنے کی استدعا ہے۔

اس محفل میں چکن بروسٹ، کولڈ ڈرنک، پیزا، شوارما، سموے، پکڑے، چاٹ، دہی بھلے، دابو، آئس کریم اور برگر..... سے ہونے والے ”نقصانات“ کے بارے میں بتایا جائے گا۔

پلیز۔ آنا نہ بھولے گا۔

مرسلہ۔ سفینہ منظور، یوحنا آباد، لاہور



# پہلا پتھر

سرزا امجد بیگ

زندگی میں چاہے معصوم بچے کا پہلا قدم ہو یا انسان کی اچھائی اور برائی کی جانب پہلی نگاہ... اہمیت ہوتی ہے اس بات کی کہ پیروں میں طاقت اور ارادوں میں استقامت کس حد تک ہے اور یہی تعین انسان کی آئندہ گزرنے والی زندگی کو درست یا غلط، کوئی بھی سمت عطا کرتا ہے۔ اس کیس کی الجھی گتھیاں بھی اسی جانب اشارہ کر رہی تھیں کہ جرم کسی نے کیا اور سزا کسی اور کے حصے میں... لیکن مجرم کی چھوٹی چھوٹی غفلتیں اور فرار کی عجلتیں اس کے گرد دائرہ تنگ کر دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا... دولت کے حصول میں وہ بھول گیا تھا کہ ببول کے پودے میں گلاب کے پھول نہیں کھل سکتے... اور جہاں مرزا امجد بیگ جیسے گہری نظر اور وسیع تجربے کے حامل وکیل کا کھیل شروع ہو جائے وہاں دلیلوں کی بساط پر مجرموں کی بازی مات ہو ہی جاتی ہے اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ بھلائی اور سچائی کے عمل میں بس پہل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کوئی پہلا پتھر پھینکنے کی ہمت کر لے تو پھر ساتھ دینے والوں کی کمی نہیں رہتی۔

رشتوں کے وبال اور سازشوں کے جال میں الجھی مجرمانہ

کارروائیوں کا احوال

صحت جرم سے انکار کے بعد ملزم عرفان کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا پھر جرح کا سلسلہ شروع ہوا۔ وکیل استغاثہ جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد اکیوزڈ باکس کے قریب چلا گیا اور تیز نظر سے ملزم کو گھورنے لگا۔

وکیل استغاثہ کے اس خاموش جارحانہ انداز پر ملزم چند لمحات کے لیے بے چین ہوا پھر وہ بڑے اعتماد کے ساتھ وکیل استغاثہ کی جانب دیکھنے لگا جیسے وہ قتل کے کسی مقدمے میں ملوث نہ ہو بلکہ دیگر افراد کی طرح وہ بھی عدالت کی سنسنی خیز کارروائی دیکھنے اور اس سے محفوظ ہونے آیا ہو۔

وکیل استغاثہ نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے ملزم سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں اپنے نام کے معنی معلوم ہیں؟“ یہ ایک غیر متعلق اور کافی حد تک بے ہنگام سوال تھا تاہم ملزم نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ”جی ہاں..... معلوم ہیں۔“ ”میں بھی تمہارے نام کے معنی جاننا چاہتا ہوں۔“

کیس کو عدالت میں لگے ہوئے لگ بھگ چار ماہ ہو گئے تھے لیکن آج اس کیس کی پہلی باقاعدہ سماعت تھی۔ عدالت کا کرا افراد سے کچھ کھچ بھرا ہوا تھا۔ متعلقہ لوگوں کے علاوہ بھی اس کیس کی سماعت کے لیے وہاں کافی افراد موجود تھے۔ جج اپنی مخصوص کرسی پر آ کر بیٹھا تو کارروائی کا آغاز ہوا۔

میرے موکل اور اس کیس کے ملزم عرفان کو اس کے جرم سے آگاہ کیا گیا تو اس نے فرد جرم کے خلاف صحت جرم سے صاف انکار کر دیا۔

ملزم عرفان پر ایک خوب صورت عورت انیٹا کے قتل کا اور ایک لاکھ روپے کی چوری کا الزام تھا اور اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ میرا موکل بے گناہ تھا۔ اسے ایک گہری سازش کے تحت قتل کے اس مقدمے میں پھنسا یا گیا تھا۔ اگر مجھے عرفان کے قاتل ہونے کا ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو میں ہرگز ہرگز اس کیس میں ہاتھ نہ ڈالتا۔





**Downloaded From  
Paksociety.com**



وکیل استغاثہ بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”بتاؤ.....؟“

”عرفان کے معنی ہیں..... جان کاری۔“ ملزم نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ”آگاہی.....“

”اوہ.....“ وکیل استغاثہ نے استہزائیہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”پھر تو تم اس بات سے بھی آگاہ ہو گے..... میرا مطلب ہے، تمہیں اس امر کی آگاہی ہوگی کہ اس وقت تم کس حیثیت سے اس عدالت میں موجود ہو؟“

میں اگر چاہتا تو اس مرحلے پر مداخلت کر کے وکیل استغاثہ کے ان غیر متعلقہ سوالات کے جواب میں بہت کچھ کہہ سکتا تھا لیکن میں دانستہ خاموش رہا۔ ملزم نے وکیل استغاثہ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

”مجھ پر میڈم کے قتل کا الزام ہے۔“

”کون میڈم؟“ وکیل استغاثہ نے جیسے انداز میں استفسار کیا۔

”میڈم اینیٹا.....!“

”صرف تم پر اینیٹا کے قتل کا الزام ہی نہیں بلکہ تم نے یہ قتل کیا بھی ہے۔“ وکیل استغاثہ نے درشت انداز میں کہا۔ ”تم اینیٹا کے قاتل ہو..... ایک خطرناک اور سنگین مجرم ہو.....!“

”آئی جیکشن پور آنرز.....!“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر تیز آواز میں کہا۔ ”میرے موکل عرفان پر عائد کردہ الزام ابھی ثابت نہیں ہوا لہذا اسے مجرم کہہ کر پکارنا قانوناً اور اخلاقاً غلط ہوگا..... بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر استغاثہ کا یہ اقدام انصاف کے اصولوں کے بھی سراسر منافی ہے۔“

جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے میرے اعتراض کو درست مانا اور اپنے مخصوص بھاری بھر کم لہجے میں وکیل استغاثہ کو ہدایت کی۔

”وکیل صاحب! آپ اپنے بیان میں سے لفظ ”مجرم“ کو خارج کر کے جرح جاری رکھیں۔“

”مسٹر عرفان! میں نے سنا ہے کہ تمہیں سردی نہیں لگتی.....؟“ وکیل استغاثہ نے اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”میں سمجھا نہیں.....“ ملزم نے الجھن زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟“

”آپ اس وقت ٹی شرٹ میں ملبوس ہو۔“ وکیل استغاثہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تم ہمیشہ ایسی شرٹ پہنتے ہو جس میں سے تمہارے بازوؤں کی یہ صحت مند مچھلیاں نظر آتی

رہیں۔ موسم چاہے کوئی بھی ہو، تمہیں کوئی پرداہ نہیں ہوتی۔ تمہیں تو بس اپنی باڈی کی نمائش کرنا ہوتی ہے.....“

کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

میرا موکل عرفان ایک دراز قامت اور صحت مند شخص تھا۔ اس کے جسم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے باڈی بلڈنگ وغیرہ کا بہت شوق تھا اور وہ باقاعدہ ایکسرسائز بھی کیا کرتا تھا۔ اس کے بازوؤں کی حرکت کرتی ہوئی خوب صورت مچھلیاں اس امر کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔

”ہاں..... آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔“ ملزم نے وکیل استغاثہ کے استفسار کے جواب میں برہمی سے کہا۔ ”مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔ اگر میں عموماً ٹی شرٹس یا ہاف سیلو شرٹس پہنتا ہوں تو اس میں آپ کو کیا اعتراض ہے؟“

”مجھے ذاتی طور پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ وکیل استغاثہ نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بس، میں تو یہ

جاننا چاہتا ہوں کہ تم اپنے بازوؤں کی مچھلیوں کی نمائش کیوں کرتے ہو؟ تم نے میرے اس سوال کا جواب نہیں دیا لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم ان سے بہت محبت کرتے ہو اسی لیے انہیں خوب تندرست اور توانا رکھتے ہو.....“

”یہ کیا بات ہوئی۔ میں تو اپنے پورے بدن ہی سے محبت کرتا ہوں۔“ ملزم نے حیرت اور الجھن کے طے طے تاثرات کے ساتھ کہا۔ ”اور سر سے پاؤں تک خود کو تندرست رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں۔“

”مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!“ میں نے ملزم کے خاموش ہوتے ہی اٹھ کر کہا۔ میرا مخاطب کر ہی انصاف پر بیٹھا ہوا سنجیدہ مزاج جج تھا۔

میں نے چونکہ ملزم کے جواب دینے کے بعد ”آئی جیکشن“ کیا تھا اس لیے جج مجھ سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”وکیل صاحب! آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟“

”جناب عالی!“ میں نے کھٹکھٹا کر گلا صاف کیا پھر اپنے اعتراض کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”قدرت کی عطا کردہ نعمتوں میں صحت کو بہت زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کوئی کسی بیمار شخص سے پوچھے۔ لوگ تو خود کو صحت مند اور چاق و چوبند رکھنے کے لیے سوسو جتن کرتے ہیں۔ یہ ایسی نعمت خداوندی ہے جو ہزاروں، لاکھوں روپے خرچ کر کے کسی دکان سے خریدی نہیں جاسکتی.....“ لگاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اگر میرا موکل قابل رشک صحت کا مالک ہے۔ اللہ



ہوتے ہوئے کہا۔ ”وکیل استغاثہ اس قسم کی پھیلیاں ڈال کر خواجہ خواہ میرے موکل کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بھلا کسی کے بازوؤں کی صحت مند مچھلیاں کیونکر ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کی جاسکتی ہیں؟“

”ڈیفنس کے اعتراض کا جواب دیں وکیل صاحب۔“ جج وکیل استغاثہ کی جانب سوالیہ نظر سے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ”آپ ملزم کے صحت مند بازوؤں کی مچھلیوں کو کیوں زیر بحث لانا چاہتے ہیں۔ آپ کی اس کوشش میں کون سا راز چھپا ہوا ہے اور..... یہ ہتھیار سے آپ کی کیا مراد ہے.....؟“

”یور آنر.....!“ وکیل استغاثہ انگلی کی مدد سے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ شخص بہت ہی عیار اور چال باز ہے۔ اس کے چہرے کی معصومیت اور انداز کی سادگی کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ کس طرح اپنے خطرناک منصوبوں کو عملی جامہ پہناتا ہوگا۔ اس نے صنف مخالف کو متاثر اور اپنی جانب راغب کرنے کے لیے یہ صحت مند مچھلیاں پال رکھی ہیں اور موجودہ کیس میں بھی ملزم کے اس آزمودہ ہتھیار نے بہت کام دکھایا ہے۔“

جج نے اثبات میں گردن ہلائی اور گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ ”وکیل صاحب! ملزم کے حوالے سے کیے گئے اس دعوے کی وضاحت آپ کس طرح کریں گے.....؟“

”جناب عالی!“ وہ ایک ایک لفظ پر زور ڈالتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میرے موقف کو سمجھنے کے لیے عورتوں کی مخصوص نفسیات کو مد نظر رکھنا بہت ضروری ہے.....“

”عورتوں کی نفسیات جج میں کہاں سے آگئی؟“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔

وکیل استغاثہ نے طنزیہ انداز میں میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”آپ مجھے بات مکمل کرنے دیں گے تو بتاؤں گا تاکہ کون کون سی اور کس کس کی نفسیات جج میں آسکتی ہے؟“

”بیگ صاحب!“ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”آپ اپنی باری پر ضرور سوال کیجیے گا۔“ پھر وہ وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

”وکیل صاحب! آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔“

”جناب عالی!“ وکیل استغاثہ کھٹکھٹا کر گلا صاف کرنے کے بعد رواں ہو گیا۔ ”جیسا کہ سب جانتے ہیں اور اس امر میں کسی شک و شبہ کی بھی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی کہ عورت بنیادی طور پر کمزور واقع ہوئی ہے اور ہر

تعلاتی نے اسے خوب صورت اور دلکش بدن عطا فرمایا ہے تو اس میں میرے فاضل دوست کو کیا اعتراض ہے۔ وہ بار بار میرے موکل کے بازوؤں کی مچھلیوں پر کیوں نکات اٹھا رہے ہیں۔ کیا اچھی صحت اور سڈول جسم کا مالک ہونا قانون کی نظر میں کوئی جرم ہے؟“

میں نے بڑے بھرپور انداز میں ملزم عرفان کا دفاع کیا تھا۔ جج نے محل سے میری وضاحت سنی پھر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وکیل صاحب! آپ ڈیفنس (وکیل صفائی) کے سوال کے جواب میں کیا کہیں گے.....؟“

”یور آنر.....!“ وکیل استغاثہ، معاندانہ نظر سے ملزم کو گھورنے کے بعد جج سے مخاطب ہوا۔ ”ملزم کی صحت اور تندرستی پر استغاثہ کو کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن.....“

”لیکن کیا.....“ جج نے وکیل استغاثہ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی استفسار کر ڈالا۔ ”جب کوئی اعتراض نہیں ہے تو پھر اس زاویے سے جرح کا کیا جواز ہے؟“

”میں وضاحت کرتا ہوں جناب عالی۔“ وہ گردن کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے معتدل انداز میں بولا۔ ”یہاں پر میں چھری کی مثال دوں گا۔ چھری عام استعمال ہونے والی ایک ایسی شے ہے جس پر کسی بھی شخص کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تاہم اس کا استعمال بعض اوقات قابل اعتراض صورت حال کو جنم دے سکتا ہے مثلاً.....“

وکیل استغاثہ نے دانستہ توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر ڈرامائی انداز میں اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”مثلاً..... اگر چھری کی مدد سے سبزی اور پھل کاٹے جائیں تو یہ عمل کسی بھی طور پر قابل اعتراض نہیں کہلائے گا۔ اگر اسی چھری سے مرثی یا بکری وغیرہ کو ذبح بھی کر ڈالیں تب بھی کہیں سے صدائے احتجاج بلند نہیں ہوگی لیکن اگر یہ چھری کسی انسان کے پیٹ میں ٹھونپ دی جائے یا کسی انسان کی شہ رگ پر چلا دی جائے اور یا پھر اس کی مدد سے کسی جیتے جاگتے انسان کی آنکھیں نکال لی جائیں تو چھری کا اس نوعیت کا استعمال قابل دخل اندازی پولیس قرار پائے گا۔ اب میں زیر سماعت کیس کی طرف آتا ہوں.....“

اس نے ایک مرتبہ پھر ذرا دیر کو توقف کیا، فاتحانہ انداز میں مجھ پر ایک نظر ڈالی پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بولا۔ ”یہ شخص انہیں بطور ہتھیار استعمال کرتا ہے۔“

”جناب عالی!“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے



اس کیس میں نامزد ملزم اور میرا موکل عرفان بیٹے کے اعتبار سے ایک الیکٹریشن تھا جبکہ مقتولہ اینیٹا ایک کاروباری شخص نجیب اللہ کی بیوی تھی۔ نجیب اللہ کا بزنس بولٹن مارکیٹ کے علاقے میں تھا۔ میں نے خاصے جیکھے انداز میں وکیل استغاثہ سے سوال کیا تھا لیکن اس نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بڑے محل سے جواب دیا تھا۔

”میں ان دونوں کے درمیان پائے جانے والے تعلقات کو افلاطونی عشق نہیں سمجھتا۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ ایک طرف سے پسندیدگی اور دوسری جانب سے ایک گہری چال کا شاخسانہ تھا۔“

وکیل استغاثہ کے اس تبصرے پر جج کی دلچسپی میں کمی گنا اضافہ ہو گیا۔ اس نے گہری تنقید کی سے استفسار کیا۔ ”یہ جو آپ نے پسندیدگی اور چال کے الفاظ استعمال کیے ہیں، ذرا ان کی وضاحت کر دیں۔“

”جناب عالی!“ وکیل استغاثہ نے یہ آواز بلند بولنا شروع کیا۔ ”اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ مقتولہ اینیٹا ملزم کو دل و جان سے پسند کرتی تھی اور اس پسندیدگی کا سب سے بڑا سبب ملزم کا صحت مند اور دلکش شخصیت کا مالک ہونا ہی تھا۔ وہ ملزم کے بازوؤں کی خوب صورت مچھلیوں کی اکثر تعریف کیا کرتی تھی۔ یہ تو ہے اس کیس کا ایک پہلو.....“

یہاں تک بتانے کے بعد اس نے ذرا سا توقف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”دوسری جانب ملزم ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق مقتولہ کو اپنے دام میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ملزم نے ابتدا ہی میں یہ بات بھانپ لی تھی کہ مقتولہ کو دلکش شخصیت کے مالک مرد بہت زیادہ پسند ہیں لہذا اسے مقتولہ کے قریب آنے اور اس کا اعتماد حاصل کرنے میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے منصوبہ بندی کی اور موقع ملنے ہی یہ ایک لاکھ روپے چرا کر بھاگ نکلا.....“

”ایک منٹ میرے فاضل دوست!“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے فرمایا کہ ملزم نے ایک خاص مقصد کی خاطر مقتولہ کا اعتماد حاصل کیا اور پھر ایک لاکھ روپے حاصل کر کے فرار ہو گیا لیکن شاید آپ بھول رہے ہیں کہ میرے موکل پر مقتولہ اینیٹا کے قتل کا الزام بھی ہے؟“

”میں کچھ بھی نہیں بھولا ہوں.....“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

”پھر آپ اینیٹا کے قتل کو کس کھاتے میں ڈالیں گے؟“ میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

وقت یہ ایک مضبوط سہارے کی تلاش میں رہتی ہے۔ اسی حقیقت کی بنیاد پر اسے طاقتور اور صحت مند مرد اچھے لگتے ہیں جو اس کی حفاظت کر سکے۔ ملزم ان خصوصیات پر صد فیصد پورا اترتا ہے۔“

”مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر احتجاجی لہجے میں کہا۔

جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ”کیسا اعتراض؟“

”جناب عالی.....!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ”میرے فاضل دوست اور اس کیس کے سرکاری وکیل نے عورتوں کی نفسیات کے حوالے سے

ابھی معزز عدالت کے سامنے جو کچھ بیان فرمایا ہے، اسے فارمولا بنا کر ہر عورت پر فٹ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ عورت کو تحفظ کی اشد ضرورت ہوتی ہے لیکن بنیادی طور پر وہ سچی محبت کی متلاشی ہوتی ہے۔ اس کی نظر میں وہی مرد کوئی

مقام پاسکتا ہے جو اپنے قول و فعل میں سچا اور پُر خلوص طرز عمل کا حامل ہو۔“

”آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں وکیل صاحب؟“

جج نے وکیل استغاثہ سے سوال کیا۔

”بے شک پورا آرزو..... یہ کوئی فارمولا نہیں ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے عورت کی عمومی نفسیات کا ذکر کیا ہے۔“

”وکیل صاحب! اس وقت ملزم عرفان پر دو الزامات کا بوجھ لدا ہوا ہے۔“ جج نے وکیل استغاثہ سے کہا۔ ”اول،

اس نے ایک حسین و جمیل عورت اینیٹا کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ دوم، اس نے مقتولہ اینیٹا کے گھر سے ایک لاکھ

روپے چرائے ہیں۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ آپ نے عورت کی عمومی نفسیات کے ذیل میں جو کہانی سنا کی ہے،

اس کا ملزم اور مقتولہ کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ کیا آپ اس کی وضاحت کریں گے؟“

”بالکل کروں گا جناب عالی۔“ وکیل استغاثہ نے اعتماد بھرے انداز میں کہا۔ ”اصل میں یہی نکتہ تو میں

عدالت کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ ملزم نے اپنی وجاہت اور پُر تاثر شخصیت کا تیر چلا کر پہلے تو مقتولہ اینیٹا کے دل میں اپنے لیے جگہ بنائی اور پھر اپنا کام کر کے چلتا بنا۔“

”دل میں جگہ بنائی..... بہت خوب۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”آپ کی تھیوری سے تو یہی ظاہر ہوتا

ہے کہ میرے موکل اور مقتولہ اینیٹا کے درمیان بڑا افلاطونی قسم کا کوئی عشق چل رہا تھا؟“



سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”کہ جب یہ وقوعہ پیش آیا، میرا مطلب ہے کہ جب چوری اور قتل کی واردات ہوئی تو ان اوقات میں ملزم کے سوا اور کوئی شخص مقتولہ کے گھر نہیں گیا تھا لہذا پہلا اور آخری شک اسی شخص پر کیا جاسکتا ہے.....“ اتنا کہنے کے بعد وکیل استغاثہ نے انگلی سے اکیوزڈ پاس میں کھڑے میرے موکل کی جانب اشارہ بھی کر دیا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ اس کا مخاطب میں تھا۔

”میرے فاضل دوست! اگر مقتولہ کی لاش کے نزدیک ہی آلہ قتل بھی پڑا ہوا مل جائے اور اس آلہ قتل پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات یعنی فنگر پرنٹس بھی موجود ہوں تو پھر ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اسی شخص نے.....“ وہ ایک مرتبہ پھر انگلی کے اشارے سے ملزم کی نشاندہی کرتے ہوئے بولا۔ ”اسی شخص نے مقتولہ انیتا کو موت کی نیند سلایا ہوگا..... دیش آل!“

وکیل استغاثہ نے بات مکمل کرنے کے بعد بڑے اسٹائل سے کندھے اچکائے تو میں نے یہ آواز بلند کہا۔

”دیش ناٹ آل مائی ڈیئر پراسیکیوٹر.....!“

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ ”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں.....؟“

”آپ نے جو دلچسپ اور سنسنی خیز اسٹوری سنائی ہے اسے ثابت کرنا بھی ضروری ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”عدالت اس نوعیت کی بے بنیاد باتوں کو اہمیت نہیں دے سکتی۔ کیا استغاثہ کے پاس اس واردات کا کوئی عینی شاہد موجود ہے.....؟“

اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”نہیں!“

”کیا آپ نے ملزم کو گرفتار کرنے کے بعد اس کے پاس سے ایک لاکھ کی رقم برآمد کر لی تھی؟“ میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں.....!“ اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں جواب دیا۔

”میرے فاضل دوست!“ میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ اس کیس کے والی ہیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ اور آلہ قتل کئی بار آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ آپ نے فنگر پرنٹس رپورٹ کو بھی متعدد بار پڑھا ہوگا۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ مقتولہ انیتا کو کس نوعیت کے آلہ قتل سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا؟“

وہ میرے اس مصصوم اور سادے سے سوال پر تعجب خیز انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔ میرے سوال کا جواب دیں؟“

”سیدھی سی بات ہے۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔

”مقتولہ نے ملزم کو ایک لاکھ کی رقم چراتے ہوئے رگے ہاتھوں پکڑ لیا ہوگا۔ اس کے بعد مقتولہ انیتا کی جانب سے مزاحمت کا مضبوط جواز بنتا تھا یقیناً اس نے ملزم کو روکنے کی کوشش کی ہوگی۔ اس خوف سے کہ پکڑے جانے پر ملزم کا راز فاش ہو جائے گا، اس نے مقتولہ کی مزاحمت کے جواب میں اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔“

”بہت خوب میرے فاضل اور قابل دوست!“ وکیل استغاثہ کے خاموش ہونے پر میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”آپ نے کہانی تو بہت دلچسپ سنائی ہے مگر آپ کی کہانی میں ”ایسا ہوا ہوگا!... ویسا ہوا ہوگا!“ جیسے الفاظ یہی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ کہانی مفروضات پر مبنی ہے۔ کیا آپ میرے تین سوالات کے ٹھوس جواب دے سکتے ہیں؟“

بات ختم کرتے ہی میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا کر رہ گیا تاہم جلد ہی سنبھلتے ہوئے بولا۔

”کون سے تین سوال؟“

”سوال نمبر ایک.....!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ”کیا آپ کے پاس اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود ہے کہ ملزم نے مقتولہ کے گھر سے ایک لاکھ روپے چوری کیے تھے؟ سوال نمبر دو..... آپ کس بنا پر اتنے دعوے سے کہہ رہے ہیں کہ مقتولہ نے ملزم کو ایک لاکھ کی رقم چراتے ہوئے دیکھ لیا تھا.....؟“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس امر کو آپ کیسے ثابت کریں گے کہ مقتولہ کی مزاحمت پر ملزم نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا؟ یہ میرا تیسرا سوال ہے.....“

”اگر کسی شخص نے اپنے گھر میں ایک لاکھ روپے رکھے ہوں اور وہ اچانک غائب ہو جائیں۔“ وہ چند لمحے سوچنے کے بعد گویا ہوا۔ ”وہ شخص اپنے گھر کے اندر مردہ پایا جائے تو اس کا ایک ہی مطلب نکلتا ہے کہ چور نے چوری کی اور صاحب خانہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد جائے وقوعہ سے فرار ہو گیا۔“

”آپ کی تھیوری تو خاصی دلچسپ ہے میرے فاضل دوست۔“ میں نے چوٹ کرنے والے انداز میں کہا۔ ”مگر اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مبینہ چور اور قاتل اس کیس کا ملزم اور میرا موکل عرفان الیکٹریشن ہی تھا؟“

”وہ اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ.....“ وہ میرے



اس کا ایک ٹول ہے۔ اس ہتھوڑی کے دستے پر اس کے فنکر پرنس پائے جانا کوئی انہونی نہیں ہے۔“

”اور ہتھوڑی کے سر پر جو مقتولہ کا خون اور بال چکے ہوئے پائے گئے ہیں.....؟“ وکیل استغاثہ نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

”ظاہر ہے، یہ خون اور بال مقتولہ ہی کے ہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”اور اس امر میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اسی ہتھوڑی کی مدد سے مقتولہ اینٹا کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔“

”اس کے باوجود بھی.....“ وہ تمسخرانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس کے باوجود بھی آپ اپنے مؤکل کو بے گناہ سمجھتے ہیں؟“

”جی ہاں..... بالکل.....“ میں نے قطعاً لہجے میں کہا۔ ”آلہ قتل کے دستے پر میرے مؤکل کی انگلیوں کے نشانات کا پتہ پتہ جانا کوئی اچھے کی بات نہیں۔ عین ممکن ہے، کسی سازشی شخص نے اس کی ہتھوڑی چرا کر یہ واردات کی ہو تاکہ الزام میرے مؤکل کے سر آئے..... اس کا کوئی دشمن، کوئی بدخواہ یہ کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔“

”ہرگز نہیں.....“ وکیل استغاثہ تیز آواز میں چلایا۔ ”کیوں..... اس میں ایسی چیخنے یا چلانے والی کون سی بات ہے؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرے مؤکل نے مجھے بتایا ہے کہ اس کی یہ ہتھوڑی چند روز پہلے گم ہو گئی تھی اور.....“

”اس نے جھوٹ بولا ہے، بکو اس کی ہے.....“ وکیل استغاثہ کی آواز اور بلند ہو گئی۔

”میں وقت آنے پر اپنے مؤکل کے بیان کو عدالت میں سچ ثابت کر سکتا ہوں۔“ میں نے بے حد مضبوط لہجے میں کہا۔

”اگر کسی شخص نے ملزم کی ہتھوڑی چرا کر قتل کی یہ واردات کی ہے تو ہتھوڑی کے دستے پر اس شخص کے فنکر پرنس آنا چاہیے تھے۔“ وکیل استغاثہ دور کی کوزی لایا۔

”ہتھوڑی کے ہینڈل پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات کیوں موجود ہیں؟“

”اس سوال کا جواب میں پہلے دے چکا ہوں۔“ میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ”جو چیز جس شخص کی ملکیت ہوتی ہے اس پر اسی کے فنکر پرنس پائے جاتے ہیں اور جہاں تک آپ کے دوسرے سوال کا تعلق ہے تو.....“ لچائی توفیق کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

میرے لیے یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ نجیب اللہ کی خوب صورت اور جوان بیوی اینٹا کو ایک ہتھوڑی کی مدد سے قتل کیا گیا تھا۔ آلہ قتل کی لیبارٹری رپورٹ ظاہر کرتی تھی کہ مذکورہ ہتھوڑی کی ایک طوفانی ضرب نے مقتولہ کی کھوپڑی کو چٹخا کر رکھ دیا تھا اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گئی تھی۔ آلہ قتل پر پائے جانے والے خون کے دھبے مقتولہ کے خون سے چھچھ کر گئے تھے۔ علاوہ ازیں ہتھوڑی کے فولادی حصے پر خون کے دھبوں کے ساتھ ہی مقتولہ کے سر کے چند بال بھی چکے ہوئے پائے گئے تھے۔ اس امر میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ اسی ہتھوڑی کے ایک کاری دار نے مقتولہ اینٹا کو اس جہان سے اس جہان میں پہنچایا تھا۔

میرے سوال کا جواب دینے کے لیے وکیل استغاثہ چوٹی میز کی جانب بڑھ گیا۔ اس قسم کی چوٹی میز یا ایک سے زیادہ میزیں عدالت کے کمرے میں موجود ہوتی ہیں جن پر زیر سماعت کیس سے متعلق تمام ثبوت اور شہادتیں رکھی جاتی ہیں۔ ایسی چیزوں میں آلہ قتل بھی شامل ہوتا ہے۔ جس ہتھوڑی کی مدد سے اینٹا کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا، وہ ایک سیلفین بیگ کے اندر چوٹی میز پر موجود تھی۔

وکیل استغاثہ میز پر سے مذکورہ سیلفین بیگ اٹھالا یا اور میری نگاہ کے سامنے بیگ کو لہراتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”یہ ہے وہ خطرناک ہتھوڑی جو اینٹا کی جان لینے کے لیے آلہ قتل کے طور پر قتل کی اس واردات میں استعمال ہوئی تھی۔“

میں نے چونک کر سیلفین بیگ کی طرف دیکھا۔

”ارے..... یہ تو.....“ میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے یوں اضافہ کیا۔ ”یہ ہتھوڑی تو میرے مؤکل عرفان کی ہے..... ہیں نا؟“

”جی ہاں..... آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“ وہ چوٹ کرنے والے انداز میں بولا۔ ”اور آپ ایسا فرما کر اپنے مؤکل کو پھنسا رہے ہیں.....“

”مؤکل کو پھنسا رہے ہیں..... کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”مطلب یہ کہ آپ اس ہتھوڑی کی شناخت کر کے ملزم پر کوئی احسان نہیں کر رہے بلکہ اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا فٹ کرنے کا بندوبست کر رہے ہیں کیونکہ اس ہتھوڑی کے دستے پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں جو اسے قاتل ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔“

”ہرگز نہیں!“ میں نے شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہتھوڑی میرے مؤکل کی ملکیت ہے۔“



کوئی چشم دید گواہ ضرور ہوگا لیکن آپ عینی شاہد کے وجود سے انکاری ہیں۔ علاوہ ازیں.....“ میں نے لجنائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”علاوہ ازیں آپ بڑے دعوے سے کہہ رہے ہیں..... میں نے جو کہہ دیا وہی حقیقت ہے..... آپ کا یہ پُرغرور دعویٰ عدالتی اور قانونی آداب و قواعد کے منافی ہے۔ عدالت میں اپنے موقف اور دعوے کو ثابت کرنے کے لیے ٹھوس ثبوت پیش کرنا پڑتے ہیں میرے فاضل دوست میں غلط تو نہیں کہہ رہا.....؟“

”نہیں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ملازم اس وقت کٹہرے میں موجود ہے۔ اصولی طور پر یہ سوال اسی سے کیا جانا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ ملازم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔“ پھر وہ روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بولا۔

”جناب عالی! میں ملازم سے چند کڑے سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کی اجازت دی جائے۔“

”پریشن گرانڈ!“ جج نے بھاری بھر کم آواز میں کہا۔ وکیل استغاثہ ملازم کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ تم مقتولہ ایما کے گھر میں پہلی بار چاراکتوبر کو گئے تھے؟“

”جی..... یہ سچ ہے۔“ ملازم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”کیوں گئے تھے..... تم مقتولہ کے گھر کس کام سے گئے تھے؟“

”ان لوگوں نے اے سی لگوانا تھا۔“ ملازم نے بتایا۔

”میں اے سی کی فننگ وغیرہ کے سلسلے میں وہاں گیا تھا۔“

”تم وہاں گئے.....“ وکیل استغاثہ نے بولنا شروع کیا۔ ”اس وقت مقتولہ کا شوہر نجیب اللہ گھر پر موجود تھا۔

نجیب اللہ نے تمہیں کام کے بارے میں سمجھایا۔ تم نے اسٹیٹ بتایا اور ضروری سامان وغیرہ لینے کے لیے مارکیٹ چلے گئے..... ایسا ہوا تھا یا نہیں؟“

”جی ہاں.....“ ملازم نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔“

”اس کے بعد کیا ہوا تھا؟“ وکیل استغاثہ نے سوالیہ نظر سے ملازم کی طرف دیکھا۔

”اس کے بعد.....“ میرے موکل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ”اس کے بعد میں مارکیٹ سے اے سی کی فننگ کے لیے ضروری سامان لے کر آیا تھا اور اپنا کام شروع کر دیا تھا۔“

”قاتل نے میرے موکل کو اس کیس میں پھنسانے کے لیے ہاتھوں پر دستانے پہن کر یہ قتل کیا ہوگا تاکہ ہتھوڑی کے دستے پر اس کی انگلیوں کے نشانات ثابت نہ ہو سکیں اور میرے موکل کی انگلیوں کے فننگ پرٹس جوں کے توں موجود رہیں اور عین ایسا ہی ہوا.....“

”یور آنر.....!“ وکیل استغاثہ جج کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ڈیفنس اس کہانی کے ذریعے کیس کو کسی اور رخ پر ڈال کر اپنے موکل اور اس کیس کے ملازم پر سے عدالت کی توجہ ہٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”یہی میرا بھی موقف ہے جناب عالی!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وکیل استغاثہ اپنی کہانی کی مدد سے اصل قاتل کی جانب سے توجہ ہٹا کر میرے موکل کو قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میرا موکل بے گناہ ہے۔ اگر استغاثہ کے پاس اس واردات کا کوئی عینی شاہد ہے تو وہ اسے عدالت میں پیش کرے..... تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے۔“

”یگ صاحب.....!“ جج نے گہری سنجیدگی سے میری طرف دیکھا اور میرے موقف کو درست تسلیم کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پلیز پروسیڈ.....!“

میں وکیل استغاثہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”استغاثہ کے پاس اس واردات کا کوئی آئی وٹنس نہیں ہے اور استغاثہ کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ ملازم نے اپنے کسرتی بدن خصوصاً بازوؤں کی ابھری ہوئی صحت مند مچھلیوں کے ذریعے مقتولہ کو اپنی محبت کے دام میں پھنسایا تھا۔ یہ اتنی اہم بات استغاثہ کو کس نے بتائی؟“

”یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔“ وہ برہمی سے بولا۔

”کسی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے.....!“

”یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔“ میں نے وکیل استغاثہ کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔ ”مقتولہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی اور ملازم اس قسم کی باتوں سے یکسر انکاری ہے۔

پھر آپ اس ٹھوس حقیقت کو عدالت میں کس طرح ثابت کریں گے۔ اس سلسلے میں کسی نہ کسی گواہ کو تو عدالت میں پیش کرنا ہی پڑے گا میرے فاضل دوست!“

”جب میں نے کہا کہ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے تو پھر یہ ایک ٹھوس حقیقت ہی ہے۔“ وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔

”اور حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہوتی۔“

”آنکھوں دیکھی حقیقت واقعی کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہوتی مگر آنکھوں دیکھی حقیقت کا مطلب ہے کہ اس واقعے کا



”تمہارے اور مقتولہ کے شوہر نجیب اللہ کے درمیان اس کام کی اجرت ایک سو روپے طے ہوئی تھی۔“ وکیل استغاثہ نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن میری معلومات کے مطابق اس روز مقتولہ نے کام ختم ہونے پر تمہیں دو سو روپے دیے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں وکیل صاحب۔“ ملزم نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس روز مقتولہ نے مجھے دو سو روپے ہی دیے تھے۔“

”تو پھر تم نے جھوٹ کیوں بولا؟“

”کون سا جھوٹ وکیل صاحب!“

”یہی کہ..... کام کی تکمیل پر مقتولہ نے تمہیں سو روپے دیے تھے!“ وکیل استغاثہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“ ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ نے میری اجرت کے حوالے سے سوال کیا تھا اور میں نے بھی اسی حوالے سے جواب دیا تھا۔ میرے کام کا معاوضہ ایک سو روپے طے ہوا تھا اور مقتولہ نے اس سلسلے میں مجھے ایک سو روپے ہی دیے تھے۔“

”اور دوسرے سو روپے.....!“ وکیل استغاثہ نے شک زدہ نظر سے ملزم عرفان کو گھورا اور سوال کیا۔ ”یہ ایکسٹرا سو روپے کس سلسلے میں تھے؟“

”انعام.....!“ ملزم نے بتایا۔ ”مقتولہ نے کہا تھا، یہ سو روپے میرا انعام ہے۔“

”انعام؟“ وکیل استغاثہ نے چونک کر غیر یقینی انداز میں ملزم کو دیکھا۔ ”کیسا انعام..... کس بات کا انعام..... تم نے کون سا کارنامہ انجام دیا تھا..... کیا تم نے ہائی جپ کے مقابلے میں ماؤنٹ ایورسٹ کو نچلا دکھا دیا تھا؟“

”جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔“ ملزم جلدی سے بولا۔

”پھر کیسی بات ہے؟“ وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”وہ ایکسٹرا سو روپے مقتولہ نے میرے کام سے خوش ہو کر دیے تھے۔“ ملزم نے بتایا۔ ”اسے میرا کام بہت پسند آیا تھا۔“

آپ ”سو روپے“ کے ذکر سے کسی الجھن میں نہ پڑیں کہ اے سی فننگ کی اجرت اتنی کم کیوں۔ واضح رہے کہ زیر نظر واقعہ آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے کا ہے۔ اس زمانے کے لحاظ سے سو روپے ایک معقول معاوضہ تھا اور جہاں تک ”انعام“ کا تعلق ہے تو اس کی رقم کا تعین کارنامے

”جب تم مارکیٹ سے واپس آئے تو کیا اس وقت مقتولہ کا شوہر نجیب اللہ گھر میں موجود تھا؟“ وکیل استغاثہ نے جھکے لہجے میں استفسار کیا۔

”تن..... نہیں..... وہ گھر میں موجود نہیں تھا۔“

”وہ کہاں چلا گیا تھا؟“

”نجیب اللہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں معمول کے مطابق گھر سے نکلا تھا۔“ ملزم نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

”ہوں.....“ وکیل استغاثہ چند لمحات تک ذومعنی انداز میں ملزم کو گھورتا رہا پھر سوال کیا۔ ”جب تم اے سی کی فننگ کا کام کر رہے تھے تو اس وقت مقتولہ کے علاوہ گھر کے اندر اور کون کون تھا؟“

”جی کوئی بھی نہیں۔“ ملزم نے بتایا۔ ”مقتولہ اکیلی ہی تھی۔ یہ دو افراد کی قبلی تھی۔ جب نجیب اللہ اپنے بزنس کو دیکھنے چلا گیا تو ظاہر ہے، اس کے بعد مقتولہ کو گھر میں اکیلا ہی ہونا تھا۔ اس میں ایسی پریشانی والی کون سی بات ہے.....؟“

”پریشانی والی بات اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔“ وکیل استغاثہ نے معنی خیز انداز میں کہا پھر ملزم سے سوال کیا۔ ”تم نے اپنے کام کے سلسلے میں مقتولہ کے شوہر سے کتنی اجرت طے کی تھی؟“

”ایک سو روپے۔“ ملزم نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

یہ آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس زمانے کے ایک سو روپے آج کے کم از کم ڈیڑھ، دو ہزار سمجھے لیں۔

”کیا اے سی کی فننگ کا ضروری سامان بھی اسی سو روپے کے اندر شامل تھا؟“

”جی نہیں، اس کے پیسے الگ تھے۔“ ملزم نے بتایا۔ ”سو روپے صرف میری مزدوری کے تھے۔“

”کام کی تکمیل کے بعد تمہیں تمہاری مزدوری تو یقیناً مل گئی ہوگی؟“ وکیل استغاثہ نے ملزم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”جی..... جی ہاں!“ ملزم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”کتنی مزدوری.....؟“

”سو روپے..... اور کتنی مزدوری!“ ملزم نے الجھن زدہ انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ ”ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا۔“



فاروق استغاثہ کی جانب سے پیش ہوا تھا تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ عرفان کے خلاف کسی قسم کا زہر اگلنے والا تھا۔

فاروق سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد فارغ ہوا تو وکیل استغاثہ نے اسے گھیر لیا۔ اس نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم عرفان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فاروق سے سوال کیا۔ ”کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟“

”جی ہاں..... بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ فاروق نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”کس طرح جانتے ہو؟“ وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کس طرح کا کیا مطلب.....!“ فاروق نے آنکھیں پھیلائیں۔ ”عرفان میرا محلے دار ہے۔ ہماری تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی ہے۔“

وکیل استغاثہ مخصوص انداز میں جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ”صرف ملاقات ہی ہوتی ہے یا بات چیت بھی ہوتی ہے؟“

”ملاقات کا مطلب، بات چیت ہی ہے جناب۔“ فاروق نے سادہ سے لہجے میں بتایا۔ ”ہم اکثر چائے کے ہوٹل میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں۔“

”گپ شپ کرتے ہیں.....“ وکیل استغاثہ نے پُرسوج انداز میں دہرایا۔ ”اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم دونوں میں اچھی خاصی دوستی ہے؟“

”جی ہاں، دوستی ہے لیکن.....!“ وہ بولتے بولتے اچانک رکا تو وکیل استغاثہ نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔ ”لیکن کیا؟“

”لیکن یہ کہ.....“ استغاثہ کا گواہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”دوستی اپنی جگہ ہے اور سچائی بیان کرنا اپنی جگہ!“

”اس بات کا بھلا کیا مطلب ہوا؟“ وکیل استغاثہ نے بڑی محسوسیت سے سوال کیا۔

وکیل استغاثہ کے انداز کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ بھولے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملزم کے گرد اپنی جرح کے گھیرے کو تنگ کر رہا تھا۔ میں چپ چاپ دلچسپی سے اس کی کارکردگی کا تماشہ دیکھنے لگا۔ مجھے کامل یقین تھا کہ وہ میرے مؤکل کو اپنے جال میں پھنسا نہیں پائے گا۔

”مطلب یہ کہ جناب.....!“ گواہ نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”میں نے ابھی بھری عدالت میں سچ بولنے کا حلف اٹھایا ہے اس لیے آپ مجھ

کی نوعیت سے نہیں بلکہ دینے والے کی دلی کشادگی سے کیا جاتا ہے لیکن یہاں پروکیل استغاثہ کا زاویہ رگڑائی کچھ اور ہی تھا۔

”کام پسند آگیا تھا یا تم پسند آگئے تھے؟“ وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔

”میرا کام.....!“ ملزم وکیل استغاثہ کی جارحیت کے جواب میں بوکھلا گیا۔

”جب مقتولہ کو تمہارا کام پسند آیا تھا تو پھر تعریف بھی تمہارے کام ہی کی کرنا چاہیے تھی نا؟“ وکیل استغاثہ نے...

بہر دستور جارحانہ لہجے میں کہا۔ ”تمہاری پرکشش صحت اور بازوؤں کی ابھری ہوئی مچھلیوں کی نہیں.....“

”ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔“ ملزم نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ”مقتولہ نے میرے کام کی تعریف کی تھی۔“

”اچھا.....“ وکیل استغاثہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ایسا کچھ نہیں ہوا تھا..... ابھی دیکھ لیتے ہیں، کیا ہوا تھا اور کیا نہیں ہوا تھا.....“

”لحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر روئے سخن سچ کی جانب موڑتے ہوئے بولا۔

”جناب عالی! میں استغاثہ کے گواہ فاروق کو کٹہرے میں بلانے کی اجازت چاہتا ہوں۔“

”اجازت ہے.....“ سچ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

میرا مؤکل اور اس مقدمے کا ملزم عرفان پٹیلے کے اعتبار سے جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، ایک الیکٹریشن تھا۔

اس کی رہائش گاہ گاندھی گارڈن یعنی چڑیا گھر کے نزدیک تھی اور وہ سو لجر بازار میں واقع ایک دکان سے منسلک تھا۔ اس

بڑی سی دکان پر رنگ و روغن، ہارڈ ویئر کا سامان، الیکٹریک کا سامان وغیرہ سب کچھ ملتا تھا اور دکان کا مالک ضرورت مندوں کو الیکٹریشن، پلمبر، رنگ ساز وغیرہ کی سروس بھی مہیا

کرتا تھا۔ عرفان اسی دکان کے توسط سے مقتولہ کے گھراے سی کی فننگ وغیرہ کا کام کرنے پہنچا تھا۔ استغاثہ نے فاروق

نامی جس گواہ کو ابھی کٹہرے میں بلانے کی بات کی تھی، وہ عرفان کا محلے دار تھا اور یہ لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر چائے وغیرہ

بھی پی لیا کرتے تھے۔

جب فاروق کٹہرے میں آ کر کھڑا ہوا تو عرفان کے چہرے پر مجھے ابھن بھری سلوٹیں ابھرتی نظر آئیں جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں

ہوئی کہ عرفان یہاں اس کی آمد کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اگر



تھا..... یہ سو روپے ان خوب صورت مچھلیوں کی پرورش کے لیے ہیں تم ان پیسوں کے بادل خرید کر کھانا....." لہجائی توقف کر کے گواہ نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"جب عرفان مجھے یہ قصہ سنا رہا تھا تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔"

"گویا اس خوب صورت اور سنسنی خیز تجربے کی وجہ سے ملزم کے دل میں لذو پھوٹ رہے تھے.....؟" وکیل استغاثہ نے ذومعنی انداز میں استفسار کیا۔

"جی..... جی ہاں..... بالکل!" گواہ نے بڑے وثوق سے اثبات میں گردن ہلادی۔

وکیل استغاثہ اپنے گواہ کو چھوڑ کر دوبارہ ملزم کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"کیا تم اپنے دوست فاروق کے بیان کو جھٹلا سکتے ہو..... تم نے یہ سب اس سے کہا تھا یا نہیں.....؟"

"جی، میں نے کہا تھا مگر اس کا وہ مطلب نہیں تھا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔" میرے مؤکل نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ مقتولہ نے میرے بازوؤں کی مچھلیوں کی تعریف کی تھی لیکن اس تعریف کو منافی انداز میں نہیں لینا چاہیے۔"

"حالانکہ تھوڑی دیر پہلے تم معزز عدالت کے سامنے اس بات سے انکار کر چکے ہو۔" وکیل استغاثہ نے ہنسنے لہجے میں کہا۔ "جب میں نے سوال اٹھایا تھا کہ مقتولہ نے انعام دیتے وقت کام کے بجائے تمہارے بازوؤں کی مچھلیوں کی تعریف کیوں کی تو تمہارا پر زور جواب تھا..... ایسا کچھ نہیں ہوا تھا..... اور گواہ فاروق کے بیان کے بعد یہ ثابت ہو چکا کہ ایسا ہوا تھا..... تم نے جھوٹ کیوں بولا؟"

"آئی بیکیشن یور آئر!" میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر تیز آواز میں کہا۔ "اگر مقتولہ نے ملزم کی قابل رشک صحت ہی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے وہ سو روپے انعام میں دیے تھے تو اس میں ایسی پریشانی والی کون سی بات ہے۔ وکیل سرکار خواجہ اس ایٹو کو اچھا ل کر میرے مؤکل کی کردار کشی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں....."

"جناب عالی یہ بہت ہی حساس اور اہم ایٹو ہے۔" وکیل استغاثہ نے تاکیدی انداز میں کہا۔ "میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے ملزم پر جرح کا موقع دیا جائے۔"

"آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔" جج نے وکیل سے جواب دیا تھا۔

"جی ہاں..... جج صاحب نے کہا کہ یہ سب اس سے کہا تھا یا نہیں.....؟"

"آپ سمجھ رہے ہیں۔" میرے مؤکل نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ مقتولہ نے میرے بازوؤں کی مچھلیوں کی تعریف کی تھی لیکن اس تعریف کو منافی انداز میں نہیں لینا چاہیے۔"

"حالانکہ تھوڑی دیر پہلے تم معزز عدالت کے سامنے اس بات سے انکار کر چکے ہو۔" وکیل استغاثہ نے ہنسنے لہجے میں کہا۔ "جب میں نے سوال اٹھایا تھا کہ مقتولہ نے انعام دیتے وقت کام کے بجائے تمہارے بازوؤں کی مچھلیوں کی تعریف کیوں کی تو تمہارا پر زور جواب تھا..... ایسا کچھ نہیں ہوا تھا..... اور گواہ فاروق کے بیان کے بعد یہ ثابت ہو چکا کہ ایسا ہوا تھا..... تم نے جھوٹ کیوں بولا؟"

"آئی بیکیشن یور آئر!" میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر تیز آواز میں کہا۔ "اگر مقتولہ نے ملزم کی قابل رشک صحت ہی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے وہ سو روپے انعام میں دیے تھے تو اس میں ایسی پریشانی والی کون سی بات ہے۔ وکیل سرکار خواجہ اس ایٹو کو اچھا ل کر میرے مؤکل کی کردار کشی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں....."

"جناب عالی یہ بہت ہی حساس اور اہم ایٹو ہے۔" وکیل استغاثہ نے تاکیدی انداز میں کہا۔ "میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے ملزم پر جرح کا موقع دیا جائے۔"

"آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔" جج نے وکیل سے جواب دیا تھا۔

سے جو بھی پوچھیں گے اس کا سچا اور کھرا جواب دوں گا، یعنی میری اور عرفان کی دوستی سچائی کے راستے میں دیوار نہیں بن سکے گی۔"

"ویری گڈ!" وکیل استغاثہ نے اپنے گواہ کی بات کو سراہتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا زیادہ وقت برباہ نہیں کروں گا۔ مجھے تم سے عرفان اور مقتولہ انیٹا کے بارے میں چند باتیں پوچھنا ہیں۔"

"جی پوچھیں..... میں حاضر ہوں۔"

"کیا کبھی ملزم نے تم سے انیٹا کا تذکرہ کیا تھا.....؟"

"مقتولہ کی موت سے چند روز پہلے عرفان نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا۔" گواہ نے بتایا۔

"کس قسم کا ذکر؟"

"یہی کہ وہ بہت اچھی عورت ہے۔ دل کی سخی اور خوب صورت ہے۔" گواہ وضاحت کرنے لگا۔ "بہت ہی پُرکشش اور طرح دار ہے۔ اس نے میری بہت تعریف کی ہے اور ایک سو روپے مجھے زیادہ دیے ہیں۔"

"ملزم نے یہ باتیں تمہیں پر جوش انداز میں بتائی تھیں یا اس کا بیان سرسری سا تھا؟" وکیل استغاثہ نے چھیڑنے والے انداز میں پوچھا۔

"بہت جوش و خروش سے جناب۔" گواہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بتایا۔ "یہ خوشی سے پھولے نہیں سارہا تھا جیسے اسے دنیا جہان کی دولت مل گئی ہو۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہاری مزدوری کے برابر انعام کبھی نہیں آ رہا۔ سچ بتاؤ یہ جھک کر کیا ہے.....!"

"پھر ملزم نے تمہیں کیا جواب دیا تھا؟"

"اس نے کہا کہ یہ خود بھی سو روپے انعام دیکھ کر حیران ہوا تھا۔" استغاثہ کے گواہ نے جواب دیا۔ "جب اس نے اپنی الجھن کو دور کرنے کے لیے انیٹا سے پوچھا کہ اتنا بھاری انعام کیوں..... تو پتا ہے، مقتولہ نے عرفان کو کیا جواب دیا تھا....."

"تمہیں پتا....." وکیل استغاثہ نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "عدالت جاننا چاہتی ہے۔ تم تفصیل سے اور پوری سچائی کے ساتھ بتاؤ۔ تمہیں اسی غرض سے یہاں بلا یا گیا ہے۔"

"میں وہی بتا رہا ہوں جو عرفان نے مجھے بتایا تھا۔"

گواہ فاروق ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "عرفان کے سوال کے جواب میں مقتولہ نے اس کے بازوؤں کی مچھلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا



استغاثہ کی استدعا کو درست مانتے ہوئے اسے اجازت دے دی۔

”تو جب مقتولہ نے تمہاری مزدوری سے زیادہ معاوضہ دیا اور یہ کہا کہ اس سو روپے کے تم با دام خرید کر کھانا تاکہ تمہارے بازوؤں کی یہ پھلیاں سدا تندرست و توانا رہیں تو کیا تمہارے دل میں خوشی سے لڈو نہیں پھوٹے تھے.....؟“ وکیل استغاثہ نے تیز نظر سے ملزم کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”میں اس سوال کا جواب دے چکا ہوں وکیل صاحب!“ میرے موکل نے پُر اعتماد انداز میں وکیل استغاثہ کی جرح کا سامنا کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ خواخواہ حقیقت کو تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں.....“

”تو پھر حقیقت کیا ہے؟“ وکیل استغاثہ قطع کلامی کرتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ”یہ تم خود ہی عدالت کے سامنے بیان کر دو۔“

”یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ مقتولہ اینٹا نے میرے کام سے خوش ہو کر مجھے انعام میں سو روپے دیے تھے۔“ ملزم وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اور مجھے اس انعام کو حاصل کرنے کی خوشی بھی ہوئی تھی لیکن ”لڈو پھوٹنے“ جیسے الفاظ استعمال کر کے میری نیت پر شک کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ بس، مجھے خوشگوار محسوس ہوئی تھی اور اس واقعے کا ذکر میں نے اپنے دوست فاروق سے بھی کیا تھا لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ.....“ لمحاتی توقف کر کے اس نے شاکی نظر سے کٹہرے میں کھڑے استغاثہ کے گواہ فاروق کی جانب دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”آج میرا دوست میرے ہی خلاف گواہی دینے کے لیے یہاں آیا ہوا ہے.....“

”تم نے ایک دوست کو تو مقتولہ کی جانب سے ملنے والے بھاری انعام کے بارے میں خوب جوش و خروش سے بتایا.....“ وکیل استغاثہ طنز لہجے میں بولا۔ ”لیکن دوسرے دوست کو اس واقعے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی..... ہیں نا؟“

”دوسرا دوست.....!“ ملزم نے الجھن زدہ لہجے میں دہرایا اور پوچھا۔ ”وکیل صاحب! آپ میرے کس دوست کی بات کر رہے ہیں؟“

”چونکہ گئے نا.....“ وکیل استغاثہ فاتحانہ نظر سے ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بلکہ ڈر گئے نا.....؟“

”میں نہ تو چونکا ہوں اور نہ ہی مجھے کوئی ڈر یا خوف ہے۔“ ملزم نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”ہاں البتہ، آپ کی بات نے میرے ذہن کو الجھا ضرور دیا ہے۔“

بتائیں، آپ میرے کس دوست کی بات کر رہے ہیں؟“

”امیر علی کی بات کر رہا ہوں.....“ وکیل استغاثہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”وہ امیر علی جو تمہارے ساتھ ہی سو لجر بازار والے مدینہ الیکٹریک اسٹور سے منسلک ہے اور تمہارا ہم پیشہ بھی ہے یعنی کہ..... الیکٹریشن!“

”اچھا اچھا..... وہ امیر علی!“ ملزم اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جلدی سے بولا۔

”دیکھا، کتنی جلدی یاد آ گیا۔“ وکیل استغاثہ ملزم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”تم نے امیر علی کو اس سو روپے والے انعام والے واقعے سے آگاہ کیوں نہیں کیا تھا؟“

”یہ کوئی خاص بات نہیں تھی اس لیے میں نے ضروری نہیں سمجھا کہ سب کو بتاتا پھروں۔“ ملزم نے نارمل انداز میں جواب دیا۔

”خاص بات تو تھی۔“ وکیل استغاثہ مخصوص انداز میں اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم نے امیر علی سے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا تو اس کے پیچھے تمہارا ایک مذموم مقصد کارفرما تھا..... بولو..... تم نے ایک خاص وجہ سے امیر علی کو یہ بات نہیں بتائی تھی نا.....؟“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.....“ ملزم کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔

”سب سمجھ میں آجائے گا۔ بس، ایک منٹ صبر.....“

یہ کہتے ہوئے وکیل استغاثہ جج کی جانب مڑا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جناب عالی! میں استغاثہ کے اگلے گواہ امیر علی کو کٹہرے میں بلانے کی اجازت چاہتا ہوں۔“

جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”اجازت ہے۔“

تھوڑی ہی دیر کے بعد استغاثہ کا گواہ فاروق عدالت کے کمرے سے باہر چلا گیا اور اس کی جگہ امیر علی ونس باکس (گواہوں والے کٹہرے) میں آکر کھڑا ہو گیا۔

امیر علی کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ میں نے استغاثہ کے اس گواہ کے بارے میں اچھی خاصی ریسرچ کر رکھی تھی۔ گواہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ گواہوں والے کٹہرے کے قریب چلا گیا۔

”امیر علی! کیا یہ درست ہے کہ تم بھی اسی دکان سے منسلک ہو جہاں ملزم کام کرتا تھا۔ میرا مطلب ہے..... مدینہ الیکٹریک اسٹور؟“

”جی ہاں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ گواہ



حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ گواہ کے اس استفسار پر وکیل استغاثہ نے پوری تفصیل کے ساتھ اسے وہ واقعہ سنایا جب چار اکتوبر کو پہلی مرتبہ ملزم مقتولہ کے گھر اے سی لگانے گیا تھا اور مقتولہ نے اس کے کام سے خوش ہو کر اس کی اجرت کے علاوہ سو روپے اسے انعام میں بھی دے ڈالے تھے۔

گواہ نے پوری بات توجہ سے سنی اور وکیل استغاثہ کے خاموش ہونے پر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”عرفان نے مجھے تو ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی البتہ.....“ وہ بولتے بولتے اچانک ایسے رک گیا جیسے اسے کوئی خاص بات یاد آگئی ہو۔

وکیل استغاثہ بھلا اس نادر موقع سے کیسے فائدہ نہ اٹھاتا۔ اس نے یہ آواز بلند سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”البتہ..... کیا؟“

”عرفان نے مجھ سے ایک عجیب بات کی تھی۔“ گواہ متذبذب لہجے میں بولا۔

”کیسی عجیب بات!“ وکیل استغاثہ کی آواز عدالت کے کمرے میں گونجی۔ ”ذرا تفصیل سے بتاؤ..... عدالت

نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہم دونوں ہی مدینہ لیکشریشن والوں کے لیے کام کرتے ہیں۔“

”تم ملزم کو کتنے عرصے سے جانتے ہو؟“ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

”لگ بھگ پانچ سال سے.....“

”پانچ سال اچھا خاصا عرصہ ہوتا ہے۔“ وکیل استغاثہ جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم ملزم کی عادات اور طور طریقوں سے اچھی طرح واقف ہو گے؟“

”جی، جی ہاں..... بالکل.....“ وہ اضطرابی لہجے میں بولا۔

استغاثہ کے گواہ امیر علی کی حرکات و سکنات سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کافی پڑھا سکھا کر عدالت کے کمرے تک لایا گیا ہے۔

”امیر علی!“ وکیل استغاثہ گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا ملزم نے تم سے مقتولہ کی کسی فیاضی کا ذکر کیا تھا؟“

”فیاضی..... کیسی فیاضی؟“ گواہ کے چہرے پر

نسوانی حسن میں اضافہ (بلوسم یونانی کریم) کل نہیں آج خوبصورت اور جاذب نظر آئیں



# بلوسم بریسٹ ڈولپنگ اینڈ ٹا سیٹنگ کریم (ہربل)

چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے۔ گزشتہ 30 سال سے آزمودہ بریسٹ کی نرمی کو دور کر کے سختی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔

جینی بڑی بونٹیوں سے لگا ہوا اور عقیقات سے تیار کردہ۔ بنانا اور عصبوں اور مہا مہا کو بھی سبب کر کے رنگ دہرا کرتی ہے۔

چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔

## یونانی کریم گلیسی

اپنی PIC روانہ کریں  
 whatsapp: 0311-5800057  
 Email: bdhdeva@yahoo.com  
 skype: devapak  
 کراچی ہوم لیوری 0322-2916250  
 پنڈی ڈیلوری 0300-2500026

- خونی، اسٹور، ٹیپس، مارکٹ، صدر کراچی
- صدر سٹیٹل، اسٹور، ٹیپس، مارکٹ، صدر کراچی
- مسلم ہیزل، اسٹور، ٹیپس، مارکٹ، ٹیپس کراچی
- ای ایم این، ٹیپس، مارکٹ، ٹیپس کراچی
- ڈاکس سٹیٹل، اسٹور، آفس، سکڑا، 22 کراچی
- قری، اسٹور، ٹیپس، مارکٹ، ٹیپس کراچی
- نیو، اسٹور، ٹیپس، مارکٹ، ٹیپس کراچی
- خاندان، اسٹور، ٹیپس، مارکٹ، ٹیپس کراچی
- قدیمی، ٹیپس، مارکٹ، ٹیپس کراچی
- سٹیپس، ٹیپس، مارکٹ، ٹیپس کراچی
- جی، ٹیپس، مارکٹ، ٹیپس کراچی
- بی بی، ٹیپس، مارکٹ، ٹیپس کراچی
- اسٹور، ٹیپس، مارکٹ، ٹیپس کراچی
- کلاٹک، اسٹور، ٹیپس، مارکٹ، ٹیپس کراچی

اپنا ایڈریس SMS کر کے لٹرچر مفت منگوائیں  
 051-5502903-5533528  
 021-32720328 ریاض محمد 69 نیو عالمگیر مارکٹ شاہ عالم لاہور۔ فون 042-7666264  
 پاکستان میں گھر منگوانے کے لیے اور بریسٹ میں کی یا اضافہ کے بارے میں مفت طبی مشورے کے لیے عظیم صاحب سے تمام امراض کے مشورے کی سہولت بریسٹ  
 ڈویلپر آن کے بارے میں معلومات اس نمبر پر حاصل کریں۔ Website: www.devaherbal.com Cell: 0333-5203553



انداز میں کہا۔ ”بلکہ وہاں صرف اور صرف ملزم ہی جایا کرے گا۔“

”جی ہاں..... میں نے اس سے یہی وعدہ کیا تھا۔“  
”گو یا اس دن کے بعد سے ملزم ہی مقتولہ کے گھر جاتا رہا تھا؟“ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

”جی..... یہی حقیقت ہے۔“ گواہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”تمہیں کچھ اندازہ ہے..... اس روز کے بعد سے لے کر وقوعہ کے روز تک ملزم کتنی مرتبہ مقتولہ کے گھر گیا تھا؟“  
وکیل استغاثہ نے گواہ امیر علی سے سوال کیا۔

”میرا خیال ہے..... دو یا تین مرتبہ.....“ گواہ نے بڑی سادگی سے بتایا۔

”دو یا تین مرتبہ.....“ وکیل استغاثہ زیر لب دہراتے ہوئے جج کی جانب مڑا پھر... یہ آواز بلند بولا۔

”یور آرز! ملزم معزز عدالت کے سامنے سراسر غلط بیانی سے کام لے رہا ہے کہ مقتولہ کی زبانی اپنی صحت خصوصاً بازوؤں کی پھیلیوں کی تعریف سن کر اس کے من میں خوشی کے لڈو نہیں پھوٹے تھے۔ استغاثہ کے موقف کی سچائی گواہ امیر علی کے بیان سے صاف ظاہر ہو گئی ہے..... اس کے من میں خوشی کے لڈو پھوٹے تھے جیسی اس نے اپنے ساتھ کام کرنے والے دوسرے الیکٹریشن کو کسی بہانے مقتولہ کے گھر جانے سے روک دیا تھا تا کہ یہ مقتولہ کے قریب ہو کر اپنا مقصد حاصل کر سکے.....“ لہجائی توقف کر کے اس نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”یور آرز! شکل و صورت سے مصوم نظر آنے والا یہ شخص، اندر سے انتہائی عیار اور مکار ہے۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ اسے کڑی سے کڑی سزا دی جائے..... دیش آل یور آرز۔“

وکیل استغاثہ نے آخری جملہ اس انداز میں ادا کیا تھا کہ جج نے ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے خاصے متعجب انداز میں پوچھا۔

”کیا تم نے اپنے ساتھ کام کرنے والے امیر علی سے اس قسم کی کوئی بات کی تھی؟“

”جی سر..... میں نے امیر علی کو مقتولہ کے گھر جانے سے منع کیا تھا۔“ ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”بیگ صاحب! جج مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔“ اب آپ اپنے مؤکل کے حوالے سے کیا کہیں گے.....؟“

سچائی جاننا چاہتی ہے۔“

”جب یہ مقتولہ کے گھر میں ”اے سی“ فٹ کر کے آیا تھا تو اس کے دوسرے دن اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر نجیب اللہ یا اینٹا کے گھر سے الیکٹریک کے کسی کام کے لیے کوئی فون آئے تو میں ہرگز وہاں نہ جاؤں بلکہ اس گھر میں ہمیشہ یہی جایا کرے گا۔“ گواہ امیر علی نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اور یہی بات مجھے عجیب سی لگی تھی۔“

”تو تم نے اس سے پوچھا نہیں کہ ایسا کیوں!“ وکیل استغاثہ نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ”تم مقتولہ کے گھر میں کسی کام سے کیوں نہیں جاسکتے.....؟“

”اصل میں بات یہ ہے جناب کہ ”مدینہ الیکٹریک اسٹور“ پر الیکٹریشن صرف ہم دونوں ہی ہیں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”یا تو عرفان کہیں جاتا ہے یا پھر میں.....“ لہجائی توقف کر کے گواہ امیر علی نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”جب میں نے عرفان سے اس حوالے سے سوال کیا تو اس نے ایک بہانہ بنا دیا تھا.....“  
وکیل استغاثہ نے سناتے ہوئے الفاظ میں پوچھا۔

”کیسا بہانہ.....؟“

”عرفان نے مجھے بتایا تھا کہ مقتولہ کی طرف اس کی اجرت کے کچھ پیسے باقی ہیں۔“ امیر علی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”اگر دوبارہ بھی اس گھر میں یہی جائے گا تو وہ رکی ہوئی رقم وصول ہوگی ورنہ اس کے پیسے مارے جائیں گے۔“

”تو تمہارے خیال میں ملزم نے تم سے غلط بیانی کی تھی؟“ وکیل استغاثہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

”جبکہ اس بہانے کی آڑ میں اس کے ذہن میں کوئی اور منصوبہ پل رہا تھا؟“

”منصوبے کے پلنے کے بارے میں تو میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ گواہ نے جواب دیا۔

”عرفان نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا، وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔“

”او کے.....!“ وکیل استغاثہ نے ایک گہری سانس خارج کی اور جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے گواہ سے استفسار کیا۔

”تم نے ملزم کی بات کے جواب میں کیا کہا تھا؟“

”میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ یہ اس سلسلے میں بالکل مطمئن ہو جائے۔“

”یعنی تم اس بات پر راضی ہو گئے تھے کہ آئندہ اگر مقتولہ کے گھر سے کسی بھی کام کے سلسلے میں بلاوا آئے گا تو تم ادھر کارخ ہرگز ہرگز نہیں کرو گے۔“ وکیل استغاثہ نے ٹھوس



جانب متوجہ ہو گیا۔ ”ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ..... استغاثہ کو تمہارے بارے میں شدید نوعیت کی غلط فہمی ہوئی ہے کہ تم نے اپنے کسی خاص مقصد کے حصول کی خاطر استغاثہ کے گواہ امیر علی کو کسی بھی کپلین پر مقتولہ کے گھر جانے سے منع کر دیا تھا۔ اس بات میں کس حد تک حقیقت ہے؟“

”کسی بھی حد تک کوئی حقیقت نہیں۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میرا ایسا کوئی مقصد تھا ہی نہیں جس کے حوالے سے استغاثہ کو کسی قسم کی کوئی غلط فہمی پیدا ہو.....“

”لیکن تم اس بات سے تو انکار نہیں کر سکتے تاکہ تم نے استغاثہ کے گواہ امیر علی کو کسی بھی کام سے مقتولہ کے گھر جانے سے منع کر رکھا تھا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”ابھی چند لمحے پہلے تم نے معزز عدالت کے روبرو اس امر کا اقرار کیا ہے۔“

”جی ہاں.....“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”میں نے واقعی امیر علی کو مقتولہ کے گھر کسی کام کے سلسلے میں جانے سے روک دیا تھا لیکن اس کی وجہ وہ نہیں جیسا کہ استغاثہ سمجھ رہے ہیں۔“

”اگر وہ وجہ نہیں تھی تو پھر کیا وجہ تھی؟“ میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔

”جو بھی وجہ تھی، اس کے دو پہلو ہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں ذرا وضاحت سے بیان کرنا چاہوں گا۔“

میں نے گردن کھما کر سوالیہ نظر سے جج کی جانب دیکھا۔ جج نے اپنے مخصوص بھاری بھر کم لہجے میں ملزم سے کہا۔ ”اجازت ہے.....“

”دیکھیں جناب! میں نے دو پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔“ ملزم عرفان نے بڑے پراعتماد انداز میں بتانا شروع کیا۔

”پہلا پہلو تو یہ ہے کہ میرے ساتھ کام کرنے والے الیکٹریشن امیر علی کی خوبیوں اور خامیوں سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ شخص.....“ ملزم نے وٹس باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ امیر علی کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ شخص اگرچہ اپنے کام میں بہت ماہر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ مختلف معاملات میں ڈنڈی مارنے کے لیے بھی خاصا مشہور بلکہ خاصا بدنام ہے۔ یہ جہاں بھی کام کرنے کے لیے جاتا ہے، دو گنا اور تین گنا ریٹ لگاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ سامان وغیرہ کے سلسلے میں بھی فراڈ کرتا ہے۔ سامان کی جو فہرست امیر علی پارٹی کو دیتا ہے، اس میں مختلف چیزوں کے نرخ بڑھا چڑھا کر لگائے

عدالت میں، کسی کیس کی سماعت کے دوران میں جج عموماً خاموش بیٹھا سنا رہتا ہے۔ دونوں پارٹیوں کی جانب سے ان کے وکیل اپنا اپنا موقف پیش کر کے کیس کو جیتنے کے لیے زور لگاتے ہیں۔ جج دونوں طرف کے دلائل سننے کے بعد تمام تر حالات و واقعات اور شواہد کی روشنی میں کوئی فیصلہ کرتا ہے لیکن کبھی کسی خاص موقع پر وہ براہ راست ملزم سے سوال بھی کرتا ہے جیسا کہ ابھی اس نے پوچھا تھا پھر مجھ سے بھی استفسار کیا تھا۔

میں نے جج کی فرمائش پر اکیوزڈ باکس (ملزموں والے کٹہرے) کا رخ کیا پھر ملزم اور اپنے موکل سے کوئی سوال کرنے سے پہلے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! ابھی بھری عدالت میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا.....“ پھر میں اپنے موکل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”عرفان!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مخاطب کیا۔ ”جیسا کہ تم معزز عدالت کے سامنے اس حقیقت کا اعتراف کر چکے ہو کہ تم نے ہی اپنے ساتھی امیر علی کو آئندہ کے لیے کسی بھی کام سے مقتولہ کے گھر جانے سے منع کر دیا تھا۔ تمہارے اس فعل کی وجہ سے استغاثہ ایک سنگین غلط فہمی کا شکار ہو رہا ہے۔ استغاثہ کا موقف ہے کہ تم چونکہ کسی گہری سازش کے تحت مقتولہ کو گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے اس لیے تم چاہتے تھے کہ تمہارے سوا اور کوئی وہاں نہ جائے اور تمہیں اپنے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کا زیادہ سے زیادہ موقع میسر.....“

”استغاثہ کو کسی قسم کی کوئی غلط فہمی نہیں ہے.....“ وکیل استغاثہ نے تیز چینی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہی حقیقت ہے..... ایک ٹھوس حقیقت!“

”میں بات کر رہا ہوں نا.....!“ میں نے ترکی بہ ترکی وکیل استغاثہ کو منہ توڑ جواب دیا۔ ”جب تک میں اپنی جرح مکمل نہ کر لوں، آپ کو مداخلت سے پرہیز کرنا چاہیے۔“

پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”جناب عالی! معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ میرے فاضل دوست کو صبر اور سکون کی تلقین فرمائی جائے تاکہ میں ملزم پر نہایت ہی اہم جرح مکمل کر سکوں۔“

جج نے وکیل استغاثہ کو مذکورہ ہدایات جاری کرنے کے بعد مجھ سے کہا۔ ”بیگ صاحب! آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔“

میں دوبارہ اپنے موکل اور اس کیس کے ملزم کی



گئے ہوتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مقتولہ کبھی امیر علی کے دستِ ستم کا نشانہ بنے.....

”اور وہ دوسرا پہلو کیا ہے؟“ ملزم سانس لینے کے لیے تھما تو میں نے سوال داغ دیا۔

”میں اسی طرف آرہا ہوں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میں چونکہ دل سے مقتولہ کی بہت عزت کرنے لگا تھا اس لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ امیر علی کے ہاتھوں بے وقوف بنے۔ بس، مقتولہ سے اسی ہمدردی کے جذبے کے تحت میں نے امیر علی کو کسی بھی کام کے لیے اس کے گھر جانے سے روک دیا..... اس کے علاوہ اور کوئی بھی بات نہیں۔“

”تمہارے اس جذبہ ہمدردی کی تو واقعی بہت قدر کرنا چاہیے۔“ میں نے سراہنے والی نظر سے ملزم عرفان کی طرف دیکھا۔ ”مقتولہ نے ایک بھاری ٹپ دے کر تم پر احسان کیا تھا۔ وہ اس کے بعد بھی یقیناً تمہیں کام کے اصل معاوضے کے علاوہ اضافی رقم دیتی رہتی ہوگی لہذا اس کے مفادات کی نگرانی اور تحفظ تم پر لازم ٹھہرا تھا۔ تم نے امیر علی کو اس کے گھر جانے سے روک کر جو بھی کیا، تمہارا وہ عمل قابل تعریف اور لائق تحسین ہے.....“ لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر جج کی اجازت حاصل کر کے استغاثہ کے گواہ امیر علی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”امیر علی! کیا یہ درست ہے کہ تم اپنے کام میں بے انتہا مہارت رکھتے ہو؟“

اس نے ایک لمحے کے لیے اس سوال پر چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ”جی، اللہ کا کرم ہے..... پچھلے پندرہ سال سے اس فیلڈ میں ہوں۔ اگر انسان طویل عرصے تک ایک کام کرتا رہے تو اس کام میں مہارت حاصل ہوئی جاتی ہے۔“

”یعنی ہر وہ مہارت جس کا ذکر تھوڑی دیر پہلے ملزم نے کیا ہے؟“ میں نے ذومعنی انداز میں سوال کیا۔

”جی..... کیا مطلب؟“ وہ ابھمن زدہ نظر سے مجھے سکنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”امیر علی! مہارت کا کوئی مذہب، کوئی مسلک، کوئی کلچر، کوئی ملک، کوئی جلیبہ اور کوئی نام نہیں ہوتا۔ بس اس کے دورخ ہوتے ہیں۔ منفی اور مثبت..... کیا تم میری بات سے انکار کرو گے؟“

”نہن..... نہیں.....“ وہ حذبذب انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”گویا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ملزم نے آپ کے

بارے میں جو کچھ بتایا ہے، وہ درست ہے؟“

”کیا مطلب.....؟“ وہ مزید الجھ گیا۔ ”میں سمجھا نہیں، آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں.....“

”مطلب بہت واضح ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ ملزم نے آپ کے کام کی تعریف کرنے کے علاوہ معزز عدالت کو یہ بھی بتایا ہے کہ تم اپنے پیٹھے کے ساتھ مخلص نہیں ہو، بے ایمانی اور فراڈ تمہاری سرشت میں شامل ہے۔ اکثر لوگوں کو تمہارے کام سے شکایت ہے اور.....“

”ایسی کوئی بات نہیں جناب۔“ وہ برہمی سے بولا۔

”پھر کیسی بات ہے؟“ میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔ ”اگر تم ایسے نہیں تو پھر ملزم نے تمہارے بارے میں اس نوعیت کا بیان کیوں دیا.....؟“

”اس میں سراسر ملزم کی بدنیتی کا دخل ہے۔“ وہ نفرت آمیز نظر سے میرے مؤکل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”بدنیتی..... کیسی بدنیتی؟“ میں نے استغاثہ کے گواہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔

اس موقع پر وکیل استغاثہ خاموش نہ رہ سکا اور اپنے گواہ کے تحفظ میں اس نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”یور آنر! میرے فاضل دوست ایک ہی نکتے کو گھما پھرا کر معزز عدالت کا وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بات اس کیس کی ابتدا ہی میں کلیئر ہوئی تھی کہ ملزم ایک بدنیت اور دھوکے باز شخص ہے۔ اس نے اپنی صحت، جسمانی وجاہت خصوصاً بازوؤں کی ابھری ہوئی خوب صورت مچھلیوں.....“

”ایک منٹ وکیل صاحب.....!“ میں نے ہاتھ اٹھا کر وکیل استغاثہ کو مزید بولنے سے روک دیا۔ ”آپ بھی تو کافی دیر سے ایک ہی رٹا رٹایا سبق عدالت کو سنانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ملزم نے اپنے بازوؤں کی صحت مند مچھلیوں کی نمائش کر کے مقتولہ کو اپنے جال میں پھنسا یا اور اپنا کام کر کے چلتا بنا..... مچھلیوں کا ذکر بہت ہو چکا میرے فاضل دوست، اب ذرا دوسری سمندری مخلوقات کا تذکرہ بھی ہو جائے۔“

”آپ کیا سمجھتے ہیں، مچھلیاں صرف سمندر ہی میں پائی جاتی ہیں؟“ وہ خامے اکھڑے ہوئے لہجے میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

وکیل استغاثہ کا یہ سوال بنی برجاقت تھا جو وقتی اشتعال کا نتیجہ بھی ہر سکتا تھا لیکن میں نے بڑے تحمل سے



”نہیں..... میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ میں سمجھتا ہوں بلکہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ مچھلیاں سمندر کے علاوہ دریاؤں، نہروں، تالابوں، جوہڑوں اور فیش فارمز میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن.....“ ڈرامائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”لیکن چونکہ ہم سمندر کے کنارے آباد ہیں اور کراچی میں زیادہ تر سمندر سے حاصل ہونے والی مچھلی استعمال کی جاتی ہے، اس لیے میں نے سمندر کا ذکر کیا تھا اور.....“

”آئی جیکشن پور آنز!“ وکیل استغاثہ کی سرسراتی ہوئی آواز عدالت کے کمرے میں گونجی۔ ”جناب عالی! اس وقت زیر سماعت کیس میں ملزم کے بازوؤں کی ابھری ہوئی مچھلیوں کا ذکر ہو رہا ہے اور میرے فاضل دوست سمندری مچھلیوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور عین ممکن ہے، یہ مچھلیوں کے ساتھ ہی دیگر سمندری حیات جھینگے، کچھوے، کیڑے اور نہ جانے کیا الابلا کو پکڑ کر عدالت میں حاضر کر دیں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں میرے دوست۔“ میں نے بڑے سکون سے کہا۔ ”میرا سمندر کی طرف جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ آئی مچھلیوں کے ذکر پر آپ ہی نے مجھے مجبور کیا تھا ورنہ میں تو کچھ اور ہی کہنے والا تھا۔“

”کیا کہنے والے تھے آپ.....؟“ وہ تیز نظر سے مجھے گھورنے لگا۔

”آپ کچھ کہنے کا موقع دیں گے تو میں کہوں گا نا۔“ میں نے کہا۔ ”میں تو استغاثہ کے گواہ سے سوال جواب کر رہا تھا اور آپ بیچ میں کود پڑے حالانکہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس پر ”آئی جیکشن“ کی منجائش نکلتی.....“ پھر میں نے بیچ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ مجھے گواہ پر اپنی جرح مکمل کرنے کا موقع دیا جائے۔“

بیچ نے مختصر الفاظ میں وکیل استغاثہ کو ہدایت جاری کر دی کہ وہ اعتراض برائے اعتراض کی پالیسی کو موقوف کر کے مجھے اپنا کام مکمل کرنے دے۔

میں سبک قدموں سے چلتے ہوئے وٹنس باکس کی جانب بڑھ گیا اور استغاثہ کے گواہ امیر علی الیکٹریشن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”غالبا..... آپ ملزم کی کسی بدعتی کا ذکر کر رہے تھے کہ..... اس نے بدعتی کی وجہ سے آپ کے خلاف اس

نوعیت کا بیان دیا تھا؟“

”جی ہاں، بالکل.....“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔

”میرا یہی خیال ہے۔“

”ذرا وضاحت کر دیں۔“ میں نے اسے گھرنے کے لیے اپنا جال بچھانا شروع کر دیا۔ ”ملزم کی بدعتی سے آپ کی کیا مراد ہے، وہ آپ سے اس قسم کی دشمنی کیوں کر رہا تھا؟ کیا آپ دونوں کے بیچ کسی نوعیت کا کوئی لین دین تھا؟“

”کوئی لین دین نہیں تھا.....“

”پھر..... ملزم کے ایسا بیان دینے کی کوئی خاص وجہ؟“

”وہ..... میرا مطلب ہے یہ!“ گواہ نے انگلی سے میرے مؤکل کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔ ”یہ مجھ سے جلتا تھا۔“

”جلتا تھا..... بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ میں نے انجان بننے کی اداکاری کی۔ ”آپ الیکٹریشن ہیں یا الیکٹرک سٹی۔ میرا مطلب ہے، بجلی..... ملزم آپ سے کیسے جلتا تھا؟“

”میں اپنی صلاحیتوں کی بات کر رہا ہوں۔“ وہ جھنجھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ”یہ میری مہارت سے جلتا تھا، مجھ سے حسد کرتا تھا۔“

”ملزم آپ سے جلتا تھا، آپ کی پیشہ ورانہ مہارت اور صلاحیت سے اسے شدید نوعیت کا حسد محسوس ہوتا تھا اسی لیے اس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آپ کے خلاف پروپیگنڈا کیا اور آپ کو بددیانت مشہور کرنے کی کوشش کی۔“ میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کچھ غلط تو نہیں بول دیا؟“

”جی نہیں۔“ وہ شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے جو کچھ بیان کیا، وہی حقیقت ہے لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی.....“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر ابھرن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا تو میں نے فوراً سوال کر ڈالا۔ ”کون سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی؟“

”یہی کہ..... آپ تو وکیل صفائی ہیں۔“

”اگر میں اس کیس میں وکیل صفائی ہوں تو.....؟“

میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

”آپ کو تو اپنے مؤکل کی حمایت کرنا چاہیے نا.....“

وہ جربز ہوتے ہوئے بولا۔

”تو میں نے کب اپنے مؤکل کی مخالفت کی ہے؟“

میں نے چپھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”آپ نے تھوڑی دیر پہلے ملزم کے حوالے سے جو کچھ



بیان کیا ہے، وہ اس کے خلاف ہی نہ جاتا ہے۔“ وہ بڑے عاقلانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”کہ اس نے میرے خلاف کوئی سازش کی تھی، ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مجھے بدویانت مشہور کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”ایسی کوئی بات سرے سے ہے ہی نہیں۔“ میں نے اس کے دماغ کے کیڑے جھاڑنا ضروری جانا اور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”میں نے دراصل آپ کے موقف کو ذرا مختلف اور واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ سب تو آپ کے دعوے کا حصہ ہے اور مجھے اس سے قطعاً اتفاق نہیں ہے۔“

”مطلب..... کیا آپ اپنے مؤکل کو سچا سمجھتے ہیں.....“ اس کی سرسراہٹ ہوئی آواز عدالت کے کمرے میں ابھری۔

”جی بالکل..... میرا مؤکل اپنی جگہ بالکل درست ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”میں اس کے بیان سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔“

”گو کیا آپ مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہیں؟“ وہ بگڑے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔

”ایک سو ایک فیصد.....“ میں نے استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اٹل لہجے میں کہا۔ ”اور میں اپنے اس دعوے کو معزز عدالت کے سامنے ثابت بھی کر سکتا ہوں۔“

”مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!“ وکیل استغاثہ اپنے گواہ کے دفاع کے لیے ایک مرتبہ پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بیج کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یور آنرز..... وکیل صفائی حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ وہ استغاثہ کے معزز گواہ کو جھوٹا کہہ رہے ہیں۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔“

”میں نے استغاثہ کے گواہ امیر علی کو صرف جھوٹا نہیں کہا جناب عالی!“ میں نے بیج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”بلکہ میں بھری عدالت میں اپنے اس دعوے کو درست ثابت بھی کر سکتا ہوں۔“

”آپ کے پاس ایسا کون سا ثبوت ہے جس سے گواہ کی دروغ گوئی ظاہر ہوتی ہو؟“ وکیل استغاثہ نے براہ راست مجھ سے سوال کیا۔

میں نے وکیل مخالف کے سوال کو درخور اعتنا جاننے ہوئے بیج سے کہا۔ ”جناب عالی! بہت پرانا محاورہ ہے کہ..... ہاتھ کلنگن کو آرسی کیا ہے، پڑھے لکھے کو فارسی کیا ہے.....“ لمحاتی توقف کر کے میں نے ڈرامائی انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد دوبارہ بیج کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”یور آنرز..... ہمارے تجربہ کار بزرگوں نے برسوں

کے مشاہدے، تجربے اور عرق ریزی کے بعد یہ محاورے تخلیق کیے ہیں جو آج کتابوں کی زینت بنے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر محاورے کے اندر کوئی نہ کوئی حکمت اور دانش چھپی بیٹھی ہے۔ بس، اس حکمت اور دانش کو باہر نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں ابھی اپنے بیان کردہ محاورے کے اندر سے حقائق کی اصل شکل نکال کر معزز عدالت کے سامنے پیش کرنے والا ہوں۔“

بیج پوری توجہ اور دلچسپی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ حاضرین عدالت کی نظریں بھی مجھ ہی پر جمی ہوئی تھیں جیسے میں کوئی مداری ہوں۔ ابھی کوئی حیرت انگیز کرب دکھا کر انہیں حیران و پریشان کر دوں گا۔ وکیل استغاثہ کو بھی جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ نفرت آمیز بے یقینی سے مجھے گھور رہا تھا۔

”جناب عالی.....!“ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اپنی بات کو گہری سنجیدگی سے آگے بڑھاتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ ”جیسا کہ تھوڑی دیر پہلے میں نے عرض کیا ہے کہ میں بھری عدالت میں استغاثہ کے گواہ امیر علی کی دروغ گوئی یہ الفاظ دیکر..... اپنے مؤکل اور اس کیس کے ملزم عرفان کی بے گناہی ثابت کر کے دکھا دوں گا تو اس دعوے کو بروئے کار لانے کے لیے میں ایک شخص کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہوں..... اگر آپ کی اجازت ہو تو.....!“

”وہ شخص کون ہے؟“ بیج نے مجھ سے پوچھا۔ ”اور اس کا زیر سماعت کیس سے کیا تعلق ہے؟“

”جناب عالی! میں ابھی جس گواہ کو عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہوں اس کا زیر سماعت کیس سے براہ راست تو کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اس کی گواہی استغاثہ کے گواہ امیر علی کے جھوٹ کی قلعی کھول دے گی..... اس شخص کا نام ہے.....“

”شاکر علی کون؟“ بیج نے استفسار کیا۔

”مدینہ الیکٹریک اسٹور کا مالک شاکر علی!“ میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔ ”جس کی دکان سے یہ دونوں افراد منسلک ہیں..... اس مقدمے کا ملزم عرفان اور استغاثہ کا گواہ امیر علی.....“

بیج نے چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا شاکر علی اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہے؟“

”کمرے کے اندر نہیں، البتہ وہ کمرے کے باہر ضرور موجود ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں مدینہ الیکٹریک اسٹور کے مالک اور ملزم و گواہ کے ”سیٹھ“ شاکر علی کو کٹہرے میں



بلا کر اس سے چند اہم سوال کرنا چاہتا ہوں۔“

”اجازت ہے.....“ سچ نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد شاکر علی ونس باکس میں موجود تھا۔ یوں تو عدالت میں موجود ہر شخص کی نظر اس وقت مجھ ہی پر لگی ہوئی تھی لیکن خصوصی طور پر میں وکیل استغاثہ کی نگاہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنی پٹاری میں سے کون سا سانپ نکالنے والا ہوں۔ میں اپنے حریف کو متذبذب اور الجھن زدہ چھوڑ کر ایک دم شاکر علی کی طرف بڑھ گیا۔

شاکر علی کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ مناسب بدن کا مالک اور میانہ قد شخص تھا جس کی کنپٹیاں سفید ہو چکی تھیں۔ وہ ایک سنجیدہ اور بردبار شخص تھا۔ میں نے چند روز پہلے اس سے ایک تفصیلی ملاقات کی تھی جس کے نتیجے میں وہ سچائی کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ یہ گواہی اسی آمادگی کا ثبوت تھی۔ وہ سچ بولنے کا حلف اٹھا چکا تو میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”شاکر صاحب! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”جی، اللہ کا شکر ہے۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔

”بس پچھلے دنوں کچھ موسم کے اثرات تھے۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔“

”شاکر صاحب! آپ کو اچھی طرح معلوم ہوگا کہ آج آپ کو کس سلسلے میں گواہی کے لیے یہاں بلا یا گیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”جی، میں جانتا ہوں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ مجھ سے جو بھی سوال کریں گے میں اس کا سچا اور کھرا جواب دوں گا کیونکہ میں ابھی آپ کے سامنے سچ بولنے کا حلف اٹھا چکا ہوں۔“

”دیری گڈ.....“ میں نے سر اٹھانے والے انداز میں صفائی کے گواہ شاکر علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”آپ کو ملزم کے بیان کی تصدیق یا تردید کے لیے یہاں آنے کی زحمت دی گئی ہے۔ میرے مؤکل کا دعویٰ ہے کہ استغاثہ کا گواہ

امیر علی مالی معاملات میں ڈنڈی مارنے کا عادی ہے۔ یہ دونوں افراد (گواہ اور ملزم) چونکہ آپ کے پاس کام کرتے ہیں اس لیے آپ ان کی رگ رگ سے واقف ہوں گے۔

آپ معزز عدالت کو بتائیں کہ آیا میرے مؤکل کا دعویٰ درست ہے یا گواہ امیر علی کی بات سچ ہے؟ امیر علی نے ملزم

کے دعوے کو سرے سے ماننے سے انکار کر دیا ہے.....“

”جہاں تک امیر علی کی مالی معاملات میں ڈنڈی مارنے کی بات ہے تو میں کہوں گا کہ اس نے میرے ساتھ کبھی ایسی حرکت نہیں کی۔“ گواہ شاکر علی نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

”آپ کی بات نہیں ہو رہی شاکر صاحب۔“ میں نے جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”امیر علی جن گھروں میں الیکٹریک کا کام کرنے جاتا ہے، ان گھروں کے مالکان کا ذکر ہو رہا ہے۔ میرے مؤکل نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ چونکہ امیر علی الیکٹریک کے سامان میں ہیر پھیر اور بے ایمانی کرنے کا عادی ہے اس لیے اس نے امیر علی کو مقتولہ کے گھر جانے سے منع کر دیا تھا۔ کیا آپ کی دکان سے الیکٹریشن کی سروس حاصل کرنے والے لوگوں میں سے کبھی کسی نے امیر علی کی بددیانتی کے حوالے سے ایسی کوئی شکایت آپ سے کی؟ آپ تک امیر علی کے کسی ایسے ہی کارنامے کی کوئی اطلاع پہنچی.....؟“

”جی ہاں!“ شاکر علی نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”امیر علی کی ذات سے اس قسم کی باتیں جڑی ہوئی ہیں۔“

”میں چند افراد کے نام گنوار ہا ہوں.....“ میں نے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”توفیق بھائی، معتم فائزہ ہائٹس۔ حاجی حفیظ اللہ، رہائشی الفاطمہ پارٹمنٹس، امتیاز حسین فرام علی پلازا، مختار شاہ، کبیر اسکوائر.....“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنا بیان مکمل کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”شاکر صاحب! یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے پچھلے دو سال میں کسی نہ کسی انداز میں آپ سے استغاثہ کے گواہ امیر علی کے کرتوتوں کے حوالے سے شکایت کی ہے۔ کبھی بل میں گڑبڑ، کبھی ناقص سامان کا استعمال، کبھی غیر معیاری سروس اور کبھی نرخ میں واضح فرق۔ میں نے صرف انہی لوگوں کے نام گنوائے ہیں جن کو یہ وقت ضرورت میں گواہی کے لیے عدالت میں بھی پیش کر سکتا ہوں۔ ان کے علاوہ بھی آپ کے پاس بہت سی شکایات پہنچتی رہتی ہوں گی؟“

”آپ نے بالکل درست کہا۔“ شاکر علی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

”امیر علی کے حوالے سے اس قسم کی شکایت عام ہے۔“

”اس کے باوجود بھی..... آپ نے اسے اپنی دکان پر رکھا ہوا ہے؟“ میں نے چپستے ہوئے لہجے میں اس سے استفسار کیا۔



”جی ہاں..... اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا آپ وہ وجہ معزز عدالت کے سامنے بیان کرنا پسند کریں گے شاکر صاحب؟“

”کیوں نہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”آپ نے تھوڑی دیر پہلے امیر علی کی جن خامیوں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک پر میرا آپ سے اختلاف ہے۔“

”کس پر؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیسا اختلاف شاکر صاحب؟“

”امیر علی میں بہت سی کاروباری خامیاں موجود ہیں جن کو آپ بے ایمانی اور بددیانتی کے کھاتے میں ڈال سکتے ہیں لیکن اس کی قابلیت اور اپنے کام میں مہارت پر کوئی

دورائے نہیں ہو سکتی۔ میں نے اس جیسا تجربہ کار الیکٹریشن اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میں آپ کی

اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ امیر علی نے کسی کو غیر معیاری سروس دی ہو۔“

”اوکے..... آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں تاکہ امیر علی دیگر ہیر پھیر کے لیے مشہور ہے؟“ میں نے اپنے پوائنٹ تک محدود رہتے ہوئے سوال کیا۔

”جی بالکل.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے گواہ شاکر علی سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!“ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

”لیکن مجھے ابھی بہت کچھ پوچھنا ہے.....“ وکیل استغاثہ کی تیز آواز عدالت کے کمرے میں گونجی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔

”جج نے آنکھیں سکوڑ کر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر کہا۔“ وکیل صاحب! کیا آپ صفائی کے گواہ شاکر علی سے کوئی پوچھنا چاہتے ہیں؟“

”یس یور آنر! بس ایک دو سیدھے سادے سوالات۔“ وہ گردن کو جھکاتے ہوئے بڑے احترام کے ساتھ بولا۔ ”اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو.....“

”جج نے گردن کو معنی خیز ایشانی جنبش دیتے ہوئے کہا۔“ اجازت ہے۔“

میں کندھے اچکاتے ہوئے اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ وکیل استغاثہ جج کی اجازت پانے کے بعد وٹنس باکس کے قریب چلا گیا پھر شاکر علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ ایک انتہائی سنجیدہ اور

سچے سچے گواہ شاکر علی سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!“ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

”لیکن مجھے ابھی بہت کچھ پوچھنا ہے.....“ وکیل استغاثہ کی تیز آواز عدالت کے کمرے میں گونجی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔

”جج نے آنکھیں سکوڑ کر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر کہا۔“ وکیل صاحب! کیا آپ صفائی کے گواہ شاکر علی سے کوئی پوچھنا چاہتے ہیں؟“

”یس یور آنر! بس ایک دو سیدھے سادے سوالات۔“ وہ گردن کو جھکاتے ہوئے بڑے احترام کے ساتھ بولا۔ ”اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو.....“

”جج نے گردن کو معنی خیز ایشانی جنبش دیتے ہوئے کہا۔“ اجازت ہے۔“

”مجھے دار انسان ہیں۔“

وکیل استغاثہ کے اس تبصرے پر شاکر علی نے بس اتنا کہا۔ ”آپ کی نوازش.....“

”میرا یہ تجربہ ہے کہ سنجیدہ اور بردبار افراد کی یادداشت بہت مضبوط اور حافظہ نہایت ہی قوی ہوتا ہے۔“

وکیل استغاثہ جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا پھر سوال کیا۔ ”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا شاکر صاحب؟“

”میں آپ کے تجربے کو تو چیلنج نہیں کر سکتا البتہ اپنے بارے میں مجھے یقین ہے کہ مجھے اس عمر میں بھی اپنے بچپن اور لڑکپن کی ساری باتیں یاد ہیں۔“

”یہ تو لانگ ٹرم میموری ہے۔“ وکیل استغاثہ نے کہا۔

”شارٹ ٹرم میموری کے بارے میں آپ کیا کہیں گے.....؟“

”وہ بھی اسی معیار کی ہے۔“ شاکر علی نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”مجھے کسی بات یا واقعے کو یاد نہیں رکھنا پڑتا بلکہ سب کچھ مجھے خود بخود یاد رہتا ہے۔“

”ویری گڈ..... خود بخود یاد رہتا ہے.....“ وکیل استغاثہ نے صفائی کے گواہ شاکر علی کے آخری الفاظ

دہرائے پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”پھر تو آپ کو مقتولہ انیتا کی موت یعنی وقوعہ کے دن کے بارے میں کبھی سب کچھ اچھی طرح یاد ہوگا؟“

”وقوعہ پر کیا حالات پیش آئے تھے، اس کے بارے میں تو میں کچھ بھی نہیں جانتا البتہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن دسمبر کی آٹھ تاریخ تھی۔“

”دسمبر کی آٹھ تاریخ اور سوموار کا دن..... ہیں نا؟“

”جی..... بالکل درست۔“ گواہ نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

”کیا آپ معزز عدالت کو بتا سکتے ہیں کہ اپنی گرفتاری سے پہلے آخری بار ملزم کب اور کس کے گھر کام کرنے گیا تھا؟“

گواہ نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔

”مقتولہ کے گھر ہی میں ایک چھوٹا سا کام تھا۔ شاید فرنیچ کا سوچ تبدیل کرنے گیا تھا۔“

”آپ نے میرے سوال کا پورا جواب نہیں دیا۔“ وکیل استغاثہ اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کب اور کس کے گھر کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ آپ نے یہ تو بتا دیا کہ وہ مقتولہ کے گھر فرنیچ کا سوچ تبدیل کرنے گیا تھا لیکن معزز عدالت یہ بھی جانا چاہتی ہے کہ..... کب؟“

”چھ دسمبر کو.....“ گواہ نے مبرا اعتماد انداز میں جواب دیا۔

”جج نے گردن کو معنی خیز ایشانی جنبش دیتے ہوئے کہا۔“ اجازت ہے۔“

میں کندھے اچکاتے ہوئے اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ وکیل استغاثہ جج کی اجازت پانے کے بعد وٹنس باکس کے قریب چلا گیا پھر شاکر علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ ایک انتہائی سنجیدہ اور

سچے سچے گواہ شاکر علی سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!“ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔



”چھ دسمبر.....“ وکیل استغاثہ نے گواہ کے الفاظ کو چبا چبا کر دہرایا اور بولا۔ ”یعنی وقوعہ سے محض ایک دن پہلے.....؟“

”جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ گواہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”چھ دسمبر کو ہفتے کا دن تھا جب ملزم آخری بار..... میرا مطلب ہے، اپنی گرفتاری سے پہلے آخری بار مقتولہ کے گھر اس کے فریج کا سوچ تبدیل کرنے گیا تھا۔ اس سے اگلے روز اتوار تھا اور اتوار کو ہماری چھٹی ہوتی ہے لہذا اس دن تو کہیں آنے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور سوموار کو جب وہ دکان پر پہنچا تو تھوڑی دیر کے بعد پولیس نے وہاں پہنچ کر اسے گرفتار کر لیا تھا۔“

”آپ کی دکان صبح کتنے بجے کھل جاتی ہے شاکر صاحب؟“ وکیل استغاثہ نے اپنے اندازِ سوالات میں تھوڑی تبدیلی لاتے ہوئے پوچھا۔

”یہی کوئی نو، سوانو بجے۔“ گواہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے نو بجے۔“

”اور ملزم کتنے بجے تک آپ کی دکان پر پہنچ جایا کرتا تھا؟“

”ساڑھے نو سے پہلے کسی بھی وقت۔“ گواہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

”کیا وقوعہ کے روز یعنی سوموار آٹھ دسمبر کو بھی ملزم ساڑھے نو بجے تک آپ کی دکان مدینہ الیکٹریک اسٹور واقع سولجر بازار پر پہنچ گیا تھا؟“ وکیل استغاثہ نے صفائی کے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ”شاکر صاحب! بہت سوچ سمجھ کر جواب دیجیے گا کیونکہ اس کے بعد میں آپ سے جو کچھ پوچھنے والا ہوں، اس کے غلط و صحیح کا دارومدار آپ کے جواب پر ہوگا۔“

”مجھے کسی قسم کی غلط بیانی کرنے کا نہ تو کوئی شوق ہے اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ ہے۔“ گواہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”آٹھ دسمبر کو ملزم دوپہر میں، لگ بھگ ایک بجے دکان پر پہنچا تھا۔“

”اس تاخیر کا سبب.....“ وکیل استغاثہ نے زہریلے لہجے میں استفسار کیا۔ ”کیا آپ نے ملزم سے پوچھا تھا کہ وہ دیر سے کیوں آیا ہے؟“

”استفسار تو لازمی بات تھی جناب۔“ گواہ شاکر علی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے اس سے پوچھا تھا اور اس نے جو جواب دیا، میں اس سے مطمئن ہو گیا تھا۔“

”اور وہ جواب کیا تھا؟“ وکیل استغاثہ نے چمک کر پوچھا۔

”اس نے مجھے بتایا تھا کہ صبح ناشتے کے بعد اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔“ گواہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس نے ڈاکٹر سے دوا لے کر کھائی، تھوڑا آرام کیا اور جب طبیعت ذرا سنبھلی تو یہ دکان پر چلا آیا۔“

”بہت خوب..... بڑی عمدہ اسٹوری ہے۔“ وکیل استغاثہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”طبیعت کی خرابی کے باعث ملزم لگ بھگ ایک بجے آپ کی دکان پر پہنچا اور ٹھیک دو بجے اسے آپ ہی کی دکان پر سے، اینٹا کے قتل کے الزام میں پولیس نے گرفتار کر لیا۔ میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا شاکر صاحب؟“

”جی نہیں..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ گواہ نے وکیل استغاثہ کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”آٹھ دسمبر کی دوپہر دو بجے اسے پولیس نے اینٹا کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔“

”جب پولیس نے ملزم کو گرفتار کیا، کیا اس وقت آپ اپنی دکان پر موجود تھے؟“ وکیل استغاثہ نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

”جی ہاں..... میری موجودگی ہی میں اس کی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔“ گواہ نے جواب دیا۔

”آپ نے اس کی گرفتاری میں روک ڈالنے کی کوشش نہیں کی؟“

”کیسی روک.....؟“ گواہ الجھن زدہ انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے لگا۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ.....“ وکیل استغاثہ طنزیہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ملزم نے تو آپ کو یہی بتایا تھا کہ اس روز ناشتے کے بعد اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ پھر یہ دوا لینے ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ دوا کھانے کے بعد اس نے آرام کیا اور پھر دکان پر چلا آیا تھا۔“ لمحے بھر کو روک کر وکیل استغاثہ نے ایک گہری سانس لی پھر اپنے مخصوص انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”آٹھ دسمبر بروز سوموار ملزم مقتولہ کے گھر تو جا ہی نہیں سکا تھا پھر اس نے مقتولہ اینٹا کو کب اور کیسے قتل کر دیا؟“

”میں نے یہ بات پولیس کو بتائی تھی۔“ گواہ نے متذبذب انداز میں جواب دیا۔

”پھر..... پھر پولیس نے کیا کہا.....؟“

”میری اس وضاحت بہ الفاظِ دیگر ملزم کی صفائی کے جواب میں پولیس نے جو کچھ کہا، اسے سن کر میں خاموش



”جی ہاں۔“ ملزم نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ”یہ بات بالکل درست ہے۔“

”معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ اس روز صبح ہی صبح آپ کی طبیعت کو ہوا کیا تھا؟“ وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ناشتے کے بعد اچانک میرا دل خراب ہونے لگا تھا۔ متلی اور الٹی سی محسوس ہو رہی تھی۔“ ملزم نے جواب دیا۔ ”اور پھر الٹی ہو بھی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔“

”اس کیفیت میں آپ فوراً ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ دوا لی اور گھر آ کر آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔“ وکیل استغاثہ نے کہا پھر سوالیہ انداز میں ملزم کی طرف دیکھا۔ ”میں غلط تو نہیں کہہ رہا.....؟“

”نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ملزم نے وکیل استغاثہ کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔“

”تم نے کچھ دیر آرام کیا تو تمہاری طبیعت سنبھل گئی۔“ وکیل استغاثہ اپنی مخصوص کیٹیلی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم معزز عدالت کو اس ڈاکٹر کا نام اور اس کے کلینک کا ایڈریس بتانا پسند کرو گے جس کی جادوئی اثر دوانے تمہیں چنگی بجاتے میں تندرست و توانا کر دیا.....؟“

”وہ کلینک ہمارے محلے ہی میں ہے اور اس کا نام ہے شریف کلینک لیکن میں نے ڈاکٹر شریف سے دوائی نہیں لی تھی۔“ ملزم نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”اور آپ کی اس بات پر بھی مجھے سخت اعتراض ہے کہ اس دوا نے چنگی بجاتے میں مجھے بھلا چنگا کر دیا تھا.....“ لجاتی توقف کر کے ملزم نے مجھے دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”جب میں دکان پر پہنچا تو اس وقت بھی میری طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں تھی۔“

ملزم نے جب اپنی بات ختم کرنے کے بعد مجھے دیکھا تھا تو میں نے خفیف انداز میں اپنے سر کو اٹھائی جنبش دی تھی جس کا مطلب تھا کہ میں اس کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ واقعی وہ تسلی بخش جواب دے رہا تھا۔

وکیل استغاثہ، ملزم سے مستفسر ہوا۔ ”تمہارے دکان پر پہنچنے کا ذکر بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے تمہارے مقتولہ کے گھر پہنچنے کا تذکرہ ضروری ہے۔ کیا تم اس بات

ہو گیا تھا۔“ گواہ نے شکست خوردہ لہجے میں جواب دیا۔ ”کیا..... پولیس نے آپ سے کیا کہا تھا؟“ وکیل

استغاثہ نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”پولیس کے بیان کے مطابق ملزم کو آٹھ دسمبر کی دوپہر مقتولہ کے گھر کے اندر داخل ہوتے دیکھا گیا تھا۔“ صفائی کے گواہ شاکر علی نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”پولیس کے پاس ایک عینی گواہ جواد حسین موجود تھا جس نے ملزم کو مقتولہ کے گھر میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پولیس کی اتنی مضبوط دلیل کے بعد میں بھلا ان کی کارروائی میں کس طرح روک ڈال سکتا تھا۔“

”پولیس کی اس مضبوط دلیل کے بعد آپ کیا، کوئی بھی ملزم کی گرفتاری کے عمل میں روک نہیں ڈال سکتا تھا۔“ وکیل استغاثہ نے بہ آواز بلند کہا پھر روئے سخن سچ کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”پورا آثر! حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔“

ملزم وقوعہ کے روز یعنی آٹھ دسمبر کی دوپہر مقتولہ کے گھر پہنچا اور وہ بھی بغیر ان لوگوں کے بلائے۔ صفائی کا گواہ شاکر علی ابھی معزز عدالت کے سامنے اس امر کا اقرار کر چکا ہے کہ سوموار آٹھ دسمبر کو مقتولہ کے گھر سے کسی قسم کی کوئی کمپلین درج نہیں کرائی گئی تھی۔ میں معزز عدالت کی اجازت سے ملزم سے چند ضروری سوال پوچھنا چاہتا ہوں.....“

”ٹھیک ہے.....“ سچ نے اسے اجازت دیتے ہوئے کہا اور پوچھا۔ ”کیا آپ کو صفائی کے گواہ شاکر علی سے مزید کچھ پوچھنا ہے؟“

”نہیں جناب.....“ وکیل استغاثہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

اس کے بعد شاکر علی کو جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس سے پہلے جب ملزم کے ساتھی الیکٹریشن امیر علی کی گواہی مکمل ہو چکی تھی تو اسے بھی عدالت کے کمرے سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔ یہ بات پہلے بھی وضاحت کے ساتھ بیان کی جا چکی ہے کہ عدالت میں، ایک وقت میں کسی ایک شخص کی ہی گواہی لی جاتی ہے تاکہ اس کے بیان سے دوسرے گواہوں کی گواہی متاثر نہ ہو۔

شاکر علی کے جانے کے بعد وکیل استغاثہ اس کیس کے ملزم اور میرے مؤکل عرفان کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس نے ملزم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ کی صبح یعنی سوموار آٹھ دسمبر کو ناشتے کے بعد اچانک تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تھی؟“



متعلق ہو چکی ہے تو یہ بڑے اطمینان سے اس کے گھر سے نکل آیا لیکن چند قدم آگے آنے کے بعد ہی جواد حسین سے اس کا سامنا ہوا۔ جواد حسین اسے مقتولہ کے گھر سے نکلنے دیکھ چکا تھا۔ جواد نے اس سے کہا کہ بھائی صاحب! آپ دروازہ کھلا چھوڑ آئے ہو..... تو اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا..... جس کا گھر ہے، وہ خود ہی دروازہ بند کر لے گی....." وکیل استغاثہ ایک مرتبہ پھر اکیوزڈ باکس کی جانب بڑھ گیا پھر ملزم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی بے رحمی سے مستفسر ہوا۔

"کیا تم اس حقیقت سے انکاری ہو کہ استغاثہ کے گواہ جواد حسین کے ساتھ وقوعہ کے روز دوپہر میں تمہارا اس نوعیت کا مکالمہ ہوا تھا؟"

"ہرگز نہیں۔" ملزم نے اٹل لہجے میں جواب دیا۔ "نہ میں نے پہلے انکار کیا ہے اور نہ ہی اب انکار کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ ایک بندے کے ساتھ میرا اس نوعیت کا مکالمہ ہوا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس بندے کا نام جواد حسین ہے اور..... یہ کہ وہ استغاثہ کا گواہ بھی ہے۔"

"کیس بالکل صاف ہے یور آنرز.....!" وکیل استغاثہ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بڑے غرور سے بولا۔ "ملزم وقوعہ کے روز مقتولہ کے گھر پہنچا، اس نے مقتولہ کی الماری میں سے ایک لاکھ روپے چرائے اور پکڑے جانے پر اس نے ہتھوڑی کا کاری وار کر کے مقتولہ کو موت کی نیند سلا دیا اور جائے وقوعہ سے رفو چکر ہو گیا ورنہ اس روز ملزم کا مقتولہ کے گھر جانے کا نہ کوئی جواز تھا اور نہ ہی کوئی پروگرام..... یہ صرف اور صرف اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے گھر پہنچا تھا..... یہ صرف ایک چور ہی نہیں بلکہ خطرناک قاتل بھی ہے۔ اسی نے مقتولہ کی الماری میں سے ایک لاکھ روپے چرائے اور پھر رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر اس نے مقتولہ کو ٹھکانے لگا دیا اور جائے وقوعہ سے خاموشی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میں....." چند لمحات کا وقفہ دے کر وکیل استغاثہ نے فاتحانہ نظر سے میری طرف دیکھا پھر دوبارہ جج کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"میں..... معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ ملزم کو سخت سے سخت سزا سنائی جائے تاکہ آئندہ کسی کو اس نوعیت کی حرکت کرنے کی جرأت نہ ہو....." وکیل آل یور آنرز!

جج نے اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر

سے انکار کرو گے کہ وقوعہ کی دوپہر یعنی آٹھ و سب سے سوا کو تم مقتولہ کے گھر گئے تھے....." لمحاتی توقف کے بعد وکیل استغاثہ نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"انکار کرنے سے پہلے ایک بات دھیان میں رکھنا کہ ہمارے پاس ایک ایسا شخص موجود ہے جس نے وقوعہ کے روز تمہیں مقتولہ کے گھر سے نکلنے ہوئے دیکھا تھا۔ اس شخص کا نام ہے جواد حسین۔ تمہارے انکار کی صورت میں جواد حسین کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کر دیا جائے گا جس کے بعد تمہارے لیے فرار کی کوئی راہ نہیں بچے گی....." "اگر آپ کے پاس کوئی گواہ نہیں بھی ہوتا تب بھی میں سچائی بیان کرتے ہوئے ایک لمحے کو بھی نہ ہچکچاتا اور کسی بھی صورت میں مجھے راہ فراری نہ ورت پیش نہ آتی۔" ملزم نے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو اس کا مطلب ہے تم وقوعہ کی دوپہر مقتولہ کے گھر جانے کا اقرار کر رہے ہو؟" وکیل استغاثہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"جی بالکل....." ملزم نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"مجھے ملزم سے اور کچھ نہیں پوچھنا یور آنرز.....!" وکیل استغاثہ ملزم عرفان کو چھوڑ کر جج کی جانب متوجہ ہو گیا۔ "ملزم کے اقرار کے بعد اس امر میں کسی شک و شبہ کی سنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ وقوعہ کی دوپہر مقتولہ کے گھر گیا تھا حالانکہ اس روز مقتولہ کے گھر سے کسی قسم کی کوئی کپٹین بھی درج نہیں کرائی گئی تھی اور ملزم کی طبیعت صبح ہی سے خراب بھی تھی۔ ملزم نے ان سازگار حالات کو موقع نصیب جانا اور اس وقت مقتولہ کے گھر پہنچ گیا جب وہ گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ اس نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا یعنی مقتولہ کی الماری میں سے ایک لاکھ روپے کی رقم نکالی لیکن اس کی بری قسمت کہ یہ رقم چرائے ہوئے پکڑا گیا مگر اس نے پلک جھپکتے میں نہایت ہی چالاک کے ساتھ اس بد قسمتی کو اپنی خوش قسمتی میں بدل ڈالا....." اس نے لمحاتی توقف کر کے ڈرامائی انداز میں حاضرین عدالت کو دیکھا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"کسی جرمیات کے ماہر نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ شاطر سے شاطر مجرم بھی اپنی کسی چھوٹی سی غلطی سے پکڑا جاتا ہے۔ یہی سب اس کیس میں بھی ہوا۔ چوری کرتے ہوئے مقتولہ نے ملزم کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ اس کی زبان بندی کے لیے ملزم نے اپنی خطرناک ہتھوڑی کا استعمال کیا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ مقتولہ اس جہان سے اس جہان میں



لکھوایا کرتی تھی یا وہ براہ راست تم سے بھی رابطہ کر لیا کرتی تھی؟“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔  
”صرف دکان پر فون کرتی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔  
”اس نے کبھی ڈائریکٹ مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔“

”اتوار کے روز مدینہ الیکٹریک اسٹور بند رہتا ہے۔“  
میں نے کہا۔ ”اس دن تم بھی چھٹی کرتے ہو گے..... ہیں نا؟“  
”جی بالکل..... اتوار کا دن میں اپنے گھر میں گزارتا ہوں۔“ اس نے مضبوط لہجے میں بتایا۔ ”یا آس پڑوس والوں کا الیکٹریک کا کوئی چھوٹا موٹا کام ہو تو وہ کر دیتا ہوں۔“  
”سوموار، آٹھ دسمبر کی صبح.....“ میں نے جرح کے سلسلے کو کلائیکس کی طرف لاتے ہوئے سوال کیا۔ ”ناشتے کے بعد تمہاری طبیعت خراب ہو گئی۔ تم نے قریبی کلینک سے دوائی اور کچھ دیر گھر میں آرام کیا تو طبیعت قدرے سنبھل گئی۔ میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”آپ وہی بیان کر رہے ہیں جو حقیقت ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”لیکن میں ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ اس روز میں نے ڈاکٹر شریف کے کمپاؤنڈر سے دوائی تھی کیونکہ اس وقت تک ڈاکٹر صاحب کلینک نہیں پہنچے تھے اور میری طبیعت بہت بگڑ رہی تھی۔“

”اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم نے ڈاکٹر سے دوائی تھی یا کمپاؤنڈر سے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ پوچھنا یا بتانا میرا مقصد نہیں ہے۔ میں دراصل کچھ اور ہی جانا چاہتا ہوں.....“

وہ ہمدن گوش ہو کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔  
میں نے پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ کے روز تم اپنے گھر سے سیدھے مقتولہ کے گھر گئے تھے؟“  
”جی ہاں، یہ درست ہے۔“

”یعنی اس روز تم کسی کسپلین کے سلسلے میں مقتولہ کے گھر نہیں گئے تھے؟“  
”جی بالکل نہیں.....“ ملزم نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔

”پھر..... تم کیوں مقتولہ کے گھر گئے تھے.....“ ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے میں نے ملزم سے استفسار کیا۔  
”عدالت یہ جانا چاہتی ہے کہ بلاوجہ اور بغیر کسی کسپلین کے تم مقتولہ کے گھر کس مقصد سے گئے تھے؟“

”وہ جی..... اس روز میں..... اپنے ایک ذاتی کام سے..... مقتولہ کے گھر گیا تھا۔“ وہ رک رک کر بولا۔  
”ذاتی کام..... کون سا ذاتی کام..... کیسا ذاتی

کچھ لکھا پھر گردن اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کبھی آواز میں پوچھا۔

”بیگ صاحب! اس صورت حال میں آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟“

”ضرور جناب عالی!“ میں نے بعد احترام گردن کو خم دیتے ہوئے کہا۔ ”اس سلسلے میں، میں اپنے موکل اور اس کیس کے ملزم سے چند نہایت ہی اہم سوالات پوچھنا چاہوں گا۔“

”جج نے اثبات میں گردن ہلا دی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ مجھے ملزم سے سوال کرنے کی اجازت ہے۔ میں ملزم عرفان کی جانب بڑھ گیا۔“

”اس امر میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ وقوعہ کے روز دوپہر میں تم مقتولہ کے گھر گئے تھے۔ تم ابھی محرز عدالت کے رو برو اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہو۔“ میں نے اہم ترین جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”ڈرا سوچ کر بتاؤ کہ وقوعہ کے روز تم کتنے بجے مقتولہ کے گھر گئے تھے؟“

”یہی کوئی بارہ، سوا بارہ بجے..... یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے بارہ بجے۔“ ملزم نے جواب دیا۔

”یعنی بارہ سے پہلے بھی نہیں اور ساڑھے بارہ کے بعد بھی نہیں۔“ میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی بالکل نہیں۔“ وہ قطعیت سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”کیونکہ وہاں سے نکلنے کے بعد میں سیدھا دکان کی طرف چلا گیا تھا اور کم و بیش ایک بجے میں مدینہ الیکٹریک اسٹور پر پہنچ گیا تھا۔“

”تم لگ بھگ کتنی دیر تک مقتولہ کے گھر میں رہے تھے؟“  
”یہی کوئی دس پندرہ منٹ.....“

”کیا یہ صحیح ہے کہ وقوعہ سے ایک روز پہلے تم فریج کا سوچ تبدیل کرنے مقتولہ کے گھر گئے تھے؟“ میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

”جی ہاں، یہ درست ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ چھ دسمبر بروز پنتہ کی بات ہے۔ مقتولہ کے فریج کے سوچ میں کچھ گڑبڑ تھی۔ اسپارک کا معاملہ تھا۔ اس نے دکان پر فون کر کے اس کی کسپلین درج کرائی تھی لہذا اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد میں مقتولہ کے گھر پر چلا گیا تھا۔“

”اور تم نے فریج کا سوچ تبدیل کر دیا تھا.....؟“  
”جی ہاں، میں نے ایسا ہی کیا تھا۔“

”کیا مقتولہ ہمیشہ دکان پر فون کر کے ہی اپنی کسپلین



## بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ مایوس وہ ہوتا ہے جو اللہ پر یقین نہیں رکھتا اور محروم وہ ہوتا ہے جو اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا۔

☆ اپنے حصے کا کام کیے بغیر دعا پر بھروسا کرنا حماقت ہے اور اپنی محنت پر بھروسا کر کے دعا سے گریز کرنا تکبر ہے۔

☆ باہمت لوگ کبھی ہار نہیں کرتے۔ وہ یا تو جیت جاتے ہیں یا پھر سیکھ جاتے ہیں۔

☆ انسان اپنی زبان اور پرندے اپنے پاؤں کی وجہ سے جال میں پھنستے ہیں۔

☆ جو غلطی کر نہیں سکتا وہ فرشتہ ہے۔ جو غلطی کر کے اس پر ڈٹ جائے، وہ شیطان ہے اور جو غلطی کر کے توبہ کر لے وہ انسان ہے اور جو توبہ کر کے اپنی توبہ پر قائم رہے، وہ اللہ کا محبوب بندہ ہے۔

☆ کمزور ہے وہ شخص جو کسی کو اپنا دوست نہ بنا سکے اور اس سے زیادہ کمزور ہے وہ شخص جو بنا ہوا دوست کھو دے۔

☆ اپنی ذات میں ایک ایسا انسان ڈھونڈو جسے اپنے لیے ہی نہیں، دوسروں کے لیے بھی جینے کا ہنر آتا ہو۔

☆ مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاک چین شریف

## الفاظ کا اثر

☆ ایک فلسفی نے ماہر نفسیات سے کہا۔ "الفاظ مرچکے ہیں، اب کسی لفظ کا کسی شخص پر اثر نہیں ہوتا۔"

☆ ماہر نفسیات نے کہا۔ "جو لوگ یہ سمجھتے ہیں، وہ بے وقوف ہیں، نالائق ہیں اور جاہل بھی ہیں۔"

☆ فلسفی چیخنے ہوئے بولا۔ "یکو اس بند کرو، ورنہ میں تمہارا منہ نوج لوں گا۔"

☆ ماہر نفسیات نے کہا۔ "دیکھا لفظ کا اثر کیسا ہوتا ہے۔"

☆ مرسلہ۔ احسان سحر، میانوالی

☆ کام.....؟" میں نے سناتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔  
"اپنی ہتھوڑی لینے۔" اس نے جواب دیا۔

☆ وہی ہتھوڑی نا..... جس کی مدد سے مقتولہ ایٹا کو موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔" میں نے یہ آواز بلند کہا اور

☆ چوٹی میز کی طرف بڑھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔  
"وہ ہتھوڑی جو آلہ قتل کی حیثیت سے اس وقت بھی عدالت کے کمرے میں موجود ہے؟"

☆ "جی ہاں۔" عرفان نے اثبات میں گردن ہلائی۔  
"میں اسی ہتھوڑی کی بات کر رہا ہوں۔"

☆ میں نے سیلفن بیک میں محفوظ آلہ قتل یعنی مذکورہ ہتھوڑی کو اٹھا لیا پھر اپنے موکل کو دکھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

☆ "یہ ہتھوڑی تمہاری ہی ہے نا؟"  
☆ "جی..... بالکل۔" اس نے جواب دیا۔

☆ "یہ ہتھوڑی اس کیس میں آلہ قتل کی حیثیت رکھتی ہے۔  
☆ پوسٹ مارٹم رپورٹ اور لیبارٹری رپورٹ کے مطابق نجیب اللہ

☆ کی ثوب صورت بیوی ایٹا کو اسی ہتھوڑی کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے لیکن....." میں نے ڈرامائی انداز میں

☆ توقف کیا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔  
☆ "لیکن اس ہتھوڑی کو تو تمہاری ٹول کٹ کے اندر

☆ ہونا چاہیے تھا۔ تم اس کی تلاش میں مقتولہ کے گھر تک کیوں  
☆ چلے گئے تھے؟"

☆ قبل اس کے کہ میرا موکل اس سوال کا جواب دیتا،  
☆ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

☆ "دی کورٹ از ایڈ جرنل.....!" جج نے عدالت  
☆ پر خاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

☆ آئندہ پیشی ایک ہفتے بعد یعنی آج ہی کے دن کی تھی۔  
☆ میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

☆ "جناب عالی! میرے فاضل دوست نے ہتھوڑی  
☆ دیر پہلے استغاثہ کے ایک نہایت ہی اہم گواہ جو اد حسین کا

☆ ذکر کیا ہے۔ ایک لحاظ سے جو اد حسین کو ہاف آئی وٹنس یعنی  
☆ نصف معنی شاہد کہا جاسکتا ہے کیونکہ استغاثہ کے دعوے کے

☆ مطابق اس شخص نے وقوعہ کے روز میرے موکل اور اس  
☆ کیس کے ملزم عرفان کو مقتولہ کے گھر سے نکلنے ہوئے دیکھا

☆ تھا۔ میری معزز عدالت سے درخواست ہے کہ اگلی پیشی پر  
☆ جو اد حسین کو عدالت میں پیش کرنے کے احکامات صادر

☆ کیے جائیں۔ میں اس نادر روزگار گواہ سے چند ضروری  
☆ سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔"

☆ جج نے میری فرمائش پوری کرتے ہوئے انکوٹری



آفسیر سے دریافت کیا۔ ”کیا مذکورہ گواہ کو آئندہ پیشی پر حاضر کیا جاسکتا ہے؟“  
 ”ضرور.....!“ آئی او نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

جیسا کہ میں نے اس کہانی کی ابتدا میں عرض کیا تھا کہ اس کیس کو عدالت میں لگے کافی عرصہ ہو گیا تھا اور آج اس کیس کو باقاعدہ سماعت کا موقع ملا تھا۔ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے اسی لیے کہا جاتا ہے..... دیر آید، درست آید!

یہ ٹھیک ہے کہ کسی بھی کیس کی ابتدائی کارروائیوں کے تقاضے پورے کرنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے لیکن ہمارے ساتھ ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ جس روز ہمارے کیس کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا، اس دن اس عدالت میں اور کوئی کیس نہیں تھا لہذا عدالت کا تمام وقت ہمیں مل گیا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی۔ زیادہ وقت میسر ہونے کے باعث آدھے سے زیادہ کیس ایک ہی پیشی پر نمٹ گیا تھا۔

ابھی تک جو عدالتی کارروائی ہوئی تھی، اس میں وکیل استغاثہ کا پلہ بظاہر بھاری نظر آتا تھا لیکن میں اپنی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آگے بڑھ رہا تھا اسی لیے میں نے آئندہ پیشی پر استغاثہ کے گواہ جواد حسین کو عدالت میں طلب کر لیا تھا۔ میں وکیل استغاثہ کے ساتھ وہ بینڈ کرنے والا تھا جس کا اسے وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ آج کی کارروائی کے خاتمے پر وکیل استغاثہ نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا تھا جیسے اس نے میدان مار لیا ہو۔ اس بے چارے کو کچھ پتا نہیں تھا کہ اگلے میدان میں کون سا گھسان کارن پڑنے والا تھا.....

مجھے مزید تحقیق و تفتیش کے لیے ایک ہفتے کی مہلت مل گئی تھی لہذا میں نے جواد حسین اور دیگر امور کے حوالے سے اپنا ہوم ورک مکمل کر لیا لیکن آئندہ پیشی پر ہمارے کیس کو بہت کم وقت مل سکا تھا جس میں ملزم عرفان پر ہونے والی ادھوری جرح کو میں نے مکمل کر دیا۔

عدالت کا وقت ختم ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ میں چاہتا تو اگلی پیشی کی تاریخ لے لیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا اور کیس کو آگے بڑھانے کے حق میں ووٹ دے دیا۔ ملزم عرفان اکیوزڈ باکس میں موجود تھا۔ جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میں اس کے قریب پہنچ گیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جرح کا آغاز کیا۔

”عرفان! جس ہتھوڑی کو تمہاری ٹول کٹ میں ہونا چاہیے تھا وہ مقتولہ کے گھر میں کیسے پہنچ گئی تھی اور اس ہتھوڑی کی تلاش میں تم مقتولہ اینٹا کے گھر کیوں چلے گئے تھے؟ وہ ہتھوڑی کہیں اور بھی تو ہو سکتی تھی؟“

”سر! یہ ہتھوڑی تو ہمیشہ میری ٹول کٹ کے اندر ہی ہوا کرتی ہے۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن اتوار کی شام یعنی سات دسمبر کی شام جب مجھے ہتھوڑی کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ مجھے ٹول کٹ میں نہیں ملی۔ اس سے ایک دن پہلے چھ دسمبر کو میں اینٹا صاحبہ کے فریج کا سوچ تبدیل کرنے ان کے گھر گیا تھا۔ انہوں نے کمپلین کی تھی کہ ان کے فریج کا سوچ اسپارک کرتا ہے۔ میں نے ان کے گھر جا کر نیا سوچ لگا دیا تھا۔ جب میں سوچ کی تبدیلی کا کام کر رہا تھا تو اس وقت ہتھوڑی میری ٹول کٹ میں موجود تھی لہذا.....“ وہ سانس ہموار کرنے کو متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”یہ وقت ضرورت جب مجھے ہتھوڑی ٹول کٹ کے اندر نہیں ملی تو میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ شاید میری ہتھوڑی اینٹا کے گھر میں کہیں رہ گئی ہے۔ میں نے سوچا، اگلی صبح دکان پر جاتے ہوئے میں اینٹا کے گھر سے اپنی ہتھوڑی اٹھا لوں گا لیکن جب میں دوسری صبح بیدار ہوا تو میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے ڈاکٹر کے پاس جا کر دوا لی اور دوپہر تک جب میری طبیعت قدرے سنبھلی تو میں گھر سے نکلا تھا اور سیدھا اینٹا کے گھر پہنچا تھا۔“

”میں یہ تو نہیں پوچھوں گا کہ وقوعہ سے ایک رات پہلے تم نے کس ضرورت کے تحت ہتھوڑی تلاش کی تھی۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”لیکن عدالت یہ جاننے میں ضرور دلچسپی رکھتی ہے کہ وقوعہ کے روز جب تم ہتھوڑی کی تلاش میں مقتولہ کے گھر پہنچے تو کیا تمہیں مذکورہ ہتھوڑی مل گئی تھی؟“

”تن..... نہیں.....“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔  
 ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنی ہتھوڑی مقتولہ اینٹا کے گھر نہیں بھول آئے تھے۔“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”ایسی بات نہیں ہے وکیل صاحب۔“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”پھر کیسی بات ہے؟“  
 ”دراصل، وقوعہ کے روز جب میں اینٹا کے گھر پہنچا تو میری اس سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔“ اس نے بتایا۔



پوچھا۔ ”کیا تم عدالت کو بتا سکتے ہو کہ مقتولہ کے گھر سے تم کتنے بجے روانہ ہوئے تھے؟“

”انیتا کا فلیٹ گارڈن ایٹ کے علاقے میں چھی مارکیٹ کے قریب ایک پارٹمنٹس بلڈنگ میں واقع ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اور میں جس دکان میں کام کرتا ہوں یعنی ”مدینہ الیکٹریک اسٹور“ سو لجر بازار میں ہے۔ ان دو مقامات کے درمیان پندرہ سے بیس منٹ یا زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا پیدل کار راستہ ہے۔ اس حساب سے کہہ سکتے ہیں کہ جب میں انیتا والی بلڈنگ سے نکلا تو اس وقت کم و بیش دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے ہوں گے۔“

”جب تم وقوعہ کے روز مقتولہ کے فلیٹ سے واپس جا رہے تھے تو تمہاری کسی جواد حسین سے مختصر سی بات بھی ہوئی تھی۔“ میں نے جرح کے سلسلے کو سیٹھتے ہوئے کہا۔ ”جواد نے تم سے کہا تھا، جس گھر سے تم نکل کر آئے ہو اس کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور تم نے جواب دیا تھا، جس کا گھر ہے وہ خود ہی دروازہ بند کر لے گی۔“

”ہاں بالکل۔ میں نے اس شخص سے ایسا ہی کہا تھا۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میں نہیں جانتا کہ اس شخص کا نام جواد حسین ہے۔“

”کیا تم اس شخص کے نام ہی سے واقف نہیں ہو یا اسے جانتے تک بھی نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”دونوں ہی باتیں ہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”وہ شخص میرے لیے لکھی اجنبی تھا۔“

”اگر تم اسے دوبارہ دیکھو تو پہچان لو گے؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے، اس کی شکل تمہارے ذہن میں محفوظ ہے؟“

”جی محفوظ ہے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”میں اگر اسے دوبارہ دیکھوں تو پہچان لوں گا۔“

میں نے روئے سخن بیچ کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! میں چاہتا ہوں کہ استغاثہ اپنے اہم باف آئی وٹس جواد حسین کو گواہی کے لیے اندر بلائے۔ اس شخص سے میں چند ضروری سوال کرنا چاہتا ہوں۔“

بیچ نے وکیل استغاثہ سے استفسار کیا۔ ”کیا گواہ جواد حسین اس وقت عدالت میں موجود ہے؟“

”یور آنر! جواد حسین کسی ایمر جنسی میں حیدرآباد چلا گیا ہے۔“ وکیل استغاثہ نے بیچ کو بتایا۔ ”آئندہ پیشی پر اسے ضرور پیش کر دیا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ بیچ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا

”ملاقات نہیں ہو سکی تھی کا کیا مطلب؟“ میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔ ”کیا مقتولہ اس وقت اپنے گھر میں موجود نہیں تھی؟“

”پتا نہیں جناب۔“ وہ سادگی سے بولا۔

”تمہارے اس جواب سے عدالت کی تسلی نہیں ہوگی۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”تفصیل سے بتاؤ، وقوعہ کے روز جب تم مقتولہ انیتا کے گھر پہنچے تو وہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

”میں نے انیتا کے فلیٹ پر پہنچ کر ڈور بیل کا بٹن دبایا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اندر گھنٹی بجی۔ میں باہر رک کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب چند منٹ گزر جانے کے بعد بھی دروازہ نہیں کھلا تو میں نے دوبارہ گھنٹی بجائی۔ اس مرتبہ بھی اندر گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی لیکن کوئی دروازہ کھولنے نہیں آیا۔ میں نے غیر ارادی طور پر دروازے پر دستک دی اور اگلے ہی لمحے چونک اٹھا۔ دروازے کو اندر سے بند نہیں کیا گیا تھا۔ میرے ہاتھ کے دباؤ سے دروازہ کھلتا چلا گیا۔“

یہاں تک بتانے کے بعد وہ خاموش ہوا تو میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ”کیا تم اس کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے؟“

”نہیں!“ اس نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔ ”مطلب یہ کہ وقوعہ کی دوپہر تم مقتولہ کے گھر میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے؟“

”جی..... یہی حقیقت ہے۔“

”مگر تم تو اپنی ہتھوڑی کی تلاش میں وہاں پہنچے تھے۔“ میں نے جاننا چاہا۔ ”پھر خالی ہاتھ واپس کیوں لوٹ گئے تھے؟“

”جب میری دستک کے جواب میں دروازہ کھلتا چلا گیا تو ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ میں اندر جا کر انیتا سے اپنی ہتھوڑی کے بارے میں استفسار کروں۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ مجھے اجازت کے بغیر کسی کے گھر کے اندر داخل ہونا اچھا نہیں لگ رہا تھا اور ویسے بھی اس وقت میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی لہذا میں نے ہتھوڑی کے معاملے پر راحت سمجھی اور دکان کی طرف چلا گیا۔“

”تمہارے سیٹھ شاکر علی کے بیان کے مطابق تم ایک بجے دوپہر دکان پر پہنچے تھے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے



پھر دیوار گیر گھڑی پر نگاہ ڈالنے کے بعد بولا۔ ”اگر وہ اس وقت یہاں موجود ہوتا تو بھی اس کی گواہی نہیں ہو سکتی تھی لیکن آئندہ پیشی پر اسے لازماً حاضر ہونا چاہیے۔“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بارے میں مختصراً بتا دوں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتولہ اینٹا کی موت آٹھ دسمبر کی دوپہر گیارہ سے ایک بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب آہنی ہتھوڑی کی وہ خوف ناک ضرب تھی جو اس کے سر کے عقبی حصے پر لگائی گئی تھی۔ سر کے متاثرہ حصے سے کھوپڑی جھنجھکی گئی تھی۔ یہ ضرب ایسی کاری ثابت ہوئی کہ وہ آنا فانا ہی موت کے منہ میں چلی گئی تھی۔

ہتھوڑی کے لیبارٹری ٹیسٹ سے بھی یہی ثابت ہوا تھا کہ اینٹا کو اسی ہتھوڑی کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ مذکورہ ہتھوڑی کے چوہی دستے کی لمبائی کم و بیش ایک فٹ تھی اور آہنی ہیمر ایک جانب سے ڈیڑھ انچ اور دوسری طرف سے ایک انچ موٹا تھا۔ ڈیڑھ انچ سائز والے سر سے اینٹا کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر وار کیا گیا تھا جس کی وجہ سے اینٹا کے چند بال ہتھوڑی کے ہیمر پر چپک گئے تھے۔ ہیمر پر اینٹا کے خون کے آثار بھی ملے تھے۔ الغرض، اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ اینٹا کو اسی ہتھوڑی کی مدد سے قتل کیا گیا تھا۔

مذکورہ ہتھوڑی یعنی آلہ قتل پر میرے موکل اور اس کیس کے ملزم عرفان کو انگلیوں کے نشانات بھی پائے گئے تھے۔ اگرچہ یہ ایک تشویش ناک بات تھی تاہم میں جانتا تھا کہ اس مرحلے سے کس طرح اپنے موکل کو بچا کر نکالنا ہے۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور ملزموں والے کٹہرے میں میرا موکل عرفان کھڑا تھا۔ اس کیس سے متعلقہ تمام افراد عدالت میں موجود تھے سوائے ایک شخص کے اور..... وہ شخص تھا، استغاثہ کا اہم گواہ جواد حسین۔ جج نے حاضرین پر نظر ڈالی اور عدالتی کارروائی کا آغاز ہو گیا۔

میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! آج مجھے استغاثہ کے گواہ جواد حسین سے نہایت ہی اہم سوالات کرنا تھے لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہے۔“ بات کے اختتام پر میں نے نظر گھما کر عدالت کے کمرے میں چاروں جانب دیکھا۔

”آپ کا گواہ کہاں ہے وکیل صاحب؟“ جج نے

وکیل استغاثہ سے استفسار کیا۔

”اس نے آنے کا وعدہ تو کیا تھا۔“ وکیل استغاثہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شاید کہیں ٹریفک جام میں پھنس گیا ہے..... وہ آئے گا ضرور۔“

”چلیں ٹھیک ہے۔“ میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”استغاثہ کا گواہ اگر ٹریفک کے ازدحام میں کہیں پھنس گیا ہے تو اس کی آمد تک میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے دو چار ضروری باتیں کر لیتا ہوں..... اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو۔“

”اجازت ہے۔“ جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ کسی بھی کیس میں تفتیشی آفیسر یا انکوائری آفیسر یا آئی او کی حیثیت استغاثہ کے گواہ ایسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں موجود رہنا پڑتا ہے۔ جج کے حکم پر آئی او وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کیس کا تفتیشی آفیسر ایک سب انسپکٹر تھا۔

میں وٹنس باکس کے قریب پہنچا اور آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سب انسپکٹر صاحب! استغاثہ کی عمارت اس اسٹوری پر ایسا وہ ہے کہ ملزم ایک چال باز شخص ہے اور اس کی چال بازی کا سب سے موثر ہتھیار اس کے بازو کی مچھلیاں ہیں۔ اس نے اپنی مردانہ وجاہت سے مقتولہ کو متاثر کیا جس کے نتیجے میں مقتولہ اس پر اندھا اعتماد کرنے لگی لہذا مقتولہ کے گھر میں ملزم کی آمد و شد میں کوئی رکاوٹ نہ رہی پھر ایک روز مناسب موقع دیکھ کر ملزم نے اپنے منصوبے پر عمل کر ڈالا.....“ لگائی توفیق کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”ملزم اچھی طرح یہ جان چکا تھا کہ مقتولہ دن بھر گھر میں اکیلی ہوتی ہے۔ اس کا شو ہرنجیب اللہ صبح کا نکلا پھر رات ہی کو واپس گھر لوٹتا ہے لہذا دن میں وہ بڑی آسانی کے ساتھ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔ وقوع کے روز وہ جھوٹی موٹی کا بیمار ہو گیا تاکہ دکان پر دیر سے پہنچنے کا جواز پیدا ہو جائے۔ وہ اپنے پروگرام کے مطابق لگ بھگ بارہ بجے دن گھر سے نکلا۔ مقتولہ کی رہائش گاہ ندھی گارڈن کے علاقے میں ہے جہاں سے چھٹی مارکیٹ بہ آسانی پندرہ بیس منٹ میں پہنچا جاسکتا ہے۔ ملزم اپنی ہتھوڑی کی تلاش میں مقتولہ کے گھر پہنچ گیا حالانکہ یہ اس کا ایک بہانہ تھا۔ اس کی ہتھوڑی تو نول کٹ کے اندر موجود تھی۔ وہ ہتھوڑی کی تلاش کے بہانے تھوڑا وقت مقتولہ کے قلیٹ پر گزارنا چاہتا تھا تاکہ اپنے مقصد کو حاصل کر سکے اور پھر ایسا ہی ہوا.....“ میں نے



ایک مرتبہ پھر لجاتی توقف کیا۔ اس کے بعد آئی او کو گھنٹا شروع کیا۔

”استغاثہ کے مطابق ملزم نے موقع پا کر مقتولہ کے

بیڈروم کا رخ کیا جہاں ایک الماری کے اندر ایک لاکھ روپے کی رقم رکھی تھی۔ اس رقم کو چراتا ہی ملزم کا اصل مقصد تھا۔ ملزم نے الماری کھول کر مذکورہ رقم چرائی اور عین موقع پر رینگے ہاتھوں پکڑا گیا کیونکہ اسی وقت مقتولہ بیڈروم میں آگئی تھی۔ جب ملزم نے دیکھا کہ اس کی چوری پکڑ لی گئی ہے تو اس کی سمجھ میں یہی بات آئی کہ پہلی فرصت میں مقتولہ کی ”زبان بندی“ کا بندوبست کرنا چاہیے تاکہ اس کے

”کارنامے“ کا راز فاش نہ ہو۔ اس نے فوراً سے پیشتر اپنی ٹول کٹ میں سے ہتھوڑی نکالی اور مقتولہ کی دائی خاموشی کے لیے ہتھوڑی سے اس کے سر پر ایک کاری ضرب لگائی۔ مقتولہ اس خطرناک وار سے زمین بوس ہو گئی اور ملزم ایک لاکھ روپے کی رقم لے کر وہاں سے فرار ہو گیا۔“

”بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔“ میرے خاموش ہونے پر انکوآری آفیسر نے تیز لہجے میں کہا۔ ”جب ملزم مقتولہ کے گھر سے نکل کر جا رہا تھا تو ایک شخص جو اد حسین نے اسے دیکھا بھی تھا اور ہتھوڑی کے دیتے پر موجود ملزم کے فنگر پرنٹس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ قتل ملزم ہی نے کیا ہے۔“

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے سب انسپکٹر صاحب!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ ہتھوڑی کے دیتے پر میرے موکل کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ وقوع کے روز کسی جو اد حسین نے ملزم کو مقتولہ کے دروازے سے نکلنے دیکھا تھا حالانکہ وہ مقتولہ کے فلیٹ کے اندر سے برآمد نہیں ہوا تھا بلکہ کھلے ہوئے دروازے کو چھوڑ کر واپس جا رہا تھا لیکن یہ کسی بھی طور ممکن نہیں کہ میرے موکل نے مقتولہ کی جان لی ہے۔“

”ساری شہادتیں ملزم کے خلاف جاری ہیں اور آپ اسے بے تصور ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔“ آئی او عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”آپ بھی کمال کرتے ہیں وکیل صاحب!“

”چلیں، اگر آپ ناراض ہوتے ہیں تو میں کمال نہیں کرتا بلکہ جمال کرتا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ذومعنی انداز میں کہا۔

”جمال کرتے ہیں۔“ وہ ابجمن زدہ لہجے میں بولا۔

”کیا مطلب ہے، آپ کا؟“

”میں سمجھتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ مقتولہ بنیں گے یا ملزم بننا پسند

”فرمائیں گے۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ وہ اکتائے ہوئے انداز میں مستفسر ہوا۔

”ہم دونوں مل کر ایک ڈیوڈیں گے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”تاکہ یہ دیکھا اور معزز عدالت کو دکھایا جاسکے کہ وقوع کے روز مقتولہ کے فلیٹ پر کیا واقعہ پیش آیا تھا۔“

”یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اس واقعے کا ڈیوڈ یہاں عدالت کے کمرے میں دے پائیں؟“ اس کی ابجمن میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

”آپ ممکن اور ناممکن کی بحث میں اپنے ذہن کو نہ تھکائیں آئی او صاحب۔“ میں نے دوستانہ بے تکلفی سے کہا۔

”یہ مشکل کام آپ میرے لیے چھوڑ دیں۔ آپ صرف اپنے لیے کردار کا انتخاب کریں۔۔۔۔۔۔ مقتولہ بنیں گے یا ملزم؟“

”میں ملزم تو ہرگز نہیں بنوں گا۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”بس تو پھر آپ چند لمحات کے لیے مقتولہ کا کردار کریں۔“ میں نے کہا۔ ”باقی میں سنبھال لوں گا۔“

وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے نظر انداز کر کے اپنے بیگ کے اندر سے ایک اسکیل نکال لیا اور آئی او کی طرف سے رخ پھیر کر کہا۔ ”یہ اسکیل میں نے اپنے بیگ میں اسی ڈیوڈ کی غرض سے رکھا تھا۔ آئی او صاحب! فرض کریں کہ میں اس وقت ملزم عرفان مقتولہ کی الماری سے ایک لاکھ روپے چرا رہا ہوں۔ میری پشت آپ کی طرف ہے۔ استغاثہ کی رپورٹ کے عین مطابق آپ یعنی مقتولہ انیٹا موقع پر مجھے رینگے ہاتھوں چوری کرتے پکڑ لیتی ہیں۔ آپ مجھے لٹکارتی ہیں۔۔۔۔۔۔“

”اے۔۔۔۔۔۔ کیا کر رہے ہو؟“

”میں پلٹ کر دیکھتا ہوں۔ آپ میرے سامنے کھڑی ہیں۔ میں آپ کی زبان بند کرنے کے لیے اپنی ہتھوڑی سے آپ کے سر پر وار کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے ایک جھٹکے سے پلٹ کر آئی او کے سر پر اسکیل سے دکھاوے کا جھوٹا وار کر دیا۔ میرا اسکیل اس کی پیشانی سے تھوڑا اوپر سر کے بالوں سے ٹکرایا۔

”ارے۔۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔؟“

وہ جلدی سے پیچھے کو ہٹا۔

”ڈیوڈ دے رہا ہوں آئی او صاحب۔“ میں نے طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”اپنے موکل کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“



میرا پوائنٹ اس کے سر کے اوپر سے گزر گیا، وہ برہمی سے بولا۔ "اس ڈیمو سے کیا ثابت ہوتا ہے؟"  
 "یہ ثابت ہوتا ہے کہ انیٹا کو میرے مؤکل عرفان نے قتل نہیں کیا....." میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔  
 "وہ کسے؟" وہ بیزار سے بولا۔

"میرا اسکیل آپ کے سر کے کس حصے پر لگا؟" اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے النامیں نے اسی سے پوچھ لیا۔  
 "یہاں پر....." وہ اپنی پیشانی کے اوپر والے بالوں کو چھوتے ہوئے بڑی معصومیت سے بولا۔

میں نے سر کو ہلکا سا نم دے کر کہا۔ "شکر یہ آئی اوصاحب۔"  
 "کس بات کا شکر یہ؟" اس کی حیرت دیدنی تھی۔  
 میں نے انکو آری آفسر کی حیرت کو اپنے جوتے کی نوک پر مارا اور روئے سخن سنج کی جانب موڑتے ہوئے...  
 یہ آواز بلند کہنا شروع کیا۔

"جناب عالی! ابھی میں نے معزز عدالت کے سامنے جو ڈیمو دیا ہے اس کا اسکرپٹ میں نے نہیں لکھا بلکہ یہ استغاثہ کی مرتب کردہ رپورٹ کا ایک حصہ ہے۔ وہ رپورٹ جس میں میرے مؤکل کو نجیب اللہ کی خوب صورت بیوی انیٹا کا قاتل ٹھہرایا گیا ہے۔ اگر ایک لمحے کے لیے ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ استغاثہ کی رپورٹ صد فی صد مبنی بر حقائق ہے تو پھر اگر میرا مؤکل اپنی چوری پکڑے جانے پر جب مقتولہ پر ہتھوڑی سے حملہ آور ہوتا تو اس صورت میں مقتولہ کی پیشانی یا سر کے سامنے والے حصے پر چوٹ لگتی جیسا کہ ابھی آئی او کے ساتھ پیش آیا لیکن....." میں نے ڈرامائی انداز میں لمحاتی خاموشی اختیار کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر سلسلہ دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ اس ڈیمو کی نفی کرتی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق مقتولہ کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر ہتھوڑی کی کاری ضرب لگائی گئی تھی جو اس کی موت کا سبب بنی۔ اب اگر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو درست مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مقتولہ پر اس کی بے خبری میں، عقب سے وار کیا گیا تھا۔ اگر استغاثہ کی رپورٹ پر انحصار کیا جائے تو پھر میرے مؤکل کی ہتھوڑی کا وار مقتولہ کے سر کے سامنے والے حصے پر لگنا چاہیے تھا۔ اگر استغاثہ کی رپورٹ درست ہے تو پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ غلط ہے لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ اس لیے غلط نہیں ہو سکتی کہ ہتھوڑی کے لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ، پوسٹ مارٹم رپورٹ کی تائید

کرتی ہے جس کی رو سے مقتولہ کے عقب سے اس کے سر پر وار کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ قاتل کوئی ایسا شخص ہے جو پہلے سے مقتولہ کے فلیٹ پر موجود تھا اور وہ مقتولہ کے لیے قابل بھروسہ بھی تھا چنانچہ مقتولہ اس کی موجودگی میں بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف رہی اور اس شخص نے موقع پا کر مقتولہ کے عقب سے اس کی کھوپڑی پر ہتھوڑی کا وار کر کے اسے موت کی نیند سلا دیا۔ آج کل یعنی وقوعہ کے وقت سردیوں کا موسم تھا اور یقیناً ممکن ہے کہ اس شخص نے دستاویز پہن رکھے ہوں جس کی وجہ سے اس کے فنگر پرنٹس ہتھوڑی پر نہیں آسکے۔"

"ایسا شخص کون ہو سکتا ہے؟" انکو آری آفسر کی سرسراہتی ہوئی آواز عدالت کے کمرے میں گونجی۔  
 "اب وقت آ گیا ہے کہ میں آپ کے الفاظ لوٹا دوں۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔  
 "کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ "ہتھوڑی دیر پہلے آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے مؤکل کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کر کے کوئی کمال کر رہا ہوں۔ میں آپ کے الفاظ لوٹاتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ "ایسا شخص کون ہو سکتا ہے؟" یہ پوچھ کر آپ کمال کر رہے ہیں کیونکہ یہ سوال کرنا آپ کا حق نہیں بنتا۔"

"میرا حق کیوں نہیں بنتا۔" وہ خنکی آمیز لہجے میں بولا۔ "آپ نے اتنی بڑی بات کہہ دی ہے..... پوچھنا تو بنتا ہے نا!"

"میں نے اتنی بڑی بات ہوا میں نہیں کی آئی او صاحب۔" میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

"اپنی بات کی صحت کی تصدیق کے لیے میں نے ٹھوس دلائل دیے ہیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن میں اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کر چکا ہوں۔"

انکو آری آفسر نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ وکیل استغاثہ کافی دیر سے خاموش کھڑا ہمارے سوال و جواب کو سن رہا تھا۔ موجودہ صورت حال نے اسے بے حد پریشان کر دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ آئی او کی سوالیہ نظر کا کیا جواب دے۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے یہی جھلمکتا تھا کہ یہ کیس اس کے



غفلت کا فائدہ اٹھا کر ہتھوڑی سے اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو چننا دیا تھا۔“

”آپ تو مجھ سے ایسے پوچھ رہے ہیں جیسے میں موقع پر موجود تھا۔“ میں نے اسے ٹھورا۔ ”اور میں نے اپنی آنکھوں سے اس شخص کو قتل کی واردات کرتے دیکھا تھا؟“

رسی جل چکی تھی مگر اس کے بل ابھی باقی تھے۔ میری دستکار کے جواب میں انکو آفری آفسیر نے بے پروائی سے کہا۔ ”چلیں ٹھیک ہے، اگر آپ نہیں بتانا چاہتے تو آپ کی مرضی ہے۔“

”مرضی صرف مالک کی ہوتی ہے آئی او صاحب۔“ میں نے اس کے زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے کہا۔ ”وہ مالک جو میرا، آپ کا اور ہم سب کا خالق ہے، رازق ہے اور پالنے والا ہے۔ میں تو ایک معمولی سا انسان ہوں اور چونکہ میں قانون کے پیشے سے وابستہ ہوں۔ یہ پیشہ ہی میری روزی روٹی ہے اس لیے میں نے ہمیشہ قانون کا احترام کیا ہے اور وقت پڑنے پر قانون کی مدد بھی کی ہے۔ میں آپ کی مدد کرنے کو بھی تیار ہوں۔“

نتیجہ عدالت برخواست کر چکا تھا لیکن میرے اور آئی او کے بیچ ہونے والی دلچسپ گفتگو نے اسے چند لمحے عدالت کے کمرے میں موجود رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ خاموشی سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

آئی او نے کہا۔ ”تو پھر کریں ہماری مدد اور بتائیں کہ وقوع کے روز مقتولہ کے گھر میں کون ایسا بااعتماد شخص موجود تھا جس نے اینٹا کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور ایک لاکھ روپے کی رقم لے کر غائب ہو گیا؟“

”میں ضرور بتاؤں گا۔“ میں نے چالاکی سے اسے اپنے جال میں پھانتے ہوئے کہا۔ ”لیکن پہلے آپ کو ایک حقیقت کا اقرار کرنا ہوگا۔“

”کون سی حقیقت؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”یہ حقیقت کہ میرے مؤکل نے اینٹا کا سر ڈر نہیں کیا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اس بے چارے الیکٹریشن کو خالی جگہ چڑھانے کے لیے قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے۔“

وہ ان لمحات میں ”نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن“ والی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ لیکن بھری عدالت کے سامنے وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ میرے مؤکل کو خواہنا وہ اس کیس میں چسپاں کیا گیا تھا۔ اس اقرار سے اس کی نالائقی ثابت ہو جاتی اور کوئی بھی شخص خود کو نالائق ثابت کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔

وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کہا نا، ملزم

ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں ان دونوں کو نظر انداز کر کے جج کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”جناب عالی! حالات و واقعات کی روشنی سے ثابت ہوتا ہے کہ میرا مؤکل عرفان بے گناہ ہے۔ اس نے اینٹا کو قتل کیا ہے اور نہ ہی ایک لاکھ روپے کی رقم چرائی ہے۔ اس سیدھے سادے معصوم انسان کو خواہنا وہ قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ قتل کی اس واردات کے پیچھے کوئی اور ہی سنسنی خیز کہانی چھپی ہوئی ہے۔ استغاثہ کی رپورٹ مبنی بر دروغ ہے۔ یہ میرے مؤکل کے خلاف ایک مذموم سازش ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں..... پوسٹ مارٹم رپورٹ، استغاثہ کی دھجیاں اڑانے کے لیے کافی ہے.....“ میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اپنے ٹھوس دلائل کو سیٹھتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! میں تو صرف اتنا عرض کروں گا کہ میرا مؤکل بے قصور ہے لہذا اس کی اس کیس سے بریت کے احکامات صادر کیے جائیں۔ دیش آل یور آنرا!“

میری بات کے اختتام پر جج نے اثبات میں گردن ہلائی اور اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کا مطالعہ کرنے لگا۔ انہی کاغذات میں پوسٹ مارٹم، لیبارٹری ٹیسٹ رپورٹ اور استغاثہ کی فائل بھی شامل تھی۔ جج نے ایک کاغذ پر کچھ نوٹ کیا اور تین دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ از ایڈ جرنڈ.....!“

ادھر جج کی بات ختم ہوئی، ادھر انکو آفری آفسیر نے پراسٹیٹوٹیو لہجے میں مجھ سے کہا۔ ”وکیل صاحب! اس شخص کے بارے میں تو کچھ بتادیں.....!“

”کس شخص کے بارے میں؟“ میں نے انجان بننے ہوئے پوچھا۔

”وہ..... جس نے اینٹا کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر ہتھوڑی سے وار کیا تھا!“

”گویا ڈیمو نے آپ پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔“ میں نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ”آپ میرے مؤکل کو بے گناہ تسلیم کر چکے ہیں؟“

”ملزم کو گناہ گار یا بے گناہ قرار دینا تو عدالت کا کام ہے۔“ وہ ہوشیاری سے بولا۔ ”لیکن میں اپنی تسلی کے لیے جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے فلسفے کے مطابق وقوع کے روز ایسا دستانہ پوش کون سا شخص مقتولہ کے فلیٹ پر موجود تھا، مقتولہ جس پر بھروسہ کرتی تھی اور اسی شخص نے مقتولہ کی



پہلو بھی عیاں ہو گئے۔ اگر وہ گواہی کے لیے پیش ہو جاتا تو میں کاسٹک سوڈا سے اسے ایسا دھوتا کہ ایک پیشی پہلے ہی یہ کیس ختم ہو چکا ہوتا لیکن کارخانہ قدرت میں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔

جواد حسین، نجیب اللہ کا بھتیجا تھا اور اکثر ان کے گھر میں آتا جاتا بھی رہتا تھا۔ مقتولہ انیٹا اس پر پورا بھروسہ کرتی تھی۔ وقوعہ کے روز جب وہ لگ بھگ ساڑھے گیارہ بجے مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچا تو سردی سے بچنے کے لیے اس نے دستانے پہن رکھے تھے۔ اسے وہاں آئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اس نے مقتولہ کو ایک لاکھ کی رقم الماری میں رکھتے دیکھ لیا تھا اور اسی لمحے اس کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ اس نے موقع پا کر مقتولہ کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر وار کیا اور ایک لاکھ کی رقم سمیٹ کر وہاں سے نکل گیا۔

جب وہ فلیٹ سے نکل کر زینے کی جانب بڑھ رہا تھا تو اس نے ملزم کو مقتولہ کے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ ملزم کو نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اسے یہ خبر تھی کہ اسی الیکٹریشن کی ہتھوڑی سے اس نے اپنی چچی کا کام تمام کر دیا ہے۔ وہ ایک سنگین جرم کر کے موقع واردات سے فرار ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں چور چھپا ہوا تھا لہذا وہ یہ دیکھنے کے لیے رک گیا کہ یہ کون شخص ہے جو اس کی چچی کے فلیٹ کی گھنٹی بج رہا ہے۔ جب ملزم مایوس ہو کر وہاں سے جانے لگا تو جواد حسین نے اس کے ساتھ ایک مختصر سا مکالمہ بھی کیا تھا۔

اگر جواد حسین یہیں تک محدود رہتا تو اس کی بچت تھی لیکن بعد ازاں جب اسے پتا چلا کہ کسی الیکٹریشن کو پولیس نے اس کیس میں قاتل کی حیثیت سے نامزد کیا ہے تو اس نے ہوشیاری دکھاتے ہوئے خود کو استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے پیش کر دیا اور بھی مجھے اس پر ریسرچ کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ یہ اس کی بد قسمتی اور میری خوش نصیبی تھی۔

جواد حسین نے میرے موکل کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے جو ہوشیاری دکھائی تھی، وہ میری ریسرچ کے نتیجے میں الٹی اسی کے گلے بڑ گئی۔ میری نشاندہی پر وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا پھر پولیس کو اس کی زبان کھلوانے میں کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہ سچ ہے کہ بھلائی اور سچائی کے کاموں میں بس، پہل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کوئی پہلا پتھر پھینکنے کی ہمت کر لے تو پھر اس کا ساتھ دینے والوں کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ حالات و واقعات خود بخود موافقت میں آ جاتے ہیں۔

(تحریر: حشام بٹ)

کو مجرم یا بے گناہ قرار دینا عدالت کا کام ہے۔ میں عدالتی معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتا۔

”او کے.....!“ میں نے اس سے بھی زیادہ برامہ بناتے ہوئے کہا۔ ”انیٹا کے قاتل کو گرفتار کرنا پولیس کا کام ہے۔ میں پولیس کے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ میرا کام اپنے موکل کو بے گناہ ثابت کرنا تھا اور مجھے یقین ہے کہ میں نے اپنا یہ کام بہ احسن طریق کر ڈالا ہے۔“

وہ مایوسی سے گردن جھٹک کر رہ گیا۔ ”مایوسی گناہ ہے آئی او صاحب۔“ میں نے اس کی حالت سے ملاحظہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”دل چھوٹا نہ کریں۔ قانون کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔ اگر میرے ”پہلا پتھر“ پھینکنے سے آپ کا کچھ بھلا ہوتا ہے تو میں ایک اشارہ دینے کو تیار ہوں.....“

”کیسا اشارہ؟“ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”دو افراد مقتولہ کے بہت زیادہ قریب تھے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ایک اس کا شوہر نجیب اللہ اور دوسرا.....“ میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو آئی او تڑپ کر بولا۔ ”دوسرا کون؟“

”نجیب اللہ کا بھتیجا۔“ میں نے اپنی ریسرچ کی روشنی میں بتایا۔ ”جو بڑی آزادی اور آسانی کے ساتھ مقتولہ کے گھر میں آتا جاتا تھا۔“

”مگر اس کا کوئی نام تو ہوگا؟“ آئی او شپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ظاہر ہے، نام تو ہے اس کا۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔

”کگ..... کیا نام ہے..... اس کا.....؟“

”جواد حسین!“ میں نے دھماکا کر دیا۔

☆☆☆

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل کو اس کیس میں باعزت بری کر دیا تھا۔ تین روز پہلے والی پیشی پر میں نے اپنے موکل عرفان کے حق میں ایسے دلائل دیے تھے جس سے اس کی بے گناہی ثابت ہو گئی تھی۔ میں نے اسی پر بس نہیں کی تھی بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر قاتل کو بے نقاب کرنے کے سلسلے میں استغاثہ کو واضح اشارہ بھی دے دیا تھا۔ مجھے نجیب اللہ پر کسی قسم کا شک نہیں تھا لیکن جواد حسین کے حوالے سے میری ریسرچ نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور میرا اس پر شبہ بعد ازاں درست ثابت ہوا تھا۔ پولیس نے جب نجیب اللہ اور جواد حسین کو شامل تفتیش کیا تو اس کیس کے تمام پوشیدہ



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



آدھی رات کا وقت تھا۔ سارا گاؤں خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ گاؤں کے باہر ویرانوں سے گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ روشن چاند کبھی بادلوں میں چھپ رہا تھا کبھی بادلوں سے جھانکنے لگتا تھا۔ ایسے عالم میں بانو گنے کے کھیت کے قریب اشرف کے گھر کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی اور اشرف اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

”میرے خیال میں اب چلنا چاہیے، کافی دیر ہوگئی ہے آئے ہوئے۔“

”ابھی تو آئی ہو اور ابھی جانے کی بھی جلدی ہوگئی۔“

اشرف نے دھیمے لہجے میں شکوہ کیا۔

”اگر میرے بھائیوں میں سے کوئی جاگ گیا تو وہ مجھے زندہ زمین میں دفن کر دیں گے۔ تمہاری محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر آتو جاتی ہوں مگر ہر لمحے خوف لگا رہتا ہے۔“

بانو نے جواب دیا۔

”ہاں بات تو تیری ٹھیک ہے مگر ہم دن کے اجالے

## امانت

محمد زبیر سلیمانی

دل کی لگی جب دل میں تیر بن کر اتر جائے تو آنکھیں بھی لہو برساتی ہیں۔ یہی حال کچھ اس کا بھی تھا جس نے اپنی امانت کا محافظ ایک ایسے بے ایمان کو بنا دیا جو اس کے خیال میں سب سے زیادہ حقیقی اور سچا دوست تھا... جبکہ نہ اس کا اپنا سکہ کھرا تھا اور نہ ہی دوستی کی میزان... ایسے میں قریب تو کھانا ہی تھا۔

مکروہ چہرے اور کالے من کے سوداگروں کا چوکا دینے والا انجام



Downloaded From  
Paksociety.com



”پورے دو گھنٹے سے جاگ رہی ہوں، گلی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سچ بتا کس سے مل کر آرہی ہے؟“

”اشرف سے۔“ بانو نے راہ فرار نہ پا کر سچ بول دیا۔

”کون اشرف!“ جمیلہ نے چپتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”اشرف کھوکھر چاچے کرم دین کا پتر۔“ بانو نے جواب دیا۔

”بانو! جس طرح میں آج جاگ رہی ہوں، اس طرح ابا بھی جاگ کر یہاں آسکتا ہے۔ پانچ بھائی ہیں ہمارے، اگر ان کو پتا چل گیا تو تیرے بیس ٹکڑے کر کے زمین میں دفن کر دیں گے اور ساتھ اس اشرف کے بھی، سنا تو نے۔ یہ ملنا ملانا پھوڑ تین ماہ بعد تیری شادی ہونے والی ہے، کیوں اپنی جان کی دشمن بنی ہوئی ہے۔“ جمیلہ تشویش ناک لہجے میں اس کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

”میں اشرف کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ یہ کہہ کر وہ بستر پر دراز ہو گئی۔

دونوں کے درمیان کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر جمیلہ بولی۔

”مجھے تیری سوچ پر حیرت ہو رہی ہے۔ تیرا منگیتر اتنا اچھا ہے۔ پڑھا لکھا بھی ہے، کیا رکھا ہے اشرف کھوکھر میں یہ مشکل دس جماعت پاس ہے، کام بھی کوئی نہیں کرتا، صرف دو سو کنال زمین ہے وہ بھی اس کے باپ کے نام۔ شکل بھی اس کی داغی ہی ہے۔“

”بس وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔“ بانو بے اختیار مسکرائی۔

جمیلہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور لائٹ آف کر دی۔ ”تو روزانہ ملنے جاتی ہے اس سے؟“ جمیلہ نے سوال کیا۔

”ہاں اور کل سے تیری ایک اور ڈیوٹی ہے، وہ یہ کہ میرے جانے کے بعد گلی والا دروازہ بند کر دیا کر اور میں تجھے مس کال دوں، تب دروازہ کھول دیا کر۔ بس اب سو جا دو گھنٹے بعد نماز کے لیے بھی اٹھنا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ٹروٹ بدل کے سو گئی، جمیلہ نے بھی آنکھیں موند لیں۔

اگلے روز کافی خوشگوار موسم تھا۔ نومبر کا آخری ہفتہ چل رہا تھا۔ سردی میں رفتہ رفتہ اضافہ ہو رہا تھا۔ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد دونوں بہنیں اپنے کمرے میں باتوں میں مصروف تھیں کہ کچھ دیر بعد بانو نے دروازہ بند کیا اور ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھ کر میک اپ کرنے لگی۔

”آج پھر اس سے ملنے جاؤ گی؟“ جمیلہ نے سوال کیا۔

”ہاں۔“ وہ لپ اسٹک ہونٹوں پر لگاتے ہوئے بولی

میں بھی تو نہیں مل سکتے نا، مجبوراً اس اندھیرے میں ملنا پڑتا ہے۔ اب تو میں تیرے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا تو پتا نہیں مجھے یاد بھی کرتی ہے کہ نہیں۔“ اشرف اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولا۔

”تو کوئی راستہ نکال نا اشرف کہ ہماری شادی ہو جا اور ہمیں یوں اس طرح نہ ملنا پڑے۔“ وہ دوپٹا درسہ رتے ہوئے بولی جیسے جانے کو پرتول رہی ہو۔

”بس جا رہی ہو؟“ اشرف نے پھر سوال کیا۔

”ہاں جانا تو ہے۔ کیا ہماری شادی نہیں ہو سکتی؟“ بانو نے سوال دہرایا۔

”نہیں۔“ اشرف نے مایوسی سے جواب دیا۔ ”میں نے دو تین بار ابا سے بات کی ہے، وہ کہتا ہے کہ ہم اپنی برادری سے باہر تیری شادی نہیں کریں گے۔ تجھے تو پتا ہی ہے کہ میرا باپ کتنا سخت آدمی ہے۔“

”میرے گھر میں بھی میرے بیاہ کی باتیں شروع ہو گئی ہیں۔ تنویر میرا منگیتر ہے میرے چاچا کا بیٹا بھی ہے۔ تین ماہ بعد دہنی سے آرہا ہے شادی کے لیے۔“ بانو دوپٹا اوڑھتے ہوئے بولی۔

”اگر وہ تجھے بیاہ کر لے گیا تو نکاح والی رات اس کو شوٹ کر دوں گا۔“ اشرف حتمی لہجے میں بولا۔

”اس کو مارنے کے بعد میرا بیاہ تجھ سے پھر بھی نہیں ہوگا، اس لیے یہ خیال دل سے نکال دے۔“ بانو اس کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

”تو پھر کوئی طریقہ نکال، اس طرح آدمی رات کو اس کھیت میں کب تک ملتے رہیں گے؟“ اشرف بولا۔

”اچھا میں چلتی ہوں، باقی باتیں کل ہوں گی۔ تو بھی کوئی طریقہ سوچ، میں بھی سوچتی ہوں۔“ یہ کہہ کر بانو وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے پانچ منٹ بعد اشرف نے بھی اپنے گھر کی راہ لی۔

بانو جب دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوئی تو ہر طرف سناٹا تھا۔ دو کنال پر محیط اس وسیع گھر کے تمام کمین سوئے ہوئے تھے۔ سامنے ایک لائن میں چھ کمرے تھے۔ وہ دبے پاؤں بڑے سے صحن کو پار کر کے اپنے کمرے میں داخل ہو گئی جہاں پر اس کی چھوٹی بہن جمیلہ بھی اس کے ساتھ سوتی تھی۔

”آدمی رات کو کہاں گئی تھی تو؟“ جمیلہ نے سوال کیا۔

”واش روم گئی تھی۔“ بانو اپنی گھبراہٹ پر قابو

پاتے ہوئے بولی۔



”کیا تو بوڑھے باپ کی عزت اپنے پاؤں تلے روند ڈالے گی، شرم نہیں آئی یہ بات کہتے ہوئے؟“ وہ غصے سے بولی۔  
 ”یہ میری زندگی ہے اور اس کے بارے میں فیصلہ میں خود کروں گی۔“ بانو نے روٹھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔  
 چند لمحوں تک دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی پھر بانو اس سے مخاطب ہوئی۔

”دیکھ جمیلہ! میں نے اپنے دل کی بات تیرے سامنے کر دی ہے، امید ہے تو اس راز کو اپنے تک رکھے گی۔“  
 ”تو اپنے گندے خیالات دل سے نکال دے تو بہتر ہے ورنہ میں اماں سے کہہ دوں گی۔“ جمیلہ نے جواب دیا۔  
 ”کیا تو واقعی اماں کو بتا دے گی؟“ بانو نے سوال کیا۔  
 ”ہاں اور اماں کو بتانا لازمی ہے، وہ ہی تجھے سمجھا سکتی ہے، بے فکر رہ وہ بھائیوں سے یا ابا سے بات نہیں کرے گی۔“ جمیلہ نے جواب دیا۔

”پاگل مت بن۔“ بانو نے جواب دیا۔ ”میں خود کسی روز موقع پا کر ان سے بات کر لوں گی وہ کوئی راستہ نکالے گی کہ میری شادی تویر سے نہ ہو۔“ جمیلہ نے ماتھے پر آئے ہوئے بال سمیٹے اور ان کو سر کے پیچھے باندھتے ہوئے بولی۔

”لیکن اس اشرف کھوکھر سے تو تیرا بیاہ پھر بھی نہ ہو پائے گا پھر کیا فائدہ تنویر سے شادی نہ کرنے کا۔“  
 بانو کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ وہ اپنی گوری کلائیوں میں ڈالی ہوئی کالج کی چوڑیوں سے کھیلنے ہوئے بولی۔  
 ”جمیلہ! تو شہری لوگوں سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کرے لیکن زندگی تو شہر میں ہی ہے۔ یہ لمبی سی کار، خوب صورت باورچی خانہ، گرم اور ٹھنڈے پانی کی ٹوشیاں، آرام دہ صوفے اور فوم والے بیڈ۔“ یہ کہہ کر اس نے آس پاس طائرانہ نگاہ ڈالی جہاں پر بان کی چارپائیاں رکھی ہوئی تھیں اور پیلے رنگ کا بلب مدھم دے بیسی روشنی بکھیر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چار سو اداسی پھیل گئی۔

باہر سے اماں کی آواز آئی۔ ”لاکیو! آج روٹیاں نہیں لگانی کیا۔ میں نے کب کاتور جلا رکھا ہے۔ جلدی سے باہر آؤ۔“

دونوں اپنے پیروں میں چپل پہن کر باہر نکلیں۔ دو کنال کے گھن میں سو واٹ کا ایک پیلا بلب جل رہا تھا۔ قریبی چھوٹے سے تنور سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔  
 ”سوئی رہتی ہو کیا۔“ اماں نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تمہارے بھائی روٹی مانگے گے۔“

جو اس نے چھپا کر رکھی ہوئی تھی کیونکہ ان کا باپ اور بھائی ان کے میک اپ کرنے پر برہم ہوتے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل ان کی ماں اپنے جینز میں لے کر آئی تھی جو بانو نے اپنے کمرے میں رکھی ہوئی تھی۔

”ڈرائیپ ریکارڈر پہ گانا تو لگا۔ وہ نور جہاں والا جدوں ہوئی جتیں.....“ بانو نے شوخ نظروں سے جمیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو جمیلہ نے پہلے کمرے کی کنڈی لگائی پھر ہلکی آواز میں ٹیپ ریکارڈر پر گانا لگا دیا۔ گانا شروع ہوا تو بانو نے خوشگوار موڈ میں تھرکننا شروع کر دیا مگر چند لمحوں بعد ہی بڑے بھائی شہباز نے زور زور سے ڈانٹ کر ٹیپ بند کر دیا۔ بھائی کے جانے کے بعد بانو بڑبڑانے لگی۔

”دنیا چاند پر پہنچ گئی ہے اور ہمارے گھر والوں کے ابھی تک وہی دقیانوسی خیالات ہیں۔ ہم اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتے کاش میں شہر میں پیدا ہوتی۔“  
 ”روک ٹوک اچھی چیز ہے باجی۔“ جمیلہ نے سمجھانا چاہا۔ ”شہر کی لڑکیوں کا حال نہ پوچھو، باپ اور بھائیوں کی غیرت کیا سوئی حیا تو جیسے رخصت ہو گئی۔“

”بس بس رہنے دے اپنی فضول باتوں کو۔“ بانو اٹھلا کر بولی۔ ”مجھے دیکھ کیا صورت دی ہے میرے رب نے مگر زندگی ایک فضول سے گاؤں میں گزر رہی ہے۔ کیا ہے اس گھر میں..... گائے بھینس اور بڑی بڑی موٹھوں والے بھائی۔“ بانو بستر پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی۔

”اور وہ تیرا اشرف کون سا افسر لگا ہوا ہے۔ وہ تو ہمارے بھائیوں سے بھی زیادہ کیا گزرا ہے۔“

”وہ تو میری صورت کا عاشق ہے۔ جب وہ بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا ہے تو اس وقت مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں کتنی خوب صورت ہوں۔“ بانو نے دھیرے سے کہا۔

”مگر تیرے ہاتھ تو کچھ نہیں آئے گا، تین ماہ بعد تنویر سے تیری شادی ہے۔“ جمیلہ نے سرزنش کی۔

”میں تو اس سے شادی نہیں کروں گی۔ بکرے جیسی شکل ہے اس کی اور وہ کون سا دینی میں کوئی افسر لگا ہوا ہے، ویلڈ رہی تو ہے۔“ بانو منہ بسورتے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب..... کیا تو اس سے شادی نہیں کرے گی؟ کیا یہ تیرے بس میں ہے؟ تو نہیں جانتی بھائیوں کو، تجھے زبردستی ڈولی میں بٹھائیں گے۔“ جمیلہ نے جواب دیا۔  
 ”میں گھر سے بھاگ جاؤں گی لیکن تنویر سے شادی نہیں کروں گی۔“ بانو کے عزائم سن کر جمیلہ کانپ کر رہ گئی۔



بانو..... تو روٹیاں لگا اور جیلے تو ذرا بھیسوں کو چار اڈال۔ اشرف نے جواب دیا۔

بھوری نے تو آج دودھ بھی کم دیا ہے۔

بانو نے جھٹ سے گوندھے ہوئے آلے کا تھال اٹھایا اور تور کے پاس آگنی، جیلے بھی اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

اشرف کھوکھرا اپنے گھر کے صحن میں درخت کے نیچے بچھی ہوئی چار پائی پر لیٹا درخت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو دیکھ رہا تھا۔ کاش وہ بھی پرندہ ہوتا اور اپنی بانو کو اڑا کر کسی دور دیس میں لے جاتا۔ اس نے دل میں سوچا۔ وہ بس جاگتی آنکھوں میں اسی کے خواب دیکھتا رہتا تھا۔

”اوائے اشرف! کیا بات ہے خیر تو ہے نا..... آج کافی دیر سے تو چار پائی پر لیٹا ہے؟“ بوڑھے کرم دین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور حقے کی منہ سے لگائی۔

”ہاں ابا، خیر ہی ہے۔ ایک بات تو بتا۔“ وہ درخت پر بیٹھی ہوئی چڑیا کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں پوچھ۔“ باپ نے حقے کی گڑگڑ کے بعد کہا۔  
”یہ بتا کہ میری شادی بھی کرے گا یا نہیں۔ میرے تمام دوستوں کی شادیاں ہو گئی ہیں۔ ایک میں ہی کنوارا رہ گیا ہوں۔“ وہ شکوہ کرنے کے انداز میں بولا۔

”اوائے بڑا بے شرم ہو گیا ہے تو..... باپ سے پوچھ رہا ہے کہ میری شادی کب ہوگی، کیا وقت آ گیا ہے۔“ وہ حقہ ایک طرف رکھتے ہوئے غفلت سے بولا۔ ”ایک ہمارا زمانہ تھا کہ شادی کے خیال سے ہی شرم آتی تھی۔ او بے شرم اپنی ماں سے بات کرے عورتوں کی ذمے داری ہوتی ہے۔“  
”ارے ابا شرع میں کیا شرم۔“ وہ چار پائی سے اٹھتے ہوئے بولا پھر وہ باپ کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور دوبارہ گویا ہوا۔

”ابا! یہ اپنا فضل داد کس قسم کا آدمی ہے؟“  
باپ نے آنکھوں کی چلیوں کو سکیرا اور پوچھا۔ ”کون فضل داد؟“

”شہباز کا باپ، اس کی ایک بیٹی کا نام بانو ہے۔“  
اس نے جواب دیا۔

”ایک نمبر کا کمینہ آدمی ہے۔ اپنے بد معاش قسم کے بیٹوں پر بڑا ناز کرتا ہے مگر تو نے اس کی بیٹی کا نام کیوں لیا۔ شہباز کہنا کافی نہیں تھا کیا؟“ باپ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”اٹوہ ابا! یونہی نام لے لیا۔ کچھ اور نہ سمجھ لینا۔“

”اچھا اچھا زیادہ فضول باتیں نہ کر اور شہر چلا جا وہاں پر میں نے ایک مکینک کو جنریٹر دیا تھا ٹھیک کرنے کے لیے۔ مین بازار میں اس کی دکان ہے، یہ لے اس کا کارڈ۔“  
باپ نے جیب سے کارڈ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”موٹر سائیکل تیز نہ چلاتا۔“ باپ نے تاکید کی اور اشرف وہاں سے چل دیا۔ جب وہ موٹر سائیکل باہر نکال رہا تھا تب بھی بانو خیالوں میں اس کے ہمراہ تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس کی موٹر سائیکل پر ہی اس کے پیچھے بیٹھی ہو۔

☆☆☆

وقت دھیرے دھیرے گزرتا جا رہا تھا۔ بانو کے گھر میں اس کی شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں اور اشرف کے پیروں تلے سے زمین ہسکتی جا رہی تھی۔ اشرف اور بانو ہفتے میں تین بار رات میں ملاقات کیا کرتے تھے۔ اس رات بھی وہ.....  
.... بارہ بجتے ہی گھر سے نکلا اور گنے کے کھیت کے قریب ہی اس کا انتظار کرنے لگا، تھوڑی دیر بعد بانو بھی آگئی۔

”سنا ہے تیری شادی ہو رہی ہے اگلے ہفتے؟“ اس نے اداس لہجے میں بانو سے سوال کیا۔

”ہاں سنا تو میں نے بھی ہے۔“ وہ اس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

”تو، تو بڑی خوش ہوگی جہاز پر بٹھا کے دہنی جو لے جائے گا وہ تجھے۔“ شہباز نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

”کیا میرے سینے پر تیر چلانے کے لیے بلایا ہے تو نے؟“ وہ اداس لہجے میں بولی۔

اشرف نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بس اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔

”مجھے اچھا نہیں لگتا وہ۔ چھوٹا سا تو قد ہے اس کا، سوکھا سڑا منہ ہے۔ وہ بھلا میرے قابل کہاں۔“ وہ اس کے سینے سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔

شہباز کے ہاتھ رک گئے۔ ”اس کا مطلب ہے وہ اگر بے قد کا ہوتا اور اس کا سوکھا ہوا منہ نہ ہوتا، تو تو اس سے خوشی خوشی بیاہ کر لیتی؟“ شہباز قدرے نمبے سے بولا۔

”یہ میں نے کب کہا ہے؟“ بانو نے احتجاج کیا۔

”تو کہے تو میں اس کو ٹھکانے لگا دوں۔“ اشرف نیچے میں رکھے ہوئے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔

”اس سے کیا ہوگا۔ تجھ سے تو میری شادی پھر بھی



نہیں ہوئی۔" بانو نے جواب دیا۔

اشرف نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"کیا تو گھر چھوڑ سکتی ہے؟"

"کیا مطلب؟" وہ کچھ کچھ سمجھتے ہوئے بولی۔

اشرف نے لمبی سانس نکالی اور گویا ہوا۔

"بانو! اپنی خوشی حاصل کرنے کے لیے ہمیں ایک فیصلہ کرنا ہوگا۔ وہ یہ کہ میں تجھے بھگا کے شہر لے جاؤں،

جہاں ہم دونوں کرائے کا کوئی گھر لے لیں گے۔ سنا ہے کورٹ کچھری میں بھی نکاح ہو جاتا ہے۔ کیا تو اپنے اندر گھر

سے بھاگنے کی جرأت رکھتی ہے؟"

شہر کا نام سنتے ہی بانو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"میں تیار ہوں۔ بس اب پیچھے نہ ہٹنا۔ میں خود کئی دنوں سے یہی سوچ رہی تھی مگر تجھ سے کہنے کی ہمت نہیں تھی۔

میں گاؤں اور یہاں کی پابندیوں سے تنگ آگئی ہوں، تو نے شہر کا نام لیا ہے تو میں تیرا ساتھ دینے کو تیار ہوں، بول کب

چلنا ہے؟"

اشرف نے درخت سے ٹیک لگائی اور پھر گویا ہوا۔

اس کا ہاتھ بانو کے ہاتھ میں تھا۔ "کیا تو سارا زیور اپنے ساتھ لاسکتی ہے؟ شہر میں نئی زندگی شروع کرنے کے لیے

قدم قدم پر پیسے کی ضرورت ہوگی۔"

"میں تو لے زیور ہے میری شادی کے لیے۔ کیا وہ کافی رہے گا؟" بانو نے سوال کیا۔

"ہاں، اس سے چھوٹا سا کاروبار ہو سکتا ہے۔ سن..... میں نے ذہن میں پروگرام ترتیب دے رکھا ہے۔"

بانو اس کے اتنا قریب آگئی کہ اشرف کی گرم سانسیں اس کے رخساروں سے لگ رہی تھیں۔ وہ ہمہ تن گوش تھی۔

اشرف نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ہم اگر ایک ساتھ فرار ہوئے تو میرے بھائی مفت میں مارے جائیں گے اور

دشمنی کا ایک لمبا سلسلہ چل نکلے گا۔ میں تجھے راتوں رات یہاں سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پر چھوڑ دوں گا اور خود واپس

آ جاؤں گا۔ پھر ایک ہفتے بعد تیرے پاس آؤں گا اور ہم رات کے اندھیرے میں شہر چلے جائیں گے۔ تیرے گھر

سے فرار کے بعد جب میں گاؤں میں ہی کچھ دن رہوں گا تو تیرے بھائی مجھ پر شک نہیں کریں گے، ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں بالکل ٹھیک۔" بانو نے دبے لہجے میں جواب دیا۔ "مگر تو مجھے چھپائے گا کہاں؟"

"دریا کے پار کپے کے علاقے میں ایک چھوٹا سا

گاؤں ہے، وہاں میرا ایک پرانا دوست رہتا ہے۔ بہت قابل اعتماد ہے وہ۔ میں تجھے اس کے پاس چھوڑ کر راتوں

رات واپس آ جاؤں گا۔ بس تو وہاں ایک ہفتہ رہے گی، اس کے گھر میں اس کی بیوی اور ماں ابھی رہتی ہے۔ بے فکر ہو کر

رہنا۔ تو ایسا کر کل رات ٹھیک بارہ بجے تمام زیور اور ہوسکے تو کچھ پیسے بھی لے کر آ جانا۔ تیرا دریا پار کرنا ہے۔ آنے سے

پہلے دیکھی لینی لیتا۔ سردی کا موسم ہے اور دریا کا پانی بہت ٹھنڈا ہوگا۔ دیکھی گھی سے تجھ پر ٹھنڈا اثر نہیں کرے گی۔"

"مگر مجھے تو تیرا نہیں آتا۔" بانو پریشان لہجے میں بولی۔

"کوئی بات نہیں، تیرا انتظام میں کر لوں گا۔ مجھے تو تیرا آتا ہے۔ بس اب تو جا۔ کل اسی جگہ اسی وقت ملنا ہے۔

زیادہ سامان نہ ہو بس زیور اور کچھ روپے۔ روپوں کو پلاسٹک کی تھیلی میں لپیٹ لینا، کپڑے اٹھانے کی ضرورت

نہیں۔" بانو نے ادھر ادھر دیکھا پھر وہ اشرف کی طرف دیکھنے لگی، اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔

"اچھا ٹھیک ہے، میں چلتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ راستے میں اس نے بہن کو ایک مس کال دے دی تھی۔ جب وہ دروازے پر پہنچی تو جمیلہ دروازہ کھول کے کھڑی تھی۔

☆☆☆

چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ سارا گاؤں نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ دونوں ستاروں اور ادھورے چاند کی مدھم

روشنی میں دریا کی جانب بڑھ رہے تھے۔ بانو نے ایک ہاتھ میں گٹھڑی تھام رکھی تھی جبکہ اشرف کے ہاتھ میں گاڑی کی ٹیوب تھی جس میں ہوا بھری ہوئی تھی۔ جہاں سے وہ چلے

تھے وہاں سے دریا ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں کا آخری گھرانہوں نے کراس کیا تو دور سے انہیں دریا کا چمکیلا

پانی نظر آیا جو خاموشی سے بہ رہا تھا۔ وہ دونوں تیز تیز چلتے ہوئے کنارے پر آئے۔

"دیکھ بانو..... ایک ہاتھ سے تو نے ٹیوب کو تھامنا ہے اور دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینا ہے، خبردار تیرے

دونوں ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہونی چاہیے۔ ٹیوب ہاتھ سے چھوٹ گئی تو دونوں ڈوب جائیں گے۔"

بانو نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"میں نے اپنے دوست کریم داد کو فون پر اطلاع دے دی تھی، وہ پرلے کنارے پر موجود ہوگا، میں تجھے اس کے حوالے کر کے واپس لوٹ جاؤں گا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔" بانو نے جواب دیا۔



”ہماری ساری عزت پاؤں تلے روند گئی ہے وہ۔“  
تیسرا بھائی جاوید امانت پیستے ہوئے بولا۔  
”اماں، نہ ہم باہر جاسکتے ہیں نہ پولیس میں رپورٹ  
کر سکتے ہیں۔ تباہ کر کے جانے کہاں چلے گئے۔ اڑاتی پھر رہی  
ہوگی، ایک بار اس کا سراغ مل جائے اتنے کلڑے کروں گا کہ  
کوئی پہچان بھی نہیں پائے گا۔“ شہباز بے بس لہجے میں بولا۔  
سرور چار پانی پر بیٹھ گیا اور سب پر طائرانہ نظر ڈالتے  
ہوئے بولا۔

”اسی گاؤں کا کوئی ہوگا جس کے ساتھ اس کا پارا نہ  
چل رہا ہوگا، اب پتا نہیں وہ کون ہے، اب ہم حاضری تو نہیں  
لگا سکتے کہ گاؤں کا کون سا بندہ غائب ہے۔“  
جاوید آگے بڑھا اور ماں سے مخاطب ہوا۔  
”تجھے منع کیا تھا کہ اس کے ہاتھ سے موبائل لے  
لے مگر تو، تو کہتی تھی کہ سہیلیوں کو میسج کرتی ہے۔“ پھر وہ  
بھائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ضروری نہیں کہ اسی  
گاؤں کا ہو، باہر کا بھی ہو سکتا ہے اور مجھے پکا یقین ہے کہ باہر  
کا بندہ ہی ہوگا۔“ یہ کہہ کر وہ اضطرابی کیفیت میں موچھوں کو  
تاؤ دینے لگا۔ چوتھا بھائی اصغر جواب تک خاموش کھڑا تھا،  
اس کی آواز گونجی۔

”اماں، اس جیلہ کا جتنا جلدی ہو سکے بیاہ کر دے۔“  
خالہ صغراں سے بات کر کے وہ جلد از جلد شادی کی تاریخ  
دے جائیں، ایسا نہ ہو کہ یہ بھی ہمارے منہ پر کا لک ل کے  
بھاگ جائے۔“  
جیلہ نے زخمی نظروں سے اصغر کو دیکھا مگر احتجاج کا  
کوئی لفظ ادا نہ کر سکی۔ تھوڑی دیر بعد سب بھائی کمرے سے  
نکل گئے۔

سارے گھر پر سوگواری کا عالم طاری تھا۔ بانو کو گھر  
سے گئے دو دن ہو چکے تھے۔ بانو کے گھر سے بھاگنے کی خبر  
تقریباً سارے گاؤں میں پھیل چکی تھی۔ بانو کے بھائی دو  
دن سے اپنے گھر میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ لوگوں کی  
نظروں کا سامنا کرنے کی ہمت نہ بھائیوں میں تھی اور نہ  
باپ میں مگر کب تک، بالآخر کام کاج کے سلسلے میں آہستہ  
آہستہ انہوں نے باہر جانا شروع کر دیا۔ لوگوں سے سلام دعا  
کے بغیر وہ آنے جانے لگے۔ کوئی شاسا سلام کرتا تو نظریں  
جھکا کر جواب دیتے۔ سینہ تان کر چلنے والے آج شانے جھکا  
کر چلنے لگے تھے۔

☆☆☆

اشرف دن میں دو تین بار بانو کے گھر کے سامنے سے

اشرف نے بیوب اس کو تھمائی اور اس کا دوسرا ہاتھ  
پکڑ لیا پھر دونوں دریا میں اتر گئے۔ ٹھنڈے پانی نے ان کا  
استقبال کیا۔ دونوں آہستہ آہستہ تیرتے ہوئے گہرے پانی  
میں چلے گئے۔  
تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ بخیریت دوسرے کنارے  
پر پہنچ گئے۔ ان کو دور سے کریم داد کی جلتی بجھتی نارنج کی  
روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دونوں پانی سے نکلے اور کچھ  
دیر بعد کریم داد کے پاس پہنچ گئے۔  
”بڑی ہمت کی یار تم دونوں نے۔“ کریم داد سلام  
کرنے کے بعد بولا۔

”بس یار۔ پیار میں تو ہمت دکھانی پڑتی ہے۔ تو بانو  
کو لے جا، اس کو باہر نہ نکلنے دینا۔ میں آج ہی کے روز اگلے  
ہفتے تیرے پاس اپنی امانت لینے آ جاؤں گا۔“  
”بے فکر رہو دوست۔ تمہاری امانت ہے جب جی  
چاہے لے جانا۔ چل بہن۔“ کریم داد نے جواب دیا اور  
خدا حافظ کہہ کر دونوں اشرف سے جدا ہو گئے۔ اشرف نے  
اسی وقت دریا میں چھلانگ لگائی اور بیوب کے سہارے تیرتا  
ہوا دوسرے کنارے کی طرف جانے لگا جہاں پر اس کا  
گاؤں تھا۔

☆☆☆

پانچوں بھائیوں کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ باپ  
اپنے کمرے میں بیٹھا خلاؤں میں گھور رہا تھا اور ماں نے رو  
رو کر برا حال کیا ہوا تھا۔ سرور سب سے چھوٹا تھا، اس نے  
اپنی چھوٹی بہن جیلہ کو بالوں سے پکڑا اور غراتے ہوئے  
بولا۔ ”ہم کیسے مان لیں کہ تجھے اس کے جانے کا پتا نہیں تھا۔  
جلدی بتا وہ کہاں ہے ورنہ اسی کلا شکوف سے تجھے چھپانی  
کر دوں گا۔“

شہباز آگے بڑھا۔ ”کس کے ساتھ گئی ہے وہ بتا۔“  
یہ کہہ کر اس نے ایک زنائے دار تھپڑ اس کے چہرے پر  
جڑ دیا، جیلہ دور جا گری۔

”مجھے نہیں معلوم کہ وہ رات کو کس وقت نکلی اور کس  
کے ساتھ گئی ہے۔ بھائی! قسم لے لو جو مجھے کچھ بھی پتا ہو۔“  
جیلہ روتے ہوئے بولی۔

ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ ”بتا دے جیلہ اگر  
تجھے تھوڑی سی بھی خبر ہے۔“ ماں دروازے پر کھڑے  
کھڑے بولی۔

”اماں، مجھے معلوم ہوتا تو کب کی بتا چکی ہوتی۔ وہ  
اپنے راز کب کسی کو دیتی تھی۔“ جیلہ سسکتے ہوئے بولی۔



گزرتا تھا کہ بانو کی گشدگی پر کوئی اس پر شک نہ کر سکتے۔ لیکن اگلے چند روز بعد اس کو بھی یہ گاؤں چھوڑنا تھا۔ ساتھ ساتھ یہ امید بھی تھی کہ اس گلی سے گزرتے ہوئے اس کے باپ یا بھائیوں میں کوئی نہ کوئی اس کو آتا جاتا دیکھ لے۔ آج بھی اشرف گلی سے گزر رہا تھا کہ رضو دکاندار نے دیکھتے ہی اس کو سلام کیا۔

”کیا حال ہے رضو۔“ وہ اس کی دکان کے تھڑے پر پاؤں رکھتے ہوئے بولا۔

”مولا کا کرم ہے بھائی۔ تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے آج کل؟“ وہ اس کے قریب آ گیا۔

”بس یا قدرت کے رنگ دیکھ رہا ہوں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اللہ بیٹی دے تو اچھے کردار والی دے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس نکالی۔

”کیا مطلب؟“ اشرف نے جان بوجھ کر انجان بننے ہوئے کہا۔

”یار! اپنے فضل داد کی بات کر رہا ہوں۔“ وہ آواز دھیمی کرتے ہوئے بولا۔ ”بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہے۔۔۔۔۔ تو یہ تو ہے۔“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔

”ہاں یار! بہت برا ہوا، خیر اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔ جو لوگ اپنی بیٹیوں پر کڑی نظر نہیں رکھتے ہیں ان کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔ گاؤں کا ماحول بہت خراب ہو گیا ہے۔ میں تو دو تین روز تک یہ گاؤں چھوڑ دوں گا۔ شہر جا کر کوئی کام ڈھونڈوں گا۔“ اشرف نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

”ہاں یار! یہاں تو نہ روزگار ہے نہ کاروبار۔ چائے پیے گا؟“ رضو ایک گاہک کو نمٹاتے ہوئے بولا۔

”نہیں یار چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ دکان سے نکل کر گھر کی جانب چل دیا۔

بانو کا سراپا ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا تھا لیکن دل اطمینان سے لبریز تھا کیونکہ وہ اب اس سے محض دو تین دن کے فاصلے پر تھی، پھر نہ چھپ چھپ کر ملنے کی ضرورت ہوگی اور نہ ملاقات کا انتظار ہوگا۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں بانو کے ہمراہ کئی مقامات کی سیر کر چکا تھا، دو تین بچوں کے خواب بھی دیکھ چکا تھا۔ اس کے یہ دن بڑی بے صبری سے گزر رہے تھے، وہ اپنے ماں باپ کو بھی کہہ چکا تھا کہ دو تین دن تک وہ گاؤں چھوڑ کر شہر چلا جائے گا۔

گھر جاتے ہی اس نے کریم داد کو فون کیا مگر اس کا نمبر بندل رہا تھا۔ دو تین گھنٹے بعد اس نے پھر کال کی مگر نمبر ہنوز بند رہا۔ رات کھانا کھانے کے بعد اس نے تیسری بار

کوشش کی اس بار نمبر مل گیا۔

”کیا حال ہے کریم داد؟“ لائن ملتے ہی اشرف نے کہا۔

”مولا کا کرم ہے بھائی۔ تم سناؤ وہاں تو سب اچھا ہے نا؟“ کریم داد نے سوال کیا۔

”ہاں، کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ یہ بتاؤ وہ کیسی ہے ٹھیک تو ہے نا۔“

”بالکل ٹھیک ٹھاک ہے تم کہو تو تمہاری بات کرادوں؟“ کریم داد نے پوچھا۔

”نہیں نہیں، بس حال پوچھنا تھا، او کے خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“

اس نے فون کو جیب میں رکھا اور چھوٹی بہن کو آواز دی۔ ”صابرہ! ایک کپ چائے تو بنا۔“

”اچھا بھائی بناتی ہوں۔“ دور سے آواز آئی۔

اس کی ماں اندر داخل ہوئی۔ ”پتر شرفو! تیرا باپ کہہ رہا تھا کہ تو تین چار روز تک شہر چلا جائے گا، مجھے تو نے بتایا ہی نہیں۔“ وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اماں! تجھے اس لیے نہیں بتایا کہ تو جانے کی اجازت جو نہیں دے گی۔ ویسے بھی اماں اس گاؤں میں میرا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ گاڑی چلانا جانتا ہوں، شہر میں کوئی نہ کوئی نوکری مل ہی جائے گی۔“

اماں نے دو پناہ درست کیا اور بولی۔ ”شرفو پتر! میں تجھے روکتی تو نہیں کیونکہ جوان جہان ہے تو۔ روزگار تو تجھے چاہیے، بس اپنا خیال رکھنا اور روزانہ فون کرتے رہنا۔“

”اماں تو، تو ایسے کہہ رہی ہے جیسے میں ابھی ابھی جا رہا ہوں۔ ابھی تین چار دن باقی ہیں۔“ اشرف بازو دکھائی بنا کر لیٹتے ہوئے بولا۔

اماں اس کی چار پائی پر بیٹھ گئی اور راز دارانہ لہجے میں بولی۔

”بانو کا کچھ پتا چلا؟“

”معلوم نہیں اماں۔۔۔۔۔ میں ایسی باتوں کی ٹوہ میں نہیں رہتا۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”ہائے ہائے اللہ ایسی بیٹی کسی کو نہ دے۔“ وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ ”باپ کی سفید ڈاڑھی اور بھائیوں کا شملہ مٹی میں ملا گئی۔“ پھر اس نے طویل سانس باہر نکالی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔

اشرف کا باپ دروازہ کھولنے چلا گیا۔ پھر وہ اشرف کے کمرے میں داخل ہوا۔

”شہباز آیا ہے، تجھے بلا رہا ہے۔“ اس نے کھانتے



### ذرا مسکرائیں

داماد اپنے سسرال "لکھنؤ" گیا تو ساس نے پوچھا۔ "دلہا بیٹا! آپ کے لیے میاں آلو پکالے جائیں۔ بھنڈی محترمہ کھانا پسند کریں گے یا پھر کدو صاحب نوش فرمائیں گے؟"

داماد بولا۔ "جی میں گناہ گار بندہ ان کے لائق کہاں..... آپ کوئی بے غیرت سامرغا پکالیں۔"

مرسلہ۔ محمد یونس چودھری، سلطان پورہ، لاہور

☆☆☆

ایک عورت (اپنے خاوند سے) "آپ مجھے رانی کیوں کہتے ہیں؟"

خاوند۔ "کیونکہ نوکرانی کہنا تھوڑا لمبا ہو جاتا ہے۔"

بیوی۔ "آپ کو پتا ہے میں آپ کو جان کیوں کہتی ہوں؟"

خاوند۔ "کیوں؟"

بیوی۔ "کیونکہ جانور کہنا تھوڑا لمبا ہو جاتا ہے۔"

مرسلہ۔ عبدالغفار فردوس، نواں شہر، ایبٹ آباد

تو چاہ رہا تھا کہ رات ہوتے ہی تیر کر دریا پار کر جائے مگر سردی میں یہ کام بہت مشکل تھا۔ تب کی بات اور تھی، اب تو وہ صبح کو کشتی پر بیٹھ کر جاسکتا تھا۔ گاؤں کے لوگ دریا پار کشتی پر بیٹھ کر ہی جایا کرتے تھے۔

اگلی صبح نماز سے فراغت کے بعد اس نے ماں سے شام تک لوٹنے کا وعدہ کیا اور روانہ ہو گیا، گھر میں اس نے یہ بتایا کہ کریم داد کے پاس کسی ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ دریا کے کنارے کشتی موجود تھی۔ چند مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی سوار ہو کر نیچے آتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ تمام مسافر نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد کشتی روانہ ہوئی، اس جگہ سے دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ اس نے موبائل پر کریم داد کا نمبر ملایا تاکہ اس کو اپنے آنے کی اطلاع دے سکے مگر اس کا نمبر بندل رہا تھا، اس نے مزید دوبار کوشش کی مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ کشتی ڈیزل انجن والے جنریٹر کے ذریعے چل رہی تھی۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ کریم داد کے گاؤں میں تھا۔ کشتی سے اترتے ہی اس نے کریم داد کے گھر جانے والی پگڈنڈی پر چلنا شروع کر دیا۔

ہوئے کہا۔

اشرف کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ "کون شہباز.....؟" اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "فضل کا بڑا بیٹا۔" باپ نے جواب دیا اور کمرے سے نکل گیا۔

اشرف نے کچھ دیر سوچا پھر الماری کھول کر پستول نکال کے قمیص کی ساڈ والی جیب میں رکھا اور باہر نکل گیا۔ "جی کیا بات ہے؟" اس نے سلام کے بعد پوچھا۔ اس کا ہاتھ پستول والی جیب پر تھا۔

"تم سے ایک کام تھا یار۔" شہباز نے دھیسے لہجے میں کہا جس سے اشرف کی تسلی ہوئی۔

"اندر آجاتے، تمہارا پردہ تو نہیں۔" اشرف نے مروتا کہا۔

"نہیں یار..... بس یہیں ٹھیک ہے۔ کام تھا تو تمہاری طرف چلا آیا۔" شہباز اس کے شانے پر بازو رکھ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ آج اس کی شان بے نیازی، عاجزی اور انکساری میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ورنہ وہ ہر ایک سے انتہائی غرور سے بات کرتا تھا۔

"بات یہ ہے اشرف کہ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے جمال الدین کے پاس بیٹھا تھا، تمہیں تو پتا ہے ہمارے گھر پر قیامت گزر گئی ہے۔ مجھے کسی پہنچے ہوئے پیر کے آستانے کی ضرورت ہے، کوئی ایسا تعویذ درکار ہے جس سے ہم اپنے اس دشمن تک پہنچ سکیں جس نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ جمال الدین نے تمہارے بارے میں بتایا ہے کہ تم ملتان کے کسی پیر کے مرید ہو اور وہ بہت پہنچا ہوا ہے، تم مجھے اس کا ایڈریس بتا سکتے ہو؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔" اشرف نے جواب دیا۔ "لیکن یہ بتاؤ کہ تم چائے تو پیو گے تا بنے وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ وہ دل ہی دل میں خود سے شرمندہ ہو رہا تھا۔

"نہیں دوست، بس تم مجھے اس کا ایڈریس بتاؤ۔" شہباز نے جواب دیا اور اشرف نے اس کو کسی اور پیر کے آستانے کا ایڈریس بتا دیا۔ ایڈریس نوٹ کرتے ہی شہباز نے واپسی کی راہ لی۔

اشرف گھر واپس آ گیا۔ آج اس کو بانو کی یاد ستا رہی تھی، اس کے جانے میں ابھی تین دن باقی تھے۔ پھر اس نے اگلی صبح بانو کا حال جاننے کے لیے روانگی کا پروگرام بنالیا۔ وہ اس کی صورت دیکھنے کے لیے سخت بے چین ہو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بانو سے مل کر واپس آ جائے گا، اس کا دل



اشرف کا ہاتھ پستول کی جانب گیا، اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا تھا پھر اچانک اس کی عقل اس کے دل پر حاوی ہو گئی۔ اس نے ان کو خود سزا دینے کے بجائے کچھ اور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ دبے پاؤں واپس جانے کو مڑا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

اس کو نہیں یاد کہ وہ کس طرح کشتی تک پہنچا تھا۔ بچپن کے دوست اور محبوبہ کی بے وفائی اس کو اندر سے ختم کر گئی تھی۔ وہ خاموشی سے کشتی پر جا بیٹھا۔ کب مسافر جمع ہوئے اور کب کشتی روانہ ہوئی اس کو قطعی ہوش نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوسرے کنارے پر تھا۔ اب وہ قدرے حواس میں بھی تھا۔ گھر جانے کے بجائے اس نے شہباز سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ دو تین بار کی دستک دینے کے بعد شہباز کا باپ باہر نکلا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اشرف کی طرف دیکھا۔

”شہباز سے ضروری کام ہے، ذرا اس کو بھیجیں۔“

اشرف نے اس کے سوال سے پہلے ہی آنے کا مقصد بتا دیا۔

”وہ تو ملتان جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ میں اس کو بھیجتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ دوبارہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد شہباز باہر نکلا۔ اشرف کی طرف گرم جوشی سے بڑھا۔

”خیر تو ہے اشرف..... کیا کام ہے؟“ اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”ہاں جبریت، ایسی نہ میں اس واپسی خبر ہوں یا بری۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

شہباز نے آنکھوں کی پٹلیوں کو سکڑا پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”بول بول اشرف، بتا کیا بات ہے؟“

اشرف نے چند لہجوں تک ادھر ادھر دیکھا پھر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ”میں آج سویرے دریا کے پار والے گاؤں جھوک موہانہ گیا تھا۔ وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ حکمت کا کام بھی جانتا ہے۔ اس سے کوئی دوالمی تھی۔“ پھر وہ ذرا دیر کورکا۔

”ہاں ہاں پھر؟“ شہباز نے جلدی سے کہا۔

”ہم دونوں کا ایک مشترکہ دوست ہے جس کا نام کریم داد ہے۔ باتوں باتوں میں میرے حکیم دوست نے بتایا کہ کریم داد کے گھر آج کل تین چار دن سے کوئی لڑکی چھپی ہوئی ہے جس کو وہ کہیں سے بھگا کر لے آیا ہے۔ مجھے شک سا ہو رہا ہے کہ وہ کہیں تمہاری بہن نہ ہو۔ یارا خفانہ ہونا تم اپنے سے لگتے ہو، پریشان بھی ہو۔ میں ایک دوست

کریم داد کا گھر گاؤں کے باقی گھروں سے ہٹ کر تھا۔ یہ کوئی باقاعدہ گاؤں نہیں تھا، دوسرے دیہاتوں کی طرح یہاں کے گھر بھی ایک دوسرے سے فاصلے پر بنے ہوئے تھے۔ کریم داد کے گھر کے آس پاس یا تو ریتلا میدان تھا یا چھوٹے چھوٹے کھیت بنے ہوئے تھے۔ زیادہ تر سرکنڈوں کے پودے سرائٹھائے کھڑے تھے۔ دریا کا پانی جہاں جہاں سے غائب ہو جاتا تھا، وہاں پر سرکنڈوں کے خودرو پودے سر نکال لیتے تھے۔ وہ دل میں طنز کی بے چینی دبائے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ دو تین منٹ کے بعد اس کو دور سے کریم داد کا گھر نظر آ گیا۔ گھر کے باہر درخت کے نیچے دو تین بھینسیں بندھی ہوئی تھیں اور کافی فاصلے پر ایک ٹیوب ویل چل رہا تھا جس پر دو عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں غالباً یہ کریم داد کی ماں اور بیوی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر بعد دروازے پر پہنچ گیا۔ لکڑی کا بڑا سا گیٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا، اس نے دو تین بار کریم داد کا نام رکارا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ وہ گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ پہلے بھی کئی بار گھر کے اندر آ چکا تھا۔ دو تین کنال پر مشتمل اس گھر کے صحن میں کوئی نہیں تھا، وہ چلتا ہوا ایک کمرے کے پاس رکاوٹ خالی تھا پھر دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ بانو کی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔ وہ کئی بات پر تہمت لگا رہی تھی پھر تہمتہ رکھتے ہی وہ بول۔ ”دیکھ کریم داد میں دو تین دن جد چٹی جاؤں نہ تجھے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“ کریم داد کی آواز گونجی۔

”جب چلی جائے گی تو پھر کب یاد رکھے گی، گھر آباد ہوتے ہی تو، تو اشرف کی ہو جائے گی۔“

”اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں کریم داد، میں تو بس گاؤں کے ماحول سے نکلنا چاہتی تھی۔ ویسے تو فکر نہ کرتی را نمبر تو میرے پاس ہے نابس جیسے ہی میرا دل تجھے دیکھنے کو چاہے گا میں تجھے فون کر دوں گی تو آ جانا۔“

کریم داد گویا ہوا۔

”اور وہ اشرف جو وہاں ہوگا پھر ہم کیسے ملیں گے؟“

”اس کو میں کسی ایسے کام پر لگا دوں گی کہ صبح کو جائے گا اور رات کو واپس آئے گا۔“ یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اشرف کے قدم جیسے پتھر کے ہو گئے تھے، اس کے ذہن میں آنندھیاں سی جلنے لگی تھیں۔ پھر کریم داد کی آواز آئی۔

”ادھر دور کیوں جیٹھی ہے؟“

”تیرا دل نہیں بھرا ابھی تک۔ صبر کر ابھی اماں اور تیری بیوی آ جائے گی۔“



بن کر تمہیں خبر دینے آیا ہوں۔ آگے تمہارا کام ہے۔  
 ”تو چائے پیے گا؟“ شہباز نے رسا پوچھا مگر بے  
 تابی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

”نہیں دوست، اب مجھے اجازت دو۔“ یہ کہہ کر اس  
 نے شہباز کو خدا حافظ کہا اور گھر لوٹ گیا۔ جانے سے پہلے وہ  
 کریم داد کا ایڈریس مکمل طور پر شہباز کو سمجھا گیا تھا۔

☆☆☆

رات کے ایک بجے غلام رسول کے گھر پہ دستک  
 ہوئی۔ غلام رسول اس کشتی کا ملاح تھا جو گاؤں والوں کو دریا  
 پار کراتا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے شہباز کھڑا تھا۔  
 اس نے اپنے چہرے کو نقاب سے چھپا رکھا تھا۔  
 ”کون ہو بھائی؟“ اس نے سوال کیا۔

”مجھے دوسرے کنارے پر جانا ہے۔“ شہباز نے  
 جواب دیا۔

”مگر اس ٹائم تو ہم نہیں جاتے۔ آخری پھیرا مغرب  
 سے ذرا پہلے لگاتے ہیں۔“ غلام رسول نے جواب دیا۔

شہباز نے پانچ سو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ  
 دیا۔ غلام رسول نے نوٹ کو دیکھا جیسے اس کے اصلی ہونے  
 کی پہچان کر رہا ہو پھر وہ اندر گیا اور دو منٹ بعد ہی لوٹ  
 آیا۔ ”آؤ۔“ وہ اس کو چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا اور  
 شہباز اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ دونوں دریا کے کنارے  
 پہنچے، شہباز کشتی میں سوار ہو گیا اور غلام رسول نے انجن  
 اسٹارٹ کر دیا۔ کشتی دھیرے دھیرے دوسرے کنارے کی  
 طرف بڑھنے لگی۔

غلام رسول نے شہباز کو دیکھا جو بدستور نقاب  
 لٹکائے ہوئے تھا اور بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔

”تم نے منہ کیوں چھپا رکھا ہے..... کوئی ڈکیت تو  
 نہیں ہو؟“ غلام رسول نے سوال کیا۔

”ڈکیت نہیں ہوں۔ گھبراؤ مت بس منہ چھپانا میری  
 مجبوری ہے۔ تم جھوک موہانہ کے کریم داد کو جانتے ہو؟“

”جھوک موہانہ میں دو کریم داد ہیں۔ ایک کریم داد  
 تائی ہے عمر ساٹھ سال کے قریب ہوگی اور دوسرا جوان آدمی  
 ہے۔ دونوں کو جانتا ہوں۔“ غلام رسول نے جواب دیا۔

شہباز خاموش ہو گیا۔ کشتی دھیرے دھیرے آگے  
 بڑھ رہی تھی۔ چاند کی کرنیں پانی پر اپنا جلوہ بکھیرے ہوئے  
 تھیں۔ کافی دُفریب اور پراسرار منظر تھا۔ تھوڑی دیر بعد  
 دوسرا کنارہ آ گیا۔ شہباز کشتی سے اتر گیا اور غلام رسول سے  
 مخاطب ہوا۔ ”مجھے اس جوان کریم داد کا پتا سمجھا دو۔ کریم

داد میرا دوست ہے۔ اس کا گھر گاؤں سے کچھ ہٹ کر ہے۔  
 میں کافی مدت بعد آیا ہوں، کیا تم مجھے اس کے گھر کی نشاندہی  
 کر سکتے ہو؟“

غلام رسول نے انگلی کے اشارے سے.... درختوں  
 کے جھنڈ کی نشان دہی کی۔ ”اس جھنڈ کے پیچھے اس کا گھر ہے۔  
 آس پاس کوئی اور گھر نہیں ہے، یہی اس کی نشانی ہے۔“

شہباز نے اس کو خدا حافظ کہا اور اپنی منزل کی طرف  
 چل دیا۔ تقریباً آدھا کلومیٹر دریا کے ساتھ ساتھ چلنے کے  
 بعد وہ جھنڈ میں آ گیا۔ جھنڈ کے پیچھے دو کنال کا گھر تھا۔ آس  
 پاس دور دور تک کوئی اور گھر نہیں تھا۔ شہباز نے کچھ دیر سوچا  
 اور پھر اجالا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا  
 جیسے انتظار کے لیے مناسب جگہ کی تلاش میں ہو پھر اس کو  
 ایک چھوٹی سی کوٹھڑی نظر آ گئی۔ وہ اس میں جا گھسا۔ یہ بھوسا  
 رکھنے کی کوٹھڑی تھی۔ وہ وہیں ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اس

دوران اس کو اوتکھ سی آ گئی۔ پھر اذان کی آواز کے ساتھ اس  
 کی آنکھ کھل گئی۔ وہ وہیں بیٹھا رہا یہاں تک کہ سپیدہ سحر

نمودار ہو گیا۔ پھر جونہی چمیلی دھوپ کمرے کے اندر آئی، وہ  
 اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے سائڈ والی جیب میں رکھے

ہوئے پستول کو نٹولا اور پھر کوٹھڑی سے نکل کر گھر کے گیٹ کی

طرف بڑھا۔ اس نے گیٹ کو ہلکا سا دھکا دیا، وہ کھلتا چلا گیا۔  
 وہ اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ایک بوڑھی عورت بھینس کا

دودھ دوہ رہی تھی۔ اس نے حیرت سے شہباز کو دیکھا جس  
 نے اپنا منہ چھپا رکھا تھا۔ دوسری جوان عورت چولہا جلا رہی

تھی۔ شہباز نے آواز دے کر بانو کو پکارا، اس کا خیال تھا کہ  
 اس کی بہن اگر نہ ہوئی تو وہ خاموشی سے معذرت کر کے

واپس چلا جائے گا لیکن اس کی آواز سنتے ہی بانو کمرے سے  
 باہر نکلی۔ اس نے آواز سے بھائی کو نہیں پہچانا، وہ تو بس اپنا

نام سن کر باہر آئی تھی۔ شہباز نے جونہی اس کو دیکھا اس کی  
 آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے فوراً پستول نکالا اور کیے

بعد دیگرے تین گولیاں بانو کے جسم میں اتار دیں۔ وہ ہلکی  
 سی دردناک آواز نکالتے ہوئے زمیں یوس ہو گئی۔ کریم داد

فائر کی آواز سن کر بے ساختہ باہر نکلا۔ شہباز نے دو گولیاں  
 اس پر بھی چلا دیں۔ وہ کٹے ہوئے درخت کے مانند زمین پر

گر گیا۔ دونوں عورتیں شور مچانے لگیں۔ ان کا شور دھیرے  
 دھیرے آہ و بکا میں تبدیل ہوتا گیا۔

شہباز نے اطمینان سے پستول واپس جیب میں رکھا  
 اور جس راستے سے آیا تھا، اسی راستے سے باہر نکل گیا۔



## مدفنِ شہر و سخن



✽ ملائکہ حریم..... اوکاڑہ

اپنے ہاتھوں کی لکیں نہ بدل پائے ہم  
نصیب والوں سے بہت ہاتھ ملائے ہم نے

✽ جاوید اختر رانا..... پاک پتن شریف

اس بے وفا کی یاد دلاتا تھا بار بار  
کل آئینے پہ ہاتھ اٹھانا پڑا مجھے  
وہ کر نہیں رہا تھا میری بات کا یقین  
پھر یوں ہوا کہ سر کے دکھانا پڑا مجھے

✽ سعید منظور..... یوحنا آباد، لاہور

گفتگو ہم سے اور خیالوں میں کوئی اور  
حال آپ کا بھی ہے میری نمازوں جیسا



✽ عبدالغفار فردوس..... نوال شہر، ایبٹ آباد

کوئی شکوہ، کوئی گلہ نہ کوئی فریاد ہوگی  
میرے محبوب میرے دل میں صرف تیری یاد ہوگی

✽ رانا بشیر احمد ایاز..... کراچی

میری بات وہ کیسے مانتا میرا درد وہ کیسے جانتا  
وہ تو خود ہوا کے سفر پہ تھا اسے روکنا محال تھا  
وہ ملا تھا برسوں بعد مگر میرے لب پہ کوئی گلہ نہ تھا  
اسے میری چپ نے رلا دیا جسے گفتگو میں کمال تھا

✽ یاد یہ ایمان، ماہا ایمان..... کھاناں

یہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں زرتابی قباؤں میں  
سحر کا نام لے کر رات کی تعلیم دیتے ہیں

✽ وردا جنید، محمد آریز ملک..... کراچی

ہم جانتے ہیں تمہیں ہماری قدر نہیں  
ان سے جا کے پوچھو جن کے مقدر میں ہم نہیں

✽ سیدہ ثانیہ کاظمی..... ڈیرہ اسماعیل خان

پر بت پر بت گونج رہی ہے میرے عشق کی شہنائی  
اڑتے پتھری دور افق سے گیت سنانے آتے ہیں  
من کی آگ میں جلتے ہیں اور انگاروں پہ چلتے ہیں  
دشتِ بلا میں لوگ جو کوئی شہر بسانے آتے ہیں

✽ رعنا رضوی..... یو کے

اب کے برس بہار تھی کھولے ہوئے قبا  
اب ہی کے ہم سے چاک گریبان نہ ہو سکا

✽ زرین آفریدی..... حیدرآباد

مانا کہ انمول ہو کثرتِ نایاب ہو تم  
ہم بھی وہ لوگ ہیں جو ہر دہلیز پر نہیں ملتے

✽ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ..... ضلع خانیوال

پردیس میں یاد آئے گی دھیان میں رکھ  
اپنے شہر کی مٹی بھی سامان میں رکھ

سارے جسم کو لے کر گھوم زمانے میں  
بس ایک دل کی دھڑکن پاکستان میں رکھ

✽ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی

وہ کیا جانیں پیار کے رسیا کتنے پاگل ہوتے ہیں  
دب جلائے آجاتے ہیں پروانوں کی بستی میں



✽ احسان عمر..... میانوالی

اپنے دامن میں کسی روز چھپا کر لے جا  
میں اگر روٹھ گیا ہوں تو منا کر لے جا  
سب یہ کہتے ہیں چرایا ہے ترا دل میں نے  
ہے اگر کوئی نشانی تو بتا کر لے جا

✽ معراج محبوب عباسی..... ہری پور، ہزارہ

ایسے ہے جیسے آنکھ سے بینائی چھن گئی  
ایسے ہے جیسے دل نے کوئی بھید پالیا  
کاغذ کے پھول سر پہ سجائے نکلی حیات  
نکلی بیرون شہر تو بارش نے آیا

✽ وزیر محمد خان..... بٹل ہزارہ

بھگی ہوئی اک شام کی دلہیز پہ بیٹھے  
میں دل کے سلگنے کا سبب سوچ رہا ہوں  
دنیا کی تو عادت ہے بدل لیتی ہیں آنکھیں  
میں تیرے بدلنے کا سبب سوچ رہا ہوں

✽ محمد یونس چودھری..... سلطان پور، لاہور

بسا لینا کسی کو دل میں دل ہی کا کلیجا ہے  
پہاڑوں کو تو بس آتا ہے جل کر طور ہو جانا

✽ محمد حسان گل سیال..... روہڑی ضلع سکھر

پوشی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے  
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انسان جاناں

✽ مدحت..... کراچی

وہ اشک بن کے میری چشم تر میں رہتا ہے  
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

✽ ظفر احمد..... راولپنڈی

جو تو نہیں تو عید بھی کیسے منائیں ہم  
اک بار آجھ کو گلے سے لگائیں ہم  
سننے ہیں زندگی کا نہیں کوئی اعتبار  
پھر اس کے بعد عید تلک مر نہ جائیں ہم

✽ محمد شہباز اکرم نوٹی..... ڈھکی پاک پتن شریف

سوچتا ہوں جو ہو بھی حکم زیارت و نشین  
میں لاؤں گا کہاں سے تیرے معیار کی آنکھیں؟

✽ مرزا گل، رمن گل..... درابن وکلاں

نگاہ قیس سے دیکھو ہمیشہ حسن لیلیٰ کو  
صنم جیسا بھی جس کا ہو بے مثال ہوتا ہے

✽ تنویر لودھی..... آفیسرز کالونی، واہ کینٹ

عشق آیا ہے رفعتِ خیالی لے کر  
حسن آیا ہے شوکتِ جمالی لے کر  
سب اہل کمال لے کر آئے ہیں کمال  
بیدم آیا ہے بے کمالی لے کر

✽ ظفر اقبال ظفر..... کامرہ شرقی

عید لیل و نہار دیکھو تم  
جوانی کی بہار دیکھو تم  
صرف آج کے دن پر ہی ہے کیا موقوف  
ایسی خوشیاں ہزار دیکھو تم

✽ سید عبادت کاظمی..... ڈیرہ اسماعیل خان

سکوت شام خزاں ہے قریب آ جاؤ  
بوا اداس سماں ہے قریب آ جاؤ  
جو دشت عشق میں پھنڑے وہ کبھی نہ ملے  
یہاں دھواں ہی دھواں ہے قریب آ جاؤ

✽ صادق معاویہ سعیدی..... خان پور، رحیم یار خان

تم بھی سوچو میں بھی سوچوں  
کس نے کس کو چھوڑ دیا ہے

✽ اوریس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی

بار ہا ساتھ وہ جس راہ گزر سے گزرے  
جی بھر آیا بھی تنہا جو ادھر سے گزرے

✽ اظہر حسین بچار..... ہزارہی، جتوئی

چھڑ کے پھر ملیں گے یقین کتنا تھا  
تھا تو اک خواب مگر حسین کتنا تھا  
وہ میرے زوال سے پہلے ہی مجھ کو چھوڑ گیا  
حسین تو تھا ہی مگر ذہین کتنا تھا

✽ اشفاق شاہین..... کراچی

نہ یہ غم نیا، نہ ستم نیا کہ تیری جفا کا گلہ کریں  
یہ نظر تھی پہلے بھی مضرب، یہ کسک تو دل میں کب کی ہے

✽ ماہین فاطمہ..... اوکاڑہ

راستے میں کہیں وہ مل جائے تو مقدر میرا  
منزل پہ کہیں میں کھو جاؤں تو قسمت اس کی

✽ داؤد اشفاق..... اوکاڑہ

دیواریں سن رہی ہیں قاصد، ذرا آرام سے کہو  
کیا وہ ہم سے پکھڑ کر سچ میں خوش ہے



✽ نازا امتیاز..... سرگودھا

کوئے جاناں میں سوگ برپا ہے  
کہ اچانک سدھر گیا ہوں میں  
✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال

دیکھنا یادِ سحر میں بُو نہ ہو بارود کی  
دیکھنا جشنِ خوشی میں غم نہ رکھا ہو کہیں

✽ کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی

ہوا کے دوش پہ رکھ کر سنبھالنا سیکھو  
فقط چراغِ جلانا کوئی کمال نہیں

✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی

جنہیں حقیر سمجھ کر بچھا دیا تو نے  
وہی چراغِ جلیں گے تو اجالا ہوگا

✽ سعید عباسی..... بہاولپور

کبھی افِ نبھی آہِ نبھی فریاد کرتے ہیں  
خدا یا وہ ہمیں کیوں نہیں ملتے جنہیں ہم یاد کرتے ہیں

✽ وحید عباسی..... بہاولپور

کاش میں کیوتر ہوتا پرواز کرتا آسمان پر  
لگاتا بازیِ عشق کی اور گرتا تیرے مکان پر

✽ گے گے عباسی..... بہاولپور

دستار اتر بھی جانی ہے چھوٹی سی بات پر  
دستار کو نہ وجہِ فضیلت شمار کر

✽ محمد وقار..... اسلام آباد

خوشی کے رنگ میں ہوں یا صلیب و وار کی صورت  
ہم اہلِ دل کسی بھی غم کو ٹھکرایا نہیں کرتے

✽ شتا عظیم..... ناظم آباد، کراچی

جان کے بازی ہار کے بھی ہم ان کا دل نہ جیت سکے  
مل نہ پائے دل کے بدلے صبح و شامِ محبت کے

✽ نورین..... گجرانوالہ

برکھا رت میں پیچھی مل کر گائیں راگِ ملہار  
اس موسم میں کیسے آؤں ساجنِ تورے دوار

✽ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی

ٹوٹ گیا آنکھوں میں سپنا چھوڑ دیا یاروں نے ساتھ  
راہِ سفر میں سب کے ہی پیمانِ وقا بے کار گئے  
✽ ارشد علی..... فیصل آباد

اشکوں سے کیا آگ بجھے گی، عشق تو نام ہے جلنے کا  
ہم تو جلے ہیں انگاروں پہ آبلے تو پڑ جانے تھے

✽ مدثر رضا..... سیالکوٹ

جب دل میں ہوتہائی بہت اور غم میں ملے گہرائی بہت  
کوئی ساتھ کہاں کب دیتا ہے جب ساتھ چلے رسوائی بہت

✽ شازیہ..... کراچی

نظہر و بھی صحرا کے سفر میں کس نے منزل پائی ہے  
کب تک یونہی تنہا جل کر دھوپ میں جلنا اور ہنسنا

✽ محمد آصف..... لاہور

آج تم یاد کیوں نہیں آئے  
آج تم سے بہت خفا ہوں میں

✽ دانش عمیر..... کراچی

کہتے ہوئے بازار میں ہم نے دیکھے رامِ محبت کے  
گلی گلی میں شور ہوا جب گر گئے دامِ محبت کے

✽ بشریٰ غزل..... راولپنڈی

کیا خوب ہے یہ حسن بھی اور حسن ادا بھی  
قربت ہے رقیبوں سے بھی اور ہم سے وفا بھی

✽ معاویہ مفضل..... ایبٹ آباد

ہمیں دیکھ کر یوں ہی بدگماں نہ ہو جایا کرو  
دلوں کے اندر تو نہیں نا، جھانک سکتے تم

✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی

آسائشِ حیات مل ہی جاتی ہیں سبھی  
لیکن سکونِ قلب مقدر کی بات ہے

✽ عبدالجبار رومی انصاری..... چوہنگ، لاہور  
صرف اک شخص کی خاطر مجھے برباد نہ کر  
روز روتے ہوئے کہتی ہے زندگی مجھ سے

کوین

اگست

2016

جولائی 2016ء

158

سپنس ڈائجسٹ



# سوپیٹر گرل

عسلی اختر

رب کائنات کسی کو سرمایا دے کر... کسی کو عقل و شعور اور کسی کو حسن کی دولت دے کر مختلف مراحل سے گزارتے ہوئے اس کی کارکردگی کو ازماتا ہے... اسے بھی حسن کا مجسمہ بنا کر زمین پر اتارا گیا تھا اور اس کا ساتھ چاہنے والے اسے موم کی بے جان گڑیا سمجھ کر کھیلنے کی کوشش کرتے رہے مگر... وقت نے ثابت کر دیا کہ نہ تو وہ موم تھی کہ جسے ہر کوئی اپنی مرضی کے سانچوں میں ڈھال سکے اور دلوں کی دھڑکن بنانے والے بھی جان گئے کہ وہ بے جان بھی ہرگز نہ تھی۔ کیونکہ اس نے ثابت کر دیا تھا کہ قدرت نے جتنی فیاضی سے حسن سے نوازا تھا اس نے اتنی ہی سخاوت سے اس کا استعمال بھی کیا۔

سنگ مرمر پر چلنے والے قدموں کی لرزشوں کا ولفریب ماجرا



بننے والی فلموں کی شوٹنگ دیکھنے کے لیے مختلف شہروں یا علاقوں سے ادھر آتے تھے یا پھر ایسے ایکسٹرافنکار جو کسی نہ کسی فلم میں اپنے مختصر کرداروں کی وجہ سے بک ہوتے تھے۔ کبھی کبھار ایسے گا بک بھی ادھر آجاتے جو کسی فنکار کو

ٹاپ ہیٹ کیفے گا ہوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہالی وڈ جیسے عالمی شہرت رکھنے والے اسٹوڈیو کے نزدیک ہونے کی وجہ سے اس میں ہمیشہ گا ہوں کا رش رہتا تھا۔ جس میں اکثریت ایسی عورتوں اور مردوں کی ہوتی تھی جو اسٹوڈیو میں

جولائی 2016ء

159

سپینس ڈائجسٹ



اپنے کچھ ساتھیوں سمیت کیفے میں داخل ہوا اور سیدھا چلتا ہوا میجر کے کاؤنٹر پر آ گیا، اس کے دوسرے ساتھی اس کی معیت میں کاؤنٹر کے نزدیک جا کھڑے ہوئے تھے۔  
 ”ابھی ابھی یہاں فائرنگ کی آواز سنی گئی ہے.....“  
 ”جی ہاں..... فائرنگ ہمارے ہی آدمیوں نے کی تھی۔“  
 ”میں اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“ انسپکٹر نے دوبارہ پوچھا۔

”کچھ لڑکے شور و غل کر رہے تھے۔ ان کو بھگانے کے لیے فائرنگ کی گئی تھی۔“ میجر نے دھیرے سے جواب دیا۔  
 ”آپ کو پتا ہے۔ یہ قانون کی خلاف ورزی ہے۔“  
 انسپکٹر نے جیسے اپنی طرف سے یاد دہانی کرائی ہو۔  
 ”ہمیں علم ہے مگر کیا کرتے۔ وہ گاہکوں سے بدتمیزی کر رہے تھے۔“ میجر نے اطمینان سے جواب دیا۔

”ہمیں فائرنگ کرنے والے بندے مطلوب ہیں۔ آپ انہیں ہمارے حوالے کر دیں.....“ انسپکٹر نے حکیمانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔  
 ”آپ ادھر میرے کیمین میں آ جائیں۔ باقی باتیں وہیں کرتے ہیں۔“ میجر نے کاؤنٹر چھوڑا اور انہیں لے کر اپنے آفس نما کیمین میں آ گیا۔

کیفے میں بیٹھے گاہک جو اس کارروائی کو دیکھ رہے تھے، ان میں سے ایک نے آوازہ کسا۔  
 ”رشوت خور.....“

مگر انسپکٹر سن کر بھی نہایت ڈھٹائی سے میجر کے آفس میں چلا گیا۔ اب تقریباً تمام گاہکوں کی نظر میجر کے آفس کے بند دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور وہ اپنے مشروبات اور اسٹیکس سے شغف بھی کر رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد آفس کا دروازہ دوبارہ کھلا اور انسپکٹر مسکراتا ہوا باہر نکلا اور بڑی تیزی سے چلتا ہوا کیفے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی میجر دوبارہ کاؤنٹر پر آ گیا۔ آہستہ آہستہ تمام کینیٹسز بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔  
 ”تم سب نکمے ہو..... کیا ضرورت پڑی تھی تمہیں فائر کرنے کی..... یہ جو اتنے لمبے قد اور پہاڑ سے جسم لیے ہوئے ہو ان سے فائدہ اٹھا لیتے.....“ میجر نے انہیں ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔

”وہ بہت تیز طرار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی اسلحہ تھا میجر.....“ ان میں سے ایک بولا۔  
 ”اور یہ ریکارڈو..... جو اپنے آپ کو بہترین کے باز سمجھتا ہے اور ہاف بازو کی ٹی شرٹس پہن کر اپنے مسل کی اس

پھانسنے کے چکر میں ہوتے تھے اور کسی سرمایہ دار کو اپنی باتوں کے گرداب میں پھانس کر اپنے لیے آسودگی کا سامان پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ میڈیا اور شو بزم رسائل کے نمائندے اپنے اپنے گلے میں انواع و اقسام کے چھوٹے بڑے کیمرے ڈالے ہوئے کیفے میں بیٹھنے کے لیے جبکہ ڈھونڈتے اکثر نظر آتے تھے۔ جو چٹ پٹی کہانی ڈھونڈتے یا ابھرتے ہوئے ستاروں کے نام پر لڑکیوں کی تلاش میں ہوتے۔ پھر تیلے بیرے گاہکوں کے آرڈرز بھگتاتے کے لیے تیزی سے گاہکوں کے ارد گرد منڈلاتے پھر رہے ہوتے جبکہ کینیٹسز خاموشی سے بیٹھے جائزہ لے رہے ہوتے تھے۔

وہ چند سر پھرے اور منچلے لڑکوں کا ایک ٹولا تھا۔ جو بننے اور شرارتیں کرتے ہوئے کیفے میں آ گیا تھا۔ اس وقت کیفے میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے ناگواری سے ان تہمت لگاتے لڑکوں کی طرف دیکھا۔ وہ کیفے میں موجود خواتین سے بھی چیخڑ چھاڑ کرنے لگے تھے۔ ان میں سے ایک نے قریبی ٹیبل پر پڑے سافٹ ڈرنک کے گلاس کو اٹھایا اور اپنی آنکھوں کے سامنے لاکر فلمی انداز میں گھما کر پینا شروع کر دیا تو دوسرے نے ایک خوب صورت نوجوان لڑکی کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور ہاتھوں میں لے کر ناپچنے لگا۔ ان کے ایسا کرنے سے گاہکوں میں خوف و ہراس پیدا ہو گیا۔ قریب تھا کہ ان کی شرارتوں میں تیزی آتی کہ کیفے کے کینیٹسز فوراً اندرونی دروازے سے نکلے، ان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پستلو کا رخ ان کی طرف تھا۔ وہ آتے ہی لاکارے۔

”خبردار بھاگنے کی کوشش نہ کرنا.....“  
 ان کی دھاڑ سن کر لڑکے بوکھلا گئے۔ وہ تیزی سے بھاگنے لگے، لوگ ایک دوسرے پر گرنے لگے اور زیادہ بوکھلا ہٹ اس وقت ہوئی جب ان کینیٹسز نے پستلو کا رخ اوپر کی جانب کر کے فائر کرنا شروع کیے۔ تڑتڑ چلتی گولیوں نے ماحول میں خوف سا بھردیا تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگتے ہوئے کیفے کے بیرونی دروازے تک آئے۔ یہ کیفے میں ہونے والا کوئی نیا واقعہ نہ تھا۔ گرد و نواح میں قائم دوسرے کیفے میں بھی ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے تھے۔ بھی ان لوگوں نے اپنی حفاظت اور بد معاشوں سے نمٹنے کے لیے ایسے پالتو غنڈوں کو باقاعدہ کیفے میں ملازم رکھا ہوا تھا۔ کچھ دیر کی بد مزگی کے بعد دوبارہ سے ماحول بہتر ہو گیا تھا کہ اتنے میں پولیس انسپکٹر



طرح کرنا نہیں کرتا رہتا ہے جیسے ابھی رنگ سے فارغ ہو کر نکلا ہے۔ ایک گھونسا مارتا تو ان کو دن میں تارے نظر آنے لگتے۔ یہ بھی بھگی بلی کی طرح نہیں دیکھتا رہا۔ کیوں نہ میں پولیس کو رشوت دینے والے میسے تمہاری تتخو اہوں سے کاٹ لوں۔“ چڑچڑے شیجر نے دھمکی دی۔

”تم ہماری تو بین کر رہے ہو شیجر..... یہ اچھی بات نہیں..... یہ فائرنگ کا سلسلہ تو یہاں کا معمول ہے۔ تم یوں کرو کسی مضافاتی علاقے کے کیفے میں چلے جاؤ جہاں بہت کم ایسی وارداتیں ہوتی ہیں۔“ ان میں سے ایک نے جواب دیا تو وہ تمام قہقہہ مار کر ہنس دیے۔ ان کے ساتھ ہی گا بکوں کے چہروں سے بھی تناؤ کی کیفیت ختم ہو گئی۔ بیرے ایک بار پھر معمول کے مطابق آرڈرز بھگتاتے لگے اور نئی فلموں کے لیے سرمایہ داروں اور ہدایت کاروں کو پھانسنے والے مصنفوں کے سین سنانے کے انداز نے ماحول کو اس طرح گرم دیا تھا جیسے شہد کی بہت سی مکھیاں اپنے چھتوں کے قریب آ کر بجنہناتی ہیں۔ ابھی صبح کے گیارہ ہی تو بچے تھے اور ناپ ہیٹ کیفے میں لوگوں کو بیٹھنے کے لیے جگہ نہیں مل رہی تھی۔ نشے میں دھت ایک ادھیڑ عمر کا مرد اچانک ایک میز سے کھڑا ہوا۔ اس نے قریب بیٹھے ہوئے ایک نوجوان کا گریبان پکڑ کر اسے اٹھایا۔ نوجوان نے بوکھلا کر اپنا گریبان چھڑایا تو بوڑھے نے اس کے چہرے پر ایک گھونسا مار دیا اور اونچی آواز میں مغلطات بکنا شروع کر دیں۔

کچھ دیر تک نوجوان محض اپنا دفاع کرتا رہا مگر جب اس نے بوڑھے کی جارحیت بڑھتی دیکھی تو اس نے کیفے کی کرسی اٹھائی اور اس پر حملہ آور ہوا۔ قریب بیٹھے لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور معاملہ رفع دفع کر دیا۔ نوجوان خفت زدہ ہو کر کیفے سے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

مرسیڈیز بارخا کیفے کے قریب ٹائپنگ اسکول کی طالبہ تھی۔ وہ اکثر کبھی بور ہوتی تو اپنی کلاس کا ٹائم کر کے کیفے میں کسی مشروب سے جی بہلانے آ جاتی تھی۔ آج صبح سے ہی اس کی طبیعت میں عجیب سی اداسی اور بے چینی در آئی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی کیفے کے مین دروازے پر آئی اور پاؤں کی ہلکی سی ٹھوک سے دروازہ کھولا۔ اس وقت کیفے میں مثل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اس نے اندر داخل ہو کر چند ٹائپے کھڑے ہو کر ادھر ادھر نظر گھمائی تو بہت سے لوگوں کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ مرسیڈیز بارخا اپنی عمر کے

اوائل شباب کے زمانے میں تھی۔ وہ بے حد خوب صورت تھی اور اس کا حسن دیو مالائی داستانوں کی دیوی کو بھی شرماتا تھا۔ سنہری لمبی زلفیں، بلوریں آنکھیں اور قیامت خیز سراپا پر اسکن ٹائٹ سویٹر نے اس کے سیمیں بدن کے ابھرتے ہوئے نقوش کو اور بھی نمایاں کر ڈالا تھا اور اسکن ٹائٹ سویٹر تو اس کے بدن پر ایسا چچتا تھا جیسے کسی انگلی میں گلیبند..... وہ لوگوں کے رش میں سے جگہ بناتی ہوئی گزرنے لگی تو ایک طرف سے آواز ابھری۔ ”سویٹر گرل.....!“

اس آواز کو سن کر مرسیڈیز نے اپنے شریقی سرخ ہونٹوں کا ایک دائرہ سیا بنایا۔ اس کے ہونٹوں کی لالی انگلیں گلابوں کی یاد دلا رہی تھی۔ وہ بچتی بچاتی کسی سیٹ کی سلاش میں آگے بڑھی تو پھر وہی آواز سنائی دی..... سویٹر گرل!

پھر نہ جانے کیا ہوا۔ وہاں موجود سارے گا بکوں نے ایک کورس کی شکل میں سویٹر گرل..... سویٹر گرل..... گانا شروع کر دیا تو مرسیڈیز خاصی خوش دلی۔ بے مسکرائی اور ایک سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اسے یہ جگہ ایک منچلے نوجوان نے خود اٹھ کر دی تھی۔ ایک بیرا آرڈر لینے کے لیے فوراً اس کے پاس آیا۔

مرسیڈیز بارخا کو اپنی خوب صورتی کا احساس تھا لیکن ابھی اسے اپنے اس حسن سے فائدہ اٹھانے کا گرنہیں آیا تھا۔ اس نے تو آج ہی یہ اسکن ٹائٹ سویٹر پہنا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ یہ اس کے حسن کو اور بھی چار چاند لگا دے گا۔ اس کے قیامت خیز جسمانی نقوش کو اس طرح نمایاں کر ڈالے گا کہ ہر کوئی اس کا دلدادہ ہو کر رہ جائے گا۔

”سافٹ ڈرنک.....“ اس نے آہستگی سے آرڈر دیا۔ کچھ ہی دیر میں سافٹ ڈرنک اس کی میز پر تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ سے ایک بوڑھا ایک نفرت کی نگاہ اس پر ڈالتا ہوا اٹھ گیا تھا۔

”میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں.....؟“ اس کے قریب سے ایک آواز آئی۔

”ہیس پلیز.....!“ مرسیڈیز نے دھیمے انداز میں کہا۔

”میں ٹیلنٹ ایجنٹ زیپو مارکس ہوں..... میری ایجنسی نئے ٹیلنٹ کو فلموں میں متعارف کرواتی ہے۔ شاید آپ کو علم نہیں میں نے اپنی ایجنسی کے ذریعے کئی ایسے لوگوں کو متعارف کرایا ہے جو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کی شخصیت میں ایک بہترین فنکار چھپا ہوا ہے اور آج وہ فلموں کے بہترین اداکار مانے جاتے ہیں۔ آپ کا جسم، آپ کی چال اور لافانی حسن..... یوں لگتا ہے کہ آپ کسی فلم کی بنی



اس کا والد گریس بارخا ایک کان کن تھا۔ صرف زندگی کی گاڑی کو وہ دھکا ہی لگا سکتا تھا اور زندگی تھی جو مصائب و مشکلات کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی۔ پھر اس کے والد نے کان کنی کا کام چھوڑ دیا اور وہ ویلیس شہر چھوڑ کر سان فرانسسکو میں آ گئے۔ یہاں آ کر تھوڑی سی زندگی میں آسانی پیدا ہوئی اس کی والدہ گلیڈیز بھی اسی کی طرح خوب صورت تھی اور جوان بھی.....

جم ڈیہور بھی اس کے والد کے ساتھ ہی کام کرتا تھا اور وہ اکثر ان کے گھر آتا جاتا تھا۔ وہ بڑا ہی شوخ اور دل چھینک قسم کا مرد تھا۔ مرسیڈیز بارخا اس وقت اسکول میں پڑھتی تھی۔ جم جب بھی ان کے گھر آتا تو مرسیڈیز اس کو دیکھتے ہی چھپ جایا کرتی تھی۔ اسے جم کا چھچھور پن اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس نے کئی بار اس بات کی شکایت اپنی والدہ سے بھی کی اور ایک روز تو بالکل رو دینے کے انداز میں اس نے اپنی والدہ سے کہا۔ ”مما..... آخر جم انکل کو آپ اپنے گھر آنے سے منع کیوں نہیں کرتیں؟ مجھے وہ ایک دم برے لگتے ہیں۔“

”لیکن بے بی..... وہ تمہارے پاپا کے دوست ہیں۔“ اس کی والدہ نے جواب دیا۔

”تو پھر آپ پاپا سے کہیں۔ وہ اسے گھر آنے سے روکیں..... وہ گھر آتے ہی بہانے بہانے سے مجھے اپنی گود میں لینے کے چکر میں ہوتے ہیں اور پیار لینے کا تو کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ میں اب بچی تو ہوں نہیں۔ ہائی کلاس کے درجے میں پڑھتی ہوں۔“ مرسیڈیز نے والدہ کو سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”وہ سب ٹھیک ہے مگر اس کا اختیار تمہارے پاپا کے پاس ہے۔“ والدہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے پاپا سے میں خود بات کروں گی۔“ مرسیڈیز نے کہا۔

”تم ان سے کچھ نہیں کہو گی۔ میں خود بات کر لوں گی۔“ اس کی والدہ نے اسے مطمئن تو کر دیا مگر اندر ہی اندر وہ خوفزدہ ہو چکی تھی۔

جم ڈیہور بھی سان فرانسسکو میں ان کا واحد آسرا تھا۔ وہ نہ صرف گریس بارخا کا دوست تھا بلکہ مشکل وقت میں وہ روپے پیسوں سے بھی ان کی مدد کر دیا کرتا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس بہانے سے اسے ان کے ہاں آنے جانے کا بہانہ مل گیا تھا۔ اس کی نظروں کا شہدائین گلیڈیز کو بھی دکھائی دیتا تھا مگر وہ مجبور تھی۔

بنائی ہیروئن ہیں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو کسی بھی اچھی فلم میں ہیروئن کا کردار دلا سکتا ہوں۔“

مرسیڈیز نے اپنے سامنے رکھے سافٹ ڈرنک کے گھونٹ لیتے ہوئے کن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”تم ایک بہترین ایجنٹ ہو..... اپنی کاروباری گفتگو میں بھی خاصے ماہر ہو مگر یقیناً تمہیں یہ سن کر دکھ ہوگا کہ مجھے فلموں میں کام کرنے کا قطعاً کوئی شوق نہیں.....“

”اوہ.....“ مارکس کو جیسے کرنٹ لگا ہوا..... ”ادھر کنی ایسے پروڈیوسرز ہر وقت انہی چکروں میں یہاں بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ کی خوب صورتی کا ہی اتنا رعب ہے کہ آپ کو اپنی جیب سے بھی کچھ خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ ذرا ادھر اپنے بائیں دیکھیں۔ وہ مشہور و معروف ہدایت کار مروین لیروڈے بیٹھے ہیں اور آپ کے دائیں نارما جین بیٹھی ہے۔ اسے ہماری کمپنی نے ہی متعارف کروایا تھا۔ آپ سوچ لیں اس وقت جلدی بھی نہیں ہے۔“ وہ اپنی جہب زبانی سے اسے ہر حال میں قائل کرنے پر تلا ہوا تھا۔

”آپ کا شکریہ..... میں نے بتایا تا کہ مجھے فلموں میں کام کرنے کا کوئی شوق نہیں۔“

”آپ کی مرضی..... جاتے جاتے ایک بات کہوں، لگتا ہے بنا۔ تو الے نے آپ کو فارغ وقت میں بتایا ہے۔ یہ میرا وزیٹنگ کارڈ ہے، کبھی بھی یاد کر لیں۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اوہ، یاد آیا..... میں نے آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔ کیا نام ہے آپ کا؟“ اس نے اختتامی جملے بولے۔

”مجھے مرسیڈیز بارخا کہتے ہیں.....“ اس نے سافٹ ڈرنک کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے جواب دیا۔

”مرسیڈیز بارخا عرف سویٹر گرل!“ زیو مارکس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے پکڑاتے ہوئے جواب دیا۔ ”امید ہے، ہم بہت جلد پھر ملیں گے۔“

اس کے جاتے ہی مرسیڈیز جلدی سے اٹھی اور کیفے سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

وہ رات اس نے یقیناً بڑی بے چینی سے گزاری تھی۔ کیفے میں گزارے وقت کی کچھ بھی لیکن خوشگوار یادیں اس کے جسم میں سوئیاں سی چھو رہی تھیں۔ کیا اسے زیو مارکس کی پیشکش کو قبول کر لینا چاہیے یا اسے اپنی ٹائپنگ کی ٹریننگ مکمل کر کے کسی آفس میں سیکریٹری شپ کا کام کرنے پر اکتفا کرنا ہوگا؟ اس کا ماضی بھی اس کے سامنے تھا۔ وہ امریکی ریاست ایڈاہو کے شہر ویلیس میں پیدا ہوئی تھی۔



جم ڈیپور تھی کسی ماہر شکاری کی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنے شکار کو دو بونے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا جس کا احساس گلیڈ یز کو بھی تھا اور پھر اس رات تو حد ہی ہو گئی۔ گریس کام پر تھا جب اچانک اس کے گھر کا دروازہ بجنے لگا۔ گلیڈ یز نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے جم کھڑا تھا۔  
 ”گریس تو اس وقت کام پر ہے۔“ اس نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

”میں جانتا ہوں۔ میں نے آج کام سے چھٹی کی تھی۔ گھر سے نکلا تو سوچا ادھر سے ہو آؤں۔ اندر آنے کو نہیں کہو گی؟“ اس نے بڑے دلار سے پوچھا۔  
 ”میں نے کہا نا گریس کام پر ہے۔“ گلیڈ یز نے لہجے کو ذرا سادہ رشت کرتے ہوئے کہا۔

”کس قدر احسان فراموش ہو۔ یقین کرو تمہارے جسم کے خدو خال نے میری راتوں کی نیند اڑا رکھی ہے۔ ذرا مجھے اندر تو آنے دو۔“ گلیڈ یز کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب مرسیڈ یز اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ذرا سا کھٹکا ہوا تو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مرسیڈ یز کی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔ تب اس نے جرات کر کے دروازہ بند کر دیا۔

”کتیا! میں صبح آؤں گا۔ اپنے بے غیرت شوہر سے کہنا کہ وہ میرے سارے پیسے تیار رکھے۔ اسی کے کہنے پر آیا تھا۔ نمٹ لوں گا اس سے بھی.....“ یہ کہتا ہوا جم ڈیپور تھی واپس پلٹ گیا۔

اگلی صبح جب گریس کام سے واپس آیا تو رات والے واقعے کی وجہ سے دونوں میاں بیوی میں بے حد جھگڑا ہوا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو..... میں بکاؤ مال ہوں.....“ اس نے چیختے ہوئے کہا۔

”تم قانونی طور پر میری بیوی ہو اور میں جیسے چاہوں تمہیں استعمال کرنے کا حق رکھتا ہوں۔“ گریس غصے سے دہاڑا۔  
 ”میں جیتی جاگتی عورت ہوں۔ شطرنج کا ممبرہ نہیں۔ میں تمہارے راستوں پر نہیں چلوں گی۔“ وہ ایک بار پھر چیختی۔

”تو پھر میرے گھر سے نکل جاؤ۔“ اس نے زور سے کہا۔  
 ”کونسا گھر..... جس میں بھی مجھے سکھ نہیں مل سکا..... اگر مجھے یہی کچھ کرنا ہے تو اکیلی رہ کر بھی بہ آسانی کر سکتی ہوں۔“ گلیڈ یز نے جواب دیا۔

میاں بیوی کے رشتے میں بڑنے والی یہ دراڑ دونوں کے تعلقات میں ایک خلیج بنتی چلی گئی۔ گریس بات بات پر اور بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس سے جھگڑنے لگا۔ تعلقات

یہاں تک بڑے کہ پھر دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ گلیڈ یز کے لیے اب یہاں رہنا مشکل ہو چکا تھا۔ گریس اب گھر آنے سے بھی کترانے لگا تھا۔ اسے لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ گریس اب روز ہی کسی پب یا کسی پارک میں نشہ کر کے پڑا رہتا ہے۔ گلیڈ یز کی مشکلات میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ پھر ایک روز پتا چلا کہ کسی پارک میں گریس کا کسی کالے کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس کالے نے گریس کو ہسپتال کے فائر سے قتل کر ڈالا اور خود بھاگ گیا۔ گلیڈ یز کو خبر ہوئی تو اسے بے انتہا دکھ ہوا مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ افسوس کے لیے آنے والے جم نے اس روز ایک بار پھر اسے پیشکش کی۔  
 ”دیکھو گلیڈ یز..... جس کا تمہیں خوف تھا، وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ زندگی بہت بڑا بوجھ ہے۔ میری مانو تو اب میری زندگی میں شامل ہو جاؤ..... ساری زندگی خوش رکھوں گا۔“

”میں اب بھی تم سے اسی قدر نفرت کرتی ہوں جیسے پہلے کرتی تھی۔ اب یہاں کارخندہ کرناور نہ پولیس اسٹیشن میں بند کروادوں گی۔“ گلیڈ یز نے کہا۔ اس سے اگلے روز وہ اپنی انیس سالہ بیٹی مرسیڈ یز کو لے کر اس اجلاس منتقل ہو گئی۔

گلیڈ یز نے یہاں آ کر چھوٹی موٹی ملازمت کر لی اور مرسیڈ یز ہالی وڈ کے علاقے میں قائم ایک اسکول میں داخل ہو گئی۔ یہ واحد کینے تھا جو اسکول سے نزدیک پڑتا تھا۔ یہاں پر اس کی طرح دیگر طالب علم اور طالبات سافٹ ڈرنک یا ہلکے پھلکے لٹچ کے لیے جاتے تھے۔

مرسیڈ یز بستر پر لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی کہ زندگی کے مشکل لمحوں کو گزارنے کے لیے اسے زیپو مارکس کی پیشکش کو قبول کر لینا چاہیے یا نہیں؟..... اس نے اس کا وزیننگ کارڈ ایک بار پھر دیکھا تو اس کی والدہ کی آواز نے اسے ہڑبڑا دیا۔

”مرسیڈ یز جاگ رہی ہو ابھی.....؟“  
 ”ممانیند نہیں آرہی۔“ مرسیڈ یز نے جوابا کہا۔  
 ”سو جاؤ ڈارلنگ رات بہت ہو چکی ہے۔“ اس کی والدہ نے دوبارہ کہا۔

”کوشش تو کر رہی ہوں۔“ مرسیڈ یز بولی اور کروٹ لے کر پڑی رہی۔

☆☆☆

لاس اجلاس جیسے بڑے شہر میں آ کر انہیں مالی طور پر تھوڑی سی آسودگی ملی تو مرسیڈ یز کو بھی بننے سنورنے کا پتا چل گیا اور پھر کچھ اس کے ارد گرد والے ساتھیوں نے اس







کھپاؤنڈ میں کارر کی۔ مرسیڈیز کو گن پوائنٹ پر باہر نکال کر بلڈنگ میں پہنچا دیا گیا اور پھر ایک کمرے کے خانے میں پہنچا کرواں پڑی کرسی کے ساتھ اسے باندھ دیا گیا۔

☆☆☆

نیم تاریک اس کمرے کی دیواروں پر مختلف قسم کے اذیتیں دینے والے ہتھیار لٹکے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ یہ کسی سفاک تنظیم کا عقوبت خانہ ہے۔ مرسیڈیز اسے دیکھ کر اور بھی خوفزدہ ہوئی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کسی دہشت گرد تنظیم کے ہاتھوں اغوا ہو چکی ہے اور اس کے ساتھ اب کیا سلوک ہونے والا تھا، یہ سوچ کر ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کس لیے اغوا کیا گیا ہے۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں پڑی تھی کہ دو آدمی ایک نوجوان کو سہارا دیے ہوئے وہاں لے آئے۔ نوجوان پر اس قدر تشدد کیا گیا تھا کہ اس سے اپنے پاؤں پر چلنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی نظروں میں ابھی تک دہشت موجود تھی۔

ان دونوں نے مرسیڈیز کے سامنے لا کر اس نوجوان کو پھر باندھ دیا۔ نوجوان کی آنکھیں کمزوری کی وجہ سے بند تھیں اور گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ مرسیڈیز نے دیکھا کبھی یہ نوجوان انتہائی خوب صورت اور مضبوط ہوگا مگر اب تشدد کی وجہ سے انتہائی لاغر اور کمزور ہو چکا تھا۔ ان میں سے ایک نے دیوار پر لگی ہوئی ڈرل مشین کو اتارا۔ اس کا پلگ بجلی کے بورڈ سے لگا کر اسے چیک کیا۔ ”نہیں..... تم یہ نہیں کرو گے۔“ مرسیڈیز اونچی آواز میں چیخی تو جس نے ڈرل مشین پکڑی ہوئی تھی اس نے اپنے سامنے کود کھستے ہوئے کہا۔

”اس کی بولتی بند کرو.....“

دوسرے نے آگے بڑھ کر اپنے ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر کی جیب سے شیب نکالا اور مرسیڈیز کے منہ پر لگا دیا۔ مرسیڈیز صرف تلملا کر رہ گئی۔ وہ ڈرل مشین لے کر اس نوجوان کے پاس گیا اور نوجوان کے ماتھے پر سوراخ کرنے لگا۔ نوجوان شدت تکلیف سے بہت ترپا مگر مضبوطی کے ساتھ بندھے اس کے ہاتھ پاؤں کے سبب وہ صرف ترپ کر ہی رہ گیا۔ اس کی چیخوں سے کمر گونج اٹھا۔ مرسیڈیز نے اپنی آنکھیں خوف سے بند کر لی تھیں۔ تشدد کرنے والوں میں سے ایک نے اس کی نبض ٹولی اور اونچی آواز میں بولا۔

”بڑا ڈھیٹ ہے..... ابھی زندہ ہے.....“

”جلدی کرو..... باس کے آنے تک کام نہ مٹالو۔“

اس کی زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی کیفے میں مفت سافٹ ڈرنک پیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھی اور فیجر کے کاؤنٹر پر جا کر اسے بل کی ادائیگی کرنا چاہی تو فیجر بولا۔

”خاتون، ہم معذرت خواہ ہیں۔ جونی کے غصے کا ہم ہرگز سامنا نہیں کر پائیں گے۔ وہ نہ صرف غصے کا تیز ہے بلکہ بہت سفاک انسان بھی ہے۔ اس علاقے کا ہر آدمی اس کی دہشت سے گھبراتا ہے۔ وہ آپ کو پسند کرتا ہے۔ جب اسے پتا چل جائے گا کہ ہم نے اس کی پسند سے بل لیا ہے تو یہ دن مصیبت کا دن ہوگا۔ آپ جا سکتی ہیں۔“

”مگر میں کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتی۔“ مرسیڈیز نے جواب دیا۔

”ہم بھی کسی قسم کی پریشانی مول نہیں لینا چاہتے۔“ فیجر نے دوبارہ کہا۔

مرسیڈیز کیفے سے باہر نکل آئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب اسے مزید احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ اسے اب کیفے میں آنا بند کرنا ہوگا چنانچہ اس نے کیفے میں جانا ہی بند کر دیا۔ یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب وہ اپنے اسکول سے نکل کر گھر جانے والے راستے پر تھوڑی دور گئی تھی کہ ایک کالے رنگ کی کار مخالف سمت سے آئی ہوئی بڑی تیزی کے ساتھ یوٹرن تک گئی اور پھر اسی تیزی کے ساتھ اس ٹریک پر آگئی جس ٹریک کے فٹ پاتھ پر مرسیڈیز چل رہی تھی۔ مرسیڈیز نے ایک انجانے خوف کے تحت پیچھے مڑ کر دیکھا تو کار کے پیسے بڑے شور کے ساتھ چپے۔ آنا فنا اس میں سے دو لمبے ترنگے آدمی نکلے جنہوں نے اپنے چہروں کو نقاب سے ڈھانپا ہوا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ انہوں نے مرسیڈیز کو گاڑی میں ڈالا اور آگے بڑھ گئے مرسیڈیز کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کے ہاتھ میں ٹائی گن تھی، جس کی نال اس کے پہلو سے لگی ہوئی تھی۔

”شور مچانے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھوگی۔“ وہ غرایا۔

مرسیڈیز کی کھلکی بندھ گئی تھی۔ ”مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو.....؟“

”تمہیں جلد ہی پتا چل جائے گا۔ اگر خاموش رہو گی تو تمہارے ساتھ ساتھ ہمارا بھی بھلا ہوگا۔“ وہی دوبارہ بولا۔ کار مختلف موڑ کاٹی ہوئی ایک ویرانے میں جا پہنچی تھی۔ اس ویرانے میں ایک پرانی سی بلڈنگ تھی جس کے



”کلا رگ..... دیکھو میری گڑیا کو بحفاظت جہاں یہ چاہے، چھوڑ آؤ..... خیال رہے اسے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں ہونا چاہیے..... اسے کھول دو..... اور ساتھ لے جاؤ۔“

کلا رگ نے آگے بڑھ کر مرسیڈیز کے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔ کرسی کے ساتھ کسے ہوئے ہاتھوں کی کلائیوں پر نشان سے پڑ گئے تھے۔ مرسیڈیز نے دونوں ہاتھوں کی کلائیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رگڑا اور پھر خاموشی کے ساتھ کلا رگ کے پیچھے پیچھے چل دی۔ دونوں کمرے سے نکل کر دوبارہ کیاؤنڈ میں آئے جہاں وہی سیاہ رنگ کی کار کھڑی تھی۔ کلا رگ نے اس کا دروازہ کھولا اور مرسیڈیز خاموشی کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نوجوان کے وحشیانہ قتل کا منظر جم کر رہ گیا تھا۔ جونی نے اسے یہ سب کیوں دکھایا..... کیا وہ اپنا خوف اس کے سینے میں بٹھانا چاہتا تھا یا اس کا مقصد کچھ اور تھا؟ وہ کتنے ہی دن اسی خوف کی وجہ سے اسکول نہ جا سکی اور اپنی والدہ کو یہی بتاتی رہی کہ اس کی طبیعت خراب ہے۔ وہ ہر وقت کمرے میں اپنے بیڈ پر پڑی خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ اس کا حسن اس کے لیے ایک عذاب بن کر رہ گیا تھا۔ جونی کا بیولا ہر وقت اس کے آس پاس گھومتا رہتا تھا۔ اگر جونی بد معاش نہ ہوتا تو وہ اس کے لیے ایک آئیڈیل تھا۔ مضبوط اعضا اور خوب صورت نقش و نگار کا مالک مگر اب اسے ہر حال میں جونی سے بچنا ہوگا۔ وہ اس سے چھٹکارے کے طریقے سوچنے لگی، مگر ہر بار وہ کسی مکڑے کے جال میں پھنسی کھسی کی طرح اس کے درود یوار سے سرکلر کر رہ جاتی۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے یہ یقین بھی ہو چلا تھا کہ وہ کسی صورت اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پائے گی۔ وہ اپنی والدہ کو یہ سب بتا کر اس کی مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی مصیبتوں سے خود ہی چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔

☆☆☆

کتنے دنوں کے بعد وہ آج اسکول آئی تھی۔ اس کے ذہن سے اپنے سامنے ہونے والے قتل کی دہشت ختم تو نہیں ہوئی تھی مگر کچھ دھندلا ہو گیا تھا۔ اس کے اسکول کا ہر ساتھی اس سے اسکول سے غیر حاضری کا سبب پوچھ رہا تھا اور وہ جواب دے کر تھک چکی تھی۔ اس نئی افتاد سے بچنے کے لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر ٹاپ ہیٹ کیفے میں آگئی۔ کیفے میں اسی طرح رش تھا۔ وہ جگہ ڈھونڈتی ہوئی ایک کرسی پر آ بیٹھی تو اس ٹیبل کا بیر فوراً اس کے پاس آ گیا۔

مرسیڈیز اس ساری کارروائی کو دیکھتے ہوئے نیم بے ہوش ہو چکی تھی پھر بھی اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اتنی دیر میں کمرے کا دروازہ ایک بار پھر کھلا اور وہ اندر داخل ہوا۔ مرسیڈیز کی آنکھیں خوف سے اور زیادہ کھل گئیں۔ یہ وہی تھا..... کیفے میں آنے والا بد معاش..... جسے سب لوگ انتہائی سفاک اور ظالم کہتے تھے۔ جونی اسٹو پنٹو..... اسے دیکھ کر وہ دونوں نوجوان کے جھولتے جسم کو چھوڑ کر ایک طرف ہو گئے تھے۔ جونی نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پائل سے دو تین گولیاں داغیں اور نوجوان کے جسم میں رہی سہی زندگی کا بھی خاتمہ کر ڈالا۔ اس کے بعد اس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا۔

”اس کی لاش لے جاؤ اور دور دیرانے میں جانوروں کے سامنے ڈال دو۔“

اس حکم کے مطابق وہ جلدی سے لاش کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ تب وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مرسیڈیز کے قریب آیا۔ مرسیڈیز کی خوفزدہ آنکھیں نیم بے ہوشی کی حالت میں تھیں۔ اس نے مرسیڈیز کے گال تھپتھپائے تو اس نے آنکھیں ایک بار پھر کھول دیں۔ جونی نے اس کے منہ سے لگا ٹیپ اتارا۔

”گھبو..... کھیل پسند آیا.....“ جونی نے مسکراتے ہوئے مرسیڈیز سے پوچھا۔

”تم بہت ہی سفاک ہو۔“ مرسیڈیز بڑبڑائی۔

”صرف اپنے دشمنوں کے لیے..... اور جن کے ساتھ جونی پیار کرتا ہے انہیں پھولوں کا زخم بھی نہیں لگنے دیتا۔ اپنی جان سے زیادہ حفاظت کرتا ہے ان کی..... یہ کھیل تمہیں صرف اس لیے دکھایا گیا ہے کہ جونی کے پیار سے انکار تمہیں کسی وقت بھی اس سے زیادہ اذیت کا شکار کر سکتا ہے۔ میں بہت ٹھنڈا کھلاڑی ہوں..... مگر کیا کروں بعض اوقات مجبوری کے تحت مجھے ایسا کرنا پڑتا ہے۔ اپنے جیسے کا شکار میں خود ہی کرنا پسند کرتا ہوں۔ کسی دوسرے کو نہ تو مجھے دار بنانا ہوں اور نہ ہی اسے اپنے شکار کے نزدیک بھٹکنے کی اجازت دیتا ہوں..... کیا سمجھیں.....“ جونی نے مطمئن لہجے میں کہا۔

”تم بے خوف ہو کر جدھر مرضی گھومو پھر..... جونی کی نگاہیں تمہارے ارد گرد ہی رہیں گی اور تمہیں کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا پھر اس نے ایک ہاتھ کی دو انگلیاں منہ میں ڈال کر سیٹی بجائی تو چند لمحوں بعد



”آرڈر پلیز.....“ اس نے مینیو کارڈ اس کے آگے رکھ دیا۔

مریڈیز نے نظریں گھما کر اس کی طرف دیکھا تو وہ فوراً بولا۔

”آخاہ..... سوئیز گرل..... بڑے دنوں کے بعد آئی ہو، تمہارے چہرے کی پیلاہٹ بتا رہی ہے کہ تم بیمار رہی ہو۔ اب طبیعت کیسی ہے۔ ٹھہرو..... میں تمہارا پسندیدہ سافٹ ڈرنک لاتا ہوں اور فیجر کو بھی تمہاری آمد کے بارے میں بتاتا ہوں۔ جونہی..... یہاں کئی مرتبہ آیا تھا تمہارا پوچھنے کے لیے۔ آدمی تو اچھا ہے مگر نہ جانے کیوں بد معاش بن گیا..... اس کا دل بہت خوب صورت ہے۔ وہ تمہیں بہت چاہتا ہے.....!“ یہ لوگ اس قدر باتوں کیوں ہوتے ہیں۔ مریڈیز سوچنے لگی۔ وہ اسے خاموش پا کر فیجر کے کاؤنٹر تک چلا گیا۔ پھر دونوں کے درمیان کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ مریڈیز آنکھیں بند کیے اپنی نقاہت بھری سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی جب بیرا اس کے آگے سافٹ ڈرنک رکھ کر چلا گیا۔

”کچھ بیمار لگ رہی ہو.....“ اس کے سامنے بیٹھے ایک بڑی عمر کے شخص نے پوچھا تو مریڈیز نے اسے پہلی بار غور سے دیکھا اور تقریباً مسکرا کر بولی۔

”تھی..... اب ٹھیک ہوں.....“ آواز میں ابھی تک کمزوری نمایاں تھی۔

”کیا یہاں کسی فلم میں کام کرتی ہو؟“ اس نے اگلا سوال کیا۔

”نہیں..... میں یہاں قریبی اسکول میں ٹیچنگ کلاس میں پڑھتی ہوں۔“

”اوہ..... تو تمہیں اس کینے میں ہرگز نہیں آنا چاہیے۔ یہاں تو تمہیں ہر طرف گدھ نظر آئیں گے۔ جو ادھر ادھر متوحش آنکھوں سے اپنے اپنے شکار کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ تمہارے جیسی خوب صورت اور معصوم لڑکی کو یہاں نہیں آنا چاہیے۔“ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”وہ اسکول یہاں سے نزدیک ہے اور پھر یہاں تو ہر کینے ایک ہی جیسا ہے۔ کوئی کہاں جائے، ہمارے اسکول کی اکثر طالبات اور طالب علم ادھر ہی آتے ہیں۔ اسکول میں تک شاپ بہت مہنگی ہے، اس سے بھی زیادہ.....“ مریڈیز نے آہستہ آہستہ سے بتایا۔

”اوہ..... ہوں..... تم ٹھیک کہتی ہو۔ بچوں کو والدین جیب خرچ بھی کتنا دیتے ہوں گے۔“ بات آگے بڑھی۔

مریڈیز کو وہ ادھیڑ عمر شخص بہت ہمدرد سا لگا۔ اگرچہ وہ عمر میں اس سے کافی بڑا تھا مگر اس کے جسمانی اعضا کی مضبوطی نے اس کی عمر کو چھپا رکھا تھا، سفید مونچھوں اور سفید براق بالوں والا شخص..... اس کی ناک پر رکھی خوب صورت سنہری کمائی والی عینک اور کڑکڑاتا ہوا نفیس پہناوا اس کے امیر ہونے کی چٹلی کر رہا تھا۔

”ایک بات اور پوچھوں.....؟“ اس نے کچھ توقف کے بعد پوچھا۔

”جی.....“ مریڈیز آہستگی سے گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔

”تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟“

”وہ..... رت ہوئی قتل کر دیے گئے تھے۔“ مریڈیز کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔

”اوہ..... بہت افسوس ہوا۔“

”گھر میں کنالٹ کرنے والا کون ہے.....؟“ اس نے افسوس کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

”والدہ ہے..... جو ایک چھوٹی سی فیکٹری میں ملازمت کرتی ہے۔“ مریڈیز نے بتایا۔

”فلموں میں کام کرنا چاہو گی۔ تمہارے چہرے کے نقوش اور خوب صورتی قیامت ڈھانے والی ہے۔“ اس نے رکتے رکتے کہا تو مریڈیز نے خشک نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں اس کے سراپا کا طواف کر رہی تھیں۔

”ہوں.....“ اس نے دوبارہ سے زور دے کر کہا۔

”یہاں میرے کئی دوست پروڈیوسر بیٹھے ہیں اگر پسند کرو تو میں کسی سے سفارش کر سکتا ہوں۔“

”نہیں..... میں اس دلدل میں نہیں پھنسنا چاہتی۔“ مریڈیز نے جواب دیا۔

”گڈ..... میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ کسی کے ہتھے نہ چڑھ جانا..... میں یہاں آتا جاتا رہتا ہوں، میرا اپنا نہایت وسیع کاروبار ہے۔ دولت تو میرے گھر کی باندی ہے۔

یہاں ایک دو فلمیں پروڈیوس کر رہا ہوں۔ یہ میرا شوق ہے۔ شیئرز کا کاروبار بھی کرتا ہوں۔ یہ میرا کارڈ ہے۔ اگر کبھی ضرورت پڑے تو مجھے ضرور یاد کر لیتا..... میں اپنا نام بتانا تو بھول ہی گیا، جوزف اسٹیفن گرین.....“ یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

”میرا نام مریڈیز بارخا ہے۔“ مریڈیز نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

وہ ابھی باتوں میں مصروف تھے کہ ایک بار پھر سے کینے کا دروازہ اسی انداز میں کھلا۔ مریڈیز نے فوراً نظریں



لائے۔ یہی کچھ اچانک مرسیڈیز کی زندگی میں ہوا۔ اس واقعے کے کتنے روز بعد اچانک ایک دن جب اس کی والدہ ٹیکسری سے واپس آئی تو اس کی طبیعت بے حد خراب تھی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس روز مرسیڈیز اسکول نہیں گئی تھی اور گھر پر ہی موجود تھی، اس نے فوراً والدہ کو لیا اور جنرل اسپتال میں لے گئی۔

ڈاکٹروں نے اس کی بیماری کو تقریباً جان لیوا جانتے ہوئے اسے اسپتال میں داخل کر لیا۔ مرسیڈیز کے لیے یہ بہت مشکل لمحات تھے۔ جو جمع پونجی بھی وہ تم ہو چکی تھی۔ پے در پے ایسے جسکوں سے وہ پریشان ہو کر رہ گئی تھی۔ جب خود اس کا نروس بریک ڈاؤن ہونے پر آیا تو اچانک اسے جوزف کا خیال آیا۔ قریبی ٹیلی فون بوتھ سے اس نے وزینگ کارڈ پر لکھے نمبروں کو ملایا، کچھ دیر تک تیل بجتی رہی۔ پھر دوسری طرف سے فون اٹھایا گیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ فون جوزف ہی نے اٹھایا تھا۔ ”کون ہے؟“

”مرسیڈیز ہوں..... میں..... وہی ٹاپ ہیٹ والی.....“

”ہاں..... ہاں..... میں سمجھ گیا۔ کہو کیا بات ہے۔“

”میرا دوبارہ تنگ تو نہیں کیا؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”نہیں..... میری والدہ بیمار ہے اور جنرل اسپتال میں داخل ہے۔ مجھے آپ.....“

”مرسیڈیز کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ دوسری طرف سے جوزف دوبارہ بولا۔

”دیکھو مرسیڈیز..... میں اس وقت کام میں مصروف ہوں۔ میرا ڈرائیور تم تک پہنچ رہا ہے، وہ خود محالاً سنبھال لے گا۔ میں ساتھ میں کچھ رقم بھی بھجوا رہا ہوں۔ تم اس کے پہنچنے کا انتظار کرو۔ میں بھی شام کو تمہیں ملنے آؤں گا۔“

جوزف نے یہ کہہ کر ٹیلی فون بند کر دیا تو مرسیڈیز کو کچھ حوصلہ ہوا۔ عورتوں کی زندگی میں کسی نہ کسی مرد کے سہارے کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ وہ اسپتال کے باہر کھڑی جوزف کے ڈرائیور کی منتظر تھی۔ اتنی دیر میں جوزف کا ڈرائیور کار پارکنگ میں کار کھڑی کر کے اسے ڈھونڈتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ ”مرسیڈیز.....؟“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں مرسیڈیز بارخا.....“

”مرسیڈیز نے اپنا پورا نام بتایا۔

”مجھے جوزف اسٹینن نے بھیجا ہے اور ساتھ یہ رقم بھی بھجوائی ہے، میری ضرورت آپ کو اور کہاں ہے.....“

اس نے رقم مرسیڈیز کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

”شکریہ.....“ مرسیڈیز نے رقم لیتے ہوئے اسے

گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ جوتی تھا۔ اس بار وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ دو ساتھی بھی تھے جن کے ہاتھوں میں کھلا ہوا اسلحہ تھا۔ انہوں نے بڑی رعوت کے ساتھ ان کو اپنے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ جونی کے ہاتھ میں حسب معمول پستل تھا جس سے وہ کھیلتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی مرسیڈیز کے چہرے پر ایک بار پھر سے خوف سا لہرانے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اس کی ساری رگوں سے خون نچوڑ لیا ہو۔ زرد پڑتے چہرے کو دیکھ کر جوزف نے اس کے ہاتھ کو تھپتھپایا۔

”خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے گڑیا.....“

جوزف نے حوصلہ دیا۔

”یہ.....!“ مرسیڈیز کے حلق سے یہ مشکل نکلا۔

”یہ جونی اسٹو پنٹو ہے۔ اس علاقے کا سب سے بڑا بد معاش۔ دوسروں پر اس کی بڑی دہشت ہے، بڑا ظالم اور سفاک انسان ہے لیکن تمہارے اس دوست سے دبتا ہے۔“

جونی اپنے ہی انداز سے آگے بڑھتا رہا پھر اچانک اس کی نظر مرسیڈیز پر پڑی تو اس کے چہرے پر خوشی سی پھیل گئی۔ وہ چلتا ہوا اس کے نزدیک آیا۔

”کہاں رہی ہو اتنے دنوں گڑیا.....“ اس نے پستول کی نال سے مرسیڈیز کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔

”میں..... میں.....“ مرسیڈیز کے حلق سے صرف اتنا ہی نکلا۔

”جونی..... لڑکی کو اور خوفزدہ مت کرو۔“ جوزف نے اس کے پستل کی نال پرے کرتے ہوئے کہا۔

”ارے..... بابا جوزف..... آپ بھی ادھر بیٹھے ہیں۔“ جونی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”اور کیا..... دیکھ نہیں رہے۔ لڑکی کا سارا خون سوکھ گیا ہے۔“ جوزف نے دوبارہ اسی لہجے میں کہا۔

”میں اسے پسند کرتا ہوں.....“ جونی نے اسی لوفرانہ انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے..... مگر اس وقت وہ خوفزدہ ہے۔ اس طرح کرنے سے اس کی جان بھی جاسکتی ہے۔“ جوزف نے پھر سے جواب دیا۔ ”آؤ..... میں تمہیں چھوڑ آؤں.....“

جوزف نے مرسیڈیز کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

پریشانی اور مصائب اگر پوچھ کر انسانی زندگی میں آئیں تو کبھی بھی کوئی انسان انہیں اپنے قریب نہ آنے



مطلب ہے زندگی کا یہ بھاری بوجھ اکیلے کس طرح اٹھایا دے گی..... مجھے ڈر ہے جب جونی کو پتا چلے گا کہ تم اکیلی رہ گئی ہو تو وہ تمہارا جینا دو بھر کر دے گا۔“ جوزف آہستہ آہستہ کھلنے لگا تھا۔

”مسٹر جوزف..... میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“

مریڈیز نے جواب دیا۔

”ایک راستہ ہے میرے پاس..... اگر تم پسند کرو تو.....“ جوزف نے مطمئن لہجے میں کہا۔

”وہ کیا؟“ مریڈیز نے سوچی ہوئی آنکھیں اس کی طرف اٹھائیں۔

”تم شادی کر لو.....“ جوزف نے مشورہ دیا۔

”مگر کس سے..... میں نے تو ابھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں ہے اور پھر کیا گارنٹی ہے کہ میں شادی کر لوں گی تو جونی میرا راستہ چھوڑ دے گا۔ میں سوچتی ہوں یہ شہر چھوڑ دوں..... کہیں دور چلی جاؤں۔“ مریڈیز نے مر جھائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”یہ تو کوئی حل نہ ہوا۔ تم شادی کر لو۔ کسی ایسے آدمی سے..... جو اس بد معاش سے مقابلہ کرنا جانتا ہو۔“ جوزف بولا۔

”ایسا مجھے یہاں کوئی دکھائی نہیں دیتا۔“ مریڈیز نے جواب دیا۔

”ہے..... جونی سے زیادہ طاقتور بھی یہاں موجود ہیں۔ جونی وہ بد معاش ہے جس کے آگے اگر دولت کی ہڈی ڈال دی جائے تو وہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔“ جوزف نے بتایا۔

”میں تو اتنا بھی نہیں کر سکتی۔“ مریڈیز نجیف آواز میں بولی۔

”میں تم سے شادی کے لیے تیار ہوں۔ یقین کرو اگر تم اس پر رضامند ہو جاؤ گی تو جونی تمہارے سامنے بھیگی بلی سے زیادہ نہیں رہے گا۔ میں اپنی بے پناہ دولت میں سے ایک بہت بڑا حصہ تمہارے نام کرنے کو بھی تیار ہوں۔ تم سوچ لو.....“ جوزف نے پانسہ پھینکا۔

”یہ نہ ہو کہ میرے لیے مصائب کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جائیں پھر اس کی کیا گارنٹی ہے کہ تم میرے لیے یہ سب کر ڈالو گے۔“ مریڈیز نے پوچھا۔

”تم کل چلو میں کوئی بھی پسندیدہ گھر تمہارے نام کروادوں گا اور تمہارے اکاؤنٹ میں ایک خطیر رقم بھی ٹرانسفر کردوں گا۔ اس سے بڑی گارنٹی اور کیا ہوگی؟“

جوزف نے اسے مطمئن کر دیا۔

جوزف نے اسی طرح کیا اور اپنا وعدہ اگلی صبح تک نبھا

”میں ڈاکٹر سے مل لیتا ہوں اور ان سے پوچھ لیتا ہوں۔ مجھے سر جوزف نے اپنے آنے تک آپ کے پاس ہی ٹھہرنے کا کہا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ایک طرف چلا گیا۔

جنرل اسپتال کے باہر کپاؤنڈ میں بچھے بیچ پر مریڈیز اکیلی بیٹھی سوچوں میں گم تھی کہ جوزف کا ڈرائیور بڑی پریشانی سے اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

”سر جوزف..... ابھی نہیں آئے.....“

”نہیں..... ماما کیسی ہیں؟“ مریڈیز نے پوچھا۔

”ڈاکٹر اپنی کوششوں میں مصروف تو ہیں۔ سر جوزف نے آنے کا کہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے ان کی بات بھی کرائی تھی۔“ ڈرائیور نے مبہم سا جواب دیا تو مریڈیز اور بھی پریشان ہو گئی۔ اتنے میں جوزف اپنی گاڑی میں آتا دکھائی دیا۔ گاڑی پارک کر کے وہ ان کے نزدیک آیا تو شدتِ جذبات سے مریڈیز اس کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔

”پلیز میری ماما کو بچالیں..... پلیز.....“

”ڈاکٹر کوشش تو کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مرض اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے، پہلے آجاتے تو زیادہ بہتر ہوتا.....“

”جہاں بھوک زندگی کی تانکا جھاگی میں لگی ہو، وہاں علاج کی کہاں سوچتی ہے۔“ مریڈیز ڈبڈبائی ہوئی آواز میں بولی۔

”بہر حال وہ کوششوں میں مصروف ہیں، میں ہوں نا یہاں تمہارے پاس.....“ جوزف نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا پھر کچھ ہی دیر بعد ایک ڈاکٹر باہر نکلا۔ وہ نہ جانے ادھر ادھر کیا تلاش کر رہا تھا۔ جوزف تیزی سے چلتا ہوا اس کے قریب گیا اور پھر اسی تیزی کے ساتھ مریڈیز کے پاس آیا۔

”افسوس ہے کہ ڈاکٹر اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود تمہاری ماما کو نہیں بچا پائے.....“ جوزف نے بتایا تو مریڈیز ایک بار پھر جوزف کے سینے میں چھپ گئی۔ جوزف روتی ہوئی مریڈیز کی لمبی اور سنہری زلفوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دلاسا دے رہا تھا۔

اسی شام مریڈیز کی والدہ گلڈیز کی آخری رسوم ادا کر دی گئیں۔ وہ رات مریڈیز کے لیے قیامت سے کسی طرح کم نہ تھی۔ جوزف اس رات مریڈیز کے پاس ہی رہا اور تمام رسوم کی اس طرح نگرانی کرتا رہا جیسے اس کے اپنے کسی عزیز کی موت واقع ہوئی ہو۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری والدہ کو نہیں بچا پایا۔“ اس نے ایک بار پھر سے وہی موضوع چھیڑ دیا۔ ”اب آگے تمہارا کیا ارادہ ہے؟ میرا



”تو کیا میں اب یہاں اکیلی رہوں گی.....؟“  
 مرسیڈیز نے پوچھا۔  
 ”نہیں۔ میں وقتاً فوقتاً چکر لگاتا رہوں گا۔“ جوزف  
 نے پیار سے جواب دیا۔  
 ”میں بھی تو تمہاری بیوی ہوں۔ داشتہ تو نہیں ہوں کہ  
 دل بہلایا اور نکل گئے۔“ مرسیڈیز کے لہجے میں غصے کا عنصر  
 چھپا ہوا تھا۔

”ارے..... رے..... تم تو ناراض ہونے لگی ہو۔  
 مجھے کھلتے گلاب کی خوب صورتی پسند ہے۔ سو گوار حسن مجھے  
 قطعاً اچھا نہیں لگتا۔ اچھا چلو..... یوں کرتے ہیں کہ میں  
 دوپہر کا کھانا تمہارے ساتھ کھایا کروں گا۔ ڈارلنگ! میری  
 مجبوری بھی سمجھنے کی کوشش کرو.....“ جوزف اسے پیار سے  
 سمجھا رہا تھا۔

”او کے.....“ مرسیڈیز نے مرجھائے ہوئے لہجے  
 میں جواب دیا۔

”دیکھو۔ گاڑی تمہارے پاس ہے۔ فون موجود  
 ہے۔ تم مجھ سے کسی وقت بھی رابطہ کر سکتی ہو۔ میں خود بھی تم  
 سے رابطے میں رہوں گا۔“

”جوزف اگر تم مناسب جانتو تو میں اسکول میں  
 دوبارہ جانے لگوں۔ اس طرح تنہائی اور اکیلے پن سے بھی  
 میری جان چھوٹی رہے گی۔“ مرسیڈیز نے پوچھا۔

”تمہیں اب اسکول جانے کی کیا ضرورت ہے۔  
 تمہارے پاس اتنی دولت موجود ہے کہ تم تو کیا تمہارے بچے  
 بھی تمام عمر کھاتے رہیں تو یہ ختم نہ ہوگی۔“ جوزف  
 نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

اور پھر وہ چلا گیا۔ وہ اب گھر میں بیٹھی کوئی نہ کوئی  
 کتاب پڑھتی رہتی۔ جب بھی بور ہو جاتی تو جوزف سے فون  
 پر باتیں کرنے لگتی۔

شادی کے بعد پانچ چھ ماہ اسی طرح گزر چکے تھے کہ  
 ایک روز اچانک دوپہر کے وقت اس کے گھر کا دروازہ بچنے  
 لگا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو باہر تقریباً اسی کا ہم عمر ایک  
 نوجوان کھڑا تھا۔

”جی فرمائیے؟“ مرسیڈیز نے پوچھا۔  
 ”باتیں زیادہ ہیں۔ مجھے اندر آنے کا نہیں کہو گی۔“  
 نوجوان کے لہجے میں بڑی سختی سی محسوس ہو رہی تھی۔

”میں اجنبی مردوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں  
 دیتی۔ تم نے جو کہنا ہے کہو۔“ مرسیڈیز نے جواب دیا۔  
 ”اجنبی مردوں سے نفرت کرتی ہو اور اجنبی بوڑھوں کو

دیا۔ مرسیڈیز کو زندگی میں پہلی بار بڑی شدت کے ساتھ  
 احساس ہوا تھا کہ دنیا میں اگر جینا ہے تو دولت اتنی سمیٹ لو  
 کہ باقی ماندہ جینا آسان ہو جائے۔ اس کے دو تین روز بعد  
 مرسیڈیز بارخا..... مرسیڈیز جوزف بن کر نئے گھر میں منتقل  
 ہو چکی تھی۔

☆☆☆

شادی کے بعد سب سے پہلا دھماکا اس روز ہوا جب  
 مرسیڈیز اپنی کار میں کیش اینڈ کیری سے گھر کے لیے کچھ  
 چیزیں خریدنے کے لیے گئی۔ وہ کیش اینڈ کیری سے باہر نکل  
 رہی تھی جب جوئی اسٹوپنا اپنے ساتھیوں کو لے کر کیش اینڈ  
 کیری میں داخل ہو رہا تھا۔ مرسیڈیز نے بہت کوشش کی کہ  
 وہ کئی کتر کر نکل جائے مگر وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا  
 اور اس کا بازو پکڑ کر بولا۔

”آج کل بڑی ڈیٹ مار رہی ہو۔“

”چھوڑو مجھے.....“ مرسیڈیز کسماتے ہوئے بولی۔  
 ”مجھے سب علم ہے، تم کیا کر رہی ہو۔ میں فی الحال  
 کیوبا جا رہا ہوں۔ وہاں سے گوریلا ٹریننگ لے کر آؤں گا  
 پھر تمہیں پوچھوں گا کہیں بھی اڑنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ  
 تمہارا حشر بھی اسی نوجوان جیسا ہو جائے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے مرسیڈیز کا ہاتھ ایک جھٹکے کے ساتھ  
 چھوڑا اور کیش اینڈ کیری میں چلا گیا۔ مرسیڈیز تیزی سے  
 اپنی کار کی طرف بڑھی اور گھر روانہ ہو گئی۔

رات اس نے جوزف کو ساری بات بتائی تو جوزف  
 نے اسے حوصلہ دیا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کو  
 جب میرے ساتھ تمہاری شادی کا علم ہوگا تو سب ٹھیک  
 ہو جائے گا۔

”جوزف! مجھے اس سے بہت خوف آتا ہے۔ وہ جو کہتا  
 ہے کہ ڈالتا ہے۔“ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ارے نہیں، یقین کرو وہ تمہارے جوزف کے  
 آگے چوہے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ دولت کے ٹکڑے اس  
 کے آگے پھینکنے سے اس کے سارے کس مل اور سارا زہر نکل  
 چکا ہے، وہ دوسروں کے لیے تیز دھار چھری ہوگا مگر جوزف  
 کے لیے نہیں.....“

کتنے ہی روز اس کے ساتھ رہنے کے بعد ایک روز  
 جوزف نے مرسیڈیز سے کہا۔ ”دیکھو مری..... میں اتنے  
 روز تمہارے پاس رہ چکا ہوں۔ اب مجھے اپنے اصل گھر میں  
 بھی چند روز کے لیے جانا ہوگا۔ کچھ روز میں تمہارے پاس  
 نہ آسکوں گا۔“



سوچوں میں گھبرائی۔ اس نے جوزف کو فون کرنا چاہا مگر بار بار فون ملانے کے باوجود جوزف سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس نئی مصیبت کے بارے میں تو مرسیڈیز نے بھی سوچا ہی نہ تھا۔ اس کے ذہن میں آیا کہ وہ خود جوزف کے آفس میں چلی جائے یا کم از کم پولیس ہی کو اس دھمکی کے بارے میں بتا کر بل از وقت کیس رجسٹرڈ کرادے۔ جوزف بھی بڑے دنوں سے نہیں آیا تھا۔ وہ رات اس نے بڑی ہی بے چینی سے گزاری۔ اگلی صبح اس نے ابھی ناشتا بھی نہیں کیا تھا کہ.... جوزف کا فون آگیا۔

”مجھے افسوس ہے جان جوزف کل تمہیں سن نہیں سکا۔ دراصل کل کچھ لوگوں کے ساتھ کاروباری مصروفیت تھی اور دوسری اپنی نئی قلم کی شوٹنگ کروانے کی تیاریاں بھی کرنا تھیں۔ تم کہو..... کیسی ہو.....“ جوزف نے اپنی مصروفیت کا بتاتے ہوئے معذرت کی۔

”میں بہت پریشان ہوں جوزف..... مجھ سے فوراً ملو۔ جلدی سے گھر آ جاؤ وگرنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔“

مرسیڈیز نے روہانسی آواز میں کہا۔

”میں آتا ہوں..... ابھی آرہا ہوں، تم اس قدر خوفزدہ کیوں ہو..... میں آرہا ہوں۔“ جوزف نے پریشانی سے جواب دیا اور فون بند کر دیا۔

انگلے ہی لمحے وہ مرسیڈیز کے پاس تھا۔ جوزف کو دیکھتے ہی وہ اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جوزف بڑے پیار سے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”کچھ منہ سے بھی کہو پلیز۔“

”وہ آیا تھا.....“ ابھی اس نے یہ کہا ہی تھا کہ جوزف بول اٹھا۔

”کون..... جوئی..... تم نے تو مجھے بتایا تھا اور میری بھی یہی اطلاع ہے کہ وہ کیوبا چلا گیا ہے۔“ جوزف نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... وہ نہیں..... وہ کوئی رابرٹ تھا..... تمہارا بیٹا رابرٹ اسٹیفن.....“ مرسیڈیز نے روتے ہوئے کہا۔

”کیا کہا تھا اس نے..... کوئی دھمکی وغیرہ دے کر گیا ہے، بتاؤ مجھے..... اسے یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی.....“ جوزف نے غصے سے پوچھا۔

تب مرسیڈیز نے سارا واقعہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

”تم فکر نہ کرو..... میں خود ہی سنبھالتا ہوں اسے.....“ جوزف نے دھیرج سے کہا۔ ”آئندہ وہ تمہیں

اپنے گلے سے لگا کر رکھتی ہو.....“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

”مطلب.....!“ مرسیڈیز نے حیرانی سے پوچھا۔

”اسی لیے تو کہتا ہوں..... مجھے اندر آنے دو..... وگرنہ مجھے اتنا حق تو پہنچتا ہے کہ میں زبردستی اندر آ جاؤں۔“

نوجوان ذرا غصے سے بولا۔

”پولیس تم جیسوں کو جیل بھجوانے میں دیر نہیں کرتی۔“

مرسیڈیز نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

”کس پولیس کی بات کرتی ہو جو میری جیب میں ہمیشہ سے رہتی ہے۔ ذرا ہٹو.....“ وہ یہ کہہ کر مرسیڈیز کا بازو ہٹا کر اندر داخل ہو گیا اور کمرے میں بیٹھتے ہوئے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”حسن میں اتنا جا دو ہوتا ہے میں نے آج تک نہیں سوچا تھا۔ سچی تو میں بھی کہوں..... میرے پاپا..... کس پر مرٹے ہیں۔“ وہ بولا۔

مرسیڈیز کو یہ دوسرا جھٹکا لگا تھا۔ تب اس نے بڑے تحمل سے کہا۔

”کھل کر بات کیوں نہیں کرتے..... کس لیے آئے ہو یہاں.....“ مرسیڈیز زچ ہو کر بولی۔

”میں جوزف اسٹیفن کرین کا بڑا بیٹا رابرٹ اسٹیفن ہوں..... لگتا ہے میرے پاپا کی دولت نے تمہاری آنکھیں چکا چوند کر دی تھیں جو تم نے انہیں اس بڑھاپے میں بھی پہانے میں کچھ برا محسوس نہیں کیا۔ کیا تمہیں اپنی عمر کا کوئی لڑکا نہیں ملا تھا.....“ اس کے لہجے کی گئی ابھر کر سامنے آگئی تھی۔

”دیکھو لڑکے..... تم جو کوئی بھی ہو احتیاط سے گفتگو کرو۔ میں نے جوزف سے باقاعدہ شادی کی ہے۔ میں اس کی رکھیل نہیں ہوں..... اور اس شادی میں ہم دونوں کی مرضی شامل تھی۔“ مرسیڈیز نے روکے انداز میں جواب دیا۔

”بہتر ہے کہ ہماری زندگی سے نکل جاؤ ورنہ بہت برا ہوگا۔“

”کیا نقصان کرو گے۔ مجھے جان سے مار دو گے..... ہوں.....“ مرسیڈیز غصے سے بولی۔

”کچھ بھی ہو سکتا ہے، پالتو کتے فنڈوں کی صورت گلی گلی بھونکتے پھرتے ہیں۔ دم ہلاتے ہوئے کسی کے پیچھے بھی آسکتے ہیں اور ان کے لیے کسی کی جان لینا بہت آسان ہوتا ہے۔“ رابرٹ نے کہا۔ ”میں جا رہا ہوں..... تم خود ہی سوچ لو..... تمہیں کونسا راستہ اختیار کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد مرسیڈیز عجیب و غریب



تجک نہیں کرے گا۔" اس نے مرسیڈیز کے گال چھتھپاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

مرسیڈیز اب ایک بہت ہی پیاری سی بیٹی شیرل کی ماں بن چکی تھی۔ جوزف کے دونوں گھرانوں میں سوتیلے پن کی آگ گویا دب چکی تھی۔ مگر اس کی راکھ میں اب بھی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ جوزف کی پہلی بیوی نے مرسیڈیز کو قبول کرنے سے یکسر انکار کر دیا تھا اور ان کے درمیان کھینچی نفرت کی لکیر باقاعدہ خلیج بنتی جا رہی تھی۔ اس روز تو انتہا ہو چکی تھی۔ جب مرسیڈیز اپنی بیٹی شیرل کو تیار کر کے اسکول چھوڑ کر آ رہی تھی۔ ابھی اس نے گھر میں قدم ہی رکھا تھا کہ زور سے کال بیل بجی..... لگتا تھا کال بیل پر کوئی انگلی رکھ کر اٹھانا بھول ہی گیا ہے۔

جب اس نے دروازہ کھولا تو سامنے جوزف کی پہلی بیوی اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے ایک طرف ہوتے ہوئے انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ اندر آتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کے ناخنوں سے اس کا چہرہ نوچنے کی کوشش کرتے ہوئے انتہائی غصے سے کہا۔

"کیسی..... میرے شوہر کی دولت چھیننا چاہتی ہے۔ میں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" وہ اس پر جھپٹی۔

مرسیڈیز نے بڑی ہی مشکل سے اپنا آپ بچایا۔ لڑکے نے والدہ کو پکڑا اور گھسینا ہوا باہر لے گیا۔ "میں نے کہا تھا ماما کہ تم وہاں جا کر جھگڑا نہیں کرو گی۔"

"چھوڑ دو مجھے۔ میرا خون کھول رہا ہے۔ جس خوبصورتی کا اسے غرور ہے، میں وہ خوبصورتی ہی نہیں رہنے دوں گی۔ تیزاب پھینک دوں گی اس کے چہرے پر....." وہ اپنا آپ چھڑا کر دوبارہ اس پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہی تھی۔

مرسیڈیز کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ کس طرح اس مصیبت سے جان چھڑائے۔ بالآخر وہ لڑکا اسے لے کر چلا گیا اور مرسیڈیز ایک بار پھر گھر میں اکیلی رہ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جس سکون کے لیے اس نے شادی کی تھی وہ اس کے لیے وبال بن گیا ہے۔ دولت..... دولت..... ہر کوئی اسی کے پیچھے پاگل ہوا پھرتا ہے۔ اسے تو محض تحفظ کی ضرورت تھی۔ جوئی جیسے بد معاش سے بچنے کے لیے اس نے جوزف کو سہارا بنایا تھا..... جوزف اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے سبب اپنی ساری ملاقات کے پرسمیٹ رہا تھا۔ اس کی اولاد جو ان ہو چکی تھی اور وہ اس کے قابو سے باہر ہو گئی تھی۔ اس نے اس

جھگڑے کا ذکر جوزف سے کیا تھا مگر اسے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنی اولاد سے کس طرح نمٹے..... اگرچہ جس معاشرے میں وہ سانس لے رہے تھے وہاں بچوں کو جوانی کی دہلیز پر پہلا پاؤں رکھتے ہی آزادی مل جاتی تھی۔

آخر وہ کب تک ان جھگڑوں میں پڑی رہے گی۔ آگے اس کی اپنی بیٹی بھی جوان ہو رہی تھی۔ یہ سوچ کر اس نے جوزف سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ وہ یہ علاقہ ہی چھوڑ دے گی۔ جس دولت کا واویلا پورے معاشرے کو اپنے نرنے میں لیے ہوئے ہے، وہ خود اس کے حصول کے لیے ہر حد پار کر جائے گی۔ ابھی اس کے حسن کا بگڑا ہی کیا تھا۔ یہ سوچ کر وہ اٹھی اور کمرے میں لگے ہوئے قد آدم شیشے کے سامنے جا کر اپنی خوب صورتی کا جائزہ لینے لگی۔ وہ ہر زاویے سے اپنے حسن کو پرکھ رہی تھی۔ کیا ہوا اگر وہ ایک نو عمر لڑکی کی ماں بن چکی ہے مگر اس کے جسمانی خدو خال کا کچھ بھی نہیں بگڑا تھا بلکہ ماں بن کر اس کا حسن اور بھی نکھر گیا تھا۔ اس کے کانوں میں برسوں پہلے کی عرفیت گونجنے لگی۔ وہ اب بھی سویٹر گرل تھی..... پھر وہ جوزف ہی کی محتاج بن کر کیوں رہے؟

بالآخر ایک روز تجک آ کر اس نے جوزف سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ سنا دیا۔ جوزف نے بڑے محل سے اس کا یہ فیصلہ سنا پھر اس پر اس نے اپنے خدشات کا اظہار بھی کر ڈالا۔ "حفاظتی دیواروں میں رہ کر بھی تو میرا جینا دو بھر ہی ہے۔ اس سے بہتر نہیں، میں آزاد فضاؤں میں اپنی مرضی سے اڑائیں بھروں....." مرسیڈیز نے کہا۔

"تمہاری مرضی..... بہر حال میری دولت اور میری دوستی کے دروازے تم پر بند نہیں ہوئے۔ تمہیں جب بھی میری مدد کی ضرورت پڑے بلا خوف و خطر مجھے آواز دے سکتی ہو۔ میری بیٹی شیرل....."

"میں اسے تمام عمر کڑھنے اور احساس کمتری میں جینے کے لیے تمہارے پاس نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ میرے پاس ہی رہے گی....." مرسیڈیز نے جواب دیا۔

بوڑھے جوزف نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اس کے خوب صورت چہرے کو دیکھا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

☆☆☆

آرٹی شا میرا فلورس علاقے کی امیر ترین شخصیت تھی۔ مرسیڈیز نے جوزف سے چھڑکارا حاصل کیا تو چند روز وہ آزادی کی فضاؤں میں سانس لینے کی غرض سے باہر نکلی۔ ایک روز اس کی ملاقات اسکول کی ایک سبیلی لٹی سے ہو گئی۔



کے.....“ آرٹی شانے ایک ماہر شکاری کی طرح اسے باتوں کے جال میں پھنسا لیا تھا۔

”کرین میرے شوہر کے نام کا حصہ تھا۔ اس کا پورا نام جوزف اسٹیفن کرین تھا۔“ مرسیڈیز نے بتایا تو آرٹی شانے کچھ مرد سا پڑ گیا۔

”تو کیا میں یہ چاند اپنے آنگن میں اتار سکتا ہوں۔ یقین کریں آپ کی ساری پریشانیاں میرے ساتھ وابستہ ہونے سے خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ میں اپنی دولت کا ایک خطیر حصہ آپ کے نام کرنے کو تیار ہوں۔“ شانے پوچھا۔

”کیا مجھے سوچنے کا موقع نہیں دو گے؟“ مرسیڈیز نے ہنس کر پوچھا۔

”یقیناً..... یہ آپ کا حق ہے۔“ آرٹی شاہ بولا۔

”تم لاس اینجلس ہو آؤ..... تب تک میں سوچ لوں گی۔“ مرسیڈیز نے کہا۔

”اوکے..... میں جلد ہی تمہارے پاس آؤں گا۔“ اس واقعے کے کچھ ہی روز بعد آرٹی شاہ اور مرسیڈیز قریبی گرجا میں جا کر شادی کر چکے تھے۔ آرٹی شاہ لاس اینجلس میں منتقل ہو چکا تھا اور ایک خطیر رقم مرسیڈیز کے اکاؤنٹ میں ایک بار پھر جمع ہو چکی تھی۔ ایک روز آرٹی شاہ اور مرسیڈیز ایک بہت بڑے شاپنگ مال سے خریداری کرنے کے بعد باہر نکل رہے تھے جب اچانک ہی کہیں سے جوئی ان کے سامنے آ گیا۔ مرسیڈیز اسے دیکھتے ہی پریشان ہو گئی۔

”ہیلو سویٹر گرل..... دیکھو میں واپس آ گیا ہوں.....“ اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے آگے کر دیا تو ناچار مرسیڈیز کو بھی اس سے مصافحہ کرنا پڑا۔

آرٹی شاہ جیرانی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مرسیڈیز نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی دوسرا سوال کرتا، مرسیڈیز نے جلدی سے اس کی توجہ شاہ کی طرف کرواتے۔

”یہ میرے شوہر آرٹی شاہ ہیں.....“ اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ مصافحہ کرنے کے کچھ ہی دیر بعد آرٹی شاہ کی کال آگئی اور وہ سوری کرتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

”یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ مسز جوزف سے تم مسز آرٹی شاہ ہوئیں؟“ جوئی نے جیرانی سے پوچھا۔

”میں اپنی ذاتی زندگی میں کچھ بھی کرنے کا حق رکھتی ہوں۔“ مرسیڈیز نے روکے پن سے جواب دیا۔

لتی بھی اسی علاقے کی رہنے والی تھی جہاں آرٹی شاہ رہتا تھا۔ مرسیڈیز ایک دو بار اس علاقے میں گئی تھی۔ وہاں اس نے دو چیزوں کی بڑی شہرت سنی تھی۔ ایک آرٹی شاہ کی امارت اور دوسرے وہاں کا ”مابوڈانس“.....

”میں بھی مابوڈانس دیکھوں گی۔“ اس نے ایک روز اپنی سہیلی سے کہا۔

”رہنے دو..... اس کی بری شہرت سنی ہے۔ یہ جنسی ہیجان پیدا کرنے والا ڈانس دیکھ کر تم کیا کرو گی.....؟“ لٹی نے نفرت سے کہا۔

”تمام بگڑے ہوئے نوجوان اور بے پناہ دولت رکھنے والے رئیسوں کی یہی پناہ گاہ ہوتی ہے۔ میں اس جگہ ضرور جاؤں گی۔ اگر تم میرے ساتھ چلو گی تو ٹھیک ورنہ میں اکیلی چلی جاؤں گی۔“ مرسیڈیز نے اسے دھمکی دی تو وہ بھی جانے کے لیے رضامند ہو گئی۔ حسب معمول اس رات بھی کیسیٹو میں بے تماشا ریش تھا۔ وہ اندر جا کر بیٹھ گئیں۔ ابھی شو شروع نہیں ہوا تھا جب آرٹی شاہ بھی کیسیٹو میں آ گیا۔ لٹی نے اسے دیکھتے ہی مرسیڈیز کو ٹھوکا مارا۔ ”آرٹی شاہ.....“ انسان خوب صورت نہ بھی ہو تو بھی دولت اس کا تک سک ستوار دیتی ہے۔ مرسیڈیز کو اس کا ہر انداز اچھا لگا تھا۔ جب شاہ کی نظریں اس پر پڑیں تو وہ بھی ایک لمحے کے لیے حیران رہ گیا۔

”میں آرٹی شاہوں۔“ اس نے اپنا تعارف کرایا۔

”میرا نام مرسیڈیز کرین ہے..... میں لاس اینجلس سے ہوں۔“ مرسیڈیز نے اپنے سابقہ شوہر کے حوالے سے اپنا نام بتایا۔

”اوہ..... میرا پروگرام بھی لاس اینجلس میں کاروبار چلانے کا ہو رہا ہے۔ آپ وہاں کہاں رہتی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”گڈ.....“ مرسیڈیز کھل اٹھی۔ ”میں شہر سے ذرا آگے نکل کر نئے قصبے میں رہتی ہوں۔“ مرسیڈیز نے بتایا۔

”چکر لگا تو آؤں گا..... چاند کے قریب جانے کا تو ہر کسی کو شوق ہوتا ہے اور کتنے دن یہاں ہیں؟“ آرٹی شانے بات آگے بڑھائی۔

”شاید کل واپس چلی جاؤں۔“ مرسیڈیز بولی۔

وہیں اس نے رات کے کھانے کا پروگرام بنالیا۔ پروگرام ختم ہوا تو آرٹی شاہ کی گاڑی ان کو لے کر ایک جدید ہوٹل میں آگئی۔ مرسیڈیز کی عشوہ طرازیوں دیکھ کر وہ اس پر بری طرح سے فریفتہ ہو چکا تھا۔

”یقیناً مرسیڈیز آپ کا اپنا نام ہوگا اور کرین آپ



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✧ ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



دی اور اکیلا ہی چلا گیا۔

اسی روز دوپہر کے وقت دروازے پر دستک ہوئی، مرسیڈیز نے شیرل کو دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔ شیرل نے دروازہ کھولا تو باہر جوئی کھڑا تھا۔ اس کا ڈیل ڈول اور لباس وغیرہ دیکھ کر شیرل سہم گئی۔ اس کے گلے میں آواز پھنس کر رہ گئی۔

اس سے پہلے کہ مرسیڈیز دروازے تک آتی۔ جوئی نے شیرل کو ایک طرف دھکا دیا اور اندر آ گیا۔

”تم یقیناً سمجھتی ہو گی کہ جوئی وعدہ کر کے بھول گیا ہے اور تمہیں یہ بھی اطمینان ہو گا کہ مجھے تمہارا گھر کبھی نہیں ملے گا۔ جوئی سے کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہتی۔ پھر میں نے شاید ایک بار تمہیں بتایا تھا کہ جوئی اپنی پسند پر پوری نظر رکھتا ہے۔ اس کی ہر حرکت جوئی کی نظر میں ہوتی ہے۔“ جوئی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیوں آئے ہو یہاں.....“ مرسیڈیز نے نفرت سے پوچھا۔

”اپنا گھر ہے..... یاد رکھو سویٹر گرل تم جہاں مرضی چلی جاؤ۔ کسی کے بھی پہلو میں چھپ جاؤ۔ رہو گی جوئی کی ہی..... اور میں جب چاہوں تمہیں اچک کر لے جاؤں گا۔ یہ نئی تہلی کہاں سے نکل کر اپنے گھر ڈال لی ہے تم نے.....“ جوئی نے شیرل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بیٹی ہے میری.....“ مرسیڈیز نے اس کی نگاہوں کا مقبوم جانتے ہوئے کہا۔

”اوہ..... میں اتنی دیر بعد تم سے ملا ہوں کہ تمہاری بیٹی بھی تمہارے کندھوں تک آ پہنچی ہے۔“ جوئی نے تیزی سے کہا اور پھر ایک تہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”اب تم اگر اپنی مسافت سے تھک چکی ہو تو آؤ میں تمہیں سمیٹ لوں..... بہت دیر ہو چکی ہے۔ جوئی کسی کام میں اتنی دیر نہیں کرتا۔ پتا نہیں تمہارے بارے میں اتنی ڈھیل کیوں برت رہا ہوں.....“ جوئی نے مسکراتے ہوئے مرسیڈیز کو یاد دلایا۔

”آرٹی شا..... میرا شوہر ہے۔ ایک بہت بڑی کاروباری شخصیت ہے وہ.....“ مرسیڈیز نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

”ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر اسے رکھ کر دوسرے ہاتھ سے مسلنا جوئی کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“ جوئی نے مذاق اڑایا۔ ابھی وہ باتیں کر رہے تھے کہ دھڑ سے دروازہ کھلا اور آرٹی شا اندر داخل ہوا۔

”اوہ..... تو گویا باتیں کرنا بھی سیکھ گئی ہو۔ میں آؤں گا، کسی روز تمہارے گھر..... میرا انتظار کرنا۔“ جوئی نے تھکے انداز میں انتہا کرتے ہوئے کہا اور ایک طرف چلا گیا۔

”کون تھا یہ.....؟“ آرٹی شا نے پوچھا۔

”جس اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کے قریب ٹاپ ہیٹ کینے کا ملازم تھا۔ جب ہم اسکول کے کسی پیریڈ سے فارغ ہوتے تھے تو اس کینے میں بیٹھ جاتے تھے۔ وہیں اس سے واقفیت ہوئی تھی۔“ مرسیڈیز نے بتایا۔

”شکل سے مجھے کینکسر لگتا ہے.....“ آرٹی شا نے کہا۔

”ہاں اسی کام کے لیے کینے کے مالکان نے اسے ملازمت دی تھی۔“ مرسیڈیز نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا تو دونوں آگے بڑھ گئے۔ آرٹی شا کا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا۔ اسی لیے گھر آ کر اس نے ایک بار پھر وہی موضوع پھیٹو دیا۔

”مگر وہ..... کیا نام بتایا تھا اس نے.....“ آرٹی شا کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”جوئی.....“ مرسیڈیز نے اسے بتایا۔

”ہاں..... جوئی..... وہ تو تم سے اس طرح مل رہا تھا جیسے اس کے تمہارے ساتھ بڑے گہرے تعلقات ہوں۔ وہ گھر آنے کا بھی کہہ رہا تھا۔ میں نے خود سنا تھا.....“ آرٹی شا بولا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس نے ایسا ضرور کہا تھا مگر وہ میرا گھر کہاں جانتا ہے، یہ سب رکی باتیں ہوتی ہیں۔ تم انہیں دل پر مت لو۔“ مرسیڈیز نے اس کی تشفی کی۔

آرٹی شا ایک شگی مزاج آدمی تھا۔ اس بات پر اس کا ذہن الجھتا چلا گیا۔ وہ میرا فلورس سے اپنا تمام کاروبار سمیٹ کر لاس اینجلس آچکا تھا۔ ایک چھوٹے شہر اور بڑے شہر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ رہن سہن، طرز معاشرت اور کاروباری انداز چھوٹے شہر سے کہیں مختلف ہوتے ہیں۔ یہ واقعہ آرٹی کے ذہن کے ساتھ چپک کر رہ گیا تھا۔ اب وہ بات بات پر مرسیڈیز کو ٹوکے اور اس پر پابندیاں لگانے لگا تھا۔ مرسیڈیز نے آزاد فضاؤں میں پہلی بار کھل کر سانس لیا تھا۔ اس لیے اسے یہ پابندیاں بالکل اچھی نہ لگتی تھیں اور اس روز تو انتہا ہی ہو گئی۔ آرٹی شا مرسیڈیز کو بتا کر گیا تھا کہ وہ ایک دو روز کے لیے اپنے آبائی گھر جا رہا ہے۔ مرسیڈیز نے کہا تھا کہ شیرل کی اسکول سے چھٹیاں ہیں۔ اس لیے وہ انہیں بھی اپنے ساتھ لے جائے مگر اس نے ”پھر کبھی“ کا کہہ کر بات ٹال



مدت چھ سات ماہ سے زیادہ نہ رہی۔ اسے اب مردوں کو بے وقوف بنا کر ان کی دولت پر ہاتھ صاف کرنے میں مزہ آنے لگا تھا۔ مرسیڈیز مرد کی فطرت سے پوری طرح آگاہ ہو چکی تھی اور اپنے حسن و خوب صورتی کا فائدہ اٹھانے میں ماہر بھی۔ ایک محفل میں.... اس کی ایک ملنے والی نے اس پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

”مرسی..... کو تو زندگی میں ہمیشہ کامیاب مرد ہی ملے ہیں اور اسے پہلے سے علم ہو جاتا ہے کہ کامیاب مرد کیسا ہوتا ہے..... کیوں ڈارنگ؟“

”بے بی سنو..... کامیاب مرد وہ ہے جو اس سے زیادہ کمائے کہ جتنا اس کی بیوی خرچ کر سکتی ہے جبکہ کامیاب عورت وہ ہے جو ایسا مرد ڈھونڈ سکے۔“ یہ کہہ کر مرسیڈیز قہقہہ مار کر ہنس دی۔

”بڑی خوب صورت منطقی ہے..... اپنی طرح تم باتیں بھی بڑی خوب صورت کرتی ہو سبھی تو مرد تمہارے گردلوں کی طرح گھومتے ہیں۔“

”اپنا اپنا..... ہنر ہے..... تم بھی آزمانے کی کوشش کرو۔“ مرسیڈیز نے ہاتھ میں پکڑے گلاس سے مشروب کا آخری گھونٹ لیا..... تو قریب سے گزرتے ہوئے بیرے نے اٹھائی ہوئی بوتل کا ڈھکنا کھول کر دوبارہ اس کا گلاس بھر دیا۔

”اب کون سے نمبر کی شادی چل رہی ہے؟“ وہ پستے ہوئے بولی۔

”میں ہمیشہ سے اس حساب میں کمزور ہوں۔“ مرسیڈیز نے جواب دیا۔

”تم بہت ذہین عورت ہو اور جواب دینے میں کوئی تمہارا جوڑ نہیں ہو سکتا۔“ وہ اب باقاعدہ اس کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملانے پر تل گئی تھی۔

تعریف کے اچھی نہیں لگتی اور پھر وہ بھی عورت کے حسن، اس کی ذہانت اور اس کے قول و فعل کی تعریف تو اس کی جوانی کے لیے ایک قوت بخش دوا کا کام کرتی ہے۔

”ٹھہرو..... ٹھہرو..... ڈارنگ! تم شاید کچھ غلط کہہ گئی ہو۔ تم نے ابھی ابھی مجھے ذہین عورت کہا۔ ذرا اپنا ذہن درست کر لو..... مرسیڈیز ابھی عورت نہیں بنی..... لڑکی ہے..... لڑکی وہی انیس بیس سال کی کنواری لڑکی.....“ مرسیڈیز نے ہنس کر کہا تو وہ بولی۔

”اوہ تم ایک شرارتی لڑکی ہو۔“ اس پر دونوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

”کون ہو تم..... اور یہاں میرے گھر میں کیا کر رہے ہو؟“ وہ غصے سے دہاڑا۔

”اتنی جلدی بھول گئے ہو۔ جوئی نام ہے میرا.....“ وہ ہولشر سے پہلے نکال کر ہاتھ میں نچاتے ہوئے بولا۔

”یہ میری پسند ہے اور جوئی اپنی پسند کو بھی چھوڑتا نہیں ہے۔ یہ دیکھو..... یہ ننھا سالو ہے کا کھلونا کس قدر ظالم ہے، مجال ہے کسی سے رعایت کرتا ہو.....“ جوئی نے انگلیوں پر پہل اچھالتے ہوئے کہا۔ ”اب چلتا ہوں پھر آؤں گا.....“ یہ کہہ کر وہ پہنکارتا ہوا باہر نکل گیا۔

مرسیڈیز جانتی تھی کہ اس کی طرح آرنی شا کو بھی جوئی ناپسند ہے مگر وہ اس ناگہانی آفت کو کس طرح ٹال سکتی تھی۔ آرنی شا بھی غصے سے باہر نکل گیا۔ ذرا سی دیر میں ایک قیامت سی آ کر گزر گئی تھی۔ ان کے جانے کے فوراً بعد شیرل نے مرسیڈیز سے پوچھا۔

”کون تھا یہ..... غنڈا لگتا ہے۔ اسے منع کر دو، یہ دوبارہ ہمارے گھر نہ آئے۔“

”پہلے کونسا میں نے اسے بلایا تھا۔“ مرسیڈیز نے جواب دیا۔

”پھر یہ کیسے آیا؟ میں ابھی پولیس میں اس کی رپورٹ درج کرواتی ہوں۔“ شیرل غصے سے بولی۔

”میرے خیال میں اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ شا کی نفرت بتا رہی تھی کہ وہ خود ہی اس سے نمٹ لے گا دیے میرا اندازہ ہے کہ وہ دوبارہ نہیں آئے گا۔“ مرسیڈیز نے اس کے گرم مزاج کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر کہا۔

مگر آرنی شا گھر چھوڑ کر گیا تو پھر دوبارہ واپس نہیں آیا بلکہ اس نے مرسیڈیز کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے کا پیغام بھجوا دیا۔ جیسے ہی مرسیڈیز کو علیحدگی کا پیغام ملا، وہ بہ ظاہر آنسوں کرتے ہوئے بولی۔

”اوہ..... بیچارہ آرنی شا کس قدر بزدل نکلا۔“

☆☆☆

آزادی کیا ملی کہ مرسیڈیز کو اب کھل کر کھینے کا موقع مل گیا۔ اب معاشی طور پر مرسیڈیز کو کسی قسم کی فکر نہ تھی۔ اس لیے وہ معاشرتی سرگرمیوں کے دریا میں کود گئی۔ اس نے کلبوں، کیسینوز اور ایسی پارٹیوں میں آنا جانا شروع کر دیا جہاں معاشرے کی کوئی حد یا پابندی لاگو نہیں ہوتی تھی۔ پھر اس نے چار پانچ سالوں میں چھ سات شادیاں کر ڈالیں۔ ہنری ٹوپنگ، لیکس پارکر، فریڈے، رونالڈ پیلر، ٹارڈون پاور کے ساتھ اس نے باقاعدہ شادیاں کیں اور ہر شادی کی



نے پوچھا۔

”یہ بات نہیں ہے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ کامیاب مرد وہ ہے جو اس سے زیادہ کمائے جتنا اس کی بیوی خرچ کر سکتی ہو جبکہ میں اس عورت کو کامیاب کہتی ہوں جو ایسا مرد ڈھونڈ سکے.....“ مرسیڈیز نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”تو گویا.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔  
 ”ہاں..... بالکل کچھ ایسا ہی میرے ساتھ اکثر ہوا ہے۔“ مرسیڈیز نے جوابا کہا۔

نمائندے نے مزید کچھ باتیں پوچھیں اور پھر شکر یہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

اگلے چند ماہ مرسیڈیز کے لیے خاصے مشکل تھے۔ جونئی اس دوران ایک دو بار گھر کا چکر لگا چکا تھا۔ اب دونوں کے درمیان... کبھی صلح کبھی لڑائی کا سلسلہ چل رہا تھا۔ وہ جب بھی آتا اس کا بس ایک ہی تقاضا ہوتا کہ مرسیڈیز اگر دوسرے مردوں کے ساتھ شادی کر سکتی ہے تو اس میں کیا کمی ہے مگر مرسیڈیز ہر بار اس کو نال دیتی تھی۔ اس روز وہ پھر صبح ہی صبح آدھرا۔

”میرے ساتھ چلو..... آج میں بھی تمہیں ڈیٹ پر لے جانا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں..... آج میں کہیں نہیں جا سکتی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ مرسیڈیز نے جواب دیا۔

”میں کچھ نہیں جانتا..... دیکھو..... جو کبھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے وہ جونئی انگلیاں میڑھی کر کے نکالنا بھی جانتا ہے..... مگر نہ جانے کیوں تمہارے ساتھ میں زبردستی نہیں کرنا چاہتا..... حالانکہ یہ میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میں نے اگر اتنا انتظار کیا ہے تو اس کی بھی وجہ تھی۔ میں نے کیوں باجانا تھا واپس آیا تو پتا چلا کہ تم نے میرے دوست اور کرم فرما جوزف اسٹیفن کرین سے شادی کر لی ہے۔ میں تب خاموش رہا..... تم نے اسے چھوڑ کر اور جگہ شادی کی پھر کئی مردوں کے پہلو گر ماتی نظر آئیں۔ پھر آرنی شا، فرنیڈو لاماس، رابرٹ ٹیلر، کئی روٹی، جان وین اور جیکل کی بغل میں نظر آتی رہیں۔ اب میں تمہیں کسی صورت نہیں چھوڑوں گا۔“ جونئی تو جیسے اس کی ہر شادی اور ہر محاشقے سے واقف رہا تھا۔

”تم مجھے اس قدر ذلیل سمجھتے ہو کہ میں جگہ جگہ مت مارتی ہوئی نظر آتی ہوں۔ تم یہاں سے فوراً نکل جاؤ اور آئندہ ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ جیل بھجوا دوں گی۔“

”تم مجھے اس قدر ذلیل سمجھتے ہو کہ میں جگہ جگہ مت مارتی ہوئی نظر آتی ہوں۔ تم یہاں سے فوراً نکل جاؤ اور آئندہ ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ جیل بھجوا دوں گی۔“

”تم مجھے اس قدر ذلیل سمجھتے ہو کہ میں جگہ جگہ مت مارتی ہوئی نظر آتی ہوں۔ تم یہاں سے فوراً نکل جاؤ اور آئندہ ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ جیل بھجوا دوں گی۔“

”تم مجھے اس قدر ذلیل سمجھتے ہو کہ میں جگہ جگہ مت مارتی ہوئی نظر آتی ہوں۔ تم یہاں سے فوراً نکل جاؤ اور آئندہ ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ جیل بھجوا دوں گی۔“

”تم مجھے اس قدر ذلیل سمجھتے ہو کہ میں جگہ جگہ مت مارتی ہوئی نظر آتی ہوں۔ تم یہاں سے فوراً نکل جاؤ اور آئندہ ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ جیل بھجوا دوں گی۔“

”تم مجھے اس قدر ذلیل سمجھتے ہو کہ میں جگہ جگہ مت مارتی ہوئی نظر آتی ہوں۔ تم یہاں سے فوراً نکل جاؤ اور آئندہ ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ جیل بھجوا دوں گی۔“

”تم مجھے اس قدر ذلیل سمجھتے ہو کہ میں جگہ جگہ مت مارتی ہوئی نظر آتی ہوں۔ تم یہاں سے فوراً نکل جاؤ اور آئندہ ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ جیل بھجوا دوں گی۔“

مردوں کے بارے میں مرسیڈیز کا کہا ہوا فقرہ اتنا مشہور ہوا تھا کہ اب وہ جس فنکشن میں بھی جاتی عورتیں اور لڑکیاں اس کے گرد جمع ہو کر ضرور اس سے سنتیں اور پھر اس کی تعریف کیے بنا نہ رہتی تھیں۔ یہ ایک ایسی ہی نیم سیاسی پارٹی تھی جہاں مرسیڈیز بھی مدعو تھی۔ جب ایک مشہور زمانہ شو بزنس میگزین ”ہالی وڈ رپورٹرز“ کا پبلشر ”ولیم وکرس“ بھی اپنے میگزین کے فوٹو گرافر اور نمائندے کے ساتھ وہاں آیا ہوا تھا۔

مرسیڈیز کی گھومتی اور ڈھونڈتی بلوریں آنکھیں ادھر ادھر اپنا شکار ڈھونڈ رہی تھیں۔ ولیم وکرس نے اپنے نمائندے کو اشارے سے اپنے پاس بلا یا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ نمائندے کی نگاہیں مرسیڈیز کی نظروں سے ملیں تو وہ فوٹو گرافر کو لے کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

”میں ڈاک گواڈرز ہوں..... ہالی وڈ رپورٹرز میگزین سے میرا تعلق ہے۔ میرے پبلشر ولیم وکرس نے آپ کے بلائیز حسن اور آپ کی خوب سورتی کی حشر سامانیوں سے مرعوب ہیں۔ میں اپنے میگزین کے لیے آپ سے کچھ پوچھنا چاہوں گا۔ آپ اسے انٹرویو بھی کہہ سکتی ہیں۔“  
 ”میرا نام مرسیڈیز بارخا ہے۔ کبھی میں سویٹر گرل کی عرفیت سے مشہور تھی۔“

”اوہ تو آپ ہیں وہ جس کی شہرت کی بازگشت آج بھی ٹاپ ہیٹ کیفے میں سنائی دیتی ہے؟“ نمائندے نے پوچھا۔

”بلاشبہ وہ میں ہی ہوں۔“ مرسیڈیز نے فخر سے کہا۔  
 ”اگر میں جھوٹ نہیں کہہ رہا تو میڈیم آج بھی آپ کا حسن نو جوان لڑکی سے کم نہیں ہے۔“ نمائندہ بولا۔  
 ”بس دیکھ لیں، کتنی مشکل سے میں نے اپنے جسم کو مناسب رکھا ہوا ہے۔“ مرسیڈیز بولی۔

”آپ لاس اینجلس کے مشہور و معروف فلمی اسٹوڈیو کے قریب رہیں۔ آپ کے ظاہری حسن کو بھی کسی بناؤ سنگمار کی ضرورت نہیں رہی۔ پھر بھی آپ نے فلموں میں کردار نہیں کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”بس یونہی مجھے شوق نہیں رہا.....“ مرسیڈیز بولی۔  
 ”آپ شادی شدہ ہیں.....“ اس نے اگلا سوال کیا تو قریب سے گزرتی ایک دوسری عورت نے لقمہ دیا۔

”ایک شادی..... کم و بیش آٹھ شادیاں تو کر ہی چکی ہیں۔“ عورت ہنستی ہوئی لقمہ دے کر... آگے نکل گئی۔

”کیوں ایک بھی شادی آپ کو اس نہیں آئی؟“ اس



مرسیڈیز نے غصے سے کہا تو جونی بھی اشتعال میں آ گیا۔

”کونسی پولیس کی دھمکی دے رہی ہو جو ہمیشہ سے جونی کی جوتیوں میں پڑی رہتی ہے۔ آج میں تمہیں ہر حال میں ساتھ لے کر جاؤں گا۔ دیکھتا ہوں کیسے انکار کرتی ہو۔“ یہ کہہ کر جونی نے مرسیڈیز کو بازو سے پکڑا اور باہر کی طرف گھسیٹنے لگا۔ مرسیڈیز اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھی مگر جونی کی سخت گرفت سے آزاد نہیں ہو پارہی تھی۔ شیرل اسکول گئی ہوئی تھی۔ باہر کا دروازہ کھلا تھا پھر اچانک شیرل اسکول سے واپس آ گئی۔

جونہی اور اپنی والدہ کو تو تین میں اور ہاتھ پائی کرتے دیکھ کر شیرل سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے اسکول بیگ ایک طرف پھینکا اور دوڑ کر باورچی خانے سے سبزی کاٹنے والی چھری اٹھا لائی۔

”چھوڑ دو میری ماما کو.....“ وہ دور سے دھاڑی۔

”کیا کر لو گی تم سہمی پری.....“ جونی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آج میں اسے اپنے ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔ بہت ہو چکا..... اب مزید انتظار نہیں ہو سکتا۔“ اس نے مرسیڈیز کو پیچھے سے پکڑ کر دونوں بازوؤں میں جکڑا اور اٹھا کر باہر لے جانے لگا۔

شیرل غصے سے آگے بڑھی اور تیز چھری سے اس کی پشت پر وار کر دیا۔ چھری وہاں سے نکالی اور پھر گردن میں گھونپ دی۔ جونی اس اچانک حملے سے گھبرا کر واپس پلٹا تو شیرل نے جرات کر کے ایک دو وار اس کے دل کے قریب کر ڈالے۔ جونی چھریوں کے پے در پے وار سے زمین پر گر پڑا۔ خون کے فوارے اس کے جسم سے نکل کر زمین کو میرا ب کرنے لگے تھے۔ رہی سہی کسر اس کے گرے ہوئے جسم پر مزید چھریاں مار کر شیرل نے پوری کر دی۔ وہ غصے سے پھری ہوئی تھی۔ جونی کا تڑپتا ہوا وجود جلد ہی ٹھنڈا ہو گیا۔

جونہی اسٹو پنٹاؤ قتل ہو چکا تھا۔ ایک بہت بڑا بد معاش اور دہشت کا پہاڑ گر چکا تھا۔ ایک بہت ہی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر چکا تھا۔ مرسیڈیز کو ہوش آیا تو اس نے فوراً خود ہی پولیس کو فون کر دیا۔ شیرل کو آلہ قتل سمیت گرفتار کر لیا گیا تھا۔

اگلی صبح شہر کے اخبارات میں جونی اسٹو پنٹاؤ کے قتل کی خبر بڑی نمایاں کر کے شائع کی گئی جس کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ ملزمہ آلہ قتل سمیت گرفتار کر لی گئی ہے۔ دو پہر کو

مرسیڈیز کو جو پہلاناؤن ملا وہ جوزف اسٹینن کرین کا تھا۔

”مرسی..... یہ میں نے کیا پڑھا ہے؟“

”یہ ٹھیک ہے جوزف..... شیرل نے جونی اسٹو پنٹاؤ کو چھری سے وار کر کے ختم کر ڈالا ہے۔ اسے خطرہ ہو گیا تھا کہ کہیں جونی اس کی ماں کو مار ہی نہ دے۔“

”وہ کب آیا تھا.....؟“ جوزف نے پوچھا۔

”اس نے میرا پیچھا چھوڑا ہی کب تھا۔ وہ میں ہی تھی جو آج تک اس سے بچتی چلی آرہی تھی۔ وہ اس وقت تک مجھ سے دور رہا جب تک میں تمہارے ساتھ رہی۔ تم ٹھیک کہتے تھے جوزف..... کہ جونی تم سے خوف زدہ ہے مگر جونی میرا اور تمہارا ساتھ چھوٹا، وہ مجھے جب بھی ملتا ہمیشہ دھمکی آمیز اور توہین کر دینے والا رہتا تھا۔ پھر اس روز تو حد ہی ہو گئی۔ شیرل اس روز اسکول گئی ہوئی تھی کہ وہ دندناتا ہوا گھر میں داخل ہوا اور مجھ سے زبردستی کرنے لگا۔ وہ مجھے گھسیٹتا ہوا باہر لے جانے کی کوششوں میں مصروف تھا جب شیرل آ گئی۔ اس نے جونی کو مجھ سے ہاتھ پائی کرتے دیکھ لیا تھا پھر اس نے غصے میں آ کر چھری سے اسے قتل کر ڈالا۔“

”تم فکر نہ کرو..... میں کچھ کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر جوزف نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ جوزف کی واقفیت اور دولت دونوں نے مل کر شیرل کی جلد ہی ضمانت کروالی۔ جونی کا قتل پولیس کی تحقیقی رپورٹ کے مطابق ذاتی تحفظ کے لیے کیا جانے والا قتل قرار دیا گیا جس کی بنیاد پر اس کی جلد ضمانت ہو گئی۔ کچھ عرصہ کیس عدالت میں چلنے کے بعد کوئی گواہ نہ ہونے اور عدم شہادتوں کی وجہ سے اسے خارج کر دیا گیا..... اور شیرل رہا ہو کر واپس گھر آ گئی۔ شیرل کی رہائی کے بعد منعقدہ ایک فنکشن میں مرسیڈیز نے دوبارہ جوزف اسٹینن کرین سے شادی کر لی۔ اتنے سارے مردوں میں جوزف پہلا بوڑھا مرد تھا جس سے مرسیڈیز نے دوسری بار شادی کر لی تھی۔ اس کی شادی اور شیرل کی رہائی کی خوشی میں ہونے والے جشن میں اس نے خود ایک عورت کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا۔ ”مرسیڈیز وہ خوش قسمت عورت ہے جس نے ہمیشہ کامیاب مردوں کا چناؤ کیا۔ یہ دیکھ کر کہ آیا یہ مرد اتنا کما سکتا ہے جتنا وہ خرچ کر دیتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کی کامیاب ترین عورت ہے۔“ مگر آخر میں مرسیڈیز ایڈز کا شکار ہو کر انتہائی برے حالات میں موت کے ہاتھوں ٹھکت کھا گئی.....





کانگ اور ڈریکولا کے نمونے نظر آجاتے ہیں چنانچہ میں نے  
..... اتر ہو سٹس کی پیش کردہ کافی قبول کی اور اخبار نکالا۔ اسی  
وقت ریچھ جیسا پنچہ میرے شانے پر پڑا اور میں عملاً اچھل  
پڑا۔ کافی نیچے گر گئی اور کچھ لوگوں نے ناپسندیدگی کے ساتھ  
مجھے گھورا۔ شکر ہے کہ چھت کافی بلند تھی ورنہ میرا سر ٹکرانے  
سے جہاز کا توازن بگڑ جاتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔

دیوزار کے حلق سے سڑک کوٹنے والے انجن جیسی  
صدا بلند ہوئی جو دراصل اس کی ہنسی کی آواز تھی۔ میں نے  
شانے کو پھلایا اور مساتنت کو برقرار رکھتے ہوئے اسے ملامت

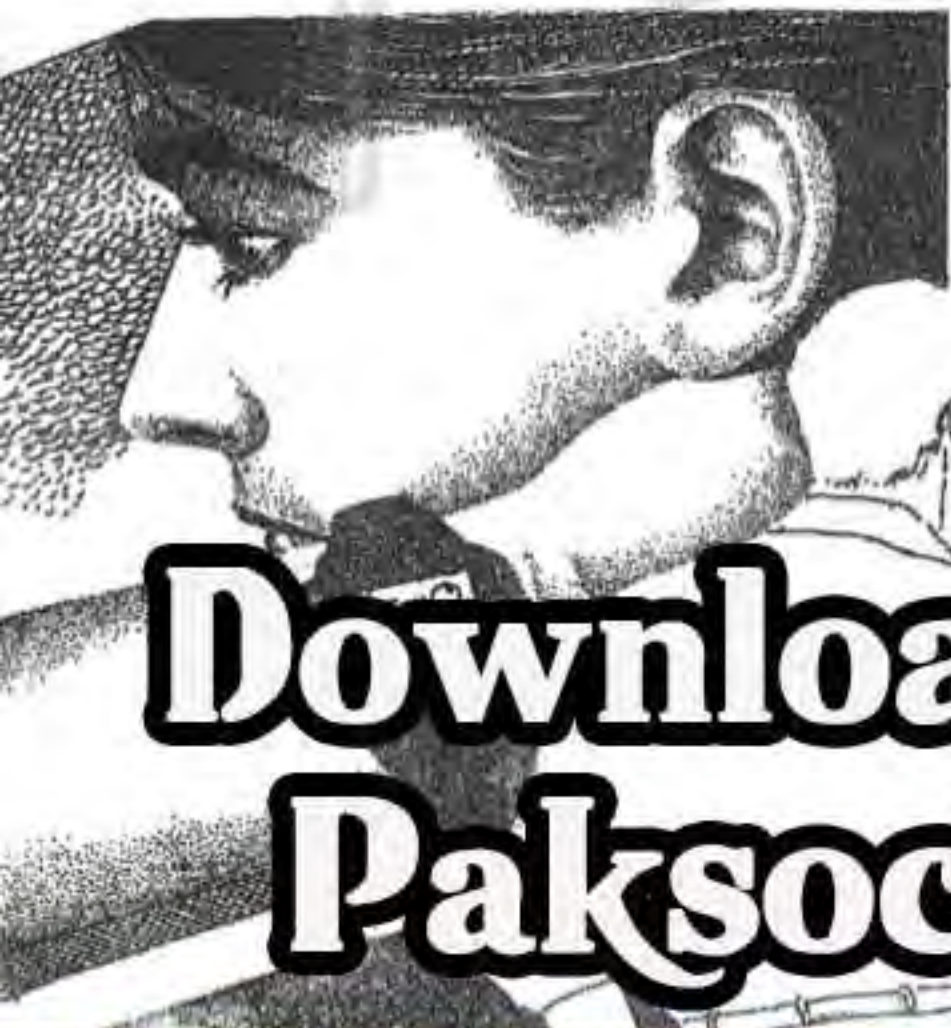
وہ ٹوکیو سے آنے والی فلائٹ پر پہلے سے موجود تھا  
اور جب جزیرہ ”ہوائی“ سے میں جہاز پر سوار ہوا تو مجھے اس  
کے ساتھ والی نشست ملی۔ میں اس گینڈے اور بن مانس کی  
مخلوط نسل کے آدمی نما پہاڑ کے ساتھ چوہے کی طرح دبک کر  
نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی غیر معمولی  
جسامت کا جائزہ میں نے اس وقت لیا جب اطمینان سے  
بیٹھنے کے بعد مجھے یقین آ گیا کہ جہاز بہ حفاظت ٹیک آف  
کر چکا ہے اور سیٹ بیلٹ کھولنے کے علاوہ سگریٹ پینے کی  
اجازت بھی ملی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی، دنیا میں کنگ

سیم جاوید سید

## ناواقف

وقت کا اگر وجود ہوتا تو شاید دنیا میں اس سے زیادہ طاقت کسی کے  
پاس نہ ہوتی مگر... اس کے باوجود وقت میں ایک کمزوری بھی اللہ نے  
رکھ دی ہے۔ اگے بڑھنے میں یہ جس قدر تیزی دکھاتا ہے اتنی ہی خوب  
صورتی سے اس کے واپسی کے راستے بھی مسدود ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا  
تو وہ بھی وقت کی سوئی اپنی مرضی سے پلٹا دیتا۔ بہر حال وقت کے ہی  
حوالے سے ذرا سی ناواقفیت نے اسے کال کو ٹھہری تک پہنچا دیا۔ بات  
وہی ہے... مجرم چاہے جتنی چالاکی دکھائے... کہیں نہ کہیں  
ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے۔

پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے مجرم کی  
بدلتی سستوں کا ماجرا



Downloaded From  
Paksociety.com



گئی جس کی تصویر رسائل و اخبارات، ٹیلی ویژن، اور پوسٹروں میں ہر جگہ دکھائی جا رہی تھی۔ جوزف بالآخر پکڑا گیا اور اس پر سزائے موت کے شدید مطالبے کے ساتھ مقدمہ چلا کر قانونی پیچیدگی اور وکیل صفائی کی مویشگافی کے باعث بنیادی گواہ منحرف قرار دے دیا گیا اور استغاثہ کی کمزور شہادتوں کے نتیجے میں جوزف صاف بچ گیا۔ یہ قانون کی بے بسی کے ان متعدد واقعات میں سے ایک واقعہ تھا، جب شبہ کی ایک فیصد گنجائش نہ ہونے کے باوجود جرم ثابت نہیں ہوتا اور سزا دینے والے بے بسی میں بیچ و تاب کھاتے رہ جاتے ہیں۔ سرکاری وکیل نے عدالت کے باہر بیچ بیچ کر کہا تھا کہ جوزف، کسی روز میں تمہیں گھسیٹ کر موت کی کرسی تک نہ لے گیا تو تمہیں یا خود کو شوٹ کر دوں گا۔ جوزف نے ایک زوردار تہتہ لگایا اور غائب ہو گیا۔ ان گنت لوگ جو اس کی جان کے دشمن تھے جھک مارتے رہ گئے۔ ان حالات میں جوزف کے تعارف سے مجھ پر سکتہ طاری ہو جانا قدرتی بات تھی۔

میں نے بمشکل تمام خود پر قابو پایا اور قاتل یا مقتول بننے سے بچ گیا۔ ”تم؟“ میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔  
 ”ہاں۔“ وہ میری حالت دیکھ کر مسکرایا۔ ”میں بھی سان فرانسسکو ہی جا رہا ہوں۔“

”تمہیں معلوم ہے سان فرانسسکو میں تمہارا حشر کیا ہوگا۔“ میں نے جرأت..... خوف اور صدمے کے ابتدائی اثرات سے سنبھل کر کہا۔ ”تم یہ سمجھ رہے ہو کہ پانچ چھ سال بعد کوئی تمہیں نہیں پہچانے گا یا لوگ بھول چکے ہوں گے.....“

اس نے ایک بار پھر میرے شانے پر ہاتھ مارا جس سے میرے بدن کی کل دوسو بیالیس ہڈیاں بل گئیں۔ اس کے گز گز اہٹ جیسے تہتہ پر بہت سے لوگوں نے سر گھا کر دیکھا مگر جوزف پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ”میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں رپورٹر..... لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں بقائی ہوش و حواس کہہ رہا ہوں۔ پوپیس اور قانون کی ایسی تیسی۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ مجھ سے زیادہ تو تمہاری حالت غیر ہو رہی ہے۔ حالانکہ میں نے یہ بات تمہیں اس لیے بتائی ہے کہ تمہیں میرا ایک کام کرنا ہے۔ تمہارے سوا یہ کام کوئی نہیں کر سکتا۔“

”میں.....؟ میں کیوں کروں گا تمہارا کوئی کام.....“ میں نے گڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

”تمہارا تو باپ بھی کرے گا۔“ وہ بولا۔ ”میں اس کا معاوضہ دوں گا حالانکہ فائدہ اس کام سے تمہیں بھی کم نہیں

آئینہ نظروں سے گھورا۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

”میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔“ اس نے اپنے میلے دانتوں کی نمائش کی۔ ”تم وہی ہونا، اخباری نمائندے؟ کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ اس جہاز میں کوئی اخبار والا بھی ہے۔ تم نے پہچانا مجھے؟“

میں نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔ ذہن میں ان گنت چہروں کے نقوش تھے اور یہ چہرہ نہ جانے کس سے ملتا جلتا تھا۔ دماغ کا کمپیوٹر جھنجاہٹ کے باعث صحیح کام نہیں کر رہا تھا۔ چھ ساڑھے چھ فٹ قد اور ڈھائی تین سو پونڈ وزن کا یہ شخص بڑے عامیاناہ حلیے میں تھا۔ کریز سے بے نیاز پتلون جس کا رنگ گھٹنوں پر سے سیاہ اور باقی مقامات پر سیاہ و سفید کا امتزاج تھا۔ زرد میٹھی جس کا کالر بھی گردن کے گرد سیاہ پڑ چکا تھا۔ جوتوں پر غالباً اسی عہد میں پالش ہوئی تھی جب انہیں بنایا گیا تھا۔ بکھرتے ہوئے بال، بڑھی ہوئی شیو اور آنکھوں کے حلقے اس کی صورت کے کرخت نقوش کی بدسورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ اس حلیے کا کوئی شخص میرا دوست نہیں ہو سکتا تھا۔

”میں جوزف ہوں، جوزف کلارک..... یاد آیا؟“ وہ بولا۔

یک لخت مجھے محسوس ہوا کہ چاروں جیٹ انجن فیل ہو گئے ہیں لیکن باقی مسافر مطمئن بیٹھے تھے کیونکہ دراصل ایک لمحے کے لیے میری حرکت قلب بند ہی ہو گئی تھی۔ جہاز کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ دل نے دوبارہ دھڑکننا شروع کیا تو گزشتہ چھ سال کے واقعات کی فلم ذہن کے پردے پر سے چند منٹ میں گزر گئی۔ پانچ چھ سال پہلے جوزف نے سات سال کے ایک بچے کو اغوا کیا تھا جو لکھ پتی والدین کا اکلوتا بیٹا تھا چنانچہ مطالبے پر انہوں نے ڈھائی لاکھ ڈالرز خاموشی سے ادا کر دیے تھے مگر جوزف نے رقم وصول کرنے کے بعد بچے کو قتل کر دیا تھا اور غائب ہو گیا تھا۔ اس سانحے پر بڑا کہرام مچا تھا۔ اخبارات ہاتھ دھو کر پولیس اور سراغ رساں اداروں کے پیچھے پڑ گئے۔ پارلیمنٹ میں طوفان آ گیا اور وزیر داخلہ کی کرسی اور عزت ہی نہیں، برسر اقتدار حکومت کی بنیادیں متزلزل ہونے لگی تھیں۔ اغوا کر کے تاوان کی رقم ملنے تک دھمکیاں تو سب ہی مجرم دیتے ہیں مگر مطالبہ پورا ہو جانے کے بعد ایک محسوم بچے کو کسی جواز کے بغیر ہلاک کر دینے والے بے ضمیر اور سفاک مجرم بہت کم ہوتے ہیں چنانچہ نفرت اور غصے کا پھیلنا ایک فطری امر تھا اور پولیس کے ساتھ بلکہ بھی جوزف کی تلاش میں لگ



ہوگا۔“ ایک جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے پچاس ڈالر کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور واپس رکھ لی۔ پھر دوسری جیب سے سو سو ڈالر کے نوٹ نکالے اور گڈی کو کسی اندازے کے بغیر درمیان سے موڑ کر آدھے نوٹ میری طرف بڑھائے جو تقریباً پانچ ہزار ڈالر کی رقم تھی۔ نوٹ پرانے اور اصلی تھے مگر میں نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔

”لے لو اور میری بات سن لو ورنہ ایک جھانپڑ مار کر دماغ درست کروں گا۔“ اس نے مشتعل ہوئے بغیر کہا۔ جھانپڑ کے نقصانات کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے نوٹ جیب میں ڈال لیے۔ مجرم قانون کی گرفت میں تھا اور یہ رقم کسی بھی وقت واپس کر سکتا تھا۔ لیکن جہاز میں جبراً نوٹ جاتا تو کوئی میرے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سوائے مجھ پر ہنسنے کے۔

”یہ بیجانہ ہے۔“ وہ آنکھ مار کے مسکرایا۔ ”بعد میں استادوں کا کہ چاہو تو اپنا اخبار نکال لینا۔ ہر رپورٹریڈیٹر بننے کا خواب دیکھتا ہے۔ کام صرف یہ ہے کہ تم بطور گواہ میرے ساتھ رہو۔ میں نے اپنے دوستوں کو تو اطلاع دے دی ہے اور وہ سب میرے استقبال کے لیے یقیناً موجود ہوں گے مگر ایک اخباری نمائندہ بھی تو ہونا چاہیے جو دیکھ لے کہ جوزف دی گریٹ کس شان سے اور کتنی بے خوفی کے ساتھ واپس آیا ہے۔ چوری چھپے نہیں علی الاعلان وہ ڈھائی لاکھ ڈالر نہیں چھوڑ گیا تھا۔ وہ بھی میں تمہارے سامنے وصول کروں گا۔ پولیس اور قانون کے محافظوں کی نظروں کے سامنے..... اور یہ سب کچھ تم ابتدا سے انتہا تک اپنے اخبار میں چھاپ دینا۔ اب بتاؤ یہ زبردست کہانی ہے یا نہیں؟ تمہارا بیچ بن جائے گا۔ میں کسی اور اخبار والے کو فون کر دیتا تو وہ مجھے ایک لاکھ ڈالر دے دیتا۔ پچاس ہزار تو کہیں نہیں گئے۔ مجھے دیکھو، النامہ میں دے رہا ہوں۔ لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں نشے میں ہوں یا میرا دماغ چل گیا ہے۔“

میں بھونچکا بیٹھا رہا کیونکہ اس کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ یہ کہانی نہیں ایٹم بم کے دھماکے جیسی خبر تھی اور مجھے اس کے جملہ حقوق و ذمہ داریوں کے معاوضے کے ساتھ مل رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ میرا اپنا اخبار بھی مجھے پچاس ہزار ڈالر ہاتھ باندھ کر دے دے گا۔ ورنہ صرف اتنی دھمکی بہت ہوگی کہ یہ رہا میرا استعفا اور میں اب فلاں اخبار میں جا رہا ہوں جو اس سے دگنے بھی دے سکتے ہیں۔ اپنے ذاتی اخبار کی ملکیت کا خواب یکنگت حقیقت کے روپ میں ڈھلنے لگا تھا چنانچہ میرا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ خوف کی بجائے

اضطراب نے لے لی اور حیرت پر تجسس غالب آ گیا۔  
”تمہارے یہ ڈھائی لاکھ ڈالر زہیں کہاں.....؟“ میں نے کہا۔

”میرے ساتھ ساتھ رہو.....“ وہ ہنسا۔ ”تمہیں سب معلوم ہو جائے گا۔ برسوں سے میں اسی دن کے انتظار میں تھا اور میں نے اپنے کینڈر میں اس تاریخ کو نوٹ کر رکھا تھا۔ جب دن ڈھلتا تھا اور رات آتی تھی تو میں سوچتا تھا اور رات کو کسی وقت تاریخ بدل جاتی تھی اور میری آنکھ نئے دن کے ساتھ کھلتی تھی۔ جیسے جیسے یہ تاریخ قریب آتی گئی میرے صبر کی آزمائش سخت سے سخت تر ہوتی گئی لیکن میں مجبور تھا اگر میں صرف ایک دن پہلے بھی آ گیا ہوتا تو قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکتا تھا لیکن آج میرے لیے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ میری زندگی کا سب سے اہم دن ہے کیونکہ اس مخصوص دن نے مجھے ڈھائی لاکھ ڈالر کی اس دولت کا مالک بنا دیا ہے جو میں نے چھ سال پہلے کمائی تھی۔ اب تک یہ دولت میری تھی مگر میں اس کا مالک نہیں تھا۔“

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک دن کے فرق سے اس کے جرم کی سنگینی اچانک ختم کیسے ہو سکتی ہے اور اگر کل تک وہ ڈھائی لاکھ ڈالر کی ملکیت سے محروم تھا تو آج اچانک یہ دولت اس کی کیسے ہو گئی؟ یقیناً اس میں کوئی قانونی چکر تھا نہ جانے کیوں میرے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ قانون اتنا اندھا گونگا اور پانچ نہیں ہے کہ ایک بے ضمیر مجرم اس کے سامنے کھڑا ہو کر اس کا مذاق اڑاتا رہے۔ وہ دولت انسانیت کے نام پر بدنامی داغ تھی..... ایک بے گناہ معصوم لہو کا داغ۔ مگر وہ مکمل تحفظ کے احساس اور اعتماد کے ساتھ ان سب کو کھلا چیلنج دینے آ گیا تھا جو اب تک اپنے ضمیر کی عدالت میں شرمندہ کھڑے تھے کہ اپنے نظام انصاف کی کوتاہیوں کے باعث وہ اصل مجرم کو سزا نہ دے سکے۔ مجھے امید تھی کہ شاید اس کی زبان سے کوئی غلط لفظ نکل جائے۔ وہ شہنی میں کوئی ایسی شہادت بیان کر دے جو مقدمے کے دوران سامنے نہیں آئی تھی۔ کسی گواہ کا ذکر کر دے جو اب تک پس پردہ رہا تھا پھر جہاز سے اترتے ہی میں اس کی رقم اس کے منہ پر مار دوں گا کہ دنیا بھر کی دولت اس خون کے ایک قطرے کا بھی قصاص نہیں ہو سکتی جس سے اس کا دامن آلودہ ہے اور قاتل کو کیفر کر دار تک پہنچانے کے لیے اسے قانون کے حوالے کر دوں گا۔

”تم کیسے احمق رپورٹرز ہو.....“ وہ مذاق اڑاتے



ہوئے بولا۔ ”ہفتہ بھر سے میں رچی کے معمولات کی نگرانی کر رہا تھا اور موقع کی تاک میں تھا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ہر جمعرات کی شام کو وہ اس موسیقارِ اعظم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے جو خود گدھے سے زیادہ بے سراگاتا ہے۔ وہ تھا بھی بالکل گھاٹنٹا۔ بالکل کاٹھ کا الو..... میں نے سوچا یہی جگہ بہتر رہے گی۔ جمعرات کو میں اس پیانو ماسٹر کے گھر پہنچا۔ پیانو تو ذرا بھاری تھا میں نے ایک والکن اس کے طبلے جیسے سر پر مارا تو وہ حلق سے ایک سُر بلند کیے بغیر لیٹ گیا۔ پھر وہ بچہ آ گیا۔ ایک تھپڑ کھا کر وہ چپ ہو گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ پیر باندھے، حلق میں کپڑا ٹھونسا اور گاڑی میں ڈال کر لے گیا۔ یہ تو تم نے بھی سنا ہوگا کیونکہ ہوش میں آتے ہی وہ موسیقار کسی ریکارڈ کی طرح بجنے لگا تھا اور اس نے فوراً سب کو بتا دیا کہ کیا ہوا ہے۔ وہ کوئی عام قسم کا بچہ نہیں تھا۔ یہ جو گلیوں میں کتے کے پلوں کی طرح دوڑتے پھرتے ہیں..... وہ بے حد قیمتی بچہ تھا۔“ جوزف مکروہ انداز میں ہنسا۔

خون میری رگوں میں تیزاب کی طرح سفتانے لگا۔ اگر میں بزدل نہ ہوتا تو وہیں اس شیطان کو قتل کر دیتا مگر میں عقل اور مصلحت کے تقاضوں میں الجھ گیا۔ ”جوزف.....“ میں نے کہا۔ ”رہنم مل چکی تھی مگر اس کے باوجود تم نے اس بچے کو قتل کر دیا..... آخر کیوں؟ کیا ضرورت تھی اس خون ریزی کی.....؟“

”وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ذہین تھا۔“ وہ سوچ کر بولا۔ ”وہ مجھے شناخت کر لیتا۔“

”شناخت تو تمہیں اس پیانو ماسٹر نے بھی کر لیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”پھر تمہارے ساتھ چند اجنبی دائیں بائیں کھڑے کیے گئے تو بات بگڑ گئی۔ اس پیانو ماسٹر نے کسی اور کی طرف انگلی اٹھا دی۔ مجھے ہی نہیں سب کو یقین تھا کہ پیانو ماسٹر نے عمداً ایسا کیا ہے۔ وہ خوفزدہ تھا اور واحد یعنی گواہ کو منحرف قرار دے دیا گیا تو تم بالکل صاف بچ گئے.....“

”اس پیانو ماسٹر کی جگہ تم ہوتے مسٹر پورٹر، تو تم بھی یہی کرتے۔“ وہ بولا۔ ”سمجھانے والے نے اسے سمجھا دیا کہ دوبارہ شناخت کی غلطی کی تو خود اس کی لاش کی شناخت بھی نہیں ہو سکے گی۔“

”سمجھانے والے تمہارے گروہ کے لوگ تھے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں اور میں اس گروہ کا سرغنہ اس لیے تھا کہ ان سب سے زیادہ سمجھ دار تھا۔“ جوزف نے کہا۔ ”یہ قانون کے

ماہر بنتے ہیں۔ میں ان سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ جیسے چور نقب لگانے سے پہلے جائے واردات کا جائزہ لے کر سمجھ لیتا ہے کہ حفاظتی نظام میں کمزوری کہاں ہے ایسے ہی قانون شکنی سے پہلے قانون کی کمزوریوں کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے مسٹر پورٹر..... اور میں سمجھتا ہوں کہ قانون کی کمزوری میری وہ طاقت ہے جس کے سہارے پر میں اب بے خوف و خطر لوٹ آیا ہوں۔“

مجھے اندازہ تھا کہ وہ کس کمزوری کا حوالہ دے رہا ہے۔ ہر جرم، ہر قانونی کارروائی کے لیے میعاد مقرر ہے۔ کوئی شخص مہینوں بعد عدالت میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں شخص نے مجھے گینڈا کہا تھا چنانچہ ہنگ عزت اور ہر جانے کا دعویٰ آج تسلیم کیا جائے کیونکہ گینڈا میں نے آج دیکھا ہے اور بے عزتی کا احساس مجھے آج ہوا ہے۔ ہر واردات کی فوری رپورٹ ضروری ہے ورنہ ایک خاص میعاد کے بعد قانونی کارروائی غیر مؤثر ہو جاتی ہے۔

”تمہاری یہ دولت اب تک کہاں تھی؟“ میں نے کہا۔

”کسی بینک میں تو جمع نہیں کرائی تھی تم نے.....؟“ وہ ہنسا..... ”اگر ایک نوٹ بھی ادھر ادھر ہو جاتا تو معلوم ہو جاتا کہ رقم کہاں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں جانتا تھا وہ نمبروں کی لسٹ لیے شکاری کتوں کی طرح نوٹوں کی بوسو گتے پھر رہے ہیں۔“

”چنانچہ تم نے کسی فرضی نام سے کسی بینک کے لا کر میں ڈھائی لاکھ ڈالر جمع کرادیے.....“ میں نے قیاس آرائی کی۔

اس نے وہی خوفناک قہقہہ بلند کیا اور پھر اپنا ہاتھ میرے شانے پر مارا۔ ”تم اتنے بے وقوف بھی نہیں ہو جتنے نظر آتے ہو۔“

”ہاں!“ میں نے کندھے کو ہلا کر تمام ہڈیوں کی سلامتی کا یقین کیا۔ جوڑ غالباً اہل گئے تھے۔ ”اب تم کس امید پر لوٹے ہو؟ قانون کی کسی کمزوری کا ذکر کیا تھا تم نے..... کیا اب وقت اتنا گزر گیا ہے کہ تم پر مقدمہ دوبارہ نہیں چل سکتا؟“

”مقدمہ کیسا.....؟“ وہ حیرانی سے بولا۔ ”میں نے چوری نہیں کی ڈاک نہیں ڈالا۔ ایک شخص نے اپنی مرضی سے یہ رقم مجھے دی تھی۔ اس کے بچے کو اغوا اور قتل کرنے کے الزام سے تو عدالت مجھے پہلے ہی بری کر چکی ہے۔“

”پھر تم اس ایک تاریخ کا انتظار کیوں کر رہے تھے؟“ میں نے کہا۔

”اس لیے کہ چھ سال پورے ہونے سے پہلے میں یہ



رقم نکالنا تو انکم ٹیکس والے مجھے پکڑ لیتے.....“ وہ حقارت بھرے لہجے میں بولا۔ ”وہ فرماتے مسٹر جوزف! پچھلے سال تمہاری آمدنی یہ تھی، اب اس سال کی آمدنی کا ذریعہ بتاؤ۔ مگر چھ سال بعد قانون غیر موثر ہو جاتا ہے۔ چھ سال پہلے کی آمدنی پر نہ انکم ٹیکس لگایا جاسکتا ہے نہ یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ رقم کہاں سے آئی۔ پولیس ہرنوٹ کا نمبر دیکھ لے گی۔ یہ وہی نوٹ ہیں جو چھ سال پہلے رچی کے باپ میلوف نے مجھے دیے تھے لیکن آج پورے چھ سال بعد کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اس میں سے ایک پیسا بھی نہیں لے سکتا.....“

شیطان کے سامنے انسان کتنا کمزور اور بے بس ہے، سفر کے ان اٹھ گھنٹوں میں یہ بات ثابت ہو گئی۔ دوپہر کے ایک بجے جہاز سان فرانسسکو ایئر پورٹ پر اترا۔ میں جوزف سے ایک قدم پیچھے رہ کر مسافروں کی قطار میں ہوائی اڈے کی عمارت تک پہنچا۔ جوزف کے کارندے میرے جانے پہچانے تھے لیکن وہاں ان میں سے کوئی اپنے چیف کو جلا وطنی کے چھ سال بعد خوش آمدید کہنے کے لیے موجود نہیں تھا۔ ”کوئی کمینہ نہیں آیا..... سب سالے بزدل ہیں.....“ جوزف نے ادھر ادھر نگاہ ڈال کر برہمی سے کہا۔ ”خیر، اب میں آ گیا ہوں۔ ہر نمک حرام سے نمٹ لوں گا۔“ اسی وقت کیلی فورنیا سمورے ہوا جو ایک اور گروہ کا سرغنہ تھا۔ کیلی اور جوزف کی دوستی مشہور تھی اور ان کی متحدہ قوت کے سامنے چھوٹے موٹے بد معاشوں کی دال نہیں گلتی تھی..... دبلا پتلا شریف صورت اور محزز نظر آنے والا شخص کیلی جو کسی بد معاش کے بجائے پروفیسر لگتا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے کسی نے اس کی موجودگی کو نوٹ نہیں کیا تھا۔ وہ شان بے نیازی سے ادھر ادھر دیکھتا، ٹہکتا ہوا قریب آیا..... ”ہیلو جوزف.....“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”کیلی..... میں نے سب کو اطلاع دے دی تھی.....“ جوزف نے غصے سے کہا۔ ”کہاں مر گئے ہیں سب لوگ.....؟“

”انہوں نے مجھے بھیجا ہے۔“ کیلی نے کہا۔ ”پوچھنے کے لیے کہ اس حماقت کا مقصد کیا ہے؟“ ”میں وہ پیسا لینے آیا ہوں جو اب قانونی طور پر میرا ہے۔“ جوزف مزید مشتعل ہو گیا۔ ”کون اسے حماقت کہہ سکتا ہے.....؟“

”یہ حماقت ہی ہے۔“ کیلی نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری عدم موجودگی میں تحقیق و تفتیش جاری تھی۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تمہارے دشمن اندھیرے میں ٹانگ

نوٹیاں مار رہے تھے۔ سرکاری وکیل.....“ ”ابھی آدھے گھنٹے کے اندر اندر میں اس وکیل کی اولاد کو بلا کر کہتا ہوں کہ میں واپس آ گیا ہوں اور دیکھتا ہوں وہ کیا تیرا مارتا ہے۔“ جوزف نے چیخ کر کہا..... ”میں اس سے بینک میں ملاقات کروں گا.....“

”جوزف.....“ کیلی نے بے سکون لہجے میں کہا۔ ”تم قانون سے کھیلنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن ایک بار پھر سوچ لو۔“ ”سوچنے کے لیے میں نے ایک بہت بڑے وکیل کو نوکیو سے بلوایا تھا۔“ جوزف نے کہا۔ ”سوچنا میرا کام نہیں ہے۔ اس وکیل نے بہت سوچ بچار کے بعد مجھ سے کہا تھا، جاؤ سرکاری وکیل کا باپ بھی تم پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ معلوم ہے یہ کون آیا ہے میرے ساتھ..... ایک رپورٹر..... اسے میں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔“ اس نے بڑے فخر سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ”آ جاؤ مسٹر رپورٹر! وکیل صفائی سے کہو آدھے گھنٹے بعد تھرڈ نیشنل بینک میں آ جائے اور چاہے تو پولیس کو بھی لیتا آئے۔“

میں بڑی عجلت میں رخصت ہوا اور ایک ٹیلی فون بوتھ میں کھس گیا جہاں سے مجھے جوزف اور کیلی ایک گوشے میں سب سے الگ ہونے کے باوجود صاف نظر آرہے تھے۔ کیلی غالباً جوزف کو اس بہادری کے مظاہرے سے باز رکھنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا مگر جوزف قائل ہونے کے بجائے مشتعل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا ارادہ فرار ہونے کا ہرگز نہیں تھا۔

میں نے اپنے اخبار کا نمبر ملا کر کم سے کم الفاظ میں ایڈیٹر کو ساری بات بتائی جو اب میں کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ایسی آواز آئی جیسے کرسی گری ہو۔ ”اوہ!“ میں نے سر پکڑ کے سوچا۔ نہ جانے یہ صدے کا اثر ہے یا ہارٹ ایک..... ”ہیلو..... ہیلو.....“ میں نے کہا۔ ”تم..... تم ٹھیک ہونا سن رہے ہو میری بات؟ یہ دھماکا کیا تھا؟“

”ہاں..... ہاں.....“ ایڈیٹر نے کہا۔ ”میں نے ولیم کی ایک گولی کھائی تھی دراز سے نکال کے..... بات سنو! تم نے جہاز پر کتنی ٹی ٹی ٹی؟ بے شک اخراجات ہم ادا کریں گے مگر فون پر ایسی گفتگو..... پچاس ہزار.....“

میں نے بڑی مشکل سے اسے دونوں نکات پر قائل کیا یعنی یہ کہ میں کسی نشے کے زیر اثر نہیں ہوں اور پاگل بھی نہیں ہوا ہوں۔ ”یہ دھماکا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کسی کو کچھ معلوم نہ ہو۔ تم پچاس ہزار ڈالرز کا انتظام کرو اور فونو گرافر



کو اسی وقت روانہ کر دو..... فجر شام تک مکمل ہو جائے گا اور اگر تم نے حسب عادت جون و چرا کی تو.....“

”بس بس..... دھمکی کی ضرورت نہیں بلیک میل.....“

اس نے فون بند کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ باقی کام وہ خود کر لے گا۔ یعنی سرکاری وکیل اور پولیس وغیرہ کو مطلع کرنا۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ جوزف نہ کھسک جائے یا کیلی اسے غائب ہونے پر مجبور نہ کر دے۔ میں نے جوزف کو بتایا کہ استقبال کمیٹی تھرڈ نیشنل بینک میں موجود ہوگی اور اس میں ایک فونو گرافر بھی ہوگا۔

اگر کیلی کی کار میں میری نشست پیچھے نہ ہوتی تو شاہاشی کے بہانے ایک اور دھپ میرے شانے پر پڑتا۔ ”بہت خوب! مسٹر رپورٹر..... میں ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ بد معاش بھی قانون اور آئین کی جنگ لڑ سکتے ہیں۔ تمہیں مشاہدہ کرنا ہے کہ میں ہر مرحلہ کیسے طے کرتا ہوں۔ پبلسٹی کے لیے میں نے معاوضہ اس لیے ادا کیا ہے کہ تم میرے نقطہ نظر سے اس معاملے کو پبلک کے سامنے پیش کرو ورنہ خبر تو ہر صورت میں آ ہی جاتی ہے اخبار میں۔ تم بتاؤ گے کہ میری تمہاری ملاقات کب، کہاں اور کیسے ہوئی۔ پھر میری اور تمہاری گفتگو کا ذکر ہوگا اور تم یہ بات خاص طور پر بیان کرو گے کہ اگر ایک دن پہلے یعنی میں کل آجاتا تو کیا ہوتا جو آج نہیں ہو سکتا۔ اپنے فونو گرافر کو ہدایات دے دینا کہ وہ ہر موقع کی تصویر اتار لے۔ میرے آنے کی۔ رقم نکالنے کی وکیل سے ہاتھ ملانے کی اور پھر بخیر و عافیت رخصت ہونے کی۔ چھ سال تک میں جلا وطن رہا اور اتنی دولت ہونے کے باوجود اس سے حاصل ہونے والی عیش و عشرت کی زندگی سے محرومی کا عذاب برداشت کرتا رہا۔ اب میں ان سب کی بے بسی کا تماشا دیکھ کر زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ جو قانون میں بال کی کھال نکالتے ہیں پھر وہ مجرموں کی کھال کھینچ لیتے ہیں اور اس کھال میں بھس بھر دیتے ہیں۔“ وہ جس اعتماد کے ساتھ بات کر رہا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ قانون اس کے معاملے میں واقعی بے بس ہو چکا ہے اور اس کا اعتماد غلط ثابت ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی کیونکہ خود اس کے کہنے کے مطابق نیویارک سے ایک بہت بڑا وکیل نوکیو گیا تھا اور اس نے بال کی کھال نکال کر جوزف کو قانون کا وہ باریک نکتہ سمجھا دیا تھا جس پر تکیہ کر کے وہ چوری جیسے آنے کے بجائے ڈنکے کی چوٹ پر آیا تھا۔ اس کی فتح یقینی نظر آتی تھی۔

تھرڈ نیشنل بینک سے کچھ دور کیلی نے ہمیں کار سے

اتار دیا اور ہم تھوڑا سا فاصلہ پیدل لے کر کے بینک میں داخل ہوئے، بینک میں کاروبار معمول کے مطابق جاری تھا۔ پولیس، سرکاری وکیل اور پریس فونو گرافر وغیرہ میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ مسلح محافظ ایک عورت کی مدد کر رہا تھا جس کے بیگ سے مٹھی بھر سکے فرش پر گر کر پھیل گئے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے بینک کا عملہ لیکن دین میں مصروف تھا اور پیچھے شیشے کے کیمین میں نیچر کسی سے فون پر باتیں کرتا نظر آ رہا تھا.....

”کدھر ہیں سب..... تمہارا فونو گرافر اور سرکاری وکیل وغیرہ؟“ جوزف نے مایوسی سے کہا۔

”میرا خیال ہے، ہم بہت جلدی پہنچ گئے ہیں۔ وہ بھی آتے ہی ہوں گے۔“ میں نے اسے دلاسا دیا۔

”اچھا تم یہاں انتظار کرو، میں آتا ہوں۔“ وہ آگے بڑھا اسٹیل کے مضبوط اور مقفل دروازے پر رک کر اس نے محافظ سے کچھ کہا۔ ایک کارڈ پر دستخط کیے اور جیب سے چابی نکالی چند منٹ بعد اسے ویسی ہی دوسری چابی مل گئی اور دروازہ کھل کر بند ہو گیا۔ جوزف تہ خانے میں غائب ہو چکا تھا۔ میں نے خود کو اس خطرناک ڈرامے کا قطعی غیر ضروری کردار محسوس کیا جس سے کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔ خاموش تماشائی کی حیثیت سے تماشا دیکھتے رہنے کے سوا جس کا کوئی کام نہ تھا۔ میں حیران اور مضطرب سا ڈراپ سین کا منظر کھڑا تھا اور چاہتا تھا کہ یہ ڈراما جلد از جلد ختم ہو جائے کیونکہ میرے ضمیر کے اندر ایک خلش سی تھی کہ رپورٹر کے بجائے میں نے... ایک فرض شناس باضمیر شہری کا کردار کیوں قبول نہیں کیا۔ اچانک مجھے اپنے اخبار کا فونو گرافر اندر آتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے سرکاری وکیل بھی تھا جو خاصی الجھن کا شکار نظر آتا تھا۔

”یہ..... یہ مذاق تو نہیں ہے مسٹر.....؟“ سرکاری

وکیل نے میرے قریب آ کر کہا۔ ”کہاں ہے جوزف؟“

”لا کر روم میں گیا ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آتا ہی

ہوگا۔“

فونو گرافر نے اپنا کیمرا فوکس کیا ہی تھا کہ جوزف تہ خانے سے نمودار ہوا۔ فلش کی چمک پیدا ہوئی اور فرخ و سرت کی مظہر مسکراہٹ کے ساتھ ڈھائی لاکھ ڈالر کا خوش گوار بوجھ اٹھا کر نکلنے والے جوزف کا عکس فلم پر محفوظ ہو گیا۔ دولت کا یہ بوجھ ایک صندوق کی صورت میں تھا جسے جوزف نے بڑی مشکل سے سنبھال رکھا تھا۔ اس نے بینک کی چابی واپس کی اور اپنی چابی جیب میں ڈال کر آگے آ گیا۔

”ہیلو.....“ وہ بیک وقت سب سے مخاطب ہو کر



بولی۔ ”آگے تم سب لوگ؟ نہ آتے تو مجھے سخت مایوسی ہوتی۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھو یہ وہی رقم ہے یا نہیں جو میں نے چھ سال پہلے وصول کی تھی؟ نمبر تو نوٹ کیے تھے تاہم نے؟ ملا کر دیکھ لو، یہ نوٹ وہی ہیں.....“ اس نے صندوقی کھول دی فونو گرافرنے دوسری تصویر اتاری پھر تیسری پھر چوتھی، وہ ہرزادے سے جوزف کی، وکیل..... کی اور نوٹوں سے بھرے ہوئے صندوق کی تصویریں بنانے جا رہا تھا کہ ہر لمحے کو کیمرے میں قید کر لے اور پیلک کے سامنے یہ ڈرامائی منظر اسی طرح پیش کر سکے جس طرح وہ خود دیکھ رہا ہے۔

جوزف نے قہقہہ مارا۔ ”تم پر تو بھگی گریزی ہے دوست۔“ اس نے سرکاری وکیل کے کندھے پر دھپ مارنے کی کوشش کی مگر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ ”میرا مشورہ مانو تو اس قانون میں ترمیم کر لو۔ میرے پاس اگر کوئی ریوالور ہو اور چھ سال بعد مجھے بعد میں پتا چلے کہ یہ تو فائر ہی نہیں کرتا پھر میں اسے رکھ کر کیا کروں گا؟ ایسے قانون کو گڑھے میں ڈال دو جو ضرورت کے وقت تمہارے کام نہ آسکے۔“ سرکاری وکیل کے پیچھے ایف بی آئی کے سراغ رساں مستعد اور حیرت سے منہ کھولے کھڑے تھے۔ دروازے پر اور اس سے باہر مسلح پولیس کی پوری جمعیت موجود تھی۔

”جوزف۔“ سرکاری وکیل نے کہا۔ ”مجھے یقین آنے لگا تھا کہ بالآخر مجھے خود کو ہی گولی ماری پڑے گی۔“ ”بزرگوں نے اسی لیے کہا ہے کہ پہلے تو لو اور پھر بولو.....“ جوزف نے ہنس کر کہا۔ ”تم نے خواہ مخواہ ایک بات کہہ دی تھی مگر اب بھی تم زندہ رہنا چاہو تو اپنی بات سے پھر سکتے ہو۔ جذبات کی رو میں بہہ کر آدمی بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ قانوناً اور اخلاقاً تم اپنے کبے پر عمل کرنے کے پابند نہیں ہو.....“

سرکاری وکیل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہ میں نے سوچے سمجھے بغیر بات کی تھی اور نہ میرا ارادہ اپنی بات سے پھرنے کا ہے۔ دراصل مجھے قدرت کے نظام انصاف پر جو بھروسا پہلے تھا، وہ آج بھی ہے۔ تم اقرار کرتے ہو کہ یہ وہی رقم ہے جو میلوف نے تمہیں دی تھی..... رچیا کے باپ نے؟“

”ہاں..... ملا کے دیکھ لو۔ میں غلط بیانی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔“ جوزف نے سینہ تان کر کہا۔

”تم نے ٹیکس کے ریکارڈ پر کس سال کی آمدنی کے گوشوارے میں یہ رقم دکھائی ہے؟“ سرکاری وکیل بولا۔

جوزف نے فلک شگاف نعرہ مارا جس نے بینک کے اندر موجود سب لوگوں کو چونکا دیا جو اب تک احمقوں کی طرح منہ کھولے یہ تماشا دیکھ رہے تھے اور کچھ سمجھ نہ پانے کے

خوف اور تجسس کا شکار تھے۔

”مائی ڈیئر وکیل سرکار.....“ جوزف نے کہا۔ ”چھ سال پہلے کی آمدنی کے بارے میں قانوناً میں کچھ بتانے کا پابند نہیں.....“

سرکاری وکیل غالباً یہ نکتہ پہلے سے سمجھتا تھا کیونکہ اس بات سے وہ حیران یا ہراساں نہیں ہوا۔ وہ اسی نفرت کے زہر میں بھیجی ہوئی خون آشام نظروں سے جوزف کو دیکھتا رہا۔ ”چھ سال، اس بات کو چھ سال ہو گئے ہیں؟“

”یس سر آج پندرہ تاریخ ہے۔“ جوزف نے کہا۔ ”آج اس بات کو چھ سال بیت چکے ہیں۔“

سرکاری وکیل نے چنگی بجا کے اپنے پیچھے صف بستہ سراغ رساںوں اور ایجنٹوں کو اشارہ کیا۔ ”اسے گرفتار کر کے فوراً ہتھکڑی ڈال دو۔“ بیک وقت تین افراد آگے بڑھے۔ تین اپنی جگہ ریوالور نکالے کھڑے رہے۔

”یہ..... یہ کیا بکواس ہے؟“ جوزف نے چیخ کر کہا۔ ”میں تم سب سے نمٹ لوں گا۔ تم قانون کے خلاف ایک شخص کو گرفتار کر رہے ہو۔ یہ مت سمجھو کہ میں اپنے دفاع کا انتظام کر کے نہیں آیا تھا۔ میرے درجن بھر وکیل تم پر جس بے جا کا مقدمہ قائم کرنے کے منتظر کھڑے ہیں۔“

لیکن اس چیخ و پکار کا نوٹس لیے بغیر جوزف کو بے قابو کر کے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی گئی۔ سرکاری وکیل قطعی بے تعلقی کے ساتھ اپنے احکامات کی تعمیل ہوتے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر وہ طمانیت تھی جو برسوں پرانے دشمن سے انتقام کی آرزو پوری ہونے پر پیدا ہوتی ہے۔

”تم ایک بات بھول گئے تھے جوزف.....“ سرکاری

وکیل نے کہا۔ ”جب کوئی مشرق یا مغرب کی سمت سفر کرتا ہے تو وقت کو آگے یا پیچھے چھوڑتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی جگہ وقت

کی وہ دیوار آجاتی ہے جسے انٹرمیشنل ڈیٹ لائن کہتے ہیں۔ اس دیوار کو آدمی کی نظر نہیں دیکھ سکتی لیکن اس دیوار کے ادھر پندرہ

تاریخ آجائے تب بھی ادھر بدستور چودہ تاریخ ہی رہتی ہے۔ جاپان اور لندن کے درمیان فاصلہ صرف مقام ہی کا

نہیں۔ وقت کا بھی ہے۔ دونوں کے مقامی وقت میں بارہ گھنٹے کا فرق ہے تم نے مشرق بعید سے مغرب کی طرف سفر کیا تو

ڈیٹ لائن عبور کر آئے۔ وقت کی دیوار کے ادھر واقعی پندرہ تاریخ ہوگئی تھی مگر یہاں اب بھی چودہ تاریخ ہے جو رات کے

بارہ بجے تبدیل ہوگی۔ چھ سال ابھی کہاں پورے ہوئے ہیں... جوزف؟ پورے نو گھنٹے باقی ہیں ابھی!“





بتیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُر جوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پرے... ٹھنڈی ہواٹوں کے جھونکے ہوں یا باد و باران کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پہوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورقِ ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموٹی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی چلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ



Downloaded From  
Paksociety.com







یہ داستان ہے دور جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی مگنی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمر اور چاہی مگنی کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا ڈیرا اشمت جلالی ایک بدتیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گولڈ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا ڈیرا اشمت کی منگی گیری کرتا تھا۔ ڈیرا اشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائیداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کر دی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ پٹی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے سین گولڈ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاہی کے ساتھ پہلے ہی آ چکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہو گئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ اشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ ڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قاتل کاٹھ کی تھی بر باد کر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے سخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گولڈ ٹیٹن ہونا تھا۔ محبوب کے سر پرست اس کے والد کے زمانے کے معروف بجلی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل نمبر اکو ٹیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرعوب ہو گیا۔ یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بیچے کو جنم دے کر دوسرے بیچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن ڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے تالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی بیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی ڈیرا اشمت سے دشمنی ہو گئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے انوار نے کی کوشش کی مگر جب وہ اپنی منگنی کی شادی میں شرکت کے لیے گولڈ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے ٹھکنے سے فرار ہو گیا۔ ماروی چاہی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے۔ مراد نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بد قسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو گیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوبو کے ساتھ ل گیا۔ ادھر ماروی کے دو بارہ سر میں چوٹ کھنسنے سے اس کی یادداشت واپس آ گئی۔ مراد مرینہ کے زیر اثر آ چکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ ادھر مرینہ دو بارہ T.M.E.T فیس بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ٹینیسن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے چہرے ہونے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دو۔ت عبداللہ کبڑی بھی آ گیا۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کر کے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجکشن آدا دیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈاکٹر کٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر ٹینیسن کے بیٹے ایمان سے ہو گئی۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھگانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلاحیت میں میکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے میکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آ گیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہو گئی اور پاکستان آ گئی۔ ادھر مراد دو بارہ اپنا چہرہ تبدیل کر کے انڈیا پہنچ گیا اور میکی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا اور اسے انوار کر لیا۔ تاہم بعد میں اسے چھوڑ دیا مگر میڈوٹا کو مرینہ سے بچانے کے لیے مراد اسے لے کر نکل پڑا لیکن مرینہ نے راستے میں اسے چھاپ لیا۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے۔ دونوں علاج کے باعث چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے۔ مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہو گئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آ رہی تھی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سے سرجری کے ذریعے تبدیل کر لیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوادیا۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر اراٹ ہو گئے اور وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ درگاہ نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشری اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہو گئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کر لیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست باب النساء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی



جیکر گوزیر کر لیا۔ مراد ملکہ نگارا کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کر لیا۔ ادھر مرید مراد کے قلم میں چل ہی۔ مراد نے ملکہ نگارا سے نکاح پڑھو لیا اور بشری اور بے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کر لیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہو گیا۔ مراد اور نگارا میں اختلاف ہو گیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد برسر اقدار آ گیا۔ بابا اجیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہو گئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاد، دونوں جب چاہتے نادیدہ ہو جاتے۔ مراد نے نادیدہ وہ کردشمنوں کو ناکوں پہنے چہوائے ادھر دشمن مراد کو پکڑنے کے لیے محبوب اور ماروی کے پیچھے پڑ گئے۔ تاہم مراد نے ان کی ہر سازش ناکام بنا دی اور انہیں سبق سکھایا۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور منگی پسند آئی۔ مراد نے اسے اپنی شریک حیات بنا لیا۔ مراد کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا کہ اس کے تابع کئی جنات ہیں جن سے وہ دشمنوں کو زبردستی آ رہا ہے۔ دشمن اس کا توڑ ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ مراد اور ہم زاد کی نادیدہ صلاحیت ختم ہو گئی اب وہ دونوں اس صورت حال پر پریشان تھے۔ ادھر ہم زاد کو اس سے زیادہ اپنی محبوبہ جینی کے پاس نہ جانے کی پریشانی تھی، وہ اس کے بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔ ادھر دشمن تنظیموں نے مراد کو دھکی دی تھی کہ وہ ان کا سر پرست بن جائے ورنہ اپنے انجام کے لیے تیار ہے۔ مراد نے جنگی براؤن کو فون کیا اور اسے انجام سے خبردار کیا تو وہ مراد سے دشمنی سے باز آ گیا اور اس نے مراد کے دس دشمنوں کو کھکانے لگا دیا۔ ادھر جینی کو ریاست ارض اسلام پہنچانے کے لیے جہاز میں سوار کیا گیا مگر حادثاتی طور پر جینی نے بیچے کو جنم دیا اور خود جان کی بازی ہار گئی۔ وہ بچہ جو بچہ تھا۔ پیدا ہوتے ہی اس نے سب کو حیران کرنا شروع کر دیا۔ وہ کروٹ بھی لے رہا تھا اور دودھ کی فیڈر کو ہاتھوں سے پکڑ کر دودھ پیتا تھا۔ جینی کی لاش کو جہاز کے ذریعے وہاں یہودیوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ یہودی اس بچہ کو (عابد علی بلنگی) کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ان کے دین پر چلے۔ وقت گزرتا گیا اور عابدی دس برس کا ہو گیا۔ دس برس کا ہونے کے باوجود وہ نوجوان لگ رہا تھا۔ غیر معمولی طاقت کا حامل عابدی کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ اس کا حافظہ بہت تیز تھا۔ عابدی کو یہودیوں نے اغوا کرانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے مگر عابدی نے ان کو کھکانے لگا دیا۔ دو اغوا کاروں کو عابدی نے زندہ رکھا اور خواہش کی کہ وہ دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ خود چلا گیا۔ مراد اور ہم زاد اس کے لیے پریشان تھے۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ عابدی اغوا کاروں کے ساتھ اپنی مرضی سے گیا ہے۔ ادھر یہودی تنظیم فری میسن کے عہدیدار اس کا برین واش کرنے کی تدبیر بھی سوچ رہے تھے۔ عابدی وہاں کے دارالسلطنت کس ناؤ پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک لڑکی کی آبرو بچائی اور ہماری جرمانے کا مطالبہ کر دیا۔ عدم ادائیگی کی صورت میں اس نے کہا کہ وہ اس شخص کو جان سے مار دے گا۔ عابدی کو چاروں طرف سے پولیس والوں نے گھیر رکھا تھا۔ تاہم وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ ماہیو یوز نے جرمانہ ادا کر دیا عابدی وہاں سے رومانیہ آ گیا۔ رومانیہ میں اسے پتا چلا کہ یہودی انسانی اعضا کی خرید و فروخت میں ملوث ہیں۔ مراد نے وہاں موجود اس عمارت کو نیست و نابود کر ڈالا تھا۔ ادھر ہم زاد کے ہاں ایک اور بیچے کی ولادت متوقع تھی جو عابدی کی طرح جو بچہ تھا۔ دراصل وہ بچہ نہیں بنی تھی۔ مراد نے مشورہ دیا کہ بچی کا نام ماروی رکھا جائے تو زیب النساء محفوظ رہے گی۔ یہ ان کے دل کی بات تھی۔ ادھر اچانک خبر ملی کہ ماروی انتقال کر گئی ہے۔ اچانک زیب النساء کی کوکھ میں نین ماہ کی بچی متحرک ہو گئی تھی ادھر یہودی عابدی کی ہر بات برداشت کر رہے تھے۔ ان کی اپنی حکمت عملی تھی۔ وہ بڑی ناسمجھی سے اسے گل ایسب لے جا رہے تھے۔

### اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

مزاج کے خلاف ہے۔“  
ایک جوان نے کہا۔ ”آپ اس لیے بے باک ہیں کہ ہمارے یہودی اکابرین نے آپ کو بہت مضبوط سیکورٹی دی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو آپ یہاں سے زندہ نہ جاتے۔“  
کسی نے کہا۔ ”ہم ابھی آپ پر حملہ نہیں کر سکتے۔ آپ کی جسمانی قوت سے مرعوب ہیں۔ آپ یہاں سے سیکڑوں افراد کو مار پیٹ کر نکل جائیں گے۔“  
کسی نے کہا۔ ”اگر آپ دجال معظم کے نمائندے ہیں تو ہمارے ہو جائیں۔ ورنہ اس شہر سے چلے جائیں۔“  
وہ چلتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف سے بولنے والے اس کی حمایت میں بھی بول رہے تھے۔ ایک بوڑھے نے کہا۔ ”پرنس! آپ نہیں جائیں گے۔ یہ غصے میں بولنے والے نادان ہیں۔ یہ نہیں جانتے، میں جانتا ہوں۔ میں ایک ماہر رمال ہوں۔ میں نے ظلم ریل سے معلوم کیا ہے۔ آپ ابھی جو ہیں، وہ نہیں رہیں گے۔ جو نہیں ہیں، وہ ہو جائیں گے۔ آپ

ان کی اپنی پلاننگ تھی۔ اس پلاننگ کے نتیجے میں دو ہی باتیں ہونے والی تھیں۔ یا تو عابدی ان کے نفسیاتی طریقہ کار کے مطابق وہاں پہنچنے تک ماں کی طرح یہودی بن جاتا، یا پھر ان کے پیشوائے اعظم کا آخری فیصلہ ہوتا کہ اس سر پھرے مسلمان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔  
وہ تفریحی میلارات ایک بجے تک جاری رہتا تھا۔ اس رات پرنس کی آمد کے باعث رونق بڑھ گئی تھی۔ لوگ خاصی تعداد میں آ رہے تھے۔ فن فیئر آرگنائزر کا مالی منافع بڑھ رہا تھا۔ اس لیے انہوں نے اسے صبح تک جاری رکھا تھا۔  
پھر اعلان ہوا کہ دروازے بند کیے جا رہے ہیں۔ لوگ پرنس کے ساتھ وہاں سے باہر آ گئے۔ کئی مرد اور عورتیں، جوان اور بوڑھے پرنس کو عبادت کرتے دیکھ کر متاثر ہوئے تھے۔ عابدی نے بڑی خوش الحانی سے پہلے عربی زبان میں تلاوت کی تھی پھر انگریزی میں اس کا ترجمہ پیش کیا تھا۔  
ایک بوڑھے نے کہا۔ ”آنراہیل پرنس! آپ نے بڑی دیدہ دلیری سے وہ آیت سنائی ہے جو ہم یہودیوں کے



ہمارے ہیں۔ ہمارے ہو جائیں گے۔“

سے اس ہاس صنعت کار کو فون پر کہا۔ ”میں میرس جا رہا ہوں۔ واپس نہیں آؤں گا۔ آپ کسی اور کو میری جگہ رکھ لیں۔ یہ یاد رکھیں کہ یہودیوں کی طرف سے کال آسکتی ہے۔ میرے بارے میں انکو آڑی ہو سکتی ہے۔ ایسے وقت آپ میری ذہانت اور نیک نامی کا قصیدہ پڑھیں گے تاکہ وہ لوگ مجھ پر اعتماد کر سکیں۔“

اس نے فون بند کیا۔ یہ ارادہ کیا کہ شام تک چار دیواری سے باہر نہیں جائے گا۔ کسی دشمن کی نظروں میں نہیں آئے گا۔ سیدھا انٹرپورٹ جا کر یہ شہر چھوڑ دے گا۔ اس نے فون پر بیٹھے سے کہا۔ ”بیٹے.....! میرا چہرہ، میری شخصیت بدل گئی ہے۔ میرا موجودہ نام حمد اللہ عرف حماد ہے۔ میں کل شام کی فلائٹ سے پیرس جا رہا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”اوکے بابا جانی! میں پرسوں کسی فلائٹ سے وہاں پہنچوں گا۔ جب ہمارے اشتہار کے مطابق آپ انٹرویو دینے آئیں گے، تب ہی آپ کے نئے روپ کو دیکھوں گا۔ اوکے..... ہم پھر ملیں گے۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد ہی کسی نے کال کی۔ فون کی تضحی سی اسکرین پر نام لکھا ہوا تھا..... جمانگہ۔

مراد نے سوچا۔ ”یہ کون ہے؟ حماد عیش و عشرت کی زندگی گزارتا تھا۔ کیا یہ اس کی کوئی گرل فرینڈ ہے؟“

رنگ ٹون ابھر رہی تھی۔ وہ تذبذب میں تھا کہ کال اٹینڈ کرے یا نال دے؟ کہیں حماد کی بلا اس کے گلے نہ پڑ جائے۔ فون چیختے رہنے کے بعد خاموش ہو گیا۔ اس نے سوچا۔ ”چلو اچھا ہے۔ بلا مل گئی۔“

وہ فون کو ایک طرف رکھ کر اٹھنے لگا۔ اسی وقت وہ پھر چیخ پڑا۔ اس نے سوچا۔ ”اٹینڈ کرنا چاہیے۔ کوئی چکنے والی بلا ہوئی تو ہوتی رہے۔ وہ تو شام کو یہ شہر چھوڑ دے گا۔“

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”ہیلو.....!“

ادھر سے سرتوں بھری چیخ سنائی دی۔ ”تھینکس گاڈ! تمہاری آواز سنائی دے رہی ہے۔ ایک ہفتے سے کال کر رہی ہوں۔ جواب میں یہی سنائی دیتا تھا کہ رابطہ نہیں ہو سکتا۔ پھر کہا گیا کہ فون بند ہو چکا ہے۔ کیا ہو گیا تھا تمہیں؟ کیوں فون کا سوئچ آف کر دیا تھا؟“

”میں اسپتال میں تھا۔ کار کے حادثے میں سر پر چوٹ لگی ہے۔ میری یادداشت بہت ہی کمزور ہو گئی ہے۔ مجھے افسوس ہے تمہیں بھول گیا ہوں۔ فون پر نام پڑھ کر معلوم ہوا کہ تمہارا نام جمانگہ ہے۔“

وہاں اس کی حمایت میں بولنے والے عقیدت مند زیادہ تھے۔ اسے اپنے نجات دہندہ کا نمائندہ مانتے تھے۔ رمال کی باتوں نے ان کی عقیدت مندی کو اور بھڑکایا تو کتنے ہی لوگ اس کے آگے جھکنے لگے۔ اس نے فوراً ہی ان سب کو دور ہٹاتے ہوئے ایک لمبی چھلانگ ماری پھر آگے بھی چھلانگیں مارتا ہوا ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس نے اپنی رہائش گاہ میں پہنچ کر یہ طے کیا کہ اگلے پندرہ بیس گھنٹوں تک اس چار دیواری سے باہر نہیں جائے گا۔ جب مراد پیرس پہنچ جائے گا اور یہ بتائے گا کہ وہاں کی شہریت حاصل کر چکا ہے، تب وہ بھی یہ شہر چھوڑ کر پیرس جائے گا۔ اس نے تمام دروازوں کو اندر سے بند کیا پھر بیڈ پر آ کر آرام سے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ گہری نیند میں تھا۔

☆☆☆

مراد ماسٹر کو بوبو کے ایک کارندے سیمسن کی رہائش گاہ میں تھا۔ وہاں اپنی پلاننگ کے مطابق اسے چہرہ بدلانا تھا۔ اپنی شخصیت تبدیل کرنا تھی پھر اس شخصیت کے مطابق پاسپورٹ وغیرہ بنا کر پیرس تک جانا تھا۔

دو ہفتے پہلے ماسٹر کا ایک کارندہ اپنے مخالفین سے مقابلہ کرنے کے دوران میں مارا گیا تھا۔ ماسٹر کے تین کارندوں نے مصلحت اس کی لاش کو رازداری سے دفن کر دیا تھا۔ دشمنوں سے یہ بات چھپائی تھی کہ ان کی تعداد کم ہو گئی ہے۔

اس کا نام حمد اللہ تھا۔ اسے حماد کہا جاتا تھا۔ اب اس کی صورت، اس کا پاسپورٹ اور دیگر اہم کاغذات مراد کے کام آ رہے تھے۔ اسی رات ایک ماہر سرجن کو بھاری رشوت دینے کے بعد اس کا چہرہ تبدیل ہو گیا۔ پھر دوسرے ہی دن شام کی ایک فلائٹ میں اس کے لیے سیٹ کنفرم ہو گئی۔ حماد ایک بہت بڑے صنعت کار کا پرسنل سیکریٹری تھا۔ وہ صنعت کار اپنے غلط دھندے کے باعث ماسٹر کو بوبو کی پناہ میں رہتا تھا۔ ماسٹر اپنے کارندوں کے ذریعے اسے مشکلات سے نکالتا رہتا تھا۔ وہ ماسٹر کا احسان مند رہا کرتا تھا اسی لیے اس نے حماد کو اپنا پرسنل سیکریٹری بنا لیا تھا۔ ماسٹر کے کارندوں نے مراد کو بتایا کہ حماد کا اور کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ وہ تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ بہت زندہ دل تھا اور عیش و عشرت میں دن گزار رہا تھا۔

جس رات مراد کا چہرہ تبدیل ہوا، اس کے دوسرے دن حماد کے فون کو آن کر دیا گیا۔ مراد نے حماد کی حیثیت

جس رات مراد کا چہرہ تبدیل ہوا، اس کے دوسرے دن حماد کے فون کو آن کر دیا گیا۔ مراد نے حماد کی حیثیت

جس رات مراد کا چہرہ تبدیل ہوا، اس کے دوسرے دن حماد کے فون کو آن کر دیا گیا۔ مراد نے حماد کی حیثیت



دوشیزہ کی چند تصویریں تھیں۔ انہیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت ہی شوخ و چٹخل ہے اور بہت ہی خوش لباس ہے۔ اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کون ہے اور کس دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔

اس نے ماسٹر کے کارندے کو بلا کر تصویریں دکھائیں پھر پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟ ابھی اس نے مجھے کال کی تھی۔“

”اس کا نام جمائلہ ہے۔ یہ ایک بہت ہی دولت مند بیوہ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اس بیوہ کا نام ثنائلہ شانی ہے۔ اس کا شوہر یعنی جمائلہ کا باپ عبداللہ شانی سونے کا اسمگلر تھا۔“

”تھا کا مطلب ہے..... اب نہیں ہے؟“

”ہاں۔ یہ دھند اب ثنائلہ سنبھالتی ہے۔ بہت خطرناک عورت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس خطرناک بلا نے اپنی بیٹی کو عشق و محبت سے دور رکھنے کے لیے حماد کو قتل کرایا ہے۔“

مراد نے پوچھا۔ ”تم لوگوں نے مجھے اتنی اہم بات پہلے کیوں نہیں بتائی؟“

”ہم نے سوچا ابھی آپ یہاں سے باہر نہیں جائیں گے اور ثنائلہ کے آدمی آپ کو نہیں دیکھیں گے۔ ہم آپ کے لیے تمام حفاظتی انتظامات کرنے کے بعد اس عورت کا ذکر کرنے والے تھے۔“

پھر وہ بتانے لگا۔ ”عبداللہ شانی ڈیل ایسٹ اور ترکی سے سونا اسمگل کراتا تھا۔ یہ صرف ثنائلہ جانتی ہے کہ سونے کا انڈر گراؤنڈ ذخیرہ کہاں ہے؟ جرائم کی دنیا میں یہ سب کہتے ہیں کہ وہ عورت بہت ہی تیز طراز خود غرض اور خطرناک ہے۔ اس نے سیکڑوں من سونے کے ذخیرے کی تہا مالک بننے کے لیے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے۔ وہ بہت چالباز ہے۔ اس کی سیکرٹ آرمی کسی کو نظر نہیں آتی۔ اس آرمی کے جوان کسی بھی ٹارگٹ پر اچانک ہی پہنچ جاتے ہیں۔“

مراد نے پوچھا۔ ”حماد کیسے مارا گیا تھا؟“

”جمائلہ نے اسے کال کی تھی۔ ریور سائڈ پارک میں ملنے کے لیے بلایا تھا۔ ہم حماد کے پیچھے چھپ کر لٹے تھے۔ اس پر اچانک گولی چلائی گئی تھی۔ وہ بڑا جی دار تھا۔ اس نے زخمی ہونے کے باوجود مقابلہ کیا۔ ان سے بڑی دیر تک کاؤنٹر فائرنگ جاری رہی۔ پھر حماد کے ہلاک ہوتے ہی وہ فرار ہو گئے۔ ہم ان کا تعاقب نہ کر سکے۔“

”کیا جمائلہ نے ماں کے حکم پر حماد کو کال کی ہوگی؟“

”حماد نے کہا تھا کہ جمائلہ اس کی دیوانی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے۔ وہ اس خطرناک عورت کی بیٹی سے کتراتا تھا۔ ماسٹر نے بھی حماد کو اس سے دور رہنے کی تاکید کی تھی۔“

وہ بولی۔ ”ویری سیڈ۔ یا خدا! تم مجھے بھول گئے ہو۔ مجھے بتاؤ کس اسپتال میں ہو؟ میں ابھی آؤں گی تو مجھے دیکھتے ہی پہچان لو گے۔ تمہاری یادداشت واپس آجائے گی۔“

”میں اسپتال سے گھر آ گیا ہوں۔ ڈاکٹر نے کسی سے ملنے اور باتیں کرنے سے منع کیا ہے۔ میں علاج کے لیے آج شام کی فلائٹ سے پیرس جا رہا ہوں۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے ہو؟ کیا واقعی پیرس جا رہے ہو؟“

”ہاں۔ سیٹ کنفرم ہے۔“

جمائلہ نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”کیا آج شام کی فلائٹ سے جا رہے ہو؟ کئی بات ہے؟“

”ہاں مگر تم خوش کیوں ہو رہی ہو؟“

اس کی خوشی کسی اور وجہ سے تھی۔ وہ بات بدل کر بولی۔ ”کیا یہ خوشی کی بات نہیں ہے کہ وہاں جاؤ گے، علاج کراؤ گے پھر یادداشت واپس آئے گی تو یہاں آ کر مجھے پہچان کر گلے سے لگاؤ گے۔“

”ہاں۔ دعا کرو کہ میرا حافظہ درست ہو جائے اور میں فوراً ہی تمہارے پاس چلا آؤں۔“

”علاج کے لیے کتنی رقم کی ضرورت ہے بولو۔ میں دوں گی۔“

”لاکھوں ڈالر خرچ ہوں گے۔ تم کہاں سے دوگی؟“

وہ ہنسنے لگی پھر بولی۔ ”واقعی تمہارا دماغ کمزور ہو گیا ہے۔ میں نے بتایا تھا کہ سونے چاندی کے محل میں رہتی ہوں۔ پیرس کے اور سوئیٹزر لینڈ کے بینکوں میں میرا اکاؤنٹ ہے۔ تم جب کہو گے، تمہارے پاس رقم پہنچ جائے گی۔“

مراد نے کہا۔ ”شکریہ۔ رقم کی ضرورت ہوگی تو ضرور تمہیں کال کروں گا۔ تم سے ضرور ملوں گا۔ ابھی اجازت دو۔ مجھے سفر کی تیاریاں کرنی ہیں۔“

وہ بولی۔ ”پلیز وعدہ کرو۔ شام کو جانے سے پہلے ضرور کال کرو گے۔“

”ضرور کروں گا۔ خدا حافظ۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ ”یہ کون ہے؟ اس قدر دولت مند ہے کہ کئی ملکوں میں بینک اکاؤنٹ رکھتی ہے۔ اس کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی ہوگی؟ اگر یہ وسیع ذرائع کی مالک ہوگی تو کسی وقت گلے کا پسندابن جائے گی۔“

مراد نے حماد کے سامان سے تصویروں کی ایک البم نکالی اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔ اس البم میں صرف ایک ہی



اٹرپورٹ جانے سے روک دوں۔“  
 ”میری فکرنہ کرو۔ میں ہر حال میں علاج کے لیے  
 پیرس جاؤں گا۔ تم مجھے اپنی صورت دکھانے کے لیے ضرور  
 آؤ گی۔“

”ضرور آؤں گی۔ اللہ حافظ۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ جمائلہ کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ  
 حماد کی محبت میں ماں کے خلاف ہے۔ ویسے حقیقت کیا ہے  
 یہ میدان جنگ میں معلوم ہونے والا تھا۔ وہ شام کو  
 اٹرپورٹ پہنچ گیا۔ اٹرپورٹ ایسی جگہ ہے جہاں دنیا کی  
 تمام قومیں آتی جاتی ہیں۔ ایسی جگہ سخت سکیورٹی ہوتی ہے۔  
 ماسٹر کے کارندے اور شوٹرز مراد کو فون پر بتا رہے  
 تھے کہ اٹرپورٹ میں کوئی دشمن نظر نہیں آ رہا ہے۔ مراد کار  
 سے اتر کر تیزی سے چلتا ہوا ڈیزیز لابی سے گزرتا ہوا ادھر  
 ادھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ جمائلہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

وہ ایک منٹ کے لیے بھی وہاں نہیں رکا۔ تیزی سے  
 چلتا ہوا بورڈنگ کارڈ لینے کے لیے اندر چلا گیا۔ وہاں کوئی  
 گولیاں چلانے والا نہیں آسکتا تھا۔ بورڈنگ کارڈ حاصل  
 کرنے کے لیے قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ وہ جمائلہ کو وہاں  
 دیکھ کر خشک گیا ایسی ہی لڑکی حماد کی اہم میں بھی تھی۔

وہ ایک قطار میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے حیرانی سے  
 پوچھا۔ ”تم..... یہاں؟“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”میں بھی جا رہی ہوں۔ تمہیں  
 سر پر اتر دینے کے لیے بات چپائی گئی۔ اپنا ٹکٹ مجھے دو۔  
 میں بورڈنگ کارڈ لوں گی۔“

مراد نے دل میں کہا۔ ”یہ تو گلے پڑ گئی ہے۔“  
 وہ مسکرا کر بولی۔ ”ہاں۔ میں نے دو دن پہلے ہی  
 سیٹ کنفرم کرائی تھی۔ یہ خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ تم  
 بھی اسی فلائٹ سے جاؤ گے اور میں پیرس کیوں جا رہی ہوں یہ  
 جہاز میں بتاؤں گی۔“

مراد نے کہا۔ ”کم آن۔ اپنا ٹکٹ مجھے دو۔ مردوں کو  
 قطار میں رہنا چاہیے۔“

وہ ٹکٹ لے کر اس کی جگہ قطار میں آ گیا۔ اس نے  
 سوچا تھا کہ اٹرپورٹ میں اس کی ماں شاملہ شانی سے اور اس  
 کے شوٹروں سے سامنا ہوگا جبکہ ایسا کچھ نہیں ہو رہا تھا اور  
 اب پیرس پہنچنے تک کسی طرح کا خطرہ نہیں تھا۔

پھر بھی بے چینی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ پیرس کیوں  
 جا رہی ہے؟ وہ اس سے بہت سے سوالات کرنا چاہتا تھا۔ وہ  
 قطار سے باہر اس کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے

مراد نے پریشان ہو کر کہا۔ ”مجھ سے ایک غلطی ہو گئی  
 بلکہ دو غلطیاں ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ میں نے اس کی کال  
 اینڈنگ کی۔ دونوں ماں بیٹی کو معلوم ہو گیا ہے کہ حماد زندہ  
 ہے۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ جمائلہ سے کہہ دیا ہے کہ آج  
 شام کی فلائٹ سے پیرس جا رہا ہوں۔“

میزبان نے پریشان ہو کر کہا۔ ”اوگاڈ..... ان ماں  
 بیٹی کی طرف سے آپ پر حملہ ہو سکتا ہے۔ مجھے ابھی  
 اٹرپورٹ میں اپنے شوٹرز کی ڈیوٹی لگانی ہوگی۔“

وہ جانے لگا۔ مراد نے کہا۔ ”جسٹ اے منٹ۔“  
 وہ رک گیا۔ مراد نے فون پر جمائلہ کے نمبر شیخ کیے۔  
 اسے کان سے لگایا۔ چند لمحوں میں ہی اس کی آواز سنائی  
 دی۔ ”ہائے حماد! تم مجھے کال کر رہے ہو۔ کیا میں تمہاری  
 میموری میں آ گئی ہوں؟ کیا مجھے پہچان رہے ہو؟“

”سوری جمائلہ! مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔ میں  
 تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ شاید دیکھتے ہی پہچان جاؤں۔ مجھ  
 سے ملنے اٹرپورٹ آؤ گی تو مجھے خوشی ہوگی۔“

”او حماد! آئی لو یو۔ میں سر کے بل آؤں گی۔“

”او کے۔ سی یو۔“  
 وہ فون بند کر کے میزبان سے بولا۔ ”میں نے نصف  
 تحفظ حاصل کر لیا ہے۔ اگر وہ ماں کے اشاروں پر چل رہی  
 ہے تو اس کی شامت آ جائے گی۔ گولیاں چلتے ہی میں اسے  
 جکڑ کر ڈھال بنا لوں گا۔ اپنے شوٹرز سے کہنا کہ کوئی اس پر  
 گولی نہ چلائے وہ میرا شکار ہے۔“

وہ وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی جمائلہ نے  
 کال کی۔ اس نے فون کا بین دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔  
 ”ہاں۔ یولو؟“

اس نے کہا۔ ”تم اٹرپورٹ آؤ گے۔ کیا عارضی میک  
 اپ کے ذریعے اپنی صورت بدل کر آسکو گے؟“

”مجھے بہرہ میں آنے کو کیوں کہہ رہی ہو؟“  
 ”اوہ مائی ڈیئر! تم اہم باتیں بھی بھول گئے ہو۔ میں  
 نے تمہیں بتایا تھا کہ میری ماما تمہیں پسند نہیں کرتی ہیں۔ اب  
 ایک اہم بات بتا رہی ہوں۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ کار کے  
 حادثے میں تمہاری یادداشت کو نقصان پہنچا ہے۔ نہیں  
 حماد.....! میری ماما کے آدمیوں نے تم پر گولیاں چلائی  
 تھیں۔ خدا کا شکر ہے تم زندہ ہو۔ میں بڑی دیر سے سوچ  
 رہی ہوں کہ تمہاری سلامتی کے لیے کیا کروں؟“

”کیا کرو گی؟“

”میرے دماغ میں ایک ہی بات آ رہی ہے کہ تمہیں



پوچھا۔ ”تم انگریزی کے علاوہ اور کون سی زبان جانتی ہو؟“  
وہ بولی۔ ”فرینچ، لیٹوینج اور انڈین لیٹوینج۔ میرے  
پاپا ایک انڈین تھے۔ اینڈ آئی ٹو انڈینز۔“

مراد نے اردو زبان میں کہا۔ ”اردو اور ہندی ایک  
جیسی دو بہنیں ہیں۔ ہماری یہ زبان یہاں کوئی نہیں سمجھے گا۔“  
وہ خوش ہو کر بولی۔ ”او گاڈ! تم بھی یہ زبان جانتے ہو  
پھر تو مشکل آسان ہو گئی۔“

”تم پیرس کیوں جا رہی ہو؟“

”ماما سے میرا جھگڑا ہے۔ انہوں نے مجھے دھوکا دیا  
ہے۔ میری اور ان کی آواز..... اور لہجہ ایک جیسا ہے۔  
انہوں نے جمانک بن کر تمہیں کال کی تھی اور رپورٹ سائڈ پارک  
میں ملاقات کے لیے بلایا تھا۔ جب وہاں گولیاں چٹپٹیں اور  
انہیں یقین ہو گیا کہ تم مر چکے ہو، تب انہوں نے مجھے بتایا  
کہ تمہیں کس طرح دھوکے سے بلایا تھا۔ یہ سن کر میں بہت  
روئی تھی۔ ماما مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں اور مجھے سمجھاتی ہیں  
کہ مرد سے دوستی کرو۔ اپنی خواہش پوری کرو لیکن اس پر  
بھروسہ نہ کرو۔ اس سے عشق کرو گی، اسے سر پر چڑھاؤ گی تو  
وہ تم پر سوکن لے آئے گا۔ تمہارے پاپا یہی غلطی کرنے  
والے تھے۔ ایک عورت کے عشق میں گرفتار ہو گئے  
تھے۔ میں نے انہیں سمجھایا لیکن ان کی شامت آگئی  
تھی۔ سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر اسے میری سوکن بنا دیتے  
تو وہ بھی ہمارے سونے کے ذخیرے تک پہنچ جاتی۔ آدھا  
سونا وہ لے جاتی۔“

انہوں نے میرے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ”سو  
سوری۔ میں نے تمہارے باپ کو بہت سمجھایا۔ وہ نہیں مانا تو  
میں نے مجبوراً اسے اوپر پہنچا دیا۔“

وہ دونوں بورڈنگ کارڈ لے کر ویننگ ہال میں  
آ کر بیٹھ گئے۔ وہ بول رہی تھی۔ ”ماما چاہتی ہیں کہ میں بھی  
ان کی طرح سنگدل بن جاؤں۔ جو مرد پسند آجائے، میں  
اسے جو تیوں میں رکھوں۔ سر پر نہ بٹھاؤں۔ اسمگلنگ کے  
دھندے پر توجہ دیتی رہوں اور سونے کے ذخیرے میں  
اضافہ کرتی رہوں لیکن مجھے ان سے اختلاف ہے۔ میں ان  
سے جھگڑتی رہتی ہوں۔ وہ بہت ہی بے رحم ہیں۔ کسی کے منہ  
سے انکار نہیں سنتی ہیں۔ جو ان کے مزاج کے خلاف بولتا  
ہے، اسے بڑی درندگی سے ہلاک کر دیتی ہیں۔ صرف مجھے  
ڈھیل دیتی ہیں۔ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ مجھے ہلاک  
نہیں کرتیں۔ میرے انکار کی وجوہات کو ختم کر دیتی ہیں۔“  
وہ مراد کو دیکھ کر بولی۔ ”جیسا کہ انہوں نے تمہیں ختم

کر دیا تھا۔ اچھا ہے وہ یہی سمجھ رہی ہیں کہ تم مر چکے ہو۔  
مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں روز تمہیں فون کرتی تھی۔ پھر میں  
نے ماما سے کہا کہ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میں کچھ روز کے لیے  
پیرس جاؤں گی۔ انہوں نے انکار نہیں کیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ  
میرا دل بہل جائے اور میں تمہیں بھول جاؤں۔“

اس نے ہنستے ہوئے مراد کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”وہ سمجھ  
رہی ہیں کہ میں تمہاری موت کا غم بھلانے جا رہی ہوں۔ کیا  
خدا کی شان ہے۔ تم میرے زندہ ہم سفر بن گئے ہو۔“

مراد نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے  
درمیان فاصلہ رہنا چاہیے۔“

وہ روٹھنے کے انداز میں بولی۔ ”میں جب بھی قریب آنا  
چاہتی ہوں تم یہی کہتے ہو۔ کیا میری ماما سے ڈرتے ہو؟“

”میں صرف خدا سے ڈرتا ہوں۔ شادی سے پہلے  
ہمیں ایک دوسرے کو چھونا بھی نہیں چاہیے۔“

”ہم پیرس پہنچ کر کورٹ میرج کر لیں گے۔“

”اس کے بعد کیا ہوگا؟ کیا تمہاری ماما تمہیں آسانی  
سے چھوڑ دیں گی؟ نہیں سمجھی نہیں..... میں تمہاری ماما کے  
شوٹروں کا مقابلہ کرتا رہوں گا۔ لیکن یہ جنگ کبھی ختم نہیں  
ہوگی۔ تم سمجھ سکتی ہو تمہاری ماما اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں  
آئیں گی۔“

”ہم کہیں دور جا کر چھپ کر رہیں گے۔“

”مرد بزدلوں کی طرح چھپ کر نہیں رہتے۔ میں لڑتا  
رہوں گا پھر ایک دن مارا جاؤں گا پھر کیا کرو گی؟ کچھ نہیں  
کر سکو گی۔ میری جان گوانے کے بعد ساری عمر کنواری نہیں  
رہو گی۔ پھر دل بہلانے کے لیے پیرس جاؤ گی۔ میں تو اپنی  
جان سے گزر جاؤں گا۔“

وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ دونوں جہاز میں آ کر بیٹھ  
گئے۔ مراد نے کہا۔ ”کیا تمہاری ماما نے پیرس جانے کے  
لیے تمہیں تنہا آزادی دے دی ہے؟ میرا ذہن نہیں مانتا۔  
میں یقین سے کہتا ہوں کہ ان کے جاسوس دور سے تمہاری  
نگرانی کر رہے ہوں گے۔ وہ اس جہاز میں موجود  
ہوں گے۔ وہ جہاز میں ہتھیار نہیں لاسکتے لیکن پیرس پہنچتے ہی  
انہیں ہتھیار مل جائیں گے۔ میں نے سنا ہے کہ تمہاری ماما کی  
ایک سیکرٹ فورس ہے۔ وہ تمہاری جیسی لاڈلی بیٹی کو بھی نظر  
نہیں آتی ہوگی لیکن میرا تجربہ کہتا ہے کہ میں... ایک بار پھر  
بارود کے ذخیرے میں پہنچ گیا ہوں۔ پھر مجھ پر گولیاں چلائی  
جائیں گی، تب کیا کرو گی؟“

وہ بے اختیار سر گھما کر سیٹ پر سے ذرا اٹھ کر ادھر

وہ بے اختیار سر گھما کر سیٹ پر سے ذرا اٹھ کر ادھر

وہ بے اختیار سر گھما کر سیٹ پر سے ذرا اٹھ کر ادھر

وہ بے اختیار سر گھما کر سیٹ پر سے ذرا اٹھ کر ادھر

وہ بے اختیار سر گھما کر سیٹ پر سے ذرا اٹھ کر ادھر

وہ بے اختیار سر گھما کر سیٹ پر سے ذرا اٹھ کر ادھر



ادھر دیکھنے لگی۔ مراد نے پوچھا۔ ”کیا اپنی ماں کے سپاہیوں کو اور سرائے رساقوں کو پہچانتی ہو؟“  
 وہ بولی۔ ”نہیں۔۔۔۔۔“  
 ”تو پھر بیٹھے جاؤ۔ کیوں انہیں سمجھا رہی ہو کہ ہم ان کی موجودگی کو سمجھ رہے ہیں؟“  
 وہ واپس اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بے بسی سے بولی۔  
 ”میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ تم بولو اب ہم کیا کریں؟“  
 ”تمہیں میری موت پر صبر آ گیا تھا۔ اب بھی صبر کرو۔ یقین کرو کہ حماد مرچکا ہے۔ میں اس کی پرچھاگیں ہوں۔ حماد نہیں کوئی اور ہوں۔“  
 وہ اسے چھو کر بولی۔ ”میں کیسے مان لوں؟ میرے سامنے زندہ سلامت موجود ہو۔“  
 ”اگر تم مان لو گی تو یہ دوسرا حماد کہیں سے آنے والی اندھی گولی سے بچ جائے گا۔ پلیز اپنی ماں سے فون پر کہہ دو کہ میں حماد نہیں ہوں۔“  
 ”ماما کبھی یقین نہیں کریں گی۔“  
 ”تم کہو گی کہ میری طلب سے باز آ رہی ہو اور ماما کے پاس واپس جا رہی ہو تو وہ مجھ سے دشمنی سے باز آ جائیں گی۔“  
 ”کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو؟ مجھ سے دور بھاگنا چاہتے ہو؟“  
 ”کیا تم چاہتی ہو، تمہارے ساتھ رہوں اور مرجاؤں؟“  
 وہ کیسے کہتی کہ اس کے ساتھ رہ کر جان دے دے وہ رونے لگی۔ مراد نے کہا۔ ”یہ جہاز ہنگری میں ایک گھنٹے کے لیے رکے گا۔ تم باہر جا کر ماما سے بات کرو۔ ان سے کہو کہ تم دھوکا کھا گئی تھیں۔ میں حماد نہیں ہوں۔ اس کا ہم شکل ہوں۔ تم واپس آ رہی ہو۔“  
 وہ اس کرف میں منہ چھپا کر رو رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ ”میں واپس نہیں جاؤں گی۔ وہ گیارہ برس کے ایک لڑکے سے میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔“  
 ”کیا.....؟“ مراد نے چونک کر اسے دیکھا۔  
 ”وہ چاہتی ہیں، میں دنیا کے سب سے طاقتور شخص کی بیوی بن جاؤں۔ وہ میرا محافظ رہے گا۔ ہمارے سونے کے ذخیرے پر آج نہیں آنے دے گا۔“  
 ”تم کہہ رہی ہو وہ گیارہ برس کا ہے۔ کیا پرنس نابعلی منگی کی بات کر رہی ہو؟“  
 ”ہاں۔ وہ عجیب و غریب لڑکا ہے۔ پوری دنیا میں

اس کی شہرت ہو رہی ہے۔ میں کبھی برس کی ہوں۔ وہ مجھ سے چودہ برس پیچھے ہے۔“  
 ”کیا تمہاری ماما سے اس کی شناسائی ہے؟ کیا اس سے رشتے کی بات چل رہی ہے؟“  
 ”نہیں۔ ماما اس سے رابطہ کرنے کی کوششیں کر رہی ہیں۔ یہودی اکابرین کسی کو پرنس سے باتیں کرنے کی اجازت نہیں دیتے اور پرنس کے پاس اپنا ذاتی فون نہیں ہے۔“  
 ”ایسے حالات میں تمہاری ماما نے کیسے سمجھ لیا کہ تمہیں پرنس کی ذہن بنا نہیں گی؟“  
 ”ماما جو ارادہ کر لیتی ہیں اسے ہر قیمت پر پورا کرتی ہیں۔ وہ پرنس کو داماد بنانے کے لیے یہودیوں سے ٹکرانے والی ہیں۔ ان کی باتیں چھوڑو۔ اپنی بات کرو۔“  
 مراد نے دل میں کہا۔ ”یہ اچھا ہو رہا ہے۔ یہودیوں سے ٹکرانے والا ایک نیا محاذ کھل رہا ہے۔ اس محاذ کو مضبوط کرنے کے لیے اپنی طرف سے سہولتیں فراہم کرنی چاہئیں۔“  
 وہ بولا۔ ”اپنی بات یہ ہے کہ تمہاری ماں فولادی ارادوں کی حامل ہے اور تم ان کے ٹھنڈے سے کبھی نکل نہیں سکو گی۔ میری موت کے بعد کسی اور سے دل لگاؤ گی تو تمہاری ماں اسے بھی کچا چبا جائے گی۔ صاف سن لو کہ مجھے اپنی زندگی پیاری ہے۔ میں حماد نہیں ہوں اور تمہارے حماد کی طرح نادان نہیں ہوں۔ تمہیں سمجھاتا ہوں کہ ماں کے سامنے میں ہی تم کسی مرد کے ساتھ ازدواجی زندگی گزار سکو گی۔ اچھی طرح سوچ لو۔“  
 وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد بولی۔  
 ”ٹھیک ہے۔ میں تمہاری زندگی کو داؤ پر نہیں لگاؤں گی۔“  
 پھر اپنا سر تھام کر بولی۔ ”او گاڈ.....! ماما کے پاس واپس جانا ہوگا۔ یہ کیسی ماں ہے۔ مجھے سراسمانے ہی نہیں دیتی۔ ہمیشہ جھکا دیتی ہے۔“  
 وہ سیٹ بیلٹ باندھنے لگے۔ جہاز ہنگری کے ایک ائرپورٹ پر اترنے والا تھا۔ مراد نے کہا۔ ”ہم تھوڑی دیر کے لیے جہاز سے باہر جائیں گے۔ ائرپورٹ کے لاؤنج میں تم ماما سے فون پر بات کرو گی پھر مجھ سے بھی باتیں کرو گی۔“  
 جہاز رن وے پر دوڑتا ہوا رگ گیا۔ مراد اس آفت کی پرکالہ سے پہلی بار باتیں کرنے والا تھا۔ وہ بھڑکتا ہوا شعلہ تھی۔ اسے یہودیوں کے خلاف اور بھڑکانے والا تھا۔  
 جہاز نے جہاز سے باہر آتے ہی اپنی ماں کو فون پر مخاطب کیا۔ ”ہیلو ماما! میں آپ سے ضروری بات کرنے



والی ہوں۔“

”پرنس فون پر ہیلو کہیں گے۔ صرف دو باتیں کریں گے۔ اس سے زیادہ باتیں کرنے سے پہلے میری شرط پوری کرنی ہوگی۔“

”کون سی شرط؟“

”تمہیں تھوک کر چاشنا ہوگا۔“

”بکو اس مت کرو۔ میں تمہارا منت توڑ دوں گی۔“

اس نے جو اپنا فون بند کر کے اسے جمانگہ کی ہتھیلی پر رکھ دیا پھر جہاز میں واپس جانے لگا۔ فون پھر بولنے لگا۔ جمانگہ نے بشن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”یس ماما؟“

”وہ کیا بکو اس کر رہا تھا؟ کیا واقعی پرنس سے رابطہ کرا سکتا ہے؟ آخر یہ ہے کون؟ کیا کرتا ہے؟“

مراد کی باتوں نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ وہ بول رہی تھی۔ ”پرنس تک میں پہنچ نہیں پائی۔ یہ کیسے پہنچ جائے گا؟ یہ معلوم کرو کہ وہاں تک اس کی پہنچ ہے یا نہیں۔“

”او کے ماما! ابھی معلوم کرتی ہوں۔“

اس نے آواز دی۔ ”حماد! رک جاؤ۔ ابھی جہاز میں نہ جاؤ۔ مجھ سے کچھ باتیں کرو۔“

وہ رک گیا۔ پلٹ کر آتے ہوئے بولا۔ ”کیا باتیں کرو گی؟“

اس نے پوچھا۔ ”کیا واقعی تمہاری پرنس تک پہنچ ہے؟“

”مجھ سے نہ پوچھو۔ تمہاری ماں کو یقین نہیں آ رہا ہے۔“

”کسے یقین آئے گا جبکہ بیہودی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ کیا وہ تمہیں نہیں روکیں گے؟“

”وہ مجھے نہیں روک سکتے۔ میں پرنس کا پرسنل نمبر جانتا ہوں۔“

”پلیز میری ماما کو وہ نمبر بتاؤ۔“

”تمہاری ماں کو میری شرط منظور نہیں ہے۔“

”شرط کیا ہے؟“

”یہ اپنی ماں سے پوچھو۔“

وہ فون پر بولی۔ ”آپ ہماری باتیں سن رہی ہیں نا؟ شرط کیا ہے؟ آپ مانتی کیوں نہیں ہیں؟“

”وہ بکو اس کر رہا ہے۔ میں نے غصے میں تھوکا تھا۔ اب کہہ رہا ہے کہ تھوکا ہوا چائو۔ کمینہ کہیں کا۔ میرے سامنے ہوتا تو کھڑے کھڑے گولی مار دیتی۔“

اس نے مراد سے شکایت کی۔ ”تم میری ماما کی انسلٹ کر رہے ہو۔ انہوں نے غصے میں تھوکا تھا۔ تم نہیں جانتے۔ یہ ان کی عادت ہے۔ اسے بھول جاؤ۔“

”میری بھی عادت ہے۔ مجھے بھی غصہ آتا ہے۔ تھوکا

ماں نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں۔ وہ ضروری بات یہ ہے کہ تم ابھی حماد کے ساتھ پیرس جا رہی ہو۔ بے وقوف لڑکی میرے سراغ رسائوں نے حماد کی ہلاکت کے بعد معلوم کیا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کی لاش چھپا دی تھی۔ اب کسی بہروپے کو حماد بنا کر پیش کر رہے ہیں اور تم دھوکا کھا رہی ہو۔“

جمانگہ نے مراد کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ حماد نہیں ہے۔ اب اس کی ماں بھی یہی کہہ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ”یس ماما! یہ بھی یہی کہہ رہا تھا کہ حماد نہیں ہے۔ اس کا ہم شکل ہے۔ میں یقین نہیں کر رہی تھی، اب آپ بھی یہی کہہ رہی ہیں۔“

پھر وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میں ہار گئی ماما! آپ سے کبھی جیت نہیں سکوں گی۔ مجھے آپ کی ہی مرضی سے شادی کرنی ہوگی۔“

”میری بچی! ماں دشمن نہیں ہوتی۔ واپس آ جاؤ۔“

”نہیں ماما! میں پیرس میں کچھ روز تنہا رہوں گی۔ یہ حماد کا ہم شکل بہت اچھا ہے۔ بڑی اچھی باتیں کرتا ہے۔ اس نے مجھے سمجھایا ہے کہ میں آپ کی بات مان لوں آپ جہاں چاہتی ہیں وہاں شادی کے لیے راضی ہو جاؤں۔“

”وہ بہروپیا ہے کون؟ اس سے بات کراؤ۔“

اس نے مراد کی طرف فون بڑھایا۔ اس نے فون لے کر کان سے لگا کر کہا۔ ”ہیلو..... حماد بول رہا ہوں جبکہ حماد نہیں ہوں۔“

شمانگہ شانی نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

حماد بن کر میری بیٹی کے سامنے کیوں آئے ہو؟“

”میں نہیں، آپ کی بیٹی میرے سامنے آئی ہے۔“

”تم نے حماد کی صورت کیوں بنوائی ہے؟“

”میں بہروپیا ہوں۔ ضرورت مندوں کے کام آنے کے لیے چہرے بدلتا رہتا ہوں۔ یہ سن لو کہ آج سے میں تمہاری بھی ضرورت بن جاؤں گا۔“

”کیا بکو اس کر رہے ہو؟ تم اور میری ضرورت..... اونہٹہ میں تھوکتی ہوں تم جیسوں پر۔“

”تم نے جو تھوکا ہے اسے چاٹو گی تو ابھی پرنس عابی سے فون پر تمہارا رابطہ کراؤں گا۔“

وہ یلکھت چونک کر بولی۔ ”کیا.....؟ کیا تم پرنس عابی سے رابطہ کرا سکتے ہو؟ میں کیسے مان لوں؟“

”رابطہ ہو جائے گا تو مان لو گی۔“

”بے شک مان لوں گی، ابھی بات کراؤ۔“



ہوا چائے پر مجبور کرو دیتا ہوں۔“

”کیوں اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو؟ تم ماما کے غصے کو نہیں جانتے۔ وہ تمہیں زندہ نہیں رہنے دیں گی۔“

”اپنی ماما سے بولو، میں زندہ رہوں گا، تب ہی وہ پرنس سے تمہارا رشتہ کرا سکیں گی۔“

شائلہ شانی ہر قیمت پر عالی کو داماد بنانا چاہتی تھی اور وہ جس بات کی ضد کرتی تھی اسے پورا کر کے ہی رہتی تھی۔ وہ مراد کی باتیں سن کر تلملا رہی تھی۔ یہ معلوم کرنا ضروری ہو گیا تھا کہ مراد واقعی اس سے رابطہ کرا سکتا ہے یا نہیں؟

اس نے غصے سے کہا۔ ”جما مکہ! اس سے بولو، پہلے پرنس سے بات کرائے۔ پہلے یقین دلائے۔ اس کے بعد اپنی شرط منوانے کی بات کرے۔“

جما مکہ نے کہا۔ ”کیوں بات بڑھا رہے ہو؟ ماما کو یقین تو دلاؤ کہ وہاں تک تمہاری پہنچ ہے۔“

وہ بولا۔ ”وہ مجھے کوئی معمولی آدمی سمجھ رہی ہے۔ اچھی بات ہے۔ ابھی یقین ہو جائے گا۔ ذرا انتظار کرو۔“

وہ اپنے فون پر بیٹے کے نمبر شیخ کرتا ہوا جما مکہ سے دور چلا گیا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ سن نہیں پا رہی تھی کہ کسی سے کیا بول رہا ہے؟

شائلہ شانی نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ وہ کہاں ہے؟“

”میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ذرا دور چلا گیا ہے۔ کسی سے کچھ بول رہا ہے۔“

”وہ میرا وقت برباد کر رہا ہے۔“

”آپ مجبور کیوں ہو گئی ہیں ماما؟“

”تم نادان پنہی نہیں ہو۔ یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تم کو اور تمہارے مستقبل کو ایک شہ زور کے ہاتھوں میں دینا چاہتی ہوں۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم ایک ریاست کی مہارانی سے بھی زیادہ دولت مند ہو۔ میں مرجاؤں گی تو دوست اور دشمن تمہیں چیل کوؤں کی طرح نوج کھائیں گے۔“

”میری پنہی! میری شہزادی! صرف پرنس عالی کی ہی آغوش میں رہ کر گدھ جیسے نوچنے والے مردوں کو مات دیتی رہو گی۔ ایک بار..... صرف ایک بار پرنس سے میرا رابطہ ہو جائے پھر میں اسے اپنا داماد بنا کر ہی رہوں گی۔“

پھر وہ جھنجلا کر بولی۔ ”وہ رابطہ کرنے والا بہر و پیا کیا کر رہا ہے؟ وہ اتنی لمبی باتیں کس سے کر رہا ہے؟ میں کسی کے انتظار میں لنگنا نہیں جانتی۔ اسے بولو کہ.....“

بیٹی نے بات کاٹ کر کہا۔ ”وہ واپس آ رہا ہے۔“

مراد نے قریب آ کر کہا۔ ”ایک نمبر بتا رہا ہوں۔ اس

پرنس سے بات ہو سکے گی۔“

جما مکہ نے اس کے بتائے ہوئے نمبر کو فون پر درج کیا۔ وہ بولا۔ ”اور میں جہاز میں جا رہا ہوں۔ پیرس پہنچنے تک تمہاری ماں سے بات نہیں کروں گا۔“

وہ پلٹ کر چلا گیا۔ جما مکہ نے ماں کو وہ نمبر نوٹ کرانے کے بعد کہا۔ ”یہ بہت مغرور ہے۔ جہاز میں چلا گیا ہے۔ کہہ رہا تھا آئندہ وہ پیرس پہنچنے کے بعد ہی آپ سے بات کرے گا۔“

”ماما! یہ آپ کی بہت بری عادت ہے۔ آپ کسی پر بھی تھوکنے کی باتیں کیوں کرتی ہیں؟“

”میں دنیا کے تمام مردوں کو قابل نفرت سمجھتی ہوں۔ جب تم میری طرح با اختیار با اقتدار خاتون بن جاؤ گی تو میرا رویہ تمہاری سمجھ میں آئے گا۔ بہر حال پہلے میں اس فون نمبر کو تو آزما لوں۔“

اس نے بیٹی سے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ اپنے شاہانہ طرز کے شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سح باڈی گارڈز اس بیٹلے کے اندر اور باہر مستعد کھڑے رہتے تھے۔ وہ بنگلا اس کی عارضی رہائش گاہ تھی۔ پیرس میں اس کا ایک عالی شان محل تھا۔ وہ ایک بڑی سکیورٹی فورس کے ساتھ وہاں ایک ملکہ معظّمہ کی طرح رہتی تھی۔ دوسرے دن بیٹی کے پیچھے پیرس پہنچنے والی تھی۔

اس نے حماد کے بتائے ہوئے فون نمبر کو بے یقینی سے شیخ کیا پھر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف نیل جانے لگی پھر تھوڑی دیر بعد ہی عالی کی بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔ ”ہیلو فرمائیں۔ کون ہیں آپ؟“

اس نے کہا۔ ”میں ملکہ شائلہ شانی بول رہی ہوں۔ سب مجھے گولڈن کوئین (سونے کی ملکہ) کہتے ہیں۔ اگر آپ پرنس عابد علی منگی ہیں تو پھر ہم ایک ہی اسٹیشن کے افراد ہیں۔“

”جی ہاں۔ میں عابد علی منگی ہوں۔“

”پلیز آپ مائنڈ نہ کریں۔ فون پر بڑے فراڈ ہوتے ہیں۔ آپ یقین دلائیں کہ واقعی پرنس عالی ہیں۔“

عالی نے کہا۔ ”میں یہودیوں کی ایک ٹیم کے ساتھ پیرس جانے والا ہوں۔ اس ٹیم کے سربراہ مسٹر کریگ ہوشن ہیں۔“

”میں جانتی ہوں۔ میں نے مسٹر ہوشن سے گزارش کی تھی کہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں لیکن انہوں نے انکار کر کے میری انسلٹ کی ہے۔ آئی ہیٹ ہم۔“



”آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بہت غصے میں رہنے والی خاتون ہیں۔“

”میں صرف ناپسندیدہ افراد کو برداشت نہیں کرتی۔ ورنہ آپ اگر آئرن ہیل پرنس عابد علی منگی ہیں تو پھر میں آپ کے لیے مستاً سے بھرپور موم کی طرح پکھلنے والی ماں ہوں۔ پلیز یقین دلائیں۔“

”فون بند کریں۔ تھوڑی ہی دیر میں کریگ ہوشن آپ سے اپنے روپے کی معافی مانگیں گے اور مجھ سے رابطہ کرنے کے لیے یہی مہر دیں گے۔“

فون بند ہو گیا۔ شائلہ شانی نے مطمئن ہو کر اپنے فون کو دیکھا۔ امید روشن ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ہونے والے داماد تک پہنچنے والی تھی۔

اس کی پرسنل سیکریٹری نے انٹرکام پر کہا۔ ”میڈم! دی رائٹ مین کی کال ہے۔“

رائٹ مین اہم خفیہ معاملات میں اس کا دست راست تھا۔ کوئی اہم بات کرنے والا تھا لیکن ان لحاظ میں خانی سے زیادہ کوئی اہم نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں آدھے گھنٹے تک کوئی کال ریسیو نہیں کروں گی۔“

”کیا آپ پیغام سنا چاہیں گی؟“  
”ویل۔ سناؤ۔“

”آپ کا کاروباری حریف سائمن گولڈی مشکل میں ہے۔ اس کے سونے کا جہاز گہرے پانیوں میں کھڑا ہے۔ یونان کی جنوبی بندرگاہ میں آری آگئی ہے۔ وہ اس بندرگاہ میں مال ڈیلیور نہیں کر سکے گا۔ دوسری طرف آئی لینڈ کریٹ میں ہماری اجارہ داری ہے۔“

شائلہ شانی نے کہا۔ ”سمجھ گئی۔ رائٹ مین سے بولو سائمن گولڈی سے پریسٹیج پر ڈیل کرے۔ میں تھوڑی دیر بعد رائٹ مین سے بات کروں گی۔“

اس نے انٹرکام کا سوچ آف کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد فون سے کانگ فون ابھرنے لگی۔ اس نے حیرانی سے دیکھا۔ سٹی اسکرین پر کریگ ہوشن کے نمبر تھے۔

وہ خوشی سے کھل گئی۔ یقین ہونے لگا کہ پرنس خانی سے رابطہ ہونے والا ہے۔ اس نے مین کو دبا کر فون کو کان سے لگا کر اپنے مزاج کے مطابق خشک لہجے میں پوچھا۔ ”ہیلو۔ کون ہے؟“

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”میڈم! میں فری مین کا ایک عہدیدار کریگ ہوشن بول رہا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا۔ آپ آئرن ہیل پرنس عابد علی منگی سے گفتگو کرنا چاہتی

تھیں۔“

وہ سخت لہجے میں بولی۔ ”اور میں آپ کی ناقدری کے باعث گفتگو نہ کر سکی۔ آپ یہودی حضرات نے پرنس پر اپنے بچے گاڑ رکھے ہیں۔ آئی ہیٹ یور بی ہیویر.....“

”سوری میڈم! آپ یہودیوں کے خلاف ایسی باتیں نہ کریں۔ ہم وسیع قلب و نظر رکھتے ہیں۔ آپ ان سے گفتگو کر سکتی ہیں۔ میں ان کا موجودہ فون نمبر بھیج رہا ہوں۔“

ایک منٹ کے اندر ہی اس کے فون پر وہی نمبر آیا جو مراد پہلے ہی دے چکا تھا۔ وہ جسے بہرہ و پیا کہہ رہی تھی، وہ کام کا آدمی نکلا۔ اس نے فوراً ہی ان نمبروں کو شیج کیا۔

رابطہ ہوا اور مرادیں برآئیں۔ خانی کی آواز سنائی دی۔ ”ویل مادام! یقین ہو گیا کہ میں پرنس بول رہا ہوں؟“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”اومائی گڈنس۔ آج کا دن میرے لیے یادگار رہے گا۔ میں آپ سے بہت سی اہم باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”میرے استاد محترم اجازت دیں گے تو ضرور باتیں کروں گا۔“

”کون ہیں آپ کے استاد محترم؟“  
”آپ جانتی ہیں۔ انہوں نے میرا فون نمبر آپ کو دیا ہے۔“

”کیا.....؟“ وہ حیرت سے چیخ پڑی۔ ”وہ..... وہ حواد..... میرا مطلب ہے، محترم حواد صاحب آپ کے استاد ہیں؟“

”استاد بھی ہیں اور مشیر بھی۔ میں ان کے مشوروں کے بغیر کبھی کوئی کام نہیں کرتا۔ ابھی انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ آپ سے گفتگو کروں۔“

”اومائی گاڈ! کتنے نیک دل ہیں آپ کے استاد اور مشیر۔ میں ابھی ان کا شکریہ ادا کروں گی۔“

”شکریہ ادا کریں اور ان کی شرط بھی پوری کریں۔“  
اس نے چونک کر پوچھا۔ ”کیسی شرط؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔ وہ اپنے معاملات مجھے بھی نہیں بتاتے ہیں۔ مجھ سے اتنا کہا ہے کہ جب آپ شرط پوری کریں گی تب وہ مجھے آپ سے شناسائی پیدا کرنے کی اجازت دیں گے۔“

وہ بولکھلا گئی۔ ابھی پرنس سے معاملہ سلجھ گیا تھا اور ابھی چشم زدن میں الجھ گیا۔ اپنا ہی تھوک چاٹنے والی بات پھر ابھرائی تھی۔

وہ بولی۔ ”پرنس! وہ بہت ہی ناگوار سی شرط ہے۔ مسٹر حواد نے آپ سے ذکر کیا ہوگا؟“



تو اسے سسلی کی بندرگاہ میں یعنی ریڈارٹ کی پناہ میں آنا ہی ہوگا۔

اس جہاز کے پیچھے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر کریٹ آئی لینڈ تھا۔ اس جزیرے پر شانہ شانی کی اجارہ داری تھی۔ اس کی سمندری فوج کسی اسمگلر کو وہاں آنے نہیں دیتی تھی۔ کوئی بھی اپنے جہاز کو ان لوڈ کرنا چاہتا تو اس سے جائز مال کے پانچ پرسنٹ اور غیر قانونی مال کے پچاس پرسنٹ وصول کرتی تھی۔

مراد نے ماضی میں ریڈارٹ کے کئی سربراہوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ انہوں نے مراد کے سر کی قیمت پچاس لاکھ ڈالر رکھی تھی لیکن دنیا کے تمام ماہر شوٹرز میں سے کوئی اسے گولی نہ مار سکا۔ آخر براؤن خاندان کا ایک ہی سربراہ جنکی براؤن رہ گیا۔ بارہ برس پہلے جنکی باپ بننے والا تھا۔ اس کا وارث یعنی ریڈارٹ کا آئندہ سربراہ پیدا ہونے والا تھا۔

ایسے وقت مراد نے اس سے کہا تھا۔ ”تمہارے باپ دادا نے میرے سر کی قیمت لگا رکھی ہے۔ میرا اللہ مجھے سلامتی دے رہا ہے۔ میرا سلامت ہے اور ریڈارٹ کے سربراہوں کے سرشانوں سے الگ ہوتے آرہے ہیں۔ اب تمہارا وارث..... آئندہ کا سربراہ بڑی رازداری سے میونخ کے ایک کالج میں پیدا ہونے والا ہے اور اتفاق سے میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔ تمہاری مضبوط سکیورٹی پہلے بھی مجھے نہ روک سکی۔ اب بھی نہیں روک سکے گی۔ یہ لکھ لو کہ تمہارا وارث پیدا ہوتے ہی میرا نشانہ بن جائے گا۔“

یہ چیخ سنتے ہی جنکی براؤن خوف سے تھرا گیا تھا۔ مراد نے کہا تھا۔ ”میں تمہیں بھی ختم کر دوں گا تو براؤن فیملی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ میرے تمام حملے کامیاب رہے ہیں۔ سوچ لو۔“

مراد ایسا درندہ نہیں تھا کہ ایک نوزائیدہ بچے کو مار ڈالتا اس نے محض دھمکی دی تھی۔ جنکی براؤن اپنے بچے کی قسم کھا کر کہنے لگا۔ ”میں تو بہ کر رہا ہوں۔ دشمنی سے باز آرہا ہوں۔ میں نے اپنے بزرگوں کی لاشیں اٹھائی ہیں۔ اپنے بچے کی لاش دیکھتے ہی مرجاؤں گا۔ مجھ پر رحم کرو۔ میری نسل کو آگے بڑھنے دو۔ میں ہر قیمت پر تم سے بچھوتا کروں گا۔“

پھر اس نے بچھوتا کر لیا۔ وہ جو مراد کا جانی دشمن تھا۔ اس کا دل سے دوست بن گیا تھا۔ اس کا وارث اس کا انکوتا بیٹا اب بارہ برس کا ہو گیا تھا اور ہر سال اپنی ساگرہ کے دن فون پر مراد کو سلام کرتا تھا۔ ریڈارٹ جرائم کی دنیا میں

”میں نے کہا۔ وہ اپنے معاملات کسی کو نہیں بتاتے ہیں پلیز آپ ان سے نمٹ لیں پھر مجھ سے باتیں ہوں گی۔“

فون بند ہو گیا۔ پھر انکار..... پھر رکاوٹ..... پھر انسلٹ..... وہ غصے سے پھٹ پڑی۔ غلطی کی سزائیں کمزوروں کو دی جاتی ہیں۔ وہ شہ زور تھی۔ گہرے سمندروں میں جہازوں کے رخ موڑ دیتی تھی۔ ہر ملک کی زمین برکائند کی کرنسی رائج رہتی ہے۔ وہ سونے کے سکے نکلتی تھی اور حکمرانوں کے فیصلے بدل دیتی تھی۔

وہ حماد..... کیا پدی کیا پدی کا شور با؟ وہ اسے تھوکا ہوا چاٹنے پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔ اس کی موت آگئی ہے وہ مرے گا۔ پیرس پہنچتے ہی مرے گا۔ وہ غصے سے تلملاتے ہوئے فیصلہ کر رہی تھی۔

لیکن نہیں..... عقل نے سمجھایا۔ وہ نہ پدی ہے نہ پدی کا شور با؟ وہ پرنس کو داماد بنانے والا ایک حربہ ہے۔ اسے مار ڈالے گی تو پرنس کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس سے بات نہیں کرے گا۔

وہ بہت ہی ضدی تھی۔ پرنس کو داماد بنانے کا حتیٰ فیصلہ کر چکی تھی۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس نے کسی بات کی ضد کی ہو اور وہ پوری نہ ہوئی ہو لیکن وہ حماد گلے میں بڑی کی طرح اٹک گیا تھا۔ بعد مجبوری اسے زندہ رکھنا تھا اور اسے قائل کرنا تھا کہ وہ تھوک کر چاٹنے والی بات نہ کرے۔ اس نے مراد سے باتیں کرنے کے لیے بیٹی کے نمبر شیئر کیے۔ معلوم ہوا کہ ادھر سوچ آف ہے۔ یقیناً وہ جہاز کے اندر ہوگی۔ اب پیرس پہنچنے کے بعد ہی بات آگے بڑھ سکتی تھی۔

اسے اگلے چار گھنٹوں تک انتظار کرنا تھا۔ اس نے دوسرے اہم معاملے پر توجہ دی۔ اس کے کاروباری حریف سائمن گولڈی کا جہاز گہرے پانیوں میں رکھا ہوا تھا۔ اسے اتھمنز کی ایک بندرگاہ میں بڑی رازداری سے سونا ڈیلور کرنا تھا لیکن اطلاع ملی کہ وہاں کے ساحلی علاقوں میں فوج گشت کر رہی ہے۔ اب وہ جہاز آگے کسی بھی بندرگاہ پر لنگر انداز ہونا چاہتا تو اس جہاز کا عملہ قانونی گرفت میں آجاتا۔ تمام سونا ضبط کر لیا جاتا۔ سائمن گولڈی اپنے عالی شان محل میں محفوظ تھا لیکن کروڑوں ڈالرز کا نقصان اٹھانے والا تھا۔

اب مجرمانہ تنظیمیں ہی اس کے سونے کو ڈوبنے سے بچا سکتی تھیں۔ اس جہاز کے آگے مغرب کی سمت جزیرہ سسلی تھا۔ وہاں ریڈارٹ کی حکمرانی تھی۔ ریڈارٹ کے موجودہ سربراہ جنکی براؤن کو اطلاع مل گئی تھی کہ سائمن گولڈی اپنا سونا بچانے کی فکر میں ہے۔ جب اسے کوئی راستہ نہیں ملے گا



بہت ہی مضبوط اور منظم تنظیم مانی جاتی تھی۔ اس کے سربراہ سے دوستی ہوتے ہی دوسرے تمام مجرم مراد سے دشمنی بھول گئے تھے۔

ہم زاور یا سستی معاملات میں مصروف تھا۔ چونکہ مراد بن کر رہتا تھا اس لیے مراد کا فون اس کے پاس رہا کرتا تھا تمام ممالک کے اعلیٰ عہدیدار اسی نمبر پر اس سے رابطہ کیا کرتے تھے۔ جیکی براؤن نے اسے کال کی۔ ہم زاد نے اس کے نمبر پڑھے پھر بن دبا کر فون کوکان سے لگا کر کہا۔

”ویل مسٹر براؤن! کیسے یاد کیا؟ خیریت تو ہے؟“

”ہاں خیریت ہے۔ فی الحال ایک ایسا معاملہ درپیش ہے جس کا تعلق کسی حد تک آپ سے ہے۔“

”معاملہ کیا ہے؟“

”پیرس میں ایک شائلہ شانی نام کی بیوہ دولت مند خاتون ہے۔ سونا اسمگل کرتی ہے۔ بہت ہی خطرناک عورت ہے۔ مکاری اور درندگی اس پر ختم ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ یورپ اور افریقا کی چھ کرمٹل تنظیمیں میری اتحادی ہیں۔ ان میں سے ایک کرمٹل تنظیم کا سربراہ اینڈی گارن، شائلہ کی حسین بیٹی جمائلہ پر عاشق ہو گیا ہے۔ اینڈی نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے لیے جمائلہ کا رشتہ اس کی ماں سے مانگوں۔ میں نے پیرس میں شائلہ سے ملاقات کی پھر جمائلہ اور اینڈی گارن کے رشتے کی بات کی۔“

اس نے جواب دیا۔ ”میں اپنی بیٹی کو کسی مجرم کے سائے میں نہیں جانے دوں گی۔ میں اس دنیا کے سب سے طاقتور شخص سے بیٹی کا رشتہ کروں گی۔ میرے پاس بے حساب سونے کا ذخیرہ ہے۔ کروڑوں ڈالرز کی جائیداد ہے۔ میرا ہونے والا داماد میری بیٹی کا اور اس کی دولت اور جائیداد کا محافظ بن کر رہے گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”ایسا کون شہ زور ہے، جسے تم داماد بنانے والی ہو؟ تب اس نے کہا کہ وہ ریاست ارض اسلام کا شہزادہ عابد علی منگی ہے۔ میں اور اینڈی گارن آپ کے صاحبزادے کا نام سنتے ہی پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ ہم تصدیق کرنا چاہتے ہیں کیا پرنس عابد علی منگی سے جمائلہ کا رشتہ ہونے والا ہے؟“

ہم زاد نے کہا۔ ”یہ فضول سی بات ہے۔ میرا بیٹا ابھی گیارہ برس کا ہے۔ وہ آئندہ کئی برسوں تک شادی بیاہ کے بارے میں نہیں سوچے گا۔ ایک بار میرے پی اے نے کہا تھا کہ شائلہ نامی ایک خاتون سونے کی تاجر ہے۔ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔ میں نے مصروفیات کے باعث گفتگو

کرنے سے انکار کر دیا تھا۔“

”ہوسکتا ہے، وہ آپ کے صاحبزادے سے رابطے میں ہو۔“

”میں بیٹے سے پوچھوں گا۔“

”ایک اور معاملہ ہے۔ سونے سے لدا ہوا ایک جہاز ہمارے جزیرہ سسلی سے ستر گلو میٹر کے فاصلے پر رکا ہوا ہے۔ جہاں اسے مال اتارنا تھا، وہاں آرمی آگئی ہے۔ اب اس سونے کا اسمگلر سائمن گولڈی ہمارے رحم و کرم پر ہے۔ دوسری طرف کریٹ آئی لینڈ پر شائلہ کی حکمرانی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ سائمن گولڈی مجبور ہو کر شائلہ سے ڈیل کرے۔ اس سے ہم ڈیل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر سائمن ہم سے ڈیل نہیں کرے گا تو آدھی رات کے بعد ہمارے آدی وہ سونا لوٹ کر لے آئیں گے۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے ہم یقین کرنا چاہتے ہیں کہ پرنس عالی کا کوئی تعلق شائلہ سے نہیں ہے۔ اگر پرنس شائلہ اور اس کی بیٹی کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں تو ہم شائلہ کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اس جہاز میں جتنا بھی سونا ہے، ہم پرنس کی خاطر اس کے حصول سے باز آجائیں گے۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”میں ابھی بیٹے سے بات کروں گا۔ میری کال کا انتظار کرو۔“

اس نے رابطہ ختم کیا پھر بیٹے کو فون پر مخاطب کیا۔

”ہیلو عالی! یہ شائلہ اور اس کی بیٹی کا کیا معاملہ ہے؟“

عالی نے بتایا کہ شائلہ اس سے رابطہ کرنے اور تعلقات استوار کرنے کے سلسلے میں ناکام ہو رہی تھی۔ بابا جانی حماد نامی ایک جوان کے بہروپ میں اپنے طور پر اسے ابھار رہے ہیں۔

اس نے اپنے اور مراد کے بارے میں تمام معاملات تفصیل سے بتائے۔ یہ بھی بتایا کہ بابا جانی آئندہ ان ماں بیٹی سے کھیل کرنے والے ہیں۔ شائلہ پرنس کو داماد بنانے کے لیے یہودیوں سے ٹکرائے گی۔ اس طرح یہودیوں کے خلاف جلد ہی ایک نیا محاذ کھل جائے گا۔

موتوہ کھیل یہ ہے کہ حماد (مراد) نامی بہروپ پنا پرنس عالی کا استاد اور مشیر ہے۔ پرنس عالی اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا ہے اور یہ کہ شائلہ جب تک حماد کی شرط پوری نہیں کرے گی تب تک پرنس اس سے فون پر بات نہیں کرے گا اور شرط یہ ہے کہ شائلہ تھوک کر چائے اور وہ مغرور عورت ایسا کبھی نہیں کرے گی۔

فی الحال بات یہاں آ کر رکی ہے کہ شائلہ پھر ایک بار

سپینس ڈائجسٹ

200

جولائی 2016ء

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY

RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



تھے۔ ایک تھال میں مشائیاں اور خشک میوے تھے۔ ایک اور تھال میں موسم کے تازہ پھل نظر آ رہے تھے۔ کھلے ہوئے دروازے پر ایک قد آور شخص کھڑا تھا۔ اس نے سر جھکا کر کہا۔ ”یہ خادم اینڈی گارن کا بڑا بھائی ہے۔“

وہ دروازے سے اندر آیا۔ کنیزیں باہر چلی گئیں۔ مسلح گارڈ نے بھی باہر جا کر دروازے کو بند کر دیا۔ شاملہ نے چھڑی ٹیک کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے رشتے سے انکار کیا تھا پھر میرے پاس یہ کچرا لے کر کیوں آئے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”میں کیا بول سکتا ہوں۔ بھائی بولے گا اور ابھی بولے گا۔ جسٹ اے سنٹ۔“

اس نے اپنا فون نکال کر نمبر شیج کیے پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ ”بھائی! میں میڈم کی خدمت میں حاضر ہوں۔“

اس نے دوسری طرف کی بات سنی پھر اپنا فون بند کر کے بولا۔ ”آپ کے فون پر کال آنے والی ہے۔ بائی دا دے آپ نے اپنے لیے بڑے سخت حفاظتی انتظامات کیے ہیں۔ یہاں کوئی ہتھیار چھپا کر نہیں لاسکتا۔“

پھر وہ ہنستے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو دکھاتے ہوئے بولا۔ ”ہمارے جیسے شہ زوروں کے لیے ہتھیار لازمی نہیں ہوتے۔ میں ایک ہاتھ سے کسی کی گردن دبوچ لوں تو وہ پھڑپھڑا کر رہ جاتا ہے۔ دم نکلنے کے بعد ہی گرفت سے نکلتا ہے۔“

فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ شاملہ نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے اینڈی گارن نے کہا۔ ”میں اپنی ہونے والی خوش دامن صاحبہ کو سلام کرتا ہوں۔“

وہ سخت لہجے میں بولی۔ ”اینڈی! میں نے انکار کیا تھا۔“

”بے شک۔ جب تم نے کہا کہ مراد علی منگی کے بیٹے سے اپنے بیٹی کا رشتہ کر رہی ہو تو میں پیچھے ہٹ گیا تھا لیکن تم نے مجھے ٹالنے کے لیے جھوٹ کہا تھا۔ مجھے معلوم ہوا ہے، پرنس عابی سے رشتہ ہونا تو دور کی بات ہے تم ان سے دو باتیں بھی نہیں کر سکتی ہو۔ تم نے مراد علی منگی سے فون پر گفتگو کرنا چاہی تھی لیکن اس نے تمہیں گھاس بھی نہیں ڈالی۔ کیوں اپنی پرواز سے زیادہ اونچی اڑنا چاہتی ہو۔ مراد علی منگی کو کوئی مجرم کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ ایک ریاست کا حکمران بن گیا ہے۔ پلیز عقل سے کام لو۔ مجرمانہ اوقات میں رہ کر مجھے داماد بنا لو۔“

حماد سے فون پر بات کر کے اسے سنانا چاہتی ہے کہ وہ تھوگ کر چاٹنے والی شرط بدل دے۔ کوئی دوسری بڑی سے بڑی شرط منوالے لیکن فون پر ابھی رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔

چار گھنٹے بعد اس سے رابطہ ہونے والا تھا۔ ادھر شاملہ انتظار کر رہی تھی اور فون پر سائمن گولڈی سے بول رہی تھی۔ ”یاد رکھو۔ مجھ سے ڈیل نہیں کرو گے تو آگے ریڈ الرٹ کے بحری قزاق ہیں۔ وہ جہاز پر دھاوا بول کر تمام سونا لے جائیں گے۔ فوراً عقل سے کام لو۔ کپتان کو حکم دو کہ جہاز کو میرے آئی لینڈ کے قریب لے آئے۔ رات کی تاریکی میں میری مسلح فورس جہاز کو سیکیورٹی دے گی۔ وہ بحری قزاق اتنی دور میرے مقابلے پر نہیں آئیں گے۔“

سائمن نے کہا۔ ”میں مانتا ہوں۔ تم سمندروں کی ملکہ ہو۔ ریڈ الرٹ کے قزاق اپنی حدود سے باہر تمہارے مقابلے پر نہیں آئیں گے لیکن تم آدھا سونا حاصل کرنا چاہتی ہو۔ یہ بالکل ہی نامناسب ہے۔ پچیس پرسنٹ پر راضی ہو جاؤ۔ ورنہ ریڈ الرٹ سے بھی ڈینگ ہو رہی ہے۔ تم میں سے جو پچیس پرسنٹ پر راضی ہوگا، میں ادھر اپنا جہاز لے جاؤں گا۔“

شاملہ کے ایک ہاتھ میں ایک خوب صورت سی چھڑی تھی۔ وہ چھڑی سے ٹھیلنے کے انداز میں اسے ادھر سے ادھر لہرا رہی تھی اور فون پر باتیں کرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں ٹہل رہی تھی۔ وہ چھڑی خالص چاندی کی تھی۔ اس کا دست خالص سونے کا تھا۔ اس میں قیمتی ہیرے اور موتی جڑے ہوئے تھے۔ انٹرکام سے کالنگ ٹون ابھری۔ اس نے فون بند کر کے انٹرکام کے بٹن کو دبایا۔ اس کے پی اے نے کہا۔ ”مسٹر اینڈی گارن کا بھائی تحائف لے کر آیا ہے۔ آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔“

”اے آنے دو۔“

اس نے انٹرکام کو آف کیا پھر چھڑی ٹیکتی ہوئی ایک صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ بوڑھی نہیں تھی۔ محض شایانہ غرور کا مظاہرہ کرنے کے لیے اس چھڑی کو ہاتھ میں رکھتی تھی۔

ایک مسلح گارڈ نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا۔ چار کنیزیں اپنے سروں پر چاندی کی تھال اٹھائے ایک قطار میں چلتی ہوئی اندر آئیں۔ پھر شاملہ کے سامنے جسک کران تھالوں کو اس کے قدموں کے پاس رکھ دیا پھر ان سے رنگین خنوار پوش بنائے۔

شاملہ نے دیکھا چاندی کے تھالوں میں ہیرے موتی سے جڑے ہوئے زیورات اور دلہن کے قیمتی بلوسات



گزر گئی۔ وہ ہزاروں ڈالرز کے قیمتی قالین پر لہو میں بھیگتے ہوئے پھڑ پھڑانے لگا۔ سانسوں کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ ذرا دیر تڑپنے کے بعد ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔

شائلہ اسے چند لمحوں تک گھورتی رہی پھر اس نے تلووار کے لہو کو مقتول کے لباس سے اچھی طرح صاف کیا۔ اسے چاندی کے خول میں ڈال کر دوبارہ چھڑی بنائی۔ پھر سینٹر ٹیبل پر رکھے ہوئے کالنگ ٹیبل کے مٹن کو دیا۔

دو مسلح گارڈز فوراً ہی دروازہ کھول کر اندر آئے پھر لاش کو دیکھ کر ٹھنک گئے۔ شائلہ نے حقارت سے کہا۔ ”اس کتے کے مردہ وجود کو غائب کر دو۔ قالین کو تبدیل کرادو اور اس کے فون سے سم نکال کر پھینک دو۔“

وہ حکم کی تعمیل کرنے لگے۔ دوسرے ملازم بھی آگئے۔ وہ چھڑی ٹیکتی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔ مسلح گارڈز لاش کو اٹھاتے ہوئے حیرانی سے سوچ رہے تھے کہ میڈم کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے پھر اسے کس طرح لہو میں ڈبو دیا ہے؟

وہ اپنی مالکہ سے کوئی سوال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ چپ چاپ حکم کی تعمیل کرنے لگے۔ شائلہ شانی نے دوسرے کمرے میں آکر فون پر اینڈی گارن سے کہا۔ ”تمہارا بھائی واقعی شہ زور ہے۔ اس نے میرے ہاتھ سے چھڑی چھین لی تھی۔ میں ہار مان کر تمہارا رشتہ منظور کر رہی ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ برات میں اپنے بھائی کو ضرور لاؤ گے۔“

اس نے پوچھا۔ ”بھائی کہاں ہے؟ بات کراؤ۔“  
اس نے فون بند کر دیا۔ دس منٹ کے بعد اینڈی نے کال کی۔ بڑی بے چینی سے چیخ کر پوچھا۔ ”ہیلو۔ بھائی سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ اس کا فون خاموش کیوں ہے؟“  
”میں کیا جانوں کیوں خاموش ہے؟“

”تم نے رشتہ منظور کیا ہے۔ وہ اتنی بڑی خوش خبری مجھے ضرور سنا تا لیکن رابطہ ہی نہیں ہو رہا ہے۔ وہ بولتا کیوں نہیں ہے؟“

”یہ تو وہی بولے گا کہ بولتا کیوں نہیں ہے؟ میں ایک ہی بات جانتی ہوں۔ برات میں بھائی کو ساتھ لاؤ گے تب ہی بیٹی دول گی۔ ورنہ ادھر کا رخ نہ کرنا۔“  
اس نے فون بند کر کے اسے صوفے پر پھینک دیا۔

☆☆☆

عابی سے باتیں کرنے کے بعد ہم زاد کی سمجھ میں آ گیا کہ مراد کس طرح شائلہ کے ساتھ گیم کھیلتا چاہتا ہے۔ اس

”یہ درست ہے کہ مراد ملی منگی تے مجھ سے بات نہیں کی۔ میں اپنی توہین کا بدلہ لینا جانتی ہوں۔ میں نے اس کے بیٹے سے رابطہ کر لیا ہے اور میں جانتی ہوں کہ اسے کیسے شیشے میں اتاروں گی۔ اپنے بھائی سے بولو یہ تمہا آف اٹھا کر یہاں سے دفع ہو جائے۔“

”میڈم! میں انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔ میرا بھائی ابھی تمہاری گردن دبوچ لے گا تو سیکورٹی گارڈز تمہیں اس کے شکنجے سے نہیں چھڑا سکیں گے۔ تم زندگی کی بھیک مانگو گی پھر زندگی اس طرح طے گی کہ تم بھائی کے شکنجے میں یہاں میرے پاس آؤ گی پھر سانس بننے کے بعد واپس جاسو گی۔“  
شائلہ نے سامنے کھڑے ہوئے قد آور شخص کو دیکھ کر پوچھا۔ ”تم کہتے ہو یہ بہت شہ زور ہے۔ میں اس کی شہ زوری کو پہلے آزماؤں گی۔“

”ضرور آزماؤ لیکن کسی گارڈ کو بلانا چاہو گی تو یہ تمہاری گردن دبوچ لے گا۔“

”میں یہاں تنہا ہوں گی۔ کسی کو کال نہیں کروں گی۔ میرے ہاتھ میں ایک چھڑی ہے۔ اگر یہ اس چھڑی کو مجھ سے چھین لے گا تو ہار مان کر تمہیں داماد بنا لوں گی۔“  
سامنے کھڑے ہوئے باڈی بلڈر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اسے تو ایک چنگی میں لے کر تمہارے ہاتھ سے چھین لوں گا۔“

شائلہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دستے پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے چھڑی اس کی طرف بڑھائی۔ شہ زور نے اس کے آخری سرے کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنی طرف ایک جھٹکے سے کھینچا۔ وہ بڑی آسانی سے اس کے ہاتھ میں آگئی لیکن.....  
چاندی کا خول اس کے ہاتھ میں آیا تھا۔ اس کے اندر سے دو دھاری تلووار نکل آئی تھی۔

وہ تنجا کی ماہر تھی۔ ہو ہو ہا ہا کی آوازیں نکالتی ہوئی اتنی پھرتی سے پیٹریے بدل رہی تھی کہ دیکھنے والی نگاہیں ایک جگہ ٹھہر نہیں پاری تھیں۔ تلووار کا پھل بجلی کی طرح ادھر سے ادھر لپک رہا تھا۔ اسے سمجھنے اور سننے کی مہلت نہیں ملی۔ تلووار کی نوک اس کی شوڑھی کے نیچے سے گزرتی ہوئی اس کے زخروے کو کاٹتی ہوئی گزر گئی۔

کٹے ہوئے زخروے سے سانسوں کی آواز نکلنے لگی۔ وہ گر پڑا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے حلق کو دبا رہا تھا۔ کٹے ہوئے زخروے کو ایک دوسرے سے ملا کر سانسوں کو پھینپھینوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔ ایسے وقت تلووار کی نوک دوسری بار وہاں سے گزری اور دونوں کلائیوں کو کاٹتی ہوئی



نے ریڈ الرٹ کے سربراہ جنگی براؤن سے فون پر کہا۔ ”میں اپنے بیٹے سے معلومات حاصل کر چکا ہوں۔ اسے شاملہ اور اس کی بیٹی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن دیکھنا چاہتا ہوں کہ شاملہ کس حد تک خطرناک ہے۔ میں اپنے طور پر اس سے گیم کھیلنا چاہتا ہوں۔“

”آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟“

”میں چاہتا ہوں، سونے سے لدے ہوئے اس جہاز کو شاملہ تک نہ پہنچنے دو۔ اگر وہ تم سے کوئی سودا کرنا چاہے تو اس سے کہو کہ جناب حماد علی تمہارے پیرومرشد ہیں۔ ان کی اجازت کے بغیر تم کسی طرح کی ڈیل نہیں کرو گے۔“

”ٹھیک ہے، میں یہی کہوں گا۔“

”شاملہ کے لیے ایسی رکاوٹیں پیدا کرو کہ وہ کم سے کم پرنسٹنچ پر سونا حاصل کرنے پر راضی ہو جائے۔“

”اوکے۔ میں یہی کروں گا لیکن مراد صاحب! وہ سونا میں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”جیسا کہ تم نے کہا ہے، وہ سائنس گولڈمی کا آدھا سونا حاصل کرنا چاہتی ہے، یعنی نفٹی پرنسٹنچ چاہتی ہے۔ تم ریٹ گراؤ۔ چالیس پرنسٹنچ کا مطالبہ کرو۔“

”پھر وہ بھی ریٹ گرائے گی۔“

”تم اور بھی ریٹ گراؤ گے۔ وہ ضدی اور بہت غصے میں آنے والی عورت ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ کیا کرے گی۔ ان حالات کے مطابق میں تم سے جو کہوں گا تم وہ کرو گے۔“

”آل رائٹ..... ہم شاملہ شانی سے پلے کریں گے۔“

ادھر مراد اور جمائلہ کا سفر تمام ہوا۔ وہ پیرس پہنچ گئے۔ سفر کے دوران میں جمائلہ نے اس سے پوچھا تھا کہ تم کون ہو؟ حماد کے بہروپ میں ہو۔ حقیقت میں کیا ہو؟

اس نے اپنے بارے میں سچ کہا تھا۔ ”میں بہروپیا نہیں ہوں۔ حماد کا ہم شکل ہوں۔ نام میرا کچھ اور ہے۔ میں حماد کا پاسپورٹ لے کر پیرس جا رہا ہوں۔“

اب وہ پیرس پہنچ کر بولی۔ ”پرنس نے نام سے کہا ہے کہ تم اس کے استاد اور مشیر ہو لیکن تم کوئی بزرگ اور استادوں جیسے تو نہیں لگ رہے ہو؟ تم پرنس تک کیسے پہنچ گئے ہو؟“

”سوری۔ میں اپنے پرسل معاملات کسی کو نہیں بتاتا۔ کوئی اور بات کرو۔ خواجواہ انکوٹری نہ کرو۔“

”میری مام کو غصہ نہ دلاؤ۔ دوستی کر لو۔“

”میں چاہتا ہوں، تمہاری ماں غصے میں پاگل ہو جائے۔“

”تم نہیں جانتے، وہ کیسی خطرناک بلا ہیں۔ وہ جب

چاہیں گی تمہاری سائیس چین لیں گی۔“

”چلو میں تمہاری ماں سے ڈرتا رہوں گا۔ تم خوش ہو جاؤ۔“

وہ جھنجھلا گئی۔ مراد اس کی مام کو کوئی اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ اسے دوستی کے قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔ وہ ماں کو کال کرنے لگی۔

مراد نے فون پر عابی سے پوچھا۔ ”کیا حالات ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”آپ بابا سے بات کریں۔“

مراد نے ہم زاد سے رابطہ کیا۔ وہ اسے ریڈ الرٹ شاملہ شانی اور سائنس گولڈمی کے متعلق تفصیل سے بتانے لگا۔ ادھر شاملہ نے بیٹی سے کہا۔ ”حماد سے بات کر اؤ۔“

اس نے دور مراد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ فون پر کسی سے باتیں کر رہا ہے۔“

”اس سے بولو، میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ مراد کے پاس آ کر بولی۔ ”پلیز میری مام سے بات کرو۔“

وہ بولا۔ ”تم دیکھ رہی ہو کہ میں اہم باتوں میں مصروف ہوں۔ اپنی مام سے کہو انتظار کریں۔“

وہ فون پر بولی۔ ”مام! یہ اپنے اہم معاملات میں مصروف ہے۔ پتا نہیں کس سے باتیں کر رہا ہے۔ آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔“

”شٹ۔“ وہ ناگواری سے بولی۔ ”دو ٹکے کا آدمی مجھ سے زیادہ کسی اور کو اہمیت دے رہا ہے۔ پتا نہیں وہ کب تک کسی سے باتیں کرتا رہے گا۔“

”مام! مجھے بھی اپنی تو بہن محسوس ہو رہی ہے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ اپنی ناک پر کبھی نہیں بیٹھنے دیتی اور یہ کبخت مجھ سے خوشامدیں کر رہا ہے۔“

مراد ہم زاد سے معلومات حاصل کرنے کے بعد دوسرے نمبر سچ کرنے لگا۔ جمائلہ نے فوراً ہی قریب آ کر کہا۔ ”اب تو مام سے بات کر لو۔“

وہ بولا۔ ”جسٹ اے منٹ۔ یہ بھی ضروری کال ہے۔“

ماسٹر کو بوبو کے کارندے اسے سیکیورٹی دینے کے لیے اتر پورٹ کی عمارت کے اندر اور باہر موجود تھے۔ مراد ابھی باہر نہیں نکلا تھا لیکن ہال میں تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”ہاں کیا سچویشن ہے؟“

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”سر! اس شہر کے تمام مجرم اور کرائے کے شوٹرز ہمیں جانتے ہیں اور ہم انہیں جانتے ہیں۔ اس وقت تین خزانہ قسم کے شوٹرز ہماری نظروں میں



ہیں۔ ان میں سے ایک وزیرز الہی میں ہے اور دو یہاں سے باہر ٹہل رہے ہیں۔ ہمارے ساتھی انہیں کن نکالنے نہیں دیں گے۔“

مراد نے فون بند کر دیا۔ اپنی اٹیچی کیس اور سفری بیگ ایک ٹرالی پر رکھتے ہوئے جمائلہ سے کہا۔ ”میں باہر وزیرز لابی میں پہنچ کر تمہاری ماں سے بات کروں گا۔“

”میں باہر نکلتے ہی تم سے دور ہو جاؤں گی۔ سخت سکیورٹی میں یہاں سے جاؤں گی۔“

”سخت سکیورٹی اس لیے ہے کہ تمہاری ماں کے حکم سے جو گولی میری طرف آئے گی وہ غلطی سے تمہیں نہ لگے۔ اسی لیے تمہیں مجھ سے دور رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔“

جمائلہ بیچ ہال سے باہر آتے ہی دو ہاڈی گارڈز کے ساتھ چلتی ہوئی وزیرز لابی سے گزر کر ایک کار کی پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی پھر اس نے فون پر پوچھا۔ ”کیا آپ کے آدمی یہاں اتنی بھیڑ میں اس پر گولی چلائیں گے؟“

شائلہ شانی نے کہا۔ ”وہ مجھ سے سمجھوتا نہیں کرے گا تو یہیں حرام موت مرے گا لیکن اب تک اس سے بات نہیں ہوئی ہے۔ بات ہوگی تو معلوم ہوگا کہ وہ ہم سے راضی ہے یا نہیں؟ ابھی اس کی موت ٹل رہی ہے۔“

”مام! میں اس کا فون نمبر بیچ رہی ہوں۔ اب وہ ضرور بات کرے گا۔“

ادھر ماسٹر اور شائلہ کے کارندوں کے درمیان معاملات طے ہو رہے تھے۔ ماسٹر کے ایک کارندے نے ان سے پوچھا۔ ”تمہارا ٹارگٹ کون ہے اور کہاں ہے؟“

شائلہ کے کارندے نے کہا۔ ”وہ جو بیلو جینز اور وائٹ شرٹ میں ہے اور ہنڈا کارڈ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے جا رہا ہے۔“

شائلہ کے تینوں شوٹرز اپنی گاڑی کی طرف جاتے ہوئے بول رہے تھے۔ ماسٹر کے آدمی نے کہا۔ ”وہی وائٹ شرٹ والا ہمارا اچھی شکار ہے لیکن ماسٹر نے تاکید کی ہے کہ اس سے سمجھوتا نہیں ہوگا، تب ہم اسے گولی ماریں گے۔“

دوسرے کارندے نے کہا۔ ”میڈم نے بھی ہم سے یہی کہا ہے کہ ہم اس کا تعاقب کرتے رہیں۔ جب وہ حکم دیں گی تب اسے گولی ماریں گے۔ ورنہ زندہ رہنے دیں گے۔“

ماسٹر کے آدمی ان کی گاڑی میں گھس کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے کہا۔ ”یہاں کیوں گھس رہے ہو۔ اپنی گاڑی میں جاؤ۔“

ماسٹر کے کارندے نے کہا۔ ”ماسٹر ہمیں حکم دے گا کہ اس سے سمجھوتا ہو گیا ہے اسے قتل نہ کریں اور میڈم تمہیں حکم

دے گی کہ قتل کر دو تو ہم تمہیں گولی چلانے نہیں دیں گے۔“

یہ ایسی سچویشن تھی کہ سب نے اپنی کنکال لیں۔ سب ایک دوسرے کے نشانے پر آگئے۔ ایک نے کہا۔ ”ہم بعد میں کوئی فیصلہ کریں گے۔ پہلے گاڑی آگے بڑھاؤ۔ وہ ہنڈا کارڈ جا رہی ہے۔“

ان کی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ دوست اور دشمن مراد کے تعاقب میں جانے لگے۔ ایک نے کہا۔ ”ہم سب کرائے کے شوٹرز ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ میڈم اور ماسٹر اس شخص حماد سے کس طرح کی ڈینگ کر رہے ہیں۔“

دوسرے نے اپنی گن کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہوسکتا ہے میڈم اور ماسٹر ایک دوسرے کے مخالف ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں کے مقاصد ایک ہوں۔ ویسے ہمیں ان کی ڈینگ سے کیا لینا ہے؟ اپنی بات کر دو۔“

ایک اور کارندے نے کہا۔ ”ہمیں آپس میں لڑنا مرنا نہیں چاہیے۔ ہم بیٹنگی رقم لے چکے ہیں۔ تم لوگوں نے بھی ویسٹ لی ہوگی۔ اب دیکھنا ہے کہ باقی ویسٹ کے لیے ہمیں کیا کرنا ہے؟ میں ابھی میڈم سے پوچھتا ہوں۔“

اس نے شائلہ شانی سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا فون انجینج ہے۔ ماسٹر کے آدمی نے بھی ایک مس کال دے کر کہا۔ ”ماسٹر بھی مصروف ہے۔ ہم حماد کا تعاقب کرتے رہیں گے۔ تھوڑی دیر بعد ان سے رابطہ کریں گے۔“

مراد کار کی پچھلی سیٹ پر آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ شائلہ نے اس سے رابطہ کیا۔ بڑے ہی شہدے بیٹھے لہجے میں بولی۔ ”حماد! تم کمال کے آدمی ہو۔ پرنس عالی کہہ رہے تھے کہ تم ان کے استاد اور مشیر ہو۔ میں حیران ہوں۔ میں نے تمہو کتنے والی بات کہہ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ پلیز میری اس غلطی کو درگزر کر دو۔“

”اچھی بات ہے۔ میرا دین سمجھاتا ہے کہ کسی کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ شرمندہ ہو تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔“

شائلہ کے غرور کو ٹھیس پہنچی۔ اس نے کہا۔ ”پلیز میرے اسٹیش کو سمجھو۔ میں گمراہ ہوئے لوگوں کی طرح معافی نہیں مانگ رہی ہوں۔ پلیز! میرے شایان شان الفاظ استعمال کرو۔ جو ہو گیا اسے درگزر کرو۔“

”غلطیاں کرنے والوں کا کوئی اسٹیش نہیں ہوتا۔ کوئی شان و شوکت نہیں ہوتی۔ جب اسے معافی مل جائے، تب ہی اس کی سابقہ حیثیت بحال ہوتی ہے۔“

”پلیز! ایک معمولی سی بات کو بول نہ دو۔“



و غلطی چھوٹی ہو یا بڑی وہ معمولی نہیں ہوتی۔ دو میں سے کوئی ایک بات ہوگی۔ تھوکنے کی غلطی کی ہے تو اسے چائو یا پھر معافی مانگو۔ سوچو کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟“

اس نے فون بند کر دیا۔ وہ غصے سے چیخ پڑی۔ اسے گالیاں دیتی ہوئی ادھر سے ادھر پاؤں شیخ کر جانے لگی۔ بیڈروم کے باہر گاڑ زکھڑے ہوئے اس کے منہ سے چیختی ہوئی گالیاں سن رہے تھے۔ جب تک وہ کال نہ کرتی، کوئی اندر نہیں جاسکتا تھا۔ کوئی پوچھ نہیں سکتا تھا کہ وہ کس عذاب میں مبتلا ہے اور اپنے بیڈروم کے در و دیوار کو کیوں گالیاں دے رہی ہے؟

اس نے فون اٹھا کر اپنے ایک شوٹر کو حکم دیا اور چیخ کر بولی۔ ”اس کتے کو گولی مار دو۔“

شوٹر نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کک..... کتے کو ماریں؟ آپ نے تو حماد کو مارنے کی ڈیل کی ہے۔“

وہ اور زیادہ چیخ پڑی۔ ”میں اسی کتے کی بات کر رہی ہوں۔ کیا اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی ہے؟ کیا اس کا تعاقب کر رہے ہو؟ کیا وہ تمہاری نظروں میں ہے؟“

”ہاں۔ وہ آگے ایک ہنڈا کارڈ میں جا رہا ہے لیکن ایک پرابلم ہے۔ ماسٹر کو بوبو کے آدمی بھی اس کا تعاقب کرنے کے لیے ہماری گاڑی میں آگئے ہیں۔“

”وہ تمہاری گاڑی میں کیوں ہیں؟“

”وہ کہتے ہیں ماسٹر حکم دے گا تو حماد کو گولی ماریں گے ورنہ اسے زندہ رکھیں گے اور ہمیں بھی گولی چلانے نہیں دیں گے۔“

”وہاٹ نان سنس؟ کیا تم لوگ ماسٹر کے آدمیوں کے مقابلے میں کمزور ہو؟“

”نہیں میڈم! ہمارے ہاتھوں میں بھی گنیں ہیں۔ یہ ہمارے نشانے پر ہیں اور ہم ان کے نشانے پر ہیں۔ آپ کا اور ماسٹر کا فیصلہ ایک ہی ہوگا تو ہم حماد کو گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔ میڈم! آپ کا حکم ہے اسے گولی مار دیں۔ اب ماسٹر کے حکم کا انتظار ہے۔ اگر وہ کہے گا کہ اسے نہ مارو تو ہم یہاں مشکل میں پڑ جائیں گے۔ ہم ایک دوسرے کے نشانے پر ہیں اور ہم میں سے کوئی حرام موت مرنا نہیں چاہے گا۔“

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ شائلہ شانی کا دماغ پھٹ پڑا۔ اس کے شوٹرز نا کام ہونے والے تھے۔ حماد نشانے پر ہوتے ہوئے بھی زندہ رہنے والا تھا۔ وہ چیخ پڑی۔ ”آخر یہ کتا ہے کون؟ یہ ماسٹر ہمارے درمیان کیوں کود پڑا ہے؟“

اس نے فوراً ہی ماسٹر کے نمبر شیخ کیے۔ تھوڑی دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ وہ بولی۔ ”ماسٹر! میں شائلہ شانی بول رہی ہوں۔ آپ کے کارندے میرے راستے میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ میرے آدمیوں کو گولیاں چلانے سے روک رہے ہیں۔“

ماسٹر نے کہا۔ ”اچھا تو وہ تمہارے شوٹرز ہیں۔ تم ظلم سبحانی حماد علی سے دشمنی کرنے کی غلطی کیوں کر رہی ہو؟“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تم اس حماد کا نام اتنی عزت اور تعظیم سے کیوں لے رہے ہو؟“

”گاڈ از گریٹ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ میرے پیر و مرشد، استاد محترم اور مشیر اعلیٰ ہیں۔“

شائلہ کا منہ شدید حیرانی سے کھل گیا۔ جرائم کی دنیا میں دی ماسٹرز سنڈیکیٹ ایک ایسی طاقتور تنظیم تھی جو ریڈارٹ اور اس کے اتحادیوں سے لگراتی تھی اور ہمیشہ ان پر بھاری پڑتی تھی۔ اس تنظیم کا ماسٹر حماد کو اپنا پیر و مرشد کہہ رہا تھا اور جرائم کی دنیا میں ناقابل شکست کہلانے والے مراد علی منگی کا بیٹا پرنس عابد علی منگی بھی حماد کو اپنا استاد اور مشیر کہہ چکا تھا۔

شائلہ نے پوچھا۔ ”یہ حضرت ہیں کون؟ میں پہلی بار ان کا نام سن رہی ہوں۔ حیران ہوں کہ پرنس عابد علی منگی بھی آپ کے پیر و مرشد کو اپنا استاد اور مشیر کہہ رہے تھے۔ پلیز ان کے بارے میں کچھ بتائیں۔ یہ کس ملک سے تعلق رکھتے ہیں؟“

ماسٹر نے کہا۔ ”پیر و مرشد جس ملک میں جاتے ہیں، وہاں ان کا سکہ چلنے لگتا ہے۔ وہ اب تک گوشہ نشین تھے۔ اب کچھ اہم دنیاوی معاملات سے نمٹنے کے لیے منظر عام پر آئے ہیں۔ آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ ان کی دشمن بن کر رہنے سے باز آجائیں۔“

ماسٹر نے فون بند کر دیا پھر اپنے کارندے سے رابطہ کر کے حکم دیا۔ ”حماد کا تعاقب کرنے والوں کو روک دو۔ کھیل ختم کرو۔“

اس کارندے نے ڈرائیو کرنے والے کو نشانے پر رکھ کر کہا۔ ”گاڑی روکو۔ ماسٹر کا حکم ہے کہ حماد کو سلامتی دی جائے۔“

گاڑی رک گئی۔ وہ سب ہاتھوں میں گن لیے ایک دوسرے کے نشانے پر تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ مراد کی ہنڈا کارڈ کو دور جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جب وہ کار نظروں سے اوجھل ہو گئی تو ایک نے اپنے ریوالور کو لباس کے اندر رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم پاگل نہیں ہیں کہ مرنے کے لیے گولیاں چلائیں۔“



دوسرے نے بھی اپنا ریو اور لباس میں چھپاتے ہوئے کہا۔ ”ہم لائف انجوائے کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ لہذا جب تک جی سکتے ہیں جینا چاہیے۔“  
 ماسٹر کے کارندے ان سے مصافحہ کر کے گاڑی سے باہر آگئے۔ ان کی ایک گاڑی پیچھے آرہی تھی۔ انہوں نے دانش مندی سے کام لیا تھا۔ ان کے راستے سلامتی سے الگ ہو گئے تھے۔

شائلہ شانی جیواگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔ جسے ایک معمولی آدمی سمجھ رہی تھی، وہ خاص لوگوں سے زیادہ خاص تھا۔ اسے پیرومرشد کہا جا رہا تھا۔ یہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ اس جوان پیر بابا کی خوشنودی حاصل کیے بغیر پرنس عالی سے بات بھی نہیں کر سکے گی۔

وہ مشیائیں بھیج کر سوچنے لگی۔ ”میں معلوم کروں گی کہ یہ کون ہے؟ اچانک کہاں سے آچکا ہے؟ جب تک یہ رہے گا پرنس کے معاملے میں میری دال نہیں کھٹکنے دے گا۔“  
 ویسے جو منزل سیدھے راستے سے نہ ملے وہ چور راستے سے مل جاتی ہے۔ وہ تھک جانے والی اور ہار مان جانے والی عورت نہیں تھی۔

اس کے دست راست رائٹ مین نے فون پر کہا۔ ”میڈم! حیرانی کی بات ہے۔ ریڈ الرٹ کے جیکبی براؤن نے پرنس جیگرادیا ہے۔ اس نے سائمن گولڈی سے کہا ہے کہ صرف تیس پرسنٹ سونا لے گا۔ باقی ستر فیصد کی فوری ہیمنٹ کر کے جہاز کا تمام سونا اپنے پورٹ میں ان لوڈ کرائے گا۔“

”میں جیکبی سے ابھی بات کرتی ہوں۔“  
 اس نے جیکبی براؤن کے پرسنٹ فون پر رابطہ کیا پھر کہا۔ ”میں شائلہ شانی بول رہی ہوں۔“  
 اس نے بڑی خوش دلی سے کہا۔ ”مائی پلیو رمیڈم۔ میں سمجھ رہا تھا کہ آپ کروڑوں ڈالرز کا سونا ہارنا نہیں چاہیں گی۔ مجھ سے کوئی ڈیل کریں گی۔“

وہ بولی۔ ”اب سے پہلے تمہارے بھری قزاقوں نے ایک جہاز کو لوٹ لیا تھا۔ میں حیران ہوں کہ اس بار لوٹ مار نہیں کر رہے ہو۔ سونے کے مالک کو ستر فیصد کی ہیمنٹ کر رہے ہو۔“

”بے شک میں اس بار بھی جہاز کا تمام سونا لوٹ کر لے جا سکتا تھا لیکن عزت آج محترم حماد علی کے حکم سے مجبور ہو کر اسے ستر فیصد مال کی ہیمنٹ کر رہا ہوں۔“  
 پھر ایک بار شائلہ کی کھوپڑی گھوم گئی۔ وہ شدید حیرانی سے

بولی۔ ”تم حماد علی کے حکم سے مجبور ہو گئے؟ یہ حماد ہے کون؟“  
 ”پلیز! ان کا نام ادب سے لو۔ وہ میرے پیر و مرشد ہیں۔“

پھر ایک بار اس کا منہ حیرانی سے کھلا رہ گیا۔ رومانیہ میں وہی پیر پیرس سے لے کر جنوبی افریقا کے شہر سن سٹی میں بھی وہی پیر پیر روم کے جزیرہ سنسلی میں ریڈ الرٹ کا بھی وہی پیر.....

جیکبی براؤن نے آواز دی۔ ”ہیلومیڈم! چپ کیوں ہو گئیں؟ زندہ تو ہونا؟“

وہ چونک کر اپنے فون کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آں..... ہاں۔ میں تمہارے پیر و مرشد سے ملنا چاہتی ہوں۔“  
 ”وہ صرف اپنے مریدوں سے ملتے ہیں۔“  
 ”میں ان کی مرید بننا چاہتی ہوں۔“  
 ”نو پرابلم۔ اس کا فون نمبر نوٹ کرو اور خود ان سے باتیں کرو۔“

”میرے پاس ان کا نمبر ہے۔ میں باتیں کر چکی ہوں لیکن وہ میرے مزاج کے خلاف ایسی بات کہہ رہے ہیں جسے میں مان نہیں سکتی لیکن میں کسی بھی طرح ان سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔“

”تم جھوٹ بول کر کبھی دوستی نہیں کر سکو گی۔ سچ یہ ہے کہ وہ کبھی کسی کے مزاج کے خلاف نہیں بولتے ہیں۔ تم نے ان کے مزاج کے خلاف کوئی بات کی ہوگی۔ تم کتنی مغرور اور بددماغ ہو، یہ سب ہی جانتے ہیں۔ ہمارے پیر و مرشد بھی جان گئے ہیں۔ وہ تمہیں منہ نہیں لگائیں گے۔“

جیکبی براؤن نے رابطہ ختم کر دیا۔ شائلہ اپنے خاموش فون کو دیکھ کر ہونٹوں کو سختی سے پیچھنے لگی۔ وہ خود کو برتر سمجھتی تھی مگر حماد اسے کتر بنا چکا تھا۔ وہ ہر کوشش کے بعد اپنے ہونے والے داماد پرنس عالی سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

وہ پرنس جیسے ناقابل شکست شہ زور داماد کی ساس بن کر اس زمین کی تمام قوتوں کو زیر کر سکتی تھی۔ اس کے دماغ میں یہ بے چینی اور ناگواری تھی کہ حماد پیر و مرشد بن کر عالی کو اپنے زیر اثر لے آیا ہے اور پرنس پر ایسی مضبوط گرفت رکھی ہے کہ وہ حماد کی اجازت کے بغیر کسی سے بات بھی نہیں کرتا ہے۔

وہ سوچ رہی تھی بلاتنگ کرنے سے مشکلات دور ہوتی ہیں۔ جو ناممکن ہے، وہ ممکن ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں بڑے بڑے کرشمے اور کرامات دکھانے والے عامل کمال ہیں میں کسی ماہر گرو گمنمال کو پکڑوں گی۔ وہ پرنس کو اپنے پراسرار عمل سے میرا تاجدار بنا سکے گا۔



اس نے پی اے کو حکم دیا کہ دوسرے دن بیرس جانے کے لیے جہاز میں سیٹ اڈ کے کرائے۔ اب وہ خم ٹھونک کر اس کے سامنے اس کے مقابلے پر آنے کے لیے پرتول رہی تھی۔

انسان اپنی چالیں چلتا ہے۔ تقدیر اپنا کھیل کھیلتی ہے۔۔۔ وہ پرنس کو ٹریپ کرنے کے لیے بھاگ دوڑ میں لگی تھی۔ بار بار ناکام ہو رہی تھی پھر اچانک کا یا پلٹ ہو گئی۔ تقدیر نے اچانک ہی اس کے من کی مرادیں پوری کر دیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ پرنس عالی بھی اسی فلائٹ سے بیرس جا رہا ہے۔ جب وہ بورڈنگ کارڈ لینے گئی تو اسے دور سے پہچان گئی۔ دو روز پہلے اسے ٹی وی چینلز کے ذریعے دیکھا تھا اس کے برعکس عالی نے اسے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ وہ فی الحال اس کے لیے ایک عام سی اجنبی خاتون تھی۔

بورڈنگ کارڈز کے کاؤنٹر پر جو خاتون تھی، وہ شانلہ کی شناختی۔ اس نے فوراً ہی فون کے ذریعے اسے کہا۔ ”روبین! میں شانلہ بول رہی ہوں۔ ایک خوب رو جوان عابد علی منگی اپنا کارڈ لینے آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ والی سیٹ میرے لیے رکھو۔“

اس نے کہا۔ ”او کے میڈم!“

عالی کے ساتھ کریگ ہوشن اور دوسرے بیہودی اکابرین تھے لیکن اس سے فاصلہ رکھتے تھے۔ وہ برلاڈ شہر میں بھی ان سے دور تنہا ایک بنگلے میں رہتا تھا۔ اس وقت بھی بیرس تک تنہا آزادی سے سفر کرنے والا تھا۔ نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کا ایک گروپ ہنستا بولتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ ایک لڑکی نے کہا۔ ”ہائے پرنس! کہاں جا رہے ہو؟“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”میری منزل بیرس ہے۔“

ایک لڑکے نے کہا۔ ”ہم اسکیننگ کمپیشن میں حصہ لینے کے لیے سوئٹزر لینڈ جا رہے ہیں۔“

ایک لڑکی نے کہا۔ ”پرنس! ہم سب تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ چلو۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم سب محبت کرنے والوں سے میں بھی محبت کرتا ہوں لیکن بیرس جانا ضروری ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ جیو اتک ہمارا ساتھ رہے گا۔“

جہاز کے اندر ان سب کی سیٹیں پرنس کے آگے پیچھے تھیں۔ وہ کھڑکی کے پاس تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر شانلہ شانی بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں نے اجنبی مسکراہٹوں کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا پھر عالی نے کہا۔ ”خواتین کھڑکی کے پاس بیٹھ کر سفر کو نچوائے کرتی ہیں۔ آپ چاہیں تو میری

سیٹ پر آ سکتی ہیں۔“

وہ اس کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”تھینک یو میرے بچے! تم خواتین کا بہت خیال رکھتے ہو۔“

عالی اس کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ بلا کا ذہین تھا۔ فون پر ہونے والی گفتگو، اس کی آواز اس کا لہجہ اس کے

دیباغ کے کمپیوٹر میں محفوظ ہو گیا تھا۔ وہ اس لیے بھی یاد رہ گئی تھی کہ محترمہ ساس بننے کی ضد کرتی آرہی تھی۔

وہ حیرانی سے سوچنے لگا۔ ”یہ عورت کیسی مکار اور تیز طرار ہے۔ میرے قریب آنے اور مجھ سے باتیں کرنے کا راستہ نکال ہی لیا۔ اب دیکھتا ہوں یہ کیا گل کھلانے والی ہے؟“

نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کی ٹولی عالی کے چاروں طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بڑی زندہ دلی سے بول رہے تھے اور عالی کو بھی اپنے ہنسی مذاق میں شریک کر رہے تھے۔ ایک

لڑکی عالی کے دوسری طرف والی سیٹ پر آ گئی تھی۔ اس کا بازو تھام کر بولی۔ ”میں تمہیں ایک جوک سناتی ہوں۔“

وہ اس کے ہاتھ کو اپنے بازو سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”پلیز! مجھ سے فاصلہ رکھو۔“

اس بات پر اس کے آگے پیچھے تہقہ بلند ہوئے۔ ایک جوان نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے ٹی وی پر کنٹری کرنے والا کہہ رہا تھا کہ تم ابھی گیارہ برس کے ہو۔“

ایک لڑکی نے کہا۔ ”چھ فٹ کا باڈی بلڈر اور گیارہ برس کا بچہ؟ اٹ مسٹ بی اے جوک۔“

دوسری لڑکی نے کہا۔ ”دنیا میں جتنے بھی آنکھوں والے ہیں وہ پرنس کو دیکھ کر کبھی ایک بچہ تسلیم نہیں کریں گے۔“

عالی نے مسکرا کر کہا۔ ”تسلیم نہ کریں۔ جو نہیں کریں گے وہ دھوکا کھائیں گے۔“

وہ شانلہ کو چور نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پچیس برس کی ایک جوان لڑکی کی ماں بھی یہ نہیں مانتی کہ میں گیارہ برس کا ہوں۔ تم سب حساب لگاؤ کہ اس لڑکی سے کیسے شادی کر سکتا ہوں جو مجھ سے چودہ برس بڑی ہے۔“

ایک جوان نے اپنی انگلیوں کو گنتے ہوئے کہا۔ ”اس حساب سے تمہیں پہلے جوان ہونا ہوگا۔“

”میں اس سے شادی کرنے کے لیے پچیس برس کا ہو جاؤں گا تو وہ لڑکی اتالیس برس کی ہو جائے گی۔ میں جوان ہوتا ہوں گا، وہ بوڑھی ہوتی جائے گی۔“

شانلہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ ایک لڑکی نے کہا۔ ”واقعی اس لڑکی کی ماں کو عمل سے سوچنا چاہیے۔“

ایک اور لڑکی نے کہا۔ ”لیکن پرنس! تم تو پچیس برس



کے گہرہ جوان لگتے ہو۔“  
 شائلہ نے کہا۔ ”لڑکیوں سنو.....! حقیقت یہ ہے کہ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔“  
 کئی لڑکوں نے تائید کی۔ ایک نے سینہ ٹھونک کر کہا۔ ”مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ آنتی نے زبردست بات کہی ہے۔“  
 شائلہ نے مسکرا کر چور نظروں سے عالی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اسی طرح مرد بچہ نہیں ہوتا۔ پرنس کی شادی بھی اس بچہ برس کی لڑکی سے ہو جائے تو میں دعوے سے کہتی ہوں، یہ پرنس دس ماہ بعد ایک بچے کے باپ بن جائیں گے۔“  
 اس بات پر تمام لڑکیاں تالیاں بجانے لگیں۔ شائلہ مسکرا رہی تھی۔ ایک لڑکی نے کہا۔ ”پرنس! مجھ سے شادی کر لو۔“  
 دوسری لڑکی نے کہا۔ ”پرنس! میں بھی یہی دعویٰ کرتی ہوں، مجھ سے بھی شادی کرو۔“  
 شائلہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”پھر تو لڑکیوں کی قطاریں لگ جائیں گی۔ بچوں کی فوج بنتی چلی جائے گی۔“  
 عالی نے اونچی آواز میں کہا۔ ”اور میں یہ فیصلہ سنا تا ہوں کہ عمر کے بائیس برس گزارنے کے بعد شادی کے متعلق سوچوں گا۔“  
 اس نے سر گھما کر ان سب کو سرسری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے الفاظ پر غور کرو کہ بائیس برس کی عمر میں صرف سوچوں گا۔ آگے کتنے برسوں کے بعد شادی کروں گا، یہ خدا ہی جانتا ہے۔ میں نہیں جانتا۔“  
 کئی لڑکیوں نے بیک وقت ”ہائے“ کی آواز نکالی۔  
 ایک لڑکی نے کہا۔ ”ہائے! یہ کیا کہہ رہے ہو؟“  
 اس بات پر پھر تہمتے بکھرنے لگے۔ شائلہ کو کھل کر سنجیدگی سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس نے ہنسی مذاق میں عالی سے کہہ دیا تھا کہ ایک بچہ برس کی لڑکی سے شادی کر لے گا تو گیارہ برس کا بچہ ہونے کے باوجود ایک بچے کا باپ بن جائے گا۔  
 شائلہ نے اس کی طرف جھک کر کہا۔ ”میں ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔“  
 وہ بولا۔ ”میں جواب دینے کی کوشش کروں گا۔“  
 ”مجھ سے ایک بڑی غلطی ہوگئی۔ مجھے اس کا احساس ہے۔ سچ کہتی ہوں، آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گی تو کیا میری اس بھول کو درگزر نہیں کرنا چاہیے؟“  
 ”بے شک۔ معمولی غلطی ہو تو درگزر کر دینا چاہیے

لیکن نڈلی نا قابل معافی ہو تو اس کی سزا ضرور دینا چاہیے۔“  
 وہ بولی۔ ”جو نا قابل معافی ہے، اسے نیک دل فرشتہ بن کر معاف کیا جاسکتا ہے۔“  
 ”معلوم تو ہو کہ غلطی کیا ہے؟“  
 وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”میں وہی خطا وار شائلہ شانی ہوں۔“  
 ”میں جانتا ہوں۔ آگے بولیں۔“  
 اس نے بڑی حیرانی سے پوچھا۔ ”تم نے مجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا پھر کیسے جانتے ہو؟“  
 ”یہ غیر ضروری سوال ہے۔ آپ غلطی بتائیں؟“  
 ”کیا آپ کے استاد محترم ماد صاحب نے نہیں بتایا ہے؟“  
 ”میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔“  
 وہ ہنکچکاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ آپ کے استاد محترم ہیں۔ میں نے انہیں ایک معمولی شخص سمجھ کر فون پر تھوک دیا تھا۔ قسم کھا کر کہتی ہوں، ان پر نہیں تھوکا تھا۔“  
 ”آپ فون پر کس سے بول رہی تھیں؟ تھوک اسی کی طرف گیا تھا۔ جس سے بول رہی تھیں۔“  
 ”ہاں مگر.....“  
 وہ بات کاٹ کر بولا۔ ”نو آرگیو منٹس۔ میرے استاد محترم کا فیصلہ اٹل ہے۔ تھوکا ہوا چائنا ہی ہوگا۔“  
 وہ توہین کے احساس سے تھلکانے لگی۔ جسے داماد بنانا چاہتی تھی، اسے غصہ نہیں دکھاسکتی تھی اور اس کے پاس بیٹھ کر بات کرنے کا موقع پھر نہیں مل سکتا تھا۔ اس سفر کے اختتام تک اسے اپنی طرف مائل کر لینا چاہتی تھی۔  
 کم سے کم وقت میں ایک بڑی فتح حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ ”پرنس! میں تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ تمہیں اپنا بیٹا سمجھتی ہوں۔ میں دل کی گہرائیوں سے ہونے والے رشتے کو ہمیشہ قائم رکھنے کے لیے استاد محترم کے سامنے جاؤں گی۔ تم بھی وہاں موجود رہو گے پھر.....“  
 وہ بڑے ہی درد بھرے جذباتی لہجے میں بولی۔ ”پھر ایک ماں تمہاری موجودگی میں روتے روتے تھوک کر چائے گی۔“  
 ”آپ ماں بن کر بیٹے کے جذبات سے کھیل رہی ہیں۔ یہ صاف صاف کہہ دوں کہ میرے بزرگ استاد محترم پر تھوکنے والی میری ماں ہو ہی نہیں سکتی۔“  
 وہ صاف اور سیدھی باتیں کہہ رہا تھا۔ ”یوں بھی دنیا کی کسی عدالت میں جذبات سے مغلوب ہو کر فیصلے تبدیل نہیں کیے جاتے۔ حقیقت اٹل ہے۔ کوئی اسے ٹال نہیں سکتا،



اس نے عمارت سے سوچا۔ صرف ایک داماد..... کیا کروں گی ایسے کو داماد بنا کر؟ کیا کنگال ہو کر ایک داماد کو لے کر اس کی آرتی اتاروں گی؟ اس کی پوجا کروں گی؟

نہ تبدیل کر سکتا ہے۔ سزا سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔  
”میں انکار نہیں کر رہی ہوں۔ اپنی انا اور خودداری کو کچل کر سزا سے گزر جاؤں گی۔ اس کے بعد تو تم مجھے ماں کہو گے۔“  
وہ بولا۔ ”ماں کا رشتہ تمام رشتوں سے افضل ہے۔

ایک ماں نے جان کی بازی لگا کر اپنی جان دے کر مجھے پیدا کیا تھا۔ میں اسے سلام کرنے اور ان کی یادوں کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے پیرس جا رہا ہوں۔ ماں کی ہوں تو ایسی کہ مرنے کے بعد بھی اولاد کے دلوں پر حکومت کرتی رہیں اور اولاد ان پر فخر کرتی رہے۔ کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔ اگر آپ قابل فخر ہوں گی تو میں آپ کو ماں کہہ کر دنیا والوں کے سامنے اپنا سراونچا کر سکوں گا۔“

وہ بڑے فخر سے بولی۔ ”میں دنیا کے ٹاپ گولڈ مرچنٹس میں سے ایک ہوں۔ میرے پاس سونے کا بے حساب ذخیرہ ہے۔ میں ان تاجر برادری میں سے ہوں جن کی مرضی سے سونے کا بھاؤ چڑھتا اترتا رہتا ہے۔ میں سونا پہنتی ہوں۔ سونے کی پلیٹوں میں کھاتی ہوں۔ سونے کے بستر پر سوتی ہوں۔“

عابی نے کہا۔ ”اور ایک دن اس بستر پر سوتی ہی رہ جائیں گی۔ یہ بتائیں کہ تجارت کیسے کرتی ہیں؟ کیا سونے کی کان کی مالکہ ہیں یا چور بازاری اور اسمگلنگ کے ذریعے سونا حاصل کرتی ہیں؟“

”حصول کا جو بھی راستہ ہوتا ہے، اسے اختیار کرتی ہوں۔“  
”کھل کر بولیں کہ چور بازاری، ہیرا پھیری اور اسمگلنگ کا دھندا ہے۔ آپ کا تعلق نیک نامی سے نہیں ہے۔ اب تک بدنامی کی دنیا میں جی رہی ہیں۔“

وہ بولی۔ ”بدنامی سے بے انتہا دولت بھی حاصل ہوتی ہے اور دور تک شہرت بھی۔“

”مگر عزت حاصل نہیں ہوتی۔ کیا میں آپ کو ماں بنا کر عزت حاصل کر سکوں گا، یا رہی سہی نیک نامی بھی گنوا دوں گا؟ آپ اپنے ذخیروں کو جائز قرار دینے کے لیے درجنوں دیلیٹس دیں گی لیکن کہاوت ہے کہ سوسٹار کی ایک لوہار کی۔ میری ایک ہی دیلیٹ ہے کہ میرا دین آپ کے دھندے پر لغت بھیجتا ہے۔“

اسے چپ لگ گئی۔ سوچنے لگی کہ اب کیا کرے؟  
کیا اسے داماد بنانے کے لیے برسوں سے جاری رہنے والی اسمگلنگ اور چور بازاری چھوڑ دے؟ کیا اپنی تمام کمائی ہوئی دولت راہ خدا میں دے کر صوم و صلوة کی پابند ہو جائے؟ پھر اس کے پاس کیا رہ جائے گا؟

وہ جھنجھلا گئی۔ یہ اچھی طرح سمجھ گئی کہ پیار و محبت سے پیش آتی رہے گی تو وہ اور اس کا استاد حماد بات بات پر اس کی انسلٹ کرتے رہیں گے۔ اب وہ سوچ رہی تھی۔ میں نے بہت ڈھیل دی ہے۔ اب اپنی توہین کا انتقام لوں گی۔ جلد یا بدیر اس پرنس کے بیچے کو اپنے آگے جھکنے پر مجبور کر دوں گی۔ دشمن کو جھکانے کے لیے اس کی کمزوریوں سے کھیلنا پڑتا ہے۔ اب تک کی معلومات کے مطابق یہ غیر معمولی اور حیرت انگیز قوتوں کا حامل ہے۔ ہتھیاروں کے بغیر پوری فوج کو شکست دے دیتا ہے۔ اس کی کوئی کمزوری اب تک معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ لیکن انسان ہے۔ کوئی تو کمزوری ہوگی۔ نہیں ہوگی تو میں اس کی طاقت کو کم سے کم کروں گی۔ ایسی چالیں چلوں گی کہ یہ رفتہ رفتہ جسمانی طور پر کمزور ہوتا جائے گا۔ اس کے جسم میں کسی طرح اعصابی کمزوریوں کی دوا میں پہنچائی جاسکتی ہیں یا پھر بلیک میجک سے شیطانی عمل سے اس کے گوشت اور اس کی چربی کو گلایا جاسکتا ہے۔

وہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر وہاں سے اٹھ گئی۔ عابی نے نہیں پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ اس نے اسے جانے کا راستہ دیا۔ وہ جہاز کے پچھلے حصے میں آگئی۔ وہاں دو سیٹیں خالی تھیں۔ وہ ایک پر بیٹھ کر جھنجھلائی ہوئی سیٹھی بیٹ باندھنے لگی۔ جہاز جینیوا کے ایئر پورٹ پر اترنے والا تھا۔

پرواز خواہ کتنی ہی بلند ہو نیچے زمین پر آنا ہی پڑتا ہے۔ وہ بلندی سے زمین کی پستی میں آگئی۔ وہ جہاز اب ایک گھنٹے کے بعد وہاں سے جانے والا تھا۔ کئی مسافر اپنے ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے اور آزادی سے چلنے پھرنے کے لیے جہاز سے باہر آ گئے۔

عابی اور شانک ایک دوسرے سے دور رہ کر ایئر پورٹ کے کونفا سنڈ ایر یا میں آ گئے۔ مسافروں کو ایسے محدود ایریا سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس نے عابی سے دور جا کر فون پر کسی سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ”پرنس اس فلائٹ سے آ رہا ہے۔ اس کی نگرانی کرنے والوں کی ایسی ٹیم بناؤ کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو سکے۔“

وہ دوسری طرف کی باتیں سن کر بولی۔ ”کئی یہودی اس کے ساتھ ہیں لیکن اس سے فاصلے پر رہتے ہیں۔ تم لوگ



اثر پورٹ سے اس کا تعاقب کرو گے۔ جہاں بھی موقع ملے  
اس پر گولیاں چلاؤ۔ خبردار...! جان سے نہ مارنا۔ اس کے  
چاروں ہاتھ پاؤں گولیوں سے چھلنی کر دینا تا کہ وہ پانچ بن  
کر زندہ رہے۔“

وہ ایک ذرا چپ رہ کر بولی۔ ”اگر وہ یہودیوں کی کسی  
پناہ گاہ میں پہنچ جائے گا تو پھر مشکل سے ہی ہاتھ آئے گا۔  
پوری کوشش کرو کہ وہ اثر پورٹ سے اسپتال پہنچ جائے۔“  
جو ان لڑکیاں اور لڑکے عابی سے مصافحہ کرتے ہوئے

رخصت ہو رہے تھے۔ شامکہ فون بند کرنے کے بعد دور  
کھڑی عابی کو غصے سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ اس  
کے ہاتھ پاؤں فولاد کے ہیں۔ وہ ایک ہاتھ مارتا ہے تو کسی کا  
سر پھٹ جاتا ہے، کسی کی گردن ٹوٹ جاتی ہے۔ بدن کے  
جس حصے پر وہ حملہ کرتا ہے، وہاں کی ہڈیاں جڑ جاتی ہیں۔

اسی لیے اس نے حکم دیا تھا کہ اس کے ہاتھوں اور  
بیروں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے پھر وہ لمبی چھلانگیں مار  
کر اور زمین سے اچھل کر بلند عمارتوں کی چھتوں پر نہیں پہنچ  
سکے گا۔ بے دست و پا ہو کر اسپتال کے بستر پر پڑا رہے گا۔  
اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کی اور اس کی بے پناہ قوتوں کی  
پوچھا کرنے والے یہودی بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔

عابی کو پانچ بنا کر وکیل چیسر پر بٹھائے رکھنے کافی الجھال  
بھی ایک راستہ تھا۔ بڑی خوش فہمی سے ایسے ہی سنے دیکھے جا  
سکتے تھے۔ دوسروں کے لیے موت کا گڑھا کھودا جائے تو وہ  
گڑھا کبھی اپنی ہی قبر بن جاتا ہے۔ وہ اپنی حرام موت کے  
بارے میں کبھی نہیں سوچتی تھی۔ اپنی دولت اور طاقت پر بڑا  
اعتماد تھا اور اس وقت تو وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ موت  
اس کا تعاقب کرتی ہوئی وہاں تک چلی آئی ہے۔

اس کے فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے  
ناگواری سے انجانے نمبروں کو دیکھا پھر پوچھا۔ ”ہیلو کون؟“  
دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”تمہاری موت۔ تم  
نے میرے بھائی کی لاش غائب کر دی۔ تمہاری لاش بھی  
جہاں دفن کی جائے گی میں وہاں سے اسے نکال کر تمہیں چیل  
کوڈز کی خوراک بنا دوں گا۔“

وہ حقارت سے بولی۔ ”تمہاری طرح مات کھانے  
والے مجھے اسی طرح تصور میں مارتے رہتے ہیں۔“  
”میں خیالوں سے نہیں بہلتا۔ پوری انفارمیشن رکھتا  
ہوں۔ تم اس وقت اثر پورٹ کے کونفائنڈ ایریا میں ہو اور  
ایک نہیں، کئی گولیاں تمہاری طرف آرہی ہیں۔ جاؤ میرے  
بھائی کے پاس جاؤ۔“

راہیل ختم ہو گیا پھر کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا کہ فون پر  
ملنے والی دھمکی دھماکا بن گئی۔ یکبارگی فائرنگ کی آوازیں  
گونجنے لگیں۔ کونفائنڈ ایریا کے گیٹ کے پاس کھڑے  
ہوئے دو مسلح سپاہی مارے گئے۔ دو گولیاں آکر شامکہ کو  
لگیں۔ وہ چیخیں مارتی ہوئی فرش پر گر کر تر پنے لگی۔

عابی نے سر گھما کر اسے دیکھا پھر لپک کر اس کے  
پاس آیا۔ پورے اثر پورٹ میں افراتفری پھیل گئی تھی۔ مرد  
عورتیں بچے اور بوڑھے فائرنگ سے بچنے کے لیے ادھر  
ادھر بھاگنے لگے۔

ایک گولی شامکہ کے سینے سے کچھ اوپر شانے کے نیچے  
آ کر پوست ہو گئی تھی۔ اس کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ عابی نے  
ایک چنگی میں پکڑ کر اسے باہر کھینچ لیا۔ ایک زبردست جھونکا  
لگا۔ وہ تکلیف برداشت نہ کر سکی بے ہوش ہو گئی۔

اس کے سینے سے لہو بہہ رہا تھا۔ اسے فوراً اسپتال  
پہنچانا تھا۔ وہ ہوش میں ہوتی تب بھی اٹھ کر چل نہیں سکتی  
تھی۔ دوسری گولی نے اس کے ایک گھٹنے کی ہڈی توڑ دی  
تھی۔ وہ اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر دوڑتے ہوئے  
پوچھنے لگا۔ ”اسپتال کہاں ہے؟ ایبولینس لاؤ۔ اسے  
اسپتال پہنچاؤ۔“

لوگ سہمے ہوئے تھے۔ سب ہی کو اپنی اپنی پڑی  
تھی۔ وہ عمارت سے باہر آ کر ایک کار کے ساتھ دوڑتے  
ہوئے بولا۔ ”گاڑی روکو۔ اسے اسپتال لے چلو۔“  
ڈرائیو کرنے والے نے کہا۔ ”یہاں گولیاں چل رہی  
ہیں۔ دوسری گاڑی میں جاؤ۔“

وہ شامکہ جیسی بھاری بھکم عورت کو اٹھائے تیز رفتار  
کار کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اس نے ایک شانے پر اسے لاد کر  
دوسرے ہاتھ سے ڈرائیو کرنے والے کی گردن دیوچ لی۔  
ایسی آہنی گرفت تھی کہ ٹکڑے میں آتے ہی اس کی سائیس  
رکنے لگیں۔ اس نے فوراً ہی بریک لگا کر گاڑی روک دی۔  
تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ ”اسپتال قریب ہے۔ اسی  
اثر پورٹ روڈ پر ہے۔“

عابی نے پچھلا دروازہ کھول کر شامکہ کو سیٹ پر لٹا دیا  
پھر ڈرائیو کو دوسری سیٹ پر ہٹا کر کار ڈرائیو کرنے  
لگا۔ طوفانی رفتار سے اسپتال کی سمت جانے لگا۔

کریگ ہوشن اور دوسرے یہودی جان بچانے کے  
لیے چھپے ہوئے تھے۔ جب کئی مسلح سپاہی آگئے اور  
مسافروں کو تسلیاں دینے لگے کہ خطرہ نہیں ہے، تب انہوں  
نے دیکھا۔ پرنس عابی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔



## والدین توجہ فرمائیں

- 1- جس بچے کا مذاق اڑایا جاتا ہے، وہ بزدل بن جاتا ہے۔
  - 2- جس بچے کو مار پیٹ کا سامنا ہوتا ہے، اس کی صلاحیتیں دب جاتی ہیں۔
  - 3- جس بچے پر اعتبار نہیں کیا جاتا وہ دھوکا دینا سیکھتا ہے۔
  - 4- جس بچے پر تنقید کی جاتی ہے، وہ کوشش کرنا چھوڑ دیتا ہے۔
  - 5- جس بچے کی تعریف نہیں کی جاتی وہ اچھی چیزوں کو پسند نہیں کرتا۔
- ☆☆☆

انہوں نے فون کے ذریعے اینڈی گارن سے کہا۔ ”باس! ہم نے شاملہ کو مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن وہ ایک اسپتال میں ہے۔ ڈاکٹر اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

گارن نے کہا۔ ”اسے اسپتال سے زندہ نہ نکلنے دو۔“

”ہم اسے چٹکیوں میں اڑا سکتے ہیں لیکن راستے میں پہاڑ آ گیا ہے۔ پرنس عالی اسے بچا رہا ہے۔ ہم اس کی موجودگی میں شاملہ پر انیک نہیں کر سکیں گے۔ اگر اس کی نظروں میں آجائیں گے تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”مائی گاڈ! یہ پرنس وہاں کیسے پہنچ گیا؟ ٹھہرؤ میں تمہارا راستہ صاف کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

اینڈی گارن نے ریڈالرٹ کے جیکلی براؤن کو فون پر وہاں کی سچویشن بتائی پھر کہا۔ ”میں بھائی کا انتقام لینے کے لیے پاگل ہو رہا ہوں لیکن پرنس عالی رکاوٹ بن گئے ہیں۔ ہم ان سے مقابلہ کر کے مراد صاحب کو ناراض کرنا نہیں چاہیں گے۔“

جیکلی براؤن نے کہا۔ ”بے شک انہیں ناراض نہیں کرنا ہے۔ میں ابھی ان سے بات کرتا ہوں۔“

اس نے مراد کے نمبر سچ کیے پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ ”جناب! آپ جانتے ہیں۔ شاملہ کیسی مکار اور خطرناک چڑیل ہے۔ اس نے ہمارے اتحادی اینڈی گارن کے بھائی کو ہلاک کر کے اس کی لاش غائب کر دی تھی۔ اب وہ اینڈی گارن کے نشانے پر آگئی ہے لیکن آپ کے صاحبزادے

کچھ لوگ کہتے تھے کہ وہ پرنس کو پہچانتے ہیں۔ انہوں نے اسے دیکھا ہے۔ وہ ایک خاتون کو بازوؤں میں اٹھائے دوڑتا جا رہا تھا اور اسپتال کا پتلا پوچھ رہا تھا۔

عمارت کے باہر سے رپورٹ ملی کہ ایک جوان مرد ایک عورت کو بازوؤں میں اٹھائے تیز رفتار کار کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ کریگ ہوشن اور دوسرے یہودی ادھر جانا چاہتے تھے لیکن گیٹ کو لاکڈ کر دیا گیا تھا۔ وہ عالی سے محروم ہو کر ایسے تڑپ رہے تھے جیسے ان کی سانسیں اکھڑ رہی ہوں۔ جہاز کے مسافروں کو اس محصور ایریا سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی اور اب جہاز کی روانگی کا وقت بھی ہو رہا تھا۔

وہ یہودی چیخنے لگے۔ ”پرنس عالی اس ایریا سے باہر چلا گیا ہے۔ اسے واپس لاؤ۔“

کچھ لوگوں نے کہا۔ ”ایک مسافر خاتون بھی زخمی تھی۔ وہ بھی علاج کے لیے باہر گئی ہے۔ ان دونوں کو واپس لایا جائے۔“

ارپورٹ کی انتظامیہ مشکل میں پڑ گئی تھی۔ باہر پولیس فورس ان مجرموں کے تعاقب میں گئی تھی جو فائرنگ کے بعد فرار ہو رہے تھے۔ وہ دو مسافر جو محصور ایریا سے باہر چلے گئے تھے، ان کی جان کو خطرہ تھا۔ اس خاتون کو گولیاں مارنے والے دشمن پھر اسے ہلاک کرنے کے لیے آسکتے تھے۔

اور بات یہی تھی۔ کرائے کے قاتلوں نے شاملہ کو جان سے مار ڈالنے کا معاوضہ لیا تھا۔ اب وہ دیکھ رہے تھے کہ پرنس اسے بچانے کے لیے اسپتال لے گیا ہے۔ اینڈی گارن انہیں فون پر کہہ رہا تھا۔ ”خون کا بدلہ خون۔ میرے بھائی کو ہلاک کرنے والی زندہ نہ رہے۔ اگر وہ بچ جائے گی تو ان شوٹرز کی باقی ہیمنٹ روک دی جائے گی۔“

وہ شوٹرز تعداد میں جا رہے تھے۔ وہ باقی پانچ لاکھ ڈالرز کی ہیمنٹ سے محروم ہونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ دو ٹولٹیوں میں بٹ گئے تھے۔ ان میں سے دو نے پولیس کو اپنے پیچھے لگالیا تھا۔ باقی دو شوٹرز اسپتال کی طرف آگئے تھے۔ معلوم کر رہے تھے کہ شاملہ مر گئی ہے یا اسے زندگی کی طرف لوٹایا جا رہا ہے؟

وہ پرنس سے خوف زدہ تھے۔ اس کی نظروں میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ عالی انہیں جانتا نہیں تھا۔ وہ بڑی رازداری سے یکے بعد دیگرے آپریشن تھیٹر کی طرف جاتے تھے پھر ٹھہرنے کے انداز میں واپس آ جاتے تھے۔



”کیسے صبر کروں؟ دوسری رکاوٹ پیدا ہوگئی ہے۔ پولیس نے اسپتال کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے کیونکہ شاملہ اور پرنس قانون کے خلاف رپورٹ کے کونٹرا سٹڈ ایریا سے باہر نکل کر شہر میں آگئے ہیں۔ وہ انہیں واپس رپورٹ لے جائیں گے۔“

وہاں یہی سٹیویشن پیدا ہوگئی تھی۔ وہ جہاز وہاں سے جا چکا تھا۔ ان دونوں کو اگلی کسی فلائٹ میں وہاں سے روانہ کرنا تھا۔ اگرچہ محصور ایریا سے باہر جانا جرم ہے لیکن ان دونوں کو مجرم نہیں سمجھا جا رہا تھا۔ کیونکہ شاملہ طبی امداد کی مستحق تھی اور عالی اس کی جان بچانے کے لیے رپورٹ سے باہر آ گیا تھا۔

شاملہ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے اسپتال سے ڈسچارج کیا جاتا۔ وہ اپنی صحت یابی تک وہاں رہ سکتی تھی۔ ایک پولیس افسر نے عالی کے پاس آکر کہا۔ ”آزاد سبل پرنس! میں آپ کا فین ہوں۔ اپنا فرض ادا کرنے کے لیے آپ کو رپورٹ کے محصور ایریا میں لے جاؤں گا لیکن کل صبح سے پہلے پیرس کے لیے کوئی فلائٹ نہیں ہے۔ آپ وہاں ایک قیدی بن کر بورہو جائیں گے۔“

عالی نے کہا۔ ”ہاں، میں ایک نیکی کر کے پھنس گیا ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”آپ میری موجودگی میں آزاد ہیں۔ کل تک اس شہر میں رہ کر تفریح کر سکتے ہیں۔ میں ایک گانڈ بن کر آپ کو یہاں کی سیر کراؤں گا۔“

عالی نے خوش ہو کر اس سے مصافحہ کیا۔ اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ ان کی تصویریں اتاری جائیں۔ وہ پرنس کے ساتھ ایک دن اور ایک رات کو یادگار بنانا چاہتا تھا۔

وہ اسپتال سے باہر آ کر عالی کے ساتھ اگلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے بولا۔ ”آپ مجھے آفیسر نہ کہیں۔ میرا نام راجر اسمتھ ہے۔“

عالی نے کہا۔ ”اس شرط پر راجر کہوں گا کہ تم مجھے آپ نہیں کہو گے۔ ہم بے تکلف دوست بن کر وقت گزاریں گے۔“ وہ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ”دوستی اور بے تکلفی کے آغاز میں کیوں نہ ایک ایک پیگ ہو جائے۔“

”سوری۔ میں شراب نہیں پیتا۔“ وہ کار آگے بڑھاتے ہوئے ہنستے ہوئے بولا۔

”ہزاروں مسلمان پیتے ہیں۔“ عالی نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور لاکھوں مسلمان نہیں پیتے۔ میں ان میں سے ایک ہوں۔ باقی داوے یہاں نہیں مسجد ہے؟ نماز کا وقت ہو رہا ہے۔“

اس کے سامنے ڈھال بن گئے ہیں۔ ہم میں سے کوئی پرنس کے خلاف ہتھیار استعمال نہیں کرے گا۔ ہمارے درمیان دوستی اور سلامتی کا معاہدہ ہے۔ تقریباً گیارہ برس گزر چکے ہیں۔ ریڈ الرٹ اور اس کے تمام اتحادی آپ سے وفاداری کا ثبوت دیتے آرہے ہیں۔ پلیز ہمارے اتحادی اینڈی گارسن کو اس چڑیل سے انتقام لینے دیں۔“

مراد نے کہا۔ ”وہ اس وقت کس اسپتال میں ہے؟ وہاں کا فون نمبر کر دو۔ میں بیٹے کو سمجھاؤں گا۔“

پندرہ منٹ کے بعد ہی بیٹے سے رابطہ ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ تمہیں شاملہ سے اس وقت بات کرنی تھی جب وہ میری شرط پوری کرتی لیکن تم تو اس پر مہربان ہو گئے ہو۔ اس کے محافظ بن گئے ہو۔“

اس نے کہا۔ ”بابا جانی! میں نے آپ کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کیا ہے۔ وہ اچانک ہی پیرس جانے والی فلائٹ میں میرے قریب آگئی تھی۔ میرے سخت رویے کے باعث دور جا کر دوسری سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ دوستی کے قابل نہیں ہے لیکن دشمن بھی گولی کھا کر زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے تو ازراہ خدا سے اسپتال پہنچانا ہمارا فرض ہے۔ میں فرض ادا کر رہا ہوں۔ جب وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے گی اور اس کے اپنے آکر اسے سنبھالیں گے تو میں اس سے دور ہو جاؤں گا۔ اسے کبھی دیکھنا بھی گوارا نہیں کروں گا۔“

”شاباش بیٹے! تم نفرت اور عداوت سے بالاتر ہو کر انسانی فرض ادا کر رہے ہو۔ دشمنوں سے ہوشیار رہو اور جلد از جلد وہاں سے یہاں پیرس آؤ۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“

”او کے بابا جانی! میری کوشش یہی ہوگی۔ اللہ نے چاہا تو اگلی کسی فلائٹ سے آ جاؤں گا۔“

مراد نے جبکی براؤن سے رابطہ کرنے کے بعد کہا۔ ”میرا بیٹا محض انسانی ہمدردی کے تحت اس عورت کو اسپتال لے گیا ہے۔ اس چڑیل سے اسے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ جب اس کے اپنے لوگ اس کی تیمارداری کے لیے آجائیں گے تو عالی وہاں سے چلا آئے گا۔ اینڈی گارسن سے بولو کہ وہ تھوڑا انتظار کرے۔ عالی کے وہاں سے جاتے ہی اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔“

جبکی نے یہ بات اینڈی گارسن سے کی۔ وہ بولا۔ ”ابھی اسپتال سے معلوم ہوا ہے وہ کتیا بچ گئی ہے۔ میں اسے زندہ نہیں دیکھ سکتا۔ اسپتال سے اس کی لاش باہر جائے گی۔“

”ایزی گارسن ایزی.....! تھوڑی دیر صبر کرو۔ پرنس وہاں سے چلے جائیں گے۔“



ہوئی تھی کہ پرنس ان سے دور ہو جائے گا۔ ان کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ ایک درجن یہودی مسجد کے سامنے آکر بیٹھ گئے کہ اسے اپنے ساتھ لے کر ہی جائیں گے۔

اینڈی گارن کے شوٹز عالی کے جانے کے بعد بھی شائلڈ شانی تک پہنچ نہیں پارے تھے۔ راجراستھ نے وہاں پولیس کا سخت پہرا لگا دیا تھا۔ انہیں تاکید کی تھی کہ دوسرے دن تک اسپتال سے چھٹی دی جائے تو اسے اتر پورٹ کے کونفا سنڈ ایریا میں پہنچا دیا جائے۔

شائلڈ کو ہوش میں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ پرنس عالی نے اس کی جان بچا کی ہے۔ اسے اتر پورٹ سے اٹھا کر اسپتال میں پہنچایا ہے۔ وہ پرنس کا شکر یہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ اسے پولیس والوں کی نگرانی میں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

اس نے پولیس کے اعلیٰ افسر سے رابطہ کیا پھر اس سے کہا۔ ”میں اسپتال میں زخمی پڑی ہوں۔ میرے انجانے دشمنوں نے مجھ پر دو گولیاں چلائی ہیں۔ وہ اس اسپتال میں بھی مجھ پر حملہ کر سکتے ہیں۔“

اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”آپ کی حفاظت کے لیے پولیس اسپتال میں موجود ہے۔ آپ اتر پورٹ کی کونفا سنڈ پینجر ہیں۔ مکمل علاج کے بعد ہم آپ کو بحفاظت یہاں سے روانہ کریں گے۔“

”میں پولیس کے علاوہ پرسنل سیکورٹی گارڈز بھی چاہتی ہوں۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام اخراجات آن لائن بینکنگ کے ذریعے ادا کروں گی۔ پلیز میری یہ درخواست قبول فرمائیں۔ سچ گارڈز کی تعداد زیادہ رکھیں۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ کی مرضی کے مطابق آدھے گھنٹے میں چھ سچ گارڈز یہاں پہنچ جائیں گے۔“

وہاں مارنے والے اور اپنا بچاؤ کرنے والے سب ہی اپنے اپنے طور پر مصروف تھے۔ ان میں اینڈی گارن کے کارندے شائلڈ تک پہنچنے میں ناکام ہو رہے تھے اور مسجد کے سامنے بیٹھی ہوئی یہودیوں کی ٹیم بھی مایوس ہونے والی تھی۔

عالی نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس مسجد کی انتظامی خوبیوں کو اندر سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں ایک وسیع و عریض کانفرنس ہال تھا، جہاں دینی احکامات اور اسلامی تہذیب کے موضوعات پر تقریریں ہوتی تھیں۔ دینی کتب کی ایک بہت بڑی لائبریری تھی۔ ایک مدرسے میں عربی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔

پیش امام نے کہا۔ ”یہاں کے مسلمان بڑی محنت اور

”ضرور ہے۔ ابھی چلو۔“

وہ کار کو دوسرے راستے پر موڑتے ہوئے بولا۔ ”پتا ہے یہاں عیسائیوں کے بعد دوسری بڑی آبادی مسلمانوں کی ہے۔ تم یہاں کئی عورتوں کو عبا اور نقاب میں دیکھو گے۔“ عالی نے ایک کمرشل علاقے سے گزرتے ہوئے دو خواتین کو عبا میں دیکھا۔ آگے اور تین خواتین نظر آئیں۔ وہ پورے حجاب میں نہیں تھیں۔ پھر بھی انہوں نے حیا کے تقاضے پورے کیے ہوئے تھے۔

راجر نے ایک عالی شان مسجد کے سامنے کار روک دی۔ عالی نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔ ”سبحان اللہ! بہت خوب صورت مسجد ہے۔ مجھے ایک گھنٹے بعد لے لینا۔“ ”اوکے میں جا رہا ہوں۔ ایک گھنٹے بعد اسی جگہ نظر آؤں گا۔ آرام سے عبادت کرو۔“

وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا چلا گیا۔ عالی نے سر اٹھا کر مینار کی بلندی کو دیکھا پھر دل کی گہرائیوں سے اللہ اکبر اللہ اکبر اور کلمہ پڑھتا ہوا مسجد میں داخل ہو گیا۔

ادھر یہودی اکابرین پریشان تھے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے پرنس ہاتھ سے نکل رہا ہے جبکہ وہ عارضی طور پر بچھڑ گیا تھا۔ وہ اسے حاصل کیے بغیر سکون سے نہیں رہ سکتے تھے۔

کریگ ہوشن اور اس کے ساتھیوں کو اسی فلائٹ سے جانا پڑا تھا۔ اس نے جیوا کی یہودی تنظیم کے اکابرین کو فون پر کہا۔ ”پرنس عالی آپ کے شہر میں حادثاتی طور پر رک گیا ہے۔ پولیس والے اسے اپنی کسٹڈی میں لے سکتے ہیں جبکہ اسے ہماری پناہ سے باہر نہیں رہنا چاہیے۔“

تنظیم کے ایک عہدیدار نے کہا۔ ”بے شک۔ اسے ہماری پناہ میں رہنا چاہیے۔“

ہوشن نے کہا۔ ”آپ حضرات فوراً اس سے رابطہ کریں اور اسے اپنی نگرانی میں رکھیں اور اپنی موجودگی میں اسے پیرس روانہ کریں۔ بہت محتاط اور ہوشیار رہیں۔ اسے انتہا پسند مسلمانوں کے ہاتھ نہ لگنے دیں۔“

ان کے پیشوا اور رتی بھی پریشان ہو گئے تھے۔ جب رتی کے کارندے اسپتال پہنچے تو عالی وہاں سے جا چکا تھا۔ انہوں نے پولیس افسر راجراستھ سے فون پر پوچھا۔ ”پرنس کہاں ہے اس سے بات کرائیں۔“

راجر نے کہا۔ ”وہ ایک مسجد میں ہے۔ عبادت سے فارغ ہو کر ایک گھنٹے بعد مسجد سے باہر آئے گا۔ تب ہی اس سے باتیں ہو سکیں گی۔ آپ حضرات انتظار کریں۔“

وہ انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے اندر کھلبلی مچی



لگن سے تحاریر اور تقاریر کے ذریعے دین کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے سروے کے مطابق یہاں کی مسلمان خواتین گمراہ نہیں ہیں۔ بہت فعال ہیں۔ یہاں ہر سال سر کیپ لگاتی ہیں اور عیسائی خواتین کے ساتھ بہت ہی عالمانہ مہارت سے مذاکرات کرتی ہیں۔ کئی عیسائی خواتین کو مشرف پہ اسلام کر چکی ہیں۔“

عابی دین اسلام کی اشاعت اور پھیلاؤ کے حوالے سے بڑی ایمان افروز اور حوصلہ افزا باتیں سن رہا تھا۔ پھر ایک گھنٹے بعد مسجد سے باہر آ گیا۔ راجر اپنی کار کے ساتھ وہاں موجود تھا۔

یہودیوں نے عابی کو دیکھتے ہی اسے بڑے ادب سے گھیر لیا۔ ایک نے کہا۔ ”ہمارے ربی آپ کے لیے پریشان ہیں۔ یہ شہر آپ کے لیے انجانا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ اگلی فلائٹ تک آپ کے آرام و آسائش کے انتظامات کیے گئے ہیں۔ وہاں آپ کی ہر ضرورت پوری ہوگی۔“

عابی نے کہا۔ ”محترم ربی سے کہہ دو میرے لیے پریشان نہ ہوں۔ میں قانون کے ایک محافظ کے ساتھ ہوں کسی اور کی پناہ میں جانا چاہوں گا تو یہ قانون کے مطابق مجھے ائر پورٹ کے کونٹائنمنٹ ایریا میں پہنچا دیں گے۔ کیا مجھے وہاں قیدی بن کر رہنا چاہیے؟“

انہوں نے انکار میں سر ہلایا۔ عابی نے کہا۔ ”تو پھر مجھے آزادی سے ایک پولس افسر کے ساتھ رہنے دیں۔ آپ حضرات جائیں۔ میری طرف سے مطمئن رہیں۔“

وہ سب مایوس ہو گئے۔ پولیس افسر راجر اسمتھ کے سامنے کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ عابی اس کے پاس اگلی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا کار وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ راجر نے پوچھا۔ ”تمہارے کھانے کا وقت ہو گیا ہے؟ مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔“

”جہاں حلال کھانا ہو، وہاں کھاؤں گا۔“

سٹی سینٹرل ریلوے اسٹیشن سے چند قدم کے فاصلے پر ایک پاکستانی ”شاہی ریسٹورانٹ“ ہے۔ راجر اسے وہاں لے آیا۔ وہاں انہوں نے نان چیکن کڑھائی اور نرگسی کوفتے کھائے۔ پہلی بار مریج مسالے والے پنچارے دار سالن کھاتے وقت عابی کی آنکھوں سے اور ناک سے پانی بہنے لگا۔ وہ رومال سے آنکھ ناک کا پانی پونچھتا رہا۔ ایسا ذائقہ اور پنچارہ تھا کہ وہ آخری لمحے تک کھاتا رہا۔

پھر اس نے سوٹ ڈش کھاتے ہوئے کہا۔ ”آج

معلوم ہوا کہ بابا جانی کے ملک میں کس قدر تیز مسالے دار اور پنچارے دار کھانے کھائے جاتے ہیں۔“

وہ کانوں کو چھو کر بولا۔ ”مزہ تو بہت آیا مگر دوبارہ یہاں آکر کھانے کا حوصلہ نہیں ہے۔“

راجر نے لگا پھر بولا۔ ”عابی! تم گیارہ برس کے بچے نہیں لگتے۔ تمہیں اتنے قریب سے دیکھ رہا ہوں۔ پچیس برس کے بھر پور جوان دکھائی دے رہے ہو۔ تم سے مصافحہ کیا تو معلوم ہوا، فولاد کی طرح سخت ہو۔ لڑکیاں تو تم پر پناہ پٹ مرتی ہوں گی۔“

وہ بولا۔ ”میں نے بے شمار عورتوں کو آہیں بھرتے اور مرتے دیکھا ہے لیکن کسی کا جنازہ اٹھتے نہیں دیکھا۔ وہ آج بھی اپنے گھروں میں زندہ ہوں گی۔“

”ہم آپس میں بے تکلف ہیں۔ تم اپنے ذاتی احساسات بتاؤ۔ کیا حسین عورتیں اچھی لگتی ہیں؟“

وہ بولا۔ ”راجر! بچوں سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”نہتے ہو کر سلیج آری کو شکست دینے والے بچے! تم نے مجھے دوست کہا ہے لہذا دوست کو نہ

نالو۔ بے تکلفی سے بولو۔ کیا حسین عورتیں اچھی لگتی ہیں؟“

”حسن عورتوں میں ہو، پھولوں میں ہو، صبح و شام کے نظاروں میں ہو..... وہ آنکھوں کو بھلا لگتا ہے۔“

”میں صرف عورتوں کے متعلق پوچھ رہا ہوں۔“

”جو عورتیں مجھے اچھی لگتی ہیں، میں انہیں ماں اور بہن بنا لیتا ہوں۔ محبت کی داستانوں والا عشق کسی سے نہیں ہوتا۔“

”سمجھ گیا۔ جسمانی طور پر فولادی رو بوٹ ہو لیکن ذہنی طور پر نابالغ ہو۔ عورت کی اس کشش کو نہیں سمجھتے ہو جو فطری تقاضوں کو پکارتی ہے۔ یہی بات ہے نا؟“

”کوئی دوسری بات کرو۔ جنیوا کے بارے میں کچھ بتاؤ۔“

وہ پھر اپنی کار میں آکر بیٹھ گئے۔ راجر نے کہا۔ ”یہ بین الاقوامی شہر ہے۔ انٹرنیشنل ائر پورٹ کے باعث یورپ کے تمام بڑے شہروں سے رابطہ رہتا ہے۔ یہاں ہر سو موٹروے اور ریل روڈ کا جال ملکی سرحد تک پھیلا ہوا ہے۔ جنیوا کو بینکوں کا شہر کہنا چاہیے۔ یہاں سو سے زیادہ غیر ممالک کے بینک ہیں اور سیکٹروں ملکی اور غیر ملکی سیاندانوں کے خفیہ اکاؤنٹس ہیں۔ حکمران اپنے ہی ملکوں سے چرائی ہوئی دولت یہاں لا کر جمع کرتے ہیں۔“

عابی نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے میں نے سنا ہے اور پڑھا ہے۔“

راجر نے کہا۔ ”ہمارا یہ شہر امن کا شہر کہلاتا ہے۔“

راجر نے کہا۔ ”ہمارا یہ شہر امن کا شہر کہلاتا ہے۔“

راجر نے کہا۔ ”ہمارا یہ شہر امن کا شہر کہلاتا ہے۔“

راجر نے کہا۔ ”ہمارا یہ شہر امن کا شہر کہلاتا ہے۔“

راجر نے کہا۔ ”ہمارا یہ شہر امن کا شہر کہلاتا ہے۔“

راجر نے کہا۔ ”ہمارا یہ شہر امن کا شہر کہلاتا ہے۔“

راجر نے کہا۔ ”ہمارا یہ شہر امن کا شہر کہلاتا ہے۔“



یو این او (اقوام متحدہ) کا ہیڈ کوارٹر یہاں ہے اور یہاں مشہور زمانہ ریڈ کراس کا صدر دفتر بھی ہے۔“

وہ تن کر بولا۔ ”ہمیں فخر ہے پوری دنیا کے سیاسی جھگڑوں کا تصفیہ ہمارے شہر میں ہوتا ہے اور تمام دنیا کے بیاروں کے لیے دوائیں اور ڈاکٹر ہماری ریڈ کراس تنظیم کے ذریعے بھیجے جاتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ایک سو ساٹھ ممالک کے سفارت کار یہاں اپنی حکومتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔“

سڑکوں پر اچھی خاصی گاڑیاں چل رہی تھیں۔ ہر سو ایسی جگہ گاتی ہوئی روشنیاں تھیں کہ رات گم ہو گئی تھی۔ دن کی طرح شہر روشن اور چمکیلا ہو گیا تھا۔ ان کے آگے جانے والی گاڑی کی رفتار سست ہو رہی تھی۔ راجر اپنی کار کو ایک طرف سے آگے نکال کر لے جانا چاہتا تھا لیکن ادھر بھی دوسری گاڑی آگئی تھی۔ تیسری طرف بھی ایک گاڑی ان سے لگی ہوئی رک رہی تھی۔

بات سمجھ میں آگئی۔ سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق راجر کو گاڑی روکنے پر مجبور کر دیا گیا پھر سامنے اور دائیں بائیں کی گاڑیوں سے تین شخص نکل کر دوڑتے ہوئے آئے۔ ان میں سے ایک نے راجر کو اپنی گن کے نشانے پر رکھ کر کہا۔ ”دروازے ان لاک کرو۔“

راجر نے خاموشی سے ایک بٹن کو دبایا۔ پھر پچھلے دروازے متقل ندر ہے۔ وہ تیزی سے اندر آ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ راجر ان کے نشانے پر تھا۔ وہ عالی کو نہیں جانتے تھے۔ اسے اہمیت نہیں دے رہے تھے۔ نظر انداز کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ”کار اشارت کرو۔ آگے بڑھو۔ تمہارے آگے پیچھے ہماری گاڑیاں رہیں گی۔ کوئی چالاکی نہیں دکھا سکو گے۔ اپنا ریو لور اور فون ہمیں دو۔“

راجر نے کار کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنا ریو لور اور فون ان کے حوالے کیا۔ ان کی تین گاڑیاں آگے اور دائیں بائیں چل رہی تھیں۔ ایک نے عالی سے کہا۔ ”اے! اپنا فون نکالو۔“

اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”میں فون نہیں رکھتا۔ میری تلاش لے سکتے ہو۔“

ایک نے اگلی سیٹ کی طرف جھک کر اس پر سوار ہو کر اس کے لباس کو اوپر ہی اوپر سے ٹٹولا۔ عالی چاہتا تو اسے ایک ہاتھ سے دیوچ کر ان کے ساتھیوں پر اسے اچھال کر پھینک دیتا۔ اس طرح، فوراً ہی گن چلانے کے لیے نشانہ نہیں لے پاتے۔ ان تینوں کو دیوچ لینا معمولی سی بات تھی۔

لیکن وہ کئی گاڑیوں کے حصار میں تھے۔ انہیں صبر و تحمل سے سوچنا سمجھنا اور آگے جا کر کچھ کر گزرانا تھا۔ ان میں سے ایک شخص نے راجر کو مستقل نشانے پر رکھا تھا۔ اس نے عالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

راجر نے کہا۔ ”یہ ہوا ہے جہاں سے گزرتا ہے وہاں سے کھیاں اڑ جاتی ہیں۔ یہ ہوا دوستوں کے لیے خوشبو ہے اور دشمنوں کے لیے طوفان ہے۔ یہ جسے چاہتا ہے ہوا کر دیتا ہے۔“

”کیا ہوا ہوا کے جار ہے ہو؟ سیدھی طرح بولو۔ یہ کون ہے؟ ہم جہاں تمہیں لے جا رہے ہیں وہاں سے یہ زندہ واپس نہیں جائے گا۔“

راجر نے کہا۔ ”عجیب اتفاق ہے۔ یہ دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے جا رہا تھا۔ میں نے اسے پکڑ کر گاڑی میں بٹھالیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ مرنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ مرو۔ میں پولیس والا ہوں۔ موت میرے چاروں طرف منڈلاتی رہتی ہے۔ دیکھ لو کہ تمہاری صورت میں موت آخر آ ہی گئی۔“

دوسرے شخص نے کہا۔ ”تم خوب سمجھ رہے ہو کہ ہم تمہیں گولی نہیں ماریں گے۔ اپنے باس کے قدموں میں پہنچائیں گے۔“

”میں جانتا ہوں۔ تمہارے باس کے پاس پہنچنے تک زندہ رہوں گا۔ اس لیے چپ چاپ تمہارے ساتھ جا رہا ہوں۔“

عالی نے دشمنوں کو دیکھا پھر راجر سے اردو زبان میں پوچھا۔ ”کیا اس لینگوئج میں بول سکتے ہو؟“

”ہاں۔ انڈین فلمیں شوق سے دیکھتا ہوں۔ یہ زبان سمجھنے اور بولنے لگا ہوں۔“

عالی نے پوچھا۔ ”یہ تمہارا دشمن کون ہے؟“

ایک گن مین نے ڈانٹ کر کہا۔ ”اے! تم لوگ کیا بول رہے ہو۔ ہماری لینگوئج میں بولو۔ ورنہ.....“

راجر نے کہا۔ ”ورنہ گولی نہیں مار سکو گے۔ اگر مجھے ذرا بھی خراش آئی تو باس تم سب کو جہنم میں پہنچا دے گا۔“

انہیں چپ لگ گئی۔ اس نے عالی سے کہا۔ ”ابھی میں نے کہا تھا کہ ہمارا شہر امن کا شہر کہلاتا ہے۔ یہاں ایسی مجرمانہ وارداتیں نہیں ہوتیں جیسی ابھی ہو رہی ہیں۔ یہ واردات کرنے والے آس پاس کے ملکوں سے آئے ہیں۔“

وہ عالی کو بتانے لگا۔ ”کارمن ڈی مورائٹی کا ایک بہت طاقتور ڈان ہے۔ وہ اپنے ملک سے باہر بھی واردات کرنے اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے لگا ہے۔ اس کے



جوان بیٹے لیورل ڈی مورانے ہمارے شہر میں آکر قتل کی واردات کی تھی۔ ایک جوان عورت سے زیادتی کی تھی پھر اسے ہلاک کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ یہاں سے فرار ہوتا میں نے اس کے شوٹرز کے ساتھ ایک خون ریز جنگ لڑنے کے بعد گرفتار کر لیا تھا۔ کارمن ڈی مورانے یہاں آکر حکم دیا کہ میں اسے رہا کر دوں لیکن میں نے اس کے حکم کو نظر انداز کر دیا۔ اس نے میری وائف کو اغوا کیا اور کہا..... میرے بیٹے کو واپس کرو اور اپنی بیوی کو لے جاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”تمہاری شامت آگنی ہے۔ اگر میری وائف کو فوراً رہا نہیں کرو گے تو فون پر اپنے بیٹے کی چیخیں سنو گے۔ میں اسے نارچرسل میں لے جاؤں گا۔“ وہ اپنے مطالبے پر اڑا رہا۔ میں نے نارچرسل میں اس کے بیٹے کو اذیتیں پہنچائیں۔ فون کے ذریعے باپ کو بیٹے کی چیخیں سنائیں تو وہ درندہ پولیس اسٹیشن کے سامنے میری وائف کی لاش پھینک کر چلا گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری وائف یوں جان سے جائے گی۔

وہ فون پر بولا۔ ”میں کبھی نہ ٹٹنے والی موت ہوں۔ اب بھی تم نے میرے بیٹے کو رہائی نہ دی تو تمہاری بیٹی کو اشوا لوں گا۔ پھر اس کی بھی لاش اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔“

”میں نے اپنی بیٹی ماریہ کو سخت سکیورٹی میں رکھا ہے۔ تمام پولیس فورس میرے ساتھ ہے۔ پھر بھی میں اسے گرفتار نہ کر سکا کیونکہ وہ ادھر نہیں آتا ہے۔ اٹلی میں بیٹھا اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے واردات کراتا رہتا ہے۔“

وہ عالی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اب تم میرے ساتھ ہو تو حوصلہ بڑھ گیا ہے۔ آسانی سے گرفتار ہو کر ان شوٹرز کے ساتھ جا رہا ہوں تاکہ اس شیطان کارمن ڈی مورانے سے سامنا ہو ہی جائے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ مجھے اپنی حراست میں رکھ کر قانون کے محافظوں سے اپنے بیٹے کی رہائی کا مطالبہ کرے گا۔“

عالی نے کہا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔ اسی لیے یہ لوگ تمہیں گولی نہیں مار رہے ہیں۔ اپنے پاس کے پاس لے جا رہے ہیں۔ ان کی پلاننگ سمجھ میں آ رہی ہے۔“

راجر نے کہا۔ ”میں سپاہی ہوں۔ موت سے نہیں ڈرتا لیکن بیٹی کی فکر مار رہی ہے۔ میں نہ رہا تو وہ اتنی بڑی دنیا میں بے یار و مددگار رہ جائے گی۔ ڈی مورانے سے بھی مار ڈالنے کے لیے تلاش کرتا رہے گا۔“

”نکر نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے جیسے نیک اور فرض

شناس بندوں کی مدد فرماتا ہے۔“

”میرا دل کہتا ہے۔ میرے گاؤ نے، تمہارے اللہ نے میری ماریہ کی حفاظت کے لیے تمہیں بھیجا ہے۔ وعدہ کر دو مجھے کچھ ہو گیا تو تم میری بیٹی کو اپنی سرپرستی میں رکھو گے۔“

”اللہ بہتر جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ تمہاری بیٹی کو صرف ہماری ریاست ارض اسلام میں تحفظ اور سلامتی ملے گی۔ کسی دشمن کی آواز بھی اسے چھو نہیں سکے گی۔“

راجر نے پوچھا۔ ”کیا ان لمحات میں مجھ سے ایک وعدہ کر دو گے اور میرے بعد اسے پورا کر دو گے؟“

”میں تمہارے اطمینان کے لیے ہر وہ وعدہ پورا کروں گا جو میرے دین کے مطابق ہوگا۔“

”تمہارے دین اسلام کے مطابق کہہ رہا ہوں۔ اسے اپنی بہن نہ بنانا۔ وہ تمہارے لیے نامحرم ہوگی۔ تم چاہو گے تو اسے اپنے نکاح میں لے آؤ گے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تم میری عمر جانتے ہو۔“

”میں اپنی بیٹی کی عمر جانتا ہوں۔ وہ بھی گیارہ برس کی ہے۔ بہت ہی ذہین اور حاضر دماغ ہے۔ میں پریشان تھا کہ اسے دشمنوں سے کہاں چھپا کر رکھوں؟ ڈی مورانے اپنے شکار تک پہنچنے کے لیے کئی بار پولیس کانسٹیبل کو توڑ چکا ہے۔ اس کے بہرہ وے جاسوس ماریہ کو تلاش کرنے کے لیے پورے جینوا میں بلکہ پورے سوئٹزر لینڈ میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ کسی دن بھی ماریہ تک پہنچ سکتے ہیں لیکن میری بیٹی نے ایک دن بڑی ذہانت سے کہا..... پاپا! میں ایسی جگہ جا کر چھپ جاؤں گی جہاں انسان اپنی زندگی میں کبھی نہیں جاتا ہے۔“

میں نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا تم قبرستان میں جا کر چھپنا چاہتی ہو۔ دشمن نادان نہیں ہیں۔ وہ قبر کھود کر بھی دیکھنے آئیں گے کہ تم زندہ ہو یا مر چکی ہو؟“

وہ بولی۔ ”میں مسلمانوں کے قبرستان میں رہوں گی۔“

”میں نے بیٹی کی پلاننگ کے مطابق مسلمانوں کے قبرستان میں جا کر دیکھا۔ وہاں مین گیٹ کے قریب دو رہائشی کوارٹرز ہیں۔ ایک کوارٹر میں قبرستان کا منتظم اور منشی رہتا ہے۔ دوسرے کوارٹر میں تین گورکن رہتے ہیں۔ میں نے منشی کوراز دار بنایا ہے۔ اب ماریہ لڑکوں کا لباس پہن کر یو آئے کٹ ہیرا سائل بنا کر وہاں رہنے لگی ہے۔ اس کا قد تقریباً پانچ فٹ ہے۔ ایک کسٹمر لڑکا دکھائی دیتی ہے۔ وہاں کے منشی کو باپ کہتی ہے۔ تدفین کے لیے آنے والوں کا کھانا لکھتی ہے۔ وہاں کے انتظامات کو پوری ذمہ داریوں سے



ان میں سے ایک نے اپنی گن سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”باہر آؤ اور ہیلی کاپٹر میں بیٹھو۔“  
راجر نے انکار میں ہاتھ ہلا کر کہا۔ ”پہلے فون دو اور کارمن ڈی مور سے بات کراؤ۔“  
وہ بولا۔ ”باس کے پاس پہنچ کر ہی باتیں کرو گے، ابھی چلو۔“

”اگر یہاں بات نہیں ہوگی تو میں آگے نہیں جاؤں گا۔“

وہ اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ ”فوراً باہر نہیں نکلو گے تو گولی مار دوں گا۔“

”گولی مارنے کے لیے بھی باس سے رابطہ کرنا ہوگا۔ وہ اجازت دے گا، تب ہی ٹریگر دبا سکو گے۔“

”باس نے ہمیں اجازت دی ہے کہ سیدھی طرح نہیں چلو گے تو تمہیں زخمی کر کے لایا جائے۔“

راجر نے کار بند نہیں کی تھی۔ انجن جاگ رہا تھا۔ عالی نے اردو میں کہا۔ ”دروازہ ایک جھکے سے کھولتے ہوئے اس کے منہ پر مارو اور سامنے والوں پر گاڑی چڑھاتے ہوئے دور نکل جاؤ۔ یہ اچھی طرح یاد رکھو، یہاں میری خاطر واپس نہ آتا۔ آؤ گے تو تمہیں بچانے کے لیے مشکل میں پڑ جاؤں گا۔“

عالی کی طرف کھڑے ہوئے گن مین نے پوچھا۔ ”اے، کیا بول رہے ہو؟ باہر نکلو۔“

اچانک ہی دونوں طرف کے دروازے بیک وقت تیزی سے کھلے۔ وہاں کھڑے ہوئے گن مین ان سے ٹکرا کر پیچھے کی طرف لڑکھڑاتے چلے گئے۔ اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ عالی نے اپنی طرف کے دروازے سے باہر نکلتے ہی بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔

”شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان ہے اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔“

اس سے پہلے کہ گن بردار سن سکتے اور کچھ سمجھتے، وہ فضا میں چھلانگ لگاتا ہوا، فلا بازی کھاتا ہوا ہیلی کاپٹر کے اوپر اس کے ایک جھکے کے بلیڈ پر بیٹھ گیا۔ آہنی جھکے کا وہ بلیڈ اس کے وزن سے نیچے کی طرف مڑ گیا۔

ان میں سے کچھ تو حیران ہو کر آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھ رہے تھے۔ کچھ راجر کی کار سے ٹکرا کر ادھر ادھر گر پڑے تھے۔ زخمی ہونے کے باعث فوراً ہی اٹھنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

وہ کار کو تیزی سے دوڑاتا ہوا ان سے دور جا رہا تھا۔

سنجالی تھی ہے۔ وہ بہت سمجھ دار ہے۔ اب تک کسی نے اس پر کسی طرح کا شبہ نہیں کیا ہے۔“

عالی نے کہا۔ ”سجان اللہ۔ تمہاری باتوں سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ بہت ذہین ہے۔ اللہ کرے کوئی اس پر شبہ نہ کرے۔“

”وہ اپنی ہی ذہانت سے فی الحال محفوظ ہے۔ لیکن دشمنوں کے خوف سے پوری زندگی اسی طرح نہیں گزار سکے گی۔“

عالی نے کہا۔ ”تم نے مجھے الجھا دیا ہے۔ میں کیسے وعدہ کروں؟ میرے سامنے جو زندگی ہے، وہ قدم قدم پر مجھے چیلنج کر رہی ہے۔ میں دنیا گھومنے نکلا ہوں اور دنیا والے خطرات کی گھنٹیاں بجاتے جا رہے ہیں۔“

راجر نے کہا۔ ”شادی لازمی ہے۔ آج نہ سہی دس برس بعد دینی احکامات کے مطابق کسی کو اپنی منکوحہ بناؤ گے۔ وہی نکاح اب پڑھو اگر میری بیٹی کو ایک مجازی خدا کے رشتے کی قوت دے دو۔ اسے اپنی ریاست میں رہنے کے لیے بھیج دو۔“

”میں بابا جانی سے بات کروں گا۔“

ان کے آگے اور دائیں بائیں چلنے والی گاڑیاں انہیں شہر سے باہر لے آئی تھیں۔ وہ ہائی وے کو چھوڑ کر دوسرے راستے پر جا رہے تھے۔ پہاڑوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ میدانی علاقے میں ہریالی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھتے ہوئے دیکھا، دور ایک کھلے میدان میں ہیلی کاپٹر کھڑا ہوا تھا۔

گاڑیاں ادھر جانے لگیں۔ راجر نے پریشان ہو کر کہا۔ ”عالی.....! میں سمجھ رہا تھا ڈی مور ہمارے ملک میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ ہم اس کے خفیہ اڈے تک پہنچ سکیں گے لیکن یہ ہیلی کاپٹر ہمیں ملک سے باہر کہیں دور لے جائے گا۔“

عالی نے کہا۔ ”ہاں۔ پتا نہیں یہ لوگ ہمیں کہاں لے جائیں گے۔ وہاں سے ہم واپس آ سکیں گے یا نہیں؟“

”نہ جانے وہ کیسی جگہ ہوگی؟ وہاں ڈی مور ہمارے مقابلے میں طاقتور ہوگا۔ ہمارے فرار کے راستے مسدود کر دے گا۔“

گاڑیاں ہیلی کاپٹر کے پاس آ کر رک گئیں۔ وہ سب اپنی گاڑیوں سے اتر کر ان کی طرف آ رہے تھے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے گن مین بھی باہر نکل کر کھڑے ہو گئے تھے۔ عالی نے دیکھا وہ تعداد میں بارہ تھے۔



گاڑی کے اندر دو ریوالور بھرے ہوئے میگزین اور موبائل فون کو پھینکا۔ پھر گاڑی کو ٹرن دے کر ان دو گاڑیوں کی طرف رخ کیا۔ سیدھا ان کی سمت جانے لگا۔

وہ کھڑکیوں سے آدھے نکل آئے تھے اور اس پر گولیاں چلا رہے تھے۔ وہ آدھا سیٹ کے نیچے تھا۔ بڑی مہارت سے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کار کو ان کی ایک گاڑی سے ٹکرایا اور باہر آ گیا۔ زمین پر گر کر قلا بازیاں کھاتا ہوا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

دو گاڑیوں کے ٹکراتے ہی کھڑکیوں سے نکلے ہوئے آدھے لوگ باہر کی طرف الٹ گئے۔ زخمی ہو کر اٹھنے اور سنبھلنے میں وقت لگتا ہے۔ اٹھنے سے پہلے ہی عالی اچھل کر ایک زخمی کے پیٹ پر آ کر کھڑا ہوا تو اس کے وزن سے پیٹ پھٹ گیا۔ دوسرے کو ٹھوک ماری تو اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

پھر وہ اچھل کر فضا میں قلا بازی کھاتا ہوا گاڑی کے دوسری طرف گرنے والے شوٹروں کے اوپر آ گیا۔ پتا نہیں وہ کس قدر بھاری بھرم تھا۔ وزن بتانے والی مشین کا کاٹنا آخری کنتی پر پہنچ کر رک جاتا تھا۔ ادھر دو شوٹرز جہنم میں چلے گئے تھے۔

دوسری گاڑی والے راجر کی طرف گولیاں چلا رہے تھے۔ وہ بھی جوابی فائر کر رہا تھا۔ کار کے اندر محفوظ تھا۔ ایسے وقت ایک ہاتھ سے فون کو کان سے لگا کر پولیس کے اعلیٰ افسر کو موجودہ حالات سے آگاہ کر رہا تھا۔

اس نے یہی غلطی کی۔ اسے دور جا کر فون پر بولنا چاہیے تھا یا پھر دشمنوں پر پوری توجہ دینی چاہیے تھی۔ اس کا ذہن صرف چند ساعتوں کے لیے بھٹک گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ صحیح سمت فائر کرتا ایک گولی اس کے سر میں آ کر گھس گئی۔ اس کے دیدے پھیل کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گئے۔

عالی اس سے بے خبر تھا۔ اپنے طور پر دشمنوں سے نمٹ رہا تھا۔ ان چار شوٹرز کی پٹائی کر رہا تھا جو اس کے پیچھے دوڑتے دوڑتے تھک کر ہانپنے لگے تھے۔ ان میں سے دو پہلے ہی ناکارہ ہو گئے تھے۔ وہ فضا میں جمناسک کے کرتب دکھاتے ہوئے باقی دو کے پیچھے پہنچ گیا۔ ان کے پلٹنے سے پہلے ہی گردنوں کو دبوچ لیا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ دونوں نے پھڑ پھڑا کر دم توڑ دیا۔

موت دشمنوں کو ہی نہیں آتی دوستوں کو بھی آتی ہے۔

تب انہوں نے فائرنگ کی لیکن وہ شوٹنگ ریج سے دور نکل گیا تھا۔ عالی بیلی کا پٹرکی چھت پر تن کر کھڑا تھا اور سورۃ البقرہ کی آیتیں انگریزی زبان میں پڑھ رہا تھا تاکہ سننے والے سمجھ سکیں۔

ایسے وقت چھ شوٹرز نے اس پر گولیاں چلائیں۔ وہ تمام گولیاں ہوا میں گئیں۔ وہ بیلی کا پٹرکی چھت سے ہوا ہو گیا تھا۔ وہاں سے چھلانگ لگا کر ان کی ایک گاڑی کے پیچھے آ گیا تھا۔ باقی دو گاڑیوں میں چھ شوٹرز راجر کا پیچھا کر رہے تھے۔

عالی سے نمٹنے والوں نے سنا۔ تیسری گاڑی کے پیچھے سے تلاوت کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

وہ چھ شوٹرز اس گاڑی کی طرف دوڑتے آرہے تھے پھر ایک بیک رک گئے۔ وہ گاڑی ان ہی کی طرف تیزی سے آرہی تھی۔ عالی ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ سب پلٹ کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ دو ٹکرا کر گرے۔ ایک بری طرح کچلا گیا۔ باقی چار شوٹرز گاڑی کی طرف فائر کرنے لگے۔ وہ ان سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

اب یہ منظر تھا کہ راجر دو گاڑیوں کو اپنے پیچھے دوڑا رہا تھا اور چار شوٹرز عالی کی گاڑی کے پیچھے فائرنگ کرتے ہوئے دوڑتے ہوئے جا رہے تھے۔ دو شوٹرز ناکارہ ہو گئے تھے۔ ایک تو گاڑی کے نیچے آ کر لہو لہان ہو گیا تھا۔ دوسرا بھی زخمی تھا۔ اٹھ کر چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

عالی گاڑی کو ایک لمبا ٹرن دے کر پھر ان زخمیوں کے پاس آیا۔ ان دونوں کو دوسری بار کچلتا ہوا گزر گیا۔ وہ چاروں شوٹرز لمبی دوڑ لگانے کے باعث ہانپ رہے تھے۔

عالی گاڑی روک کر دوڑتا ہوا زخمیوں کے پاس آیا۔ ان کے ریوالور اور بھرے ہوئے میگزین اٹھائے۔ ان کی جیبوں سے فون نکالے پھر دوڑتا ہوا آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اسے تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا راجر کی طرف جانے لگا۔

وہ چاروں اس کی طرف دوڑتے آرہے تھے۔ اسے پھر دور جاتے دیکھ کر رک گئے۔ وہ تھک گئے تھے۔ بری طرح ہانپ رہے تھے۔ وہ بلند آواز سے تلاوت کر رہا تھا۔

راجر عالی کے ہاتھ کا اشارہ پا کر اس کی طرف آرہا تھا۔ پیچھے دشمن لگے ہوئے تھے۔ عالی فائرنگ کے ذریعے انہیں دور ہونے پر مجبور کر سکتا تھا۔ اسے شوٹنگ میں بھی مہارت حاصل تھی لیکن اس نے کبھی کسی دشمن پر گولی نہیں چلائی تھی۔ وہ خود کو خالی ہاتھ لڑنے کا عادی بنا تا جا رہا تھا۔

اس نے راجر کے برابر کار دوڑاتے ہوئے اس کی



راجر نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ کی پشت سے فیک لگائے ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ صرف چار دشمن رہ گئے تھے۔ وہ راجر کی طرف سے جوابی فائرنگ کا انتظار کر رہے تھے۔

انہوں نے دو گولیاں اس کی طرف چلائیں پھر ایک نے کہا۔ ”شاید وہ مر گیا ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے چال بازی دکھا رہا ہو۔ ہمیں سوچ سمجھ کر اس کے قریب جانا ہوگا۔“

تیسرے نے چونک کر پوچھا۔ ”ارے وہ چھلانگیں لگانے والا بازی گر کہاں ہے؟“

یاد کرتے ہی شامت آگئی۔ وہ جس کار کے پیچھے چھپے ہوئے گولیاں چلا رہے تھے، وہ کار دوسری طرف سے اٹھ

کر بڑی تیزی سے ان کے اوپر آگئی۔ عالی نے اسے ایک طرف سے اٹھا کر ان کے اوپر پھینکا تھا۔ ان میں سے تین

فوراً ہی بھاگ نہ سکے، اس کے پیچھے دب گئے۔ چوتھا اور آخری دشمن بھاگ رہا تھا۔ عالی چھلانگیں لگاتا ہوا آ رہا تھا۔

پھر اس کی پیٹھ پر ایک لات پڑی۔ وہ اچھل کر اوندھے منہ گرا تو پھر اٹھ نہ سکا۔ ایک ہی لات نے اس کی کمر کی ہڈی توڑ دی تھی۔

پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے۔ شاید ہر ملک کی پولیس کا یہی دستور ہے۔ قصہ تمام ہونے کے بعد

پہنچتی ہے۔ عالی دوڑتا ہوا راجر کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”باہر نکلو۔ تمہاری پولیس والے آرہے ہیں۔“

وہ قریب پہنچ کر ٹھنک گیا۔ دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہ کار تابوت بن گئی تھی۔ اندر اس کی میت رکھی ہوئی تھی۔ اس

کا سر جھک گیا۔ وہ بڑے صدمے سے زیر لب پڑھنے لگا۔ ”ہر ذی روح کو اللہ کی طرف جانا ہے۔“

تھوڑی دیر پہلے راجر سے دوستی ہوئی تھی بلکہ رشتے داری ہو رہی تھی۔ عالی نے اس کے لیے جنگ لڑی تھی اور

سج یاب ہوا تھا لیکن دوست کو ہار گیا تھا۔ سائرن بجاتی ہوئی گاڑیاں وہاں آ کر رک گئیں۔

سج سپاہی گاڑیوں سے نکل کر دوڑتے ہوئے ادھر ادھر پڑی ہوئی لاشوں کی طرف جا رہے تھے۔ ان میں سے دو

چار زندہ تھے لیکن زمین سے اٹھنے اور حرکت کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

دو پولیس افسر اور چند سپاہی عالی کے پاس آئے۔ انہوں نے اپنے افسر راجر کی لاش دیکھی تو ان کے سر

جھک گئے۔

پھر ایک افسر نے عالی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”راجر نے آدھا گھنٹا پہلے فون پر یہاں کے حالات بتائے تھے۔ یہ آپ کے ممنون تھے۔ ہم بھی آپ کے شکر گزار ہیں۔ آپ نے آخر وقت تک راجر کا ساتھ دیا ہے۔“

عالی نے کہا۔ ”میرا یہ ساتھ آخری نہیں ہے۔ جنگ تو اب شروع ہوگی۔ راجر مجھے بہت بڑی ذمے داری سونپ گیا ہے۔ اس کی بیٹی ماریہ کی حفاظت کا فرض ادا کرنا ہے۔ میں

کارمن ڈی موراکو جہنم میں پہنچاؤں گا، تب ہی ماریہ محفوظ رہ سکتی گی۔“

افسر نے کہا۔ ”اسے باپ کی ہلاکت کی اطلاع دینی ہوگی۔ پتا نہیں، وہ کہاں روپوش ہے؟“

عالی نے کہا۔ ”ان دشمنوں میں سے ایک نے راجر سے فون اور ریوالور لے لیا تھا۔ اس فون میں ماریہ کا

کانٹیکٹ نمبر ہوگا۔“

وہ مردہ اور زخمی دشمنوں کی طرف جاتے ہوئے فون چھیننے والے کو پہچاننے لگا۔ وہ دو سپاہیوں کے قریب زمین پر

پڑا ہوا تھا۔ اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ عالی نے اس کے لباس کی تلاشی لے کر اس کا فون نکالا۔ پھر اسے آن

کر کے ڈائنگ لسٹ میں ماریہ کا نام پڑھا۔ دل میں یہ صدمہ تھا کہ ایک بیٹی کو صدمہ پہنچانے والی اطلاع دینی

ہے۔ اس نے دل پر جبر کر کے نمبر پیچ کیے تو دوسری طرف تیل جانے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ایک مٹھی سی پیاری سی آواز سنائی دی۔ ”ہائے پاپا! میں آپ کو مس کال دینے والی تھی۔ مجھے

پتا ہے آپ میرے لیے فکر مند ہوں گے اور میں نے پہلے بھی کہا ہے۔ آپ ایک ذرا فکر نہ کریں۔ میں یہاں پوری طرح محفوظ ہوں۔“

وہ اپنی سلامتی کے سلسلے میں باپ کو مطمئن کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ ”ویسے بھی ایک سپاہی باپ کی بیٹی

ہوں۔ حالات سے لڑنا جانتی ہوں۔ باقی واوے، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ میں ہی بولتی جا رہی ہوں۔ آپ بھی تو کچھ

بولیں۔ ابھی آپ کہاں ہیں؟“

عالی نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ”وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔“

وہ چونک کر بولی۔ ”تم کون ہو؟ پاپا کہاں ہیں؟“

”میں پرنس عابد علی منگلی بول رہا ہوں۔“

وہ حیرانی سے بولی۔ ”کیا واقعی..... تم سچ بول رہے ہو؟ تم پرنس عالی ہو؟ پاپا کو فون دو۔ وہ بولیں گے تو تمہیں پرنس مان لوں گی۔“



دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

# گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ  
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سمرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ  
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا قصبے کے لیے 800 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد  
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے  
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر  
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے  
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر  
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شرم عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیئرسٹ ایسٹینٹس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 ٹیکس: 021-35802551

”تمہارے پاپا اب کبھی نہیں بولیں گے۔ پورے  
حوصلے سے یقین کر لو کہ وہ تمہیں ہمیشہ کے لیے تنہا چھوڑ کر  
جا چکے ہیں۔“

وہ چیخ پڑی۔ ”نہیں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔“

میرے پاپا کا فون تمہارے پاس کیسے ہے؟ پاپا.....!“

وہ پکارنے لگی۔ ”پاپا! تم کہاں ہو؟ یہ کونئی دشمن ہے۔“

عابی نے فون افسر کو دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ یقین نہیں  
کر رہی ہے۔ آپ اسے سمجھائیں۔“

افسر نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”بیٹی ماریہ! میں

شیرون بول رہا ہوں۔ میری آواز پہچان رہی ہوتا؟ بیٹی!

حوصلہ کرو۔ وہ بہادر افسر دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے

مارا گیا ہے۔“

اسے چپ لگ گئی۔ فون ذرا دیر تک خاموش رہا۔

شیرون نے اسے آواز دی۔ ”بیٹی ماریہ.....!“

وہ آنسو بھری آواز میں بولی۔ ”ایم آل رائٹ انکل!

میں آنسو نہیں بہاؤں گی اور اب روپوش نہیں رہوں گی۔ بائی

گاڈ اپنے باپ کے قاتلوں سے فائنٹ کروں گی۔ ابھی پاپا

کے آخری دیدار کے لیے آؤں گی۔“

”تم سمجھ دار ہونا دانی کی باتیں نہ کرو۔ جو ڈو کرائے

کی ٹریننگ حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی پہاڑ

سے نکل جاؤ گی۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟“

”آپ نصیحت نہ کریں۔ مجھے بتائیں پاپا کو پوسٹ

مارٹم کے لیے کہاں لایا گیا ہے؟ میں ابھی اس ہاسپٹل میں

آؤں گی۔“

”ابھی اسے یہاں سے لے جانے والے ہیں۔ میں

ہاسپٹل پہنچنے کے بعد تمہیں کال کروں گا۔ تب تک ٹھنڈے

دماغ سے سوچو۔ تم جہاں بھی روپوش ہو وہاں سے تمہیں باہر

نہیں آنا چاہیے۔“

وہ فون بند کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ لڑکی بہت ضدی

ہے۔ خواہ مخواہ دشمنوں کو لٹکانے کے لیے اپنی پناہ گاہ سے

لٹکانا چاہتی ہے۔“

عابی نے کہا۔ ”میں اسے سمجھاؤں گا۔“

شیرون نے پوچھا۔ ”ہم نہیں جانتے وہ کہاں

ہے؟ کیا آپ جانتے ہیں وہ کہاں پھپھی ہوگی؟“

”جانتا ہوں۔ میں کارمن ڈی مورائیک پہنچنے کے

لیے آپ سے تعاون چاہتا ہوں۔“

”آپ اس خبیث تک پہنچنا چاہیں گے تو گویا قانون

کی مدد کریں گے۔ آپ جو سہولتیں چاہیں گے وہ حاصل ہوتی



”میں چاہتا ہوں مجھے کسی بھی بہانے سے یہاں روک لیں۔ آگے پیس نہ جانے دیں۔“

”ہم بیان دیں گے کہ آپ پولیس آفیسر راجر کے مرڈر کے چشم دید گواہ ہیں۔ اس لیے آپ کو اس ملک میں روکا جا رہا ہے۔ آپ جب تک چاہیں گے یہاں رہ سکیں گے۔ باقی داوے، کیا یہاں رہ کر کارمن ڈی مور اتک پہنچ سکیں گے؟“

وہ بولا۔ ”وہ قاتل یہاں نہیں آئے گا۔ مجھے ادھر جانا ہوگا۔ آپ میرے اٹلی جانے کے انتظامات کریں۔“

”ہمارے ماہر شوٹرز، فائٹرز اور سراغ رسالوں کی ٹیم آپ کے ساتھ جائے گی۔“

”بے شک جائے لیکن وہ ٹیم مجھ سے دور رہا کرے گی۔ میں اپنی عادت کے مطابق اپنی جنگ آپ لڑوں گا۔“

”آپ جیسا چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔“

”ابھی مجھے ایک گاڑی دیں۔ میں تمہارا یہ کے پاس جاؤں گا۔ اس سے ملنے کے بعد آپ کے پاس آؤں گا۔“

”آپ واپسی کا وقت مقرر کریں۔ میں اس وقت تمام اعلیٰ افسران کو کال کروں گا۔ سب ہی آپ سے مل کر آئندہ کالانچ عمل تیار کریں گے۔“

”میں فون پر اطلاع دے دوں گا۔“

”سنا ہے آپ فون، ہتھیار، گھڑی اور انگوٹھی جیسی چیزیں اپنے پاس نہیں رکھتے ہیں۔“

”میں یہ بوجھ نہیں اٹھاتا۔ آپ کو کہیں سے بھی فون پر اطلاع دوں گا۔ آپ نمبر بتائیں۔“

افسر نے نمبر بتا کر کہا۔ ”اسے لکھ لیں۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ یہ میرے دماغ میں نقش ہو چکا ہے۔“

انہوں نے وہاں سے ہیڈ کوارٹر میں آ کر اسے ایک گاڑی دی۔ وہ اسے ڈرائیو کرتا ہوا اس قبرستان کی طرف جانے لگا جہاں ماریہ روپوش رہتی تھی۔ اس نے پولیس والوں سے قبرستان کی سمت جانے کا راستہ نہیں پوچھا تھا۔ اگر پوچھتا تو وہ سمجھ لیتے کہ ماریہ وہیں چھپ کر رہتی ہے۔

پولیس والے دشمن نہیں تھے لیکن ان میں کوئی دشمن کا مخبر ہو سکتا تھا۔ اس لیے ہیڈ کوارٹر سے دور نکلنے کے بعد اس نے ایک راہ گیر سے پوچھا۔ اسے معلوم ہوا کہ کن راستوں سے گزر کر وہاں تک پہنچ سکے گا۔ آگے جا کر الجھن ہوتی تو وہ پھر کسی سے پوچھ لیتا۔

اسے ڈرائیو کرنے کے دوران معلوم ہوا کہ ایک گاڑی بہت دیر سے اس کے پیچھے چلی آرہی ہے۔ اس نے سڑک کے کنارے اپنی گاڑی روک دی۔ وہ کسی کو قبرستان تک اپنے پیچھے لگانا نہیں چاہتا تھا۔ وہیں ان سے نمٹ لینا چاہتا تھا۔ وہ دشمن نہیں لیکن دردمست تھے۔ ان کی گاڑی قریب آ کر رک گئی۔ ان کے دروازے کھلے پھر وہ چار بیہودی نظر آئے جو مسجد کے سامنے اس سے ملنے آئے تھے۔ وہ کار سے نکل کر تیزی سے چلتے ہوئے اس کے قریب آئے پھر انہوں نے بڑے ادب سے سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنے سر جھکا لیے۔

عابی نے پوچھا۔ ”میرے پیچھے کیوں آرہے ہو؟“

ایک نے کہا۔ ”یہ ہماری ڈیوٹی ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ہم آپ کو ڈسٹرب نہیں کریں گے۔ دور سے آپ کا خیال رکھیں گے۔“

”کیوں خیال رکھیں گے؟ کیا میں نادان بچہ ہوں؟“

وہ عاجزی سے بولا۔ ”سر! یہ انجانا شہر ہے۔ آپ کو کہیں بھی ہماری ضرورت پیش آ سکتی ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”فار گاڈ سیک۔ آپ ہمارے فرائض سے ہمیں نہ روکیں۔“

عابی نے انہیں سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔

”فون نکالو۔ مسٹر ہوشن سے بات کراؤ۔“

اس نے فوراً ہی جیب سے فون نکال کر نمبر بیچ کئے۔ اسے کان سے لگایا پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ ”مسٹر ہوشن! آئراہیل پرنس سے بات کریں۔“

اس نے فون کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بڑے ادب سے پیش کیا۔ عابی نے اسے لے کر کان سے لگا کر کہا۔

”مسٹر ہوشن! یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ لوگ میرے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہیں؟ کیا میں قیدی ہوں؟ کیوں میری نگرانی کی جا رہی ہے؟“

وہ بولا۔ ”آئراہیل پرنس! آپ ناراض نہ ہوں۔ ہم سب ایک ساتھ پیرس پہنچنے والے تھے۔ ہم تو پہنچ گئے۔ آپ پیچھے رہ گئے۔ ہم تشویش میں مبتلا ہیں کہ آپ خلاف قانون وہاں رک گئے ہیں۔ قانونی گرفت میں نہ آ گئے ہوں یا آپ کے نئے دشمن پیدا نہ ہو گئے ہوں۔ طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے پیدا ہو رہے ہیں۔ آپ ہماری محبت کو اور ذمے داریوں کو سمجھیں۔ پلیز.....“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں ایک پولیس افسر کا مرڈر ہوا ہے۔ میں اس قتل کا چشم



صرف قبرستان کا منشی ہی اس کی حقیقت جانتا تھا۔ باقی سب ہی اسے لڑکا سمجھتے تھے۔

عالی نے ایک درخت کی آڑ سے دیکھا۔ لڑکا بن کر رہنے کے باوجود اس کے چہرے پر گلاب کھل رہا تھا۔ وہ بہت ہی حاذب نظر تھی۔ اسے لڑکیوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے پہلی بار ایک لڑکی کو اس خیال سے دیکھا کہ وہ شادی کی عمر کو پہنچ کر اس کی دلہن بنے گی۔

اس کے دل میں شاعرانہ جذبات نہیں تھے اور نہ ہی اس کی فطرت میں عشق اور دیوانگی تھی۔ پھر بھی پہلی بار اسے وہ لڑکی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ اس سے دوستی کر سکتا تھا۔

ایک گورکن نے ماریہ سے کہا۔ ”یارو کی! تم صبح سے خوب بول رہے تھے اور اب نہیں رہے تھے پھر اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہاری صورت دیکھ کر یوں لگ رہا ہے جیسے ابھی رو پڑو گے۔“

پھر ہزار ضبط کے باوجود ماریہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ فوراً ہی رد مال سے آنکھیں پونختے ہوئے بولی۔ ”پتا نہیں کیوں آج پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہتا ہے۔“ وہ پھر بے اختیار روتے ہوئے بولی۔ ”دیکھو پھر آنسو نکل رہے ہیں۔ پلیز جیسے تنہا چھوڑ دو۔ تھوڑی دیر رونے کے بعد میرا موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں ابھی تم لوگوں کے پاس آ کر خوب باتیں کروں گا۔“

وہ دونوں اپنے رہائشی حصے کی طرف جانے لگے۔ وہ رو رہی تھی اور رد مال سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ باپ کے قتل ہونے کے بعد دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔ یہ صدمہ بھی رلا رہا تھا کہ ایک لڑکی ہے پہاڑ جیسے دشمن سے انتقام نہیں لے سکے گی۔

عالی کے احساسات پہلی بار کچھ عجیب سے ہو گئے تھے۔ وہ روتی ہوئی لڑکی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ دل کہہ رہا تھا، اس کے شانے پر ہاتھ رکھے۔ اسے تنہا کر تیلی دے جبکہ وہ کسی کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔

وہ درخت کے پیچھے سے نکل آیا۔ ماریہ نے آہٹ سن کر سر اٹھایا پھر ایک اجنبی کو دیکھ کر گھبرائی۔ یہ دھڑکا سا لگا کہ دشمن کا کوئی جاسوس اسے تلاش کرتا ہوا آ گیا ہے۔

پھر چند لمحوں کے بعد عقل نے سمجھایا۔ یہ تو پرنس عالی ہے جسے نی وی اسکرین پر دیکھ چکی ہے اور جس کا چہ چانسٹی آرہی ہے۔ دور کھڑے ہوئے گورکنوں نے بھی اسے حیرانی سے دیکھا پھر تیزی سے چلتے ہوئے اس کے قریب آئے۔ ایک نے کہا۔ ”آپ..... جناب..... آپ پرنس عالی ہیں؟“

ماریہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔

دید گواہ ہوں اس لیے مجھے روک لیا گیا ہے۔ پولیس والوں کا رویہ دوستانہ ہے۔ میں دو چار دنوں میں آپ کے پاس آ جاؤں گا۔“

”آز سہل پرنس! ہمارے بے شمار انجانے دشمن ہیں۔ وہ چھپ کر حملہ کریں گے تو آپ مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔“ عالی نے کہا۔ ”دشمن موت کی طرح ہوتے ہیں۔ کہیں سے بھی کسی بھی وقت چھپ کر دھاوا بول دیتے ہیں۔ کیا آپ میری موت سے مجھے اور اپنی موت سے خود کو بچا سکتے ہیں؟“

”نہیں مگر آپ ہمارے درمیان رہیں گے تو ہمیں.....“ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے درمیان رہ کر بھی موت آئے گی۔ پلیز میری فکر نہ کریں۔ میں اپنی مام کے اپارٹمنٹ میں رہنے کے لیے پیس ضرور آؤں گا۔ آپ انتظار کریں اور ابھی ان لوگوں کو سمجھا دیں کہ میرے پیچھے نہ آئیں۔ آئندہ ان میں سے کوئی بھی نظر آئے گا اور مجھے غصہ آئے گا تو ان میں سے کوئی اپنی جان سے جائے گا۔“

اس نے فون واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”لو، بات کرو۔“ وہ فون لے کر بولا۔ ”یس مسٹر ہوشن!“ کریگ ہوشن نے کہا۔ ”وہ سر پھرا ہے۔ آئندہ اس کی نظروں میں نہ آتا۔ مارے جاؤ گے۔“ ”پھر تو ہم نگرانی نہیں کریں گے۔“ ”کریں گے پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ اس کی نگرانی کا کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا جائے گا۔“

وہ فون بند کر کے عالی سے بولا۔ ”ہم جا رہے ہیں پھر کبھی آپ کے پیچھے نہیں آئیں گے۔ آپ جائیں۔ ہم یہاں آدھے گھنٹے تک رکے رہیں گے۔“

وہ چاروں اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے۔ عالی نے اسٹیرنگ سیٹ سنبھالی پھر کار اشارت کر کے وہاں سے جانے لگا۔ ان چاروں کو اپنی زندگی عزیز تھی۔ وہ وہیں بیٹھے رہے۔ عالی نے قبرستان پہنچنے تک پھر کسی گاڑی کو اپنے تعاقب میں نہیں دیکھا۔

وہ کار سے اتر کر قبرستان کے احاطے کے اندر آیا پھر ٹھہرنے کے انداز میں ان رہائشی کوارٹروں کے سامنے پہنچا جہاں انتظامیہ کے کارکن رہتے تھے۔ ماریہ ایک کوارٹر کے برآمدے میں سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے آس پاس دو گورکن کھڑے ہوئے تھے۔ وہ گیارہ برس کی لڑکی تھی۔ لڑکیوں کے لباس میں رہتی تھی۔ اس کے بیان کے مطابق



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



”تم پرس ہو۔ اس شہر نموشاں میں آئے ہو۔ کیوں آئے ہو؟ اور میرے پاس آ کر رک گئے ہو۔“

اس گیارہ برس کی لڑکی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ”اوہ گاڈ! میرا دل دھڑک رہا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آج کی دنیا کا سب سے شہ زور آدمی میرے اتنے قریب آ جائے گا۔ اس کے انداز سے پتا چل رہا ہے کہ یہ مجھ سے کچھ کہنے والا ہے۔“

عالی نے گورکھ کو دیکھا پھر اس سے کہا۔ ”میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

ماریہ حیران رہ گئی۔ ”اوہ گاڈ! میں ابھی یہی چاہتی تھی۔ یہ جواب دے رہا ہے۔ کیا میرے دل کی باتیں سن رہا ہے۔“

وہ بولا۔ ”میں تمہارے دل کا حال جانتا ہوں۔ تم پر جو گزر رہی ہے اسے سمجھ رہا ہوں۔“

پھر اس نے گورکھ سے کہا۔ ”پلیز، ہمیں تنہا چھوڑ دیں۔“ وہ دونوں وہاں سے جانے لگے۔ ماریہ نے پوچھا۔ ”آپ دلوں کا حال کیسے جانتے ہیں؟ کیا نیلی پتھی جانتے ہیں؟“

عالی نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ ”آپ نے ابھی ابھی کہا ہے کہ میرے دل کا حال جانتے ہیں۔ مجھ پر جو گزر رہی ہے اسے سمجھ رہے ہیں۔“

”میں تمہارے حالات سے واقف ہوں۔ میں تمہارے پاپا کے آخری وقت میں ان کے ساتھ تھا۔ افسوس انہیں دشمنوں سے نہ بچا سکا۔ حقیقت یہی ہے کوئی کسی کو موت سے بچا نہیں سکتا۔“

اس نے پوچھا۔ ”پاپا کو پوسٹ مارٹم کے لیے کس ہسپتال میں لے گئے ہیں۔“

عالی نے کہا۔ ”پولیس افسر گیری کو پھر کال کرو۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔“

”وہ افسران مجھے نہیں بتائیں گے۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں خفیہ پناہ گاہ سے باہر دشمنوں کی نظروں میں آؤں۔“

”تم کال کرو اور مجھ سے بات کراؤ۔ میں ان سے معلوم کروں گا پھر تم اپنے پاپا کا آخری دیدار کر سکو گی۔“

”تھینک یو پرس! میں ابھی کال کرتی ہوں۔“

وہ کوارٹر کے اندر جا کر اپنا فون لے آئی۔ مطلوبہ نمبر بیچ کرنے کے بعد اسے کان سے لگایا پھر رابطہ ہونے پر بولی۔ ”انگل! میں ماریہ بول رہی ہوں۔“

”ہاں بیٹی! تمہارے پاپا کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے گئے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد ان کی آخری رسومات ادا کی

جائیں گی۔ میں تمہیں پہلے بھی سمجھا چکا ہوں، تمہیں نہ ہسپتال آنا چاہیے۔ نہ میت کے ساتھ قبرستان جانا چاہیے۔ ابھی تھوڑی دیر میں پرس عالی تم سے ملنے آرہے ہیں۔ وہ بھی تمہیں یہی سمجھائیں گے۔“

”پرس میرے سامنے موجود ہیں۔ ان سے بات کریں۔“ عالی نے فون لے کر کہا۔ ”بس آفیسر! میرا خیال ہے ایک بیٹی کو باپ کے آخری دیدار سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔ اگرچہ یہ بات محض جذباتی ہے۔ عقل سمجھاتی ہے کہ سلامتی کی خاطر دشمنوں سے چھپ کر رہا جائے۔“

”پلیز، آپ ماریہ کو سمجھائیں۔“

”میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ ہم بیٹی کو باپ سے دور نہیں رکھ سکیں گے۔ یہ راز کی بات بتا دوں کہ ماریہ قبرستان میں روپوش رہتی ہے۔ اب اسے یہاں نہیں رہنا چاہیے۔“

”دشمن اس کی تاک میں ہوں گے۔ اسے پہچان لیں گے۔“

”میں اسے عبا اور نقاب میں لاؤں گا۔ دشمن پھر بھی دیکھ لیں گے تو ان سے نمٹ لوں گا۔“

”اوکے۔ آپ ماریہ کی ذمہ داری لے رہے ہیں تو ہمیں اعتراض نہیں ہے۔“

”ابھی فوراً ایک عبا اور نقاب کی ضرورت ہوگی۔“

ماریہ نے فون کے قریب چیک کر کہا۔ ”میرے پاس ہے۔ میں عبا میں چھپ کر یہاں آئی تھی۔ بس ہم آرہے ہیں۔“

اس نے عالی سے فون لے کر بند کیا پھر کہا۔ ”مائی گاڈ! آپ کتنے اچھے ہیں۔ میری مشکل آسان کرنے آئے ہیں۔ میں کس منہ سے شکر یہ ادا کروں؟ بس ابھی آتی ہوں۔“

وہ اندر گئی پھر جلد ہی عبا اور نقاب میں چھپ کر آگئی۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ”ابھی آپ نے کہا تھا کہ میرے پاپا کے آخری وقت ان کے ساتھ تھے۔ آپ ہمارے ملک میں کب سے ہیں؟ پاپا آپ کو کب سے جانتے ہیں؟“

”صرف پانچ گھنٹے پہلے ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ایسے زندہ دل تھے اتنے اچھے انسان تھے کہ انہوں نے چند منٹوں میں مجھے اپنا دوست بنا لیا تھا۔“

وہ قبرستان سے باہر آ کر کار میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”میرے پاپا بہت گریٹ تھے۔ دشمنوں کو بھی دوست بنا لیتے تھے۔ لعنت ہے کارمن ڈی موراپر کہ اس نے ایک فرشتے کو ہلاک کیا ہے۔“

وہ کار اشارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اس کے بھی دن پورے ہو چکے ہیں۔ میں اسے جہنم میں



بارے میں کوئی خاص بات نہیں جانتے ہیں۔

پہنچانے کے لیے اٹلی جا رہا ہوں۔“

وہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ بڑے جذبے سے اس کی طرف گھوم کر بولی۔ ”کیا واقعی؟ آپ میرے پاپا کا انتقام لینے اس خبیث کے ملک میں جائیں گے؟“

وہ صد مات کے باوجود خوش ہو رہی تھی۔ ”اوہ مائی گاڈ! تو نے ایک فرشتے کو میرے ملک کی زمین پر اتارا ہے۔“

میں تیرا جتنا بھی شکر ادا کرتی رہوں کم ہے۔ میں آپ کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی ہوں۔ بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے بتائیں آپ کیا کرنے والے ہیں؟ اس دشمن سے کب نمٹنے والے ہیں؟“

”پہلی بات تو یہ کہ یور آنر اور آپ جیسے الفاظ ادا نہ کرو۔ میں بزرگ نہیں ہوں۔ تمہارا ہم عمر ہوں۔ یقین کرو کہ میں بھی گیارہ برس کا ہوں۔“

”ہاں۔ میں نے سنا ہے۔ دیکھ کر یقین نہیں ہوتا۔ آپ پچیس تیس برس کے گبرو جوان دکھائی دے رہے ہیں۔“

”پھر آپ.....!“

وہ جلدی سے بولی۔ ”تم..... میں تم کہوں گی۔ تم مجھے بھرپور اپنایت دے رہے ہو۔ پاپا کی موت نے مجھے بد نصیب بنایا ہے۔ تم آتے ہی خوش نصیب بنا رہے ہو۔“

وہ کہہ نہ سکا کہ وہ اس کے نصیب میں لکھی جا رہی ہے۔ ایسی بات بڑے جذبے سے کی جاتی ہے لیکن اسے کہتے ہوئے جھجک سی ہو رہی تھی۔ پہلی بار ایک لڑکی کے لیے چور جذبات اچھے لگ رہے تھے۔ وہ اچانک ہی اس کی بہت کچھ لگ رہی تھی۔

وہ ہاسپٹل میں آئے۔ راجرا ایک فرض شناس افسر تھا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے تمام افسران وہاں موجود تھے۔ وہ سب اس لیے بھی آئے تھے کہ پرنس عالی سے روبرو ملاقات کر کے آئندہ کالانچ عمل تیار کریں گے۔

تمام افسران..... محبت اور ہمدردی سے ماریہ کے ساتھ پیش آئے۔ اس نے روتے ہوئے باپ کا آخری دیدار کیا۔ پھر عالی ان افسران کے ساتھ ایک سیل میں آ گیا۔ کارمن ڈی موراک کے تین کارندے زندہ تھے۔ بری طرح زخمی تھے۔ اب الگ الگ سیل میں لائیں اور جوتے کھا رہے تھے۔ ان سے ڈی موراک کے بارے میں اہم سوالات پوچھے جا رہے تھے۔

کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ تینوں کرائے کے قابل تھے۔ ڈی موراک کے متعلق قسمیں کھا کر کہہ رہے تھے کہ اس کی ذاتی زندگی اور درپردہ مصروفیات کے

ان میں سے ایک شوٹر کا نام ڈینی تھا۔ اس نے عالی سے کہا۔ ”میں آپ کا قین ہوں۔ میرا گاڈ جانتا ہے۔ میں نے آپ کی طرف گولیاں چلائی ہیں لیکن آپ پر نہیں چلائی۔ اب بھی آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ کارمن ڈی موراک پر سن لائف کو میں دور تک جانتا ہوں۔“

عالی نے کہا۔ ”اس کے خلاف میرے کام آؤ گے تو تمہاری سزائیں معاف کرادوں گا۔ تم زندہ رہو گے۔ بولو اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ تمہاری معلومات کے ذرائع کیا ہیں؟“

”میں ڈی موراک کا سالہا ہوں۔ میری بہن ٹائرن موراک اس کی بیوی ہے۔ اس لورل ڈی موراک کی ماں ہے جو آپ کی قید میں اذیتیں برداشت کر رہا ہے۔“

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ”ٹائرن اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے پاگل ہو رہی ہے..... سنا ہے یہاں بیٹے کی حالت نازک ہے۔ وہ اذیتیں برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ اگر وہ مرے گا تو ماں کا بھی دم نکل جائے گا۔“

وہ مایوسی سے بولا۔ ”میں بہن کو جھوٹی تسلیاں دے کر آیا ہوں کہ اسے کسی طرح رہائی دلا کر لے آؤں گا۔ لیکن رہائی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ میں ہر طرح آپ کے کام آتا رہوں گا۔ کیا آپ میرے بھانجے لورل ڈی موراک کی سزائے موت کو بدل سکیں گے؟“

عالی نے کہا۔ ”میں کسی ملک کے قوانین اور عدالتی فیصلے نہیں بدل سکتا۔ کسی اور طرح تمہارے کام آؤں گا۔ تمہاری بہن کو سمجھاؤں گا کہ بیٹے کے لیے صبر کرے۔ جو مجرمانہ زندگی گزارتے ہیں وہ ایک دن حرام موت مارے جاتے ہیں۔ تم اپنی جان کی امان چاہو۔ میں تمہاری سزا معاف کرادوں گا۔ تم مجھے وہاں لے جاؤ گے، جہاں ڈی موراک ہوگا۔“

ایک افسر نے پوچھا۔ ”کیا ڈی موراک اٹلی میں ہے؟“

”نہیں، پیرس میں ہے۔ وہاں شاید دو چار روز رہے گا۔“

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”مسٹر عالی! یہ ہمارے اور آپ کے لیے آسانی ہوگئی۔ آپ اپنے ہی پاسپورٹ پر کل صبح کی فلائٹ سے پیرس جا سکیں گے۔“

ڈینی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”فار گاڈ سیک۔ مجھے ساتھ لے چلیں۔ میں بہت کام آؤں گا۔“

اعلیٰ افسر نے حکم دیا کہ ڈینی کا علاج توجہ سے کیا جائے تاکہ وہ عالی کے ساتھ جانے کے قابل ہو جائے۔



ماریہ نے ڈینی کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس کی صورت دیکھ کر غصہ آ رہا ہے۔ اس کے بہنوئی نے پہلے میری مٹی کو پھر پاپا کو ہلاک کیا ہے۔ جی چاہتا ہے اس کے پورے خاندان کو لہو میں ڈبو دوں۔“

عابی نے کہا۔ ”دشمنوں سے نفرت کرو۔ غصہ نہ کرو۔ غصہ ہماری ذہانت اور حکمتِ عملی کو کمزور بنا دیتا ہے۔ یہ حقیقت ہمیشہ یاد رکھو کہ وہ دنیا کا سب سے طاقتور آدمی کہلاتا ہے جو غصے کے وقت نارمل رہتا ہے۔“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”تم نے بہت اچھی بات سمجھائی ہے۔ میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“

وہ دونوں سپاہیوں کے ساتھ ایک سیل میں آئے۔ وہاں لورل ڈی مورانیم مردہ حالت میں پڑا تھا۔ اسے آئے دن تھرڈ ڈگری کے تشدد سے گزارا جاتا تھا۔ فون کے ذریعے اس کی ماں ٹائرن مورانیم اور اس کے باپ کارمن ڈی مورانیم کو اس کی روٹی گڑ گڑاتی اور زندگی کی بھیک مانگتی صداکیں سنائی جاتی تھیں۔

ماریہ اور عابی نے دیکھا۔ وہ اذیتیں برداشت کرتے کرتے ہڈیوں کا ڈھانچا بن رہا تھا۔ اس کی حالت قابلِ رحم ہو گئی تھی۔ اسے دیکھ کر دل یہی کہتا تھا کہ اسے مرجانا چاہیے اور تکالیف برداشت نہیں کر سکے گا۔

ایک افسر نے اس سے کہا۔ ”یو پاسٹریڈ لورل ڈی مورانیم! دیکھو۔ یہ اس فرض شناس پولیس افسر کی بیٹی ہے جس کی ماں کو اور باپ کو تمہارے خبیث باپ نے ہلاک کر دیا ہے۔ تمہو ہے تم پر۔“

لورل نے مردہ نظروں سے ماریہ کو دیکھا پھر کمزوری لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم مجھے پر تھوک دو۔ دنیا سے جانے والے کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ مجرم ہے یا نہیں ہے۔ مجھے تو اب جانا ہی جانا ہے۔ سچ کیا ہے؟ گاڈ جانتا ہے۔ میں نے ڈان کارمن ڈی مورانیم کا بیٹا ہو کر بھی کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ میں اٹلی سے یہاں اپنی ایلسی سے ملنے آیا تھا۔ اسے کسی نے ہلاک کر دیا۔ میں آخری سانس تک یہی کہوں گا کہ میں نے ایلسی کی عزت نہیں لوٹی، اسے ہلاک نہیں کیا ہے۔ میں نہیں جانتا میرے خلاف کس نے سازش کی ہے اور کیوں کی ہے؟ میں دن میں کئی بار بس اتنا ہی بولتا ہوں۔ آگے میری بے گناہی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ چپ ہو جاتا ہوں۔“

”خدا ہے تو خود انصاف کرے گا۔ کوئی معجزہ دکھائے گا۔ کوئی میجا آئے گا اور میری موت سے پہلے مجھے الزامات

سے پاک کرے گا۔ کاش ایسا ہو جائے۔۔۔۔۔“

عابی اسے گہری سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں دل کو چھو رہی تھیں۔ اس نے بولتے بولتے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس پر نشا ہت طاری ہو گئی تھی۔

عابی نے اعلیٰ افسر سے پوچھا۔ ”کیا یہ ثابت ہوا تھا کہ اس نے ایلسی سے زیادتی کرنے کے بعد اسے ہلاک کیا تھا؟“

افسر نے کہا۔ ”ایک لڑکی اس کے اپارٹمنٹ میں مردہ پائی گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ مرڈر سے پہلے اس کی عزت سے کھلا گیا تھا۔ لڑکی کی شناخت نہ ہو سکی کہ وہ ایلسی تھی یا کوئی اور تھی۔“

”کیا لورل کو جانے واردات سے گرفتار کیا گیا تھا؟“

”نہیں۔ وہ ایک نائٹ کلب میں تھا۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ وہ مرڈر کے وقت نائٹ کلب میں اپنی موجودگی ثابت کرنے گیا تھا۔“

عابی نے کہا۔ ”یہ شخص قیاس آرائی ہے۔“

افسر نے کہا۔ ”ایسے ہی وقت اس کے باپ کارمن ڈی مورانیم نے پولیس افسر راجر کی وائف کو قتل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ بیٹا بھی قاتل ہے۔ اسے رہائی دلانے کے لیے وہ قانون سے کھیل رہا ہے۔ وہ بار بار مطالبہ کر رہا تھا کہ اس کے بیٹے کو رہا کیا جائے ورنہ وہ پولیس افسران کی لاشیں گراتا رہے گا پھر اس کے شوٹرز نے راجر کو بھی ہلاک کر دیا۔ پولیس والے اور تو کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ باپ کو گرفتار نہیں کر سکتے تھے اس لیے بیٹے پر ظلم و تشدد کی انتہا کر رہے تھے۔“

عابی نے تمام افسران کی موجودگی میں کہا۔ ”آپ حضرات کا اصل مجرم کارمن ڈی مورانیم ہے۔ اس کا بیٹا ملزم ہے اس پر جرم ثابت نہیں ہوا ہے۔ میں اس کے لیے رعایت اور سہولتیں چاہتا ہوں۔“

ایک اعلیٰ افسر نے پوچھا۔ ”آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”یہ کہ اس پر اور ظلم نہ کیا جائے۔ جرم ثابت ہونے تک میری خاطر اسے وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا جائے۔ ماہر ڈاکٹروں سے اس کا علاج کرایا جائے۔“

”ہم آپ کی خاطر اسے وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیں گے۔ یہ قوی امید ہے کہ آپ کارمن کو عبرت ناک انجام تک پہنچائیں گے۔ کل صبح کی فلائٹ میں ڈی مورانیم کا سالانہ ڈینی بھی آپ کے ساتھ جائے گا۔ ہمارے آدمی دور سے نگرانی کرتے رہیں گے۔“

عابی نے ماریہ کو دیکھ کر کہا۔ ”ماریہ تمہارہ مٹی ہے۔ آپ حضرات ماسٹرنہ کریں۔ اس کی مٹی اور پاپا کی ہلاکت



وہ ماریہ کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ مراد نے اس کی تمام روداد سن کر کہا۔ ”اگرچہ شادی خانہ آبادی کی عمر نہیں ہے۔ تاہم موجودہ حالات میں نکاح پڑھوا لینا چاہیے۔ یوں بھی تمہاری زندگی کا ہر کام اپنی عمر سے آگے جا کر ہو رہا ہے۔ عقل، دانائی، علوم و فنون اور جسمانی قوتیں جو جوانی میں حاصل ہوتی ہیں، وہ تمہیں کسنی میں حاصل ہو گئی ہیں۔ اب کسنی میں ایک دلہن بھی آرہی ہے۔ تمہارے ساتھ عجیب حالات پیش آرہے ہیں آنے دو۔ کل یہاں آرے ہو۔ میری بہو ہم دونوں کی نگرانی میں دینی تعلیم حاصل کرتی رہے گی۔ جاؤ بیٹے! ایک نئی زندگی کی ابتدا کرو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

پھر اس نے ہم زاد سے رابطہ کیا۔ اسے بھی ماریہ کے حالات بتائے۔ اس نے مسرتوں کا اظہار کیا اور کہا۔ ”تم بہت ہی سنگین حالات سے دوچار ہوتے رہتے ہو۔ تمہارے بابا جانی بھی کسی پیچیدہ معاملے میں الجھ جایا کرتے ہیں۔ ایسی کوئی سچویشن پیدا ہو تو یاد رکھو ماریہ کو فوراً ارضِ اسلام روانہ کر دینا۔ میری بہو کو میرے پاس بھی رہنا چاہیے۔“

یہ عالی کی سعادت مندی اور فریاد نبرداری تھی۔ اس نے دونوں بزرگوں کو پہلے اہمیت دی تھی اور ان کی رضا مندی حاصل کر لی تھی۔ پھر ایک گھنٹے بعد ہی وہ دونوں رشید ازواج میں منسلک ہو گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بہت بڑے بہت اہم فیصلے پر عمل کیا تھا۔

ماریہ کا میں آ کر بیٹھی پھر عالی کے شانے پر سر رکھ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ اسے اچانک ایک ہی دن میں اس قدر تحفظ، سلامتی اور مسرتیں حاصل ہو رہی تھیں کہ اندر سے پھٹ پڑی تھی۔ خوشیوں کے آنسو دریا بن گئے تھے۔ وہ شانے سے لگ کر آنسوؤں کے موتی لٹانے والی اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ عالی بے اختیار قریب ہو گیا۔ پہلی بار صنف نازک کی نزاکت کھینچ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ بے اختیار اس کی پشت پر آ گئے۔ اس نے اپنی طرف اسے کھینچ لیا۔

ایک سحر سا طاری ہو رہا تھا۔ کوئی ہوس نہیں تھی۔ معصوم سی قربت میں دوستی تھی۔ لالچ نہیں تھا۔ وہ بے اختیار بولا۔ ”پتا نہیں کیوں..... کیوں اچھی لگ رہی ہو؟ دل کہہ رہا ہے کبھی الگ نہ ہونا۔“

”میرا بھی دل یہی کہہ رہا ہے۔ میں کبھی الگ نہیں ہونا چاہتی۔ مجھے اپنے اندر چھپا کر رکھ لو۔“

وہ اچانک ہی اس سے الگ ہو کر بولا۔ ”ہم سڑک کے کنارے ہیں۔ لوگ آتے جاتے دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں

سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ پولیس کی سکیورٹی میں محفوظ نہیں رہ سکتے گی۔“

”یہ حقیقت ہے۔ ہم مائنڈ نہیں کر رہے ہیں۔ پھر ماریہ کے لیے کیا کیا جائے؟“

عالی نے ماریہ سے پوچھا۔ ”کیا میرے ساتھ چلو گی؟ میرے ساتھ رہو گی؟“

یہ سنتے ہی وہ جیسے اچھل پڑی۔ حیرانی سے اس کی طرف گھوم کر بولی۔ ”میں تمہارے ساتھ چلوں؟ تمہارے ساتھ رہوں؟ اوہ گاڈ! تم تو میری تقدیر بدل رہے ہو۔“

وہ کرسی سے کھسک کر اس کے سامنے فرش پر دو زانو ہو گئی۔ اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”میں ساری عمر تمہارے ساتھ رہوں گی۔ کیا یہ ممکن ہے؟“

وہ اسے تھک کر بولا۔ ”ممکن ہے۔ واپس کرسی پر جاؤ۔ آئندہ یوں گھٹنوں کو ہاتھ نہ لگانا۔“

وہ واپس کرسی پر بیٹھ گئی۔ شام تک راجر کی تدفین ہو گئی۔ عالی نے کہا۔ ”ساتھ رہنے میں کچھ رکاوٹیں ہیں۔ اگرچہ ہم عمر کے حوالے سے بالغ نہیں ہوئے ہیں لیکن ذہنی طور پر باشعور ہیں۔ ہمیں کسی رشتے کے بغیر ایک چھت کے نیچے نہیں رہنا چاہیے۔“

وہ سر ہلا کر بولی۔ ”ہاں۔ ہم دیکھنے میں بالغ نوجوان دکھائی دیتے ہیں۔ لوگ باتیں بنائیں گے۔“

”ایک ہی راستہ ہے۔ میں تمہیں پروپوز کرتا ہوں۔“

یہ ایک نئی زندگی کا پیغام تھا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ اچانک اتنی بڑی بات کہہ دے گا۔ وہ خوشی کے مارے لہرائی۔ آنکھیں مسرتوں سے بھینکنے لگیں۔ اس نے دھڑکتے ہوئے سینے پر دونوں ہاتھوں کی فینچی بنا کر کہا۔ ”میں تو نہال ہو گئی۔ مجھے اور کیا چاہیے۔ مانگنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔ اپنے گاڈ سے صرف آپ کی سلامتی چاہتی ہوں۔“

”ماریہ! میں مسلمان ہوں اور تم عیسائی۔“

”جیسے ہی تم نے پروپوز کیا میں تمہارے سانچے میں ڈھل گئی۔ ان لمحات سے تمہارا خدا میرا خدا، تمہارا دین میرا دین ہے۔ بولو میں کیسے ایمان لاؤں؟“

وہ دونوں پولیس گیٹ ہاؤس میں تھے۔ عالی نے کہا۔ ”غسل کرو۔ لباس تبدیل کرو پھر مسجد میں چلو۔ وہاں

پیش امام صاحب تمہیں مشرف بہ اسلام کریں گے۔“

ماریہ وادش روم میں چلی گئی۔ عالی تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے ماریہ کے فون سے مراد کو مخاطب کیا۔ ”بابا جانی! میں آپ کا بیٹا بول رہا ہوں۔ یہ ماریہ کا فون ہے۔“



جھسی لگی لیکن میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ وہ زندہ ہے۔ کہیں گم ہو گئی ہے۔“

عابی نے اس کے ماموں ڈینی سے پوچھا۔ ”وہ کون تھی؟ تمہاری معلومات کیا ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ نہ میں ایلسی کے بارے میں جانتا ہوں، نہ ہی وہ میرے متعلق کچھ جانتی تھی۔“

عابی نے کہا۔ ”ایلسی فراڈ ہوگی۔ کوئی لورل سے دشمنی کر رہا ہے۔ کسی فراڈ لڑکی کے ذریعے اسے جینوا میں بلا کر مرڈر کیس میں پھنسا دیا ہے۔ سوچو اور سمجھو کون اس سے دشمنی کر رہا ہوگا؟“

ڈینی کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے ننھی سی اسکرین کو پڑھ کر عابی سے کہا۔ ”میرا بہنوئی کارمن ڈی مورہ ہے۔“

اس نے مٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”ویل برادر کارمن..... بولو۔“

کارمن نے کہا۔ ”تم نے کہا تھا کہ دشمنی ہو گئے تھے گرفتار ہو گئے تھے لیکن پرنس عابی کی سفارش پر تمہیں رہا کیا جا رہا ہے۔“

وہ غصے سے بول رہا تھا۔ ”ابھی ٹائزن اس پرنس کو دعائیں دے رہی ہے۔ کہتی ہے پرنس ہمارے بیٹے لورل پر بھی مہربان ہو گیا ہے۔ کیوں ہو گیا ہے؟ اسے وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا جا رہا ہے۔ کیوں اس پر مہربانی کی جا رہی ہے؟ میں سب جانتا ہوں وہ پرنس مجھے گرفتار کر کے یا قتل کر کے میرے بیٹے کو رہائی دلانے گا۔ میں حیران ہوں کہ یہ پرنس ہمارے معاملات میں کیوں دلچسپی لے رہا ہے۔ یہ کیسا ٹیم کھیل رہا ہے کہ بیٹے سے دوستی اور باپ سے دشمنی کر رہا ہے؟“

ڈینی نے کہا۔ ”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہ آڑا۔ بیل پرنس ہی جانتے ہیں کہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“

”کیا اس سے رابطہ کر سکتے ہو؟“

ڈینی نے عابی کو دیکھا پھر اس سے پوچھا۔ ”جناب! آپ بات کرنا پسند کریں گے؟“

عابی نے سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ”کارمن! پرنس سے رابطہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ تم لگی ہو۔ یہ ابھی موجود ہیں۔ لو بات کرو۔“

عابی نے اس سے فون لے کر کان سے لگایا پھر کہا۔ ”میں پرنس عابد علی منگی بول رہا ہوں۔“

وہ بولا۔ ”ہائے پرنس! تم نے تو پوری دنیا میں دھوم

چار دیواری میں رہنا چاہیے۔“

اس نے کارا اشارت کر کے آگے بڑھا دی۔ خوشیاں تو بہت مل رہی تھیں لیکن ماتی حالات بھی تھے۔ اس کے پاپا کی ہلاکت اور تدفین ہوئی تھی۔ عابی نے رہائش گاہ میں پہنچ کر کہا۔ ”ہم حالات کے مطابق ایک دوسرے سے دور رہ کر یہ رات گزاریں گے۔ کل صبح پھر ایک ہو کر اتر پورٹ جائیں گے پھر کبھی اپنے درمیان فاصلہ نہیں رکھیں گے۔“

اس رہائش گاہ میں ماریہ کے لیے سخت سیکورٹی کے انتظامات کیے گئے تھے۔ وہ مطمئن ہو کر لورل ڈی مورہ سے ملنے آیا۔ اسے جیل کی چار دیواری سے نکال کر ایک بنگلے میں لایا گیا تھا۔ عابی کی فرمائش کے مطابق اسے وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا جا رہا تھا۔ وہاں اسے نظر بند رکھ کر اس کا علاج کیا جا رہا تھا۔

اس کے ماموں ڈینی کو اس سے ملنے کی اجازت دی گئی تھی۔ لورل عابی کو دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”آپ پر خدا کی رحمت ہو۔ میں ہر روز اپنے گاڑ سے بولتا تھا کہ میرے اندر ایمان ہے۔ میں نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ اے ساری دنیا کے خدا!..... مجھ سے انصاف کر۔ باقی گاڑا ماننا پڑتا ہے کہ خدا ہے۔ وہ دیر سے تہی سہمی پر انصاف کرتا ہے۔ اس معبود نے آپ کو منصف بنا کر بھیجا ہے۔“

عابی نے پوچھا۔ ”تم یہاں جینوا آئے تھے۔ اپنی محبوبہ ایلسی سے ملنے۔ کیا اس سے پہلے بھی مل چکے تھے؟ کیا وہ اس اپارٹمنٹ میں ملنے آئی تھی جہاں اسے ہلاک کیا گیا تھا؟“

”ہماری انٹرنیٹ کے ذریعے دوستی ہوئی تھی۔ ہم نے اسکا پ کے ذریعے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ رو برو بھی مل نہ سکے۔ اس نے فون پر کہا تھا، کیونٹی سینٹر میں ملے گی لیکن وہاں کسی مجبوری سے نہ آسکی۔ پھر کہا، رات کو نائٹ کلب میں ضرور ملے گی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ شامت آنے والی ہے۔ نائٹ کلب میں پولیس نے آکر مرڈر کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ الزام یہ تھا کہ میں نے ایلسی یا کسی بھی لڑکی کو اپنے اپارٹمنٹ میں بلا کر اس کی آبرو سے کھیل کر اسے ہلاک کیا ہے۔“

”کیا تم نے ایلسی کی لاش دیکھی تھی؟“

”جی ہاں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایلسی تھی۔ میں نے ایک ہی بار اسکا پ کے ذریعے اسے دیکھا تھا۔ ہلاکت کے بعد اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ زرد پڑ گیا تھا۔ دیدے پھیل کر کچھ ڈراؤنے سے ہو گئے تھے۔ وہ ایلسی

تھی۔ میں نے ایک ہی بار اسکا پ کے ذریعے اسے دیکھا تھا۔ ہلاکت کے بعد اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ زرد پڑ گیا تھا۔ دیدے پھیل کر کچھ ڈراؤنے سے ہو گئے تھے۔ وہ ایلسی

تھی۔ میں نے ایک ہی بار اسکا پ کے ذریعے اسے دیکھا تھا۔ ہلاکت کے بعد اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ زرد پڑ گیا تھا۔ دیدے پھیل کر کچھ ڈراؤنے سے ہو گئے تھے۔ وہ ایلسی

تھی۔ میں نے ایک ہی بار اسکا پ کے ذریعے اسے دیکھا تھا۔ ہلاکت کے بعد اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ زرد پڑ گیا تھا۔ دیدے پھیل کر کچھ ڈراؤنے سے ہو گئے تھے۔ وہ ایلسی

تھی۔ میں نے ایک ہی بار اسکا پ کے ذریعے اسے دیکھا تھا۔ ہلاکت کے بعد اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ زرد پڑ گیا تھا۔ دیدے پھیل کر کچھ ڈراؤنے سے ہو گئے تھے۔ وہ ایلسی

تھی۔ میں نے ایک ہی بار اسکا پ کے ذریعے اسے دیکھا تھا۔ ہلاکت کے بعد اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ زرد پڑ گیا تھا۔ دیدے پھیل کر کچھ ڈراؤنے سے ہو گئے تھے۔ وہ ایلسی

تھی۔ میں نے ایک ہی بار اسکا پ کے ذریعے اسے دیکھا تھا۔ ہلاکت کے بعد اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ زرد پڑ گیا تھا۔ دیدے پھیل کر کچھ ڈراؤنے سے ہو گئے تھے۔ وہ ایلسی







رہی۔ لورل کو اس کا جائز وارث کہتی رہی۔ اس نے کہا۔  
 ”تم سے پہلے چھ عورتیں میری زندگی میں آئیں۔  
 انہوں نے اولاد نہیں دی۔ میں نے انہیں چھوڑ دیا۔ تم بہت  
 مکار ہو۔ اس سے پہلے کہ تمہیں چھوڑتا، تم چور دروازے  
 سے اسے لارہی ہو۔“

”اس کی میڈیکل رپورٹ یہ تھی کہ وہ کبھی باپ نہیں  
 بن سکے گا۔ اس نے کہا..... جرائم کی دنیا میں دوست اور  
 دشمن سب ہی مجھے باپ بننے کی مبارکباد دے رہے ہیں۔  
 میں نے کڑوا گھونٹ پی کر یہ بات پھیلائی ہے تاکہ باپ  
 بننے والا مرد کہلا سکوں۔“

”کیا کیا جائے؟ سین تان کر چلنے کے لیے جھوٹی  
 مردانگی لازمی ہو جاتی ہے اس لیے میں تمہارے بچے کا باپ  
 بن کر رہوں گا۔ یہ میرا وارث بن کر زندہ رہے گا۔ میں دھوکا  
 دینے والوں کو زندہ نہیں چھوڑتا۔ تم زندہ رہو گی لیکن کبھی کسی  
 وقت ایسی سزا دوں گا کہ تم تڑپ کر خود ہی اپنی جان سے گزر  
 جاؤ گی۔“

”اس نے اپنے بھائی والٹر ڈی موراکو یعنی میرے  
 بیٹے کے اصل باپ کو گولی مار دی۔ اس نے عجیب سا رویہ  
 اختیار کیا ہے۔ مجھے ایک شوہر کی محبت اور لورل کو ایک باپ  
 کی توجہ دیتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میرے فراڈ کو بھلا چکا  
 ہے۔ اس کی اور تو کوئی اولاد کبھی نہیں ہوگی۔ لہذا لورل کو ہی  
 اپنا جاں نشین کہتا ہے۔ شاید دنیا والوں کو دکھانے کے لیے  
 کہتا ہے کہ اس کے بعد لورل ہی گاڈ فادر کی ذمہ داریاں  
 سنبھالے گا۔“

مراد فون پر سن رہا تھا۔ وہ ہنسنے لگا۔ وہ انداز میں کہہ  
 رہی تھی۔ ”کہاں کہاں نہیں؟ کہاں کا گاڈ فادر؟ وہ کوئی اور  
 ہی کھیل کھیل رہا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ اس نے میرے  
 بیٹے کو ایسی نامی لڑکی کے مرڈر کیس میں جان کر الجھایا  
 ہے۔ وہ چاہتا تو کہیں بھی کسی وقت بھی لورل کو گولی مار دیتا  
 لیکن اس نے جینوا کے نارچر سیل میں اسے پہنچا دیا ہے۔  
 تاکہ اسے آسانی سے موت نہ ملے اور ایک ماں دن رات  
 اس کے لیے تڑپتی رہے۔ میرے بھائی! تمہارا بیٹا میرے  
 بیٹے کے لیے رحمت کا فرشتہ بن گیا ہے۔ اس نے نارچر سیل  
 سے اسے نجات دلائی ہے۔ فارگاڈ سیک، میرے بچے کو کسی  
 طرح میری آغوش میں لے آؤ۔ یہ ماں ساری زندگی تمہاری  
 احسان مند رہے گی۔“

مراد نے پوچھا۔ ”ابھی کہاں ہو؟ کیا تم اپنی رہائش  
 گاہ میں اس کے ساتھ ہو؟“

”میں وہ ایک گھنٹا پہلے کہیں گیا ہے۔ میں دوسرے  
 فون سے معلوم کرتی ہوں کہ وہ کہاں ہے اور کب تک واپس  
 آئے گا۔“

ٹائرن نے دوسرے فون پر اس کے نمبر شیخ کیے۔  
 شیخ سنائی دیا کہ فی الحال رابطہ نہیں ہوگا۔ اس نے کہا۔  
 ”بھائی! تھوڑی دیر بعد پھر اسے کال کروں گی۔“  
 مراد نے کہا۔ ”آل رائٹ۔ معلوم کرو کہ وہ کہاں  
 ہے؟ میں تمہاری کال کا انتظار کروں گا۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ اسے اپنے بیٹے کی فکر میں نیند نہیں  
 آسکتی تھی۔ اس نے دوسری بار کارمن کو کال کی تو معلوم ہوا کہ  
 اس نمبر پر رابطہ نہیں ہو سکے گا۔ اس نے سم بدل دی تھی۔ ٹائرن  
 نے پریشان ہو کر اس کے قابل اعتماد دست راست سے  
 پوچھا۔ ”کارمن کہاں ہے؟ مجھ سے بات کراؤ۔“

اس نے کہا۔ ”سوری میڈم! ان کے کسی نمبر پر رابطہ  
 نہیں ہو رہا ہے۔ میں کئی بار کوششیں کر چکا ہوں۔“  
 رات کے ایک بجے کارمن نے اسے کال کی اور کہا۔

”میرا انتظار نہ کرو۔ تمہارے آس پاس موت کے...  
 ہر کارے مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ ڈھونڈتے ہی رہیں  
 گے۔ میں ان سے نمٹ لوں پھر میری صورت دکھائی دے  
 گی۔ وہ گیارہ برس کا بچہ تم ماں بیٹے کے ذریعے میرے  
 سائے تک بھی نہیں پہنچ سکے گا۔“

”کارمن! بچے کا باپ آ گیا ہے۔ مراد علی منگی کا نام  
 سن کر بڑے بڑے سو مارا دست بدل دیتے ہیں۔ تمہاری  
 کوئی بھی پناہ گاہ تمہیں چھپا نہیں سکے گی۔“

”تم میری نہیں، اپنے بیٹے کی فکر کرو۔ میں نے لورل  
 کو پینا مان کر ایسے ہی دنوں کے لیے اس کی پرورش کی ہے۔  
 اگر وہ بچپن میں مرجاتا تو تم رو دھو کر صبر کر لیتیں۔ لیکن  
 نہیں، یہ موقع ہوتا ہے، جب جوان بیٹے کی موت سے ماں  
 کا کلیجا پھٹ جاتا ہے۔ جو سزا دینا چاہتا تھا، دے رہا ہوں۔  
 جس اذیت ناک انجام تک پہنچانا چاہتا تھا، وہاں تک ماں  
 بیٹے پہنچ رہے ہیں۔ اس لمحے سے میں بیوی اور بیٹے کے  
 رشتے پر تھوک رہا ہوں۔“

اس نے آخ تھو کہہ کر فون بند کر دیا۔ ٹائرن نے اس  
 فون کو نفرت سے دیکھتے ہوئے اسے ایک طرف پھینک دیا  
 اور زیر لب کہا۔ ”میں بھی تم پر تھوکتی ہوں۔“

اس ماں کو مراد اور عابی کا مضبوط سہارا مل گیا تھا۔ اس  
 نے سوچا، رات کا ایک بج گیا ہے۔ بھائی مراد گہری نیند میں  
 ہوں گے۔ ان سے صبح باتیں کرنا مناسب ہوگا۔ ابھی مجھے معلوم



کا کوئی باپ نہیں ہے۔ صرف یہودی ماں ہے۔

بہر حال مراد نے ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعے ثابت کر دیا تھا کہ وہ عالی کا باپ ہے۔ یہودیوں کے پیشوائے اعظم اور ربیوں نے اس بچی کے متعلق کسی طرح کی پیش گوئی نہیں کی تھی جبکہ وہ پیدا ہونے سے پہلے عجیب و غریب ثابت ہو رہی تھی۔

عالی اور ماروی ایک ہی باپ کی اولاد تھے لیکن یہودیوں کی دلچسپی صرف عالی سے تھی۔ وہ اسے ماں کے حوالے سے پیدا ہونے کی یہودی کہتے آرہے تھے۔ ماروی کو ایک مسلمان ماں جنم دینے والی تھی۔ وہ مسلمان لڑکی پیدا ہونے سے پہلے ہی یہودیوں کو کھٹک رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آئندہ وہ لڑکی عالی کی طرح ناقابل شکست فائزر اور غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل ہو۔

عالی کی یادداشت غیر معمولی تھی وہ دو سو پچاس کے جی کا وزن دونوں ہاتھوں سے اٹھایا کرتا تھا اور یہی پیدا ہونے والی بچی سے توقع کی جا رہی تھی۔ فی الحال بچی کے لیے نہیں زیب النساء عرف زہبی کی سلامتی کے لیے سب ہی تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔

ہم زاد نے عالی سے کہا۔ ”بیٹے! زچگی کے وقت جو تمہاری ماں جینی کے ساتھ ہوا، وہی زیب النساء کے ساتھ ہوگا تو وہ بے چاری اپنی زندگی ہار جائے گی۔“ عالی نے سر جھکا کر کہا۔ ”جب میں سوچتا ہوں کہ کیسے پیدا ہوا تھا تو میرا سر جھک جاتا ہے۔ میں نے اپنی ماں پر بڑا ظلم کیا ہے۔“

”نہیں بیٹے! تم نے کچھ نہیں کیا ہے۔ سب قدرت کا تماشا ہے۔ جو عجیب و غریب ہوتے ہیں، وہ عجیب طرح سے دنیا میں آتے ہیں۔ تمہاری بہن نہیں جانتی ہے کہ وہ پیدائش کے لمحات میں کس طرح جنم لے گی۔ قدرت کے ہاتھوں میں تم بھی کھلونا تھے، وہ بھی کھلونا ہوگی۔“

مراد اور ہم زاد پوری کوششیں کر رہے تھے کہ زیب النساء ہر قیمت پر سلامت رہے۔ جینی کی طرح ناقابل برداشت نکالیف سے گزر کر جان سے نہ جائے۔ وہ اپنی کسی تدابیر کر رہے تھے۔

انہوں نے انتہائی تجربہ کار ڈاکٹروں کی ٹیم بنائی تھی۔ اس ٹیم میں ایک ننانوے برس کا بزرگ تجربہ کار ڈاکٹر بھی تھا۔ وہ بغیر تمام کڑے چہرہ دیکھ کر آنکھوں میں جھانک کر معلوم کر لیتا تھا کہ مریض اپنے اندر کیسے مسائل سے دوچار ہو رہا ہے۔ وہ تمام ڈاکٹر فرض شناس تھے۔ اپنی ڈیوٹی کے مطابق

کرنا چاہیے کہ کارمن کس خفیہ پناہ گاہ میں گزار رہا ہوگا۔ اس نے اپنے بھائی ڈینی سے پوچھا تو اس نے کہا۔ ”اٹلی میں کارمن کی کئی خفیہ پناہ گاہیں ہیں۔ پیرس میں دو ہیں۔ میں فون پر دونوں پناہ گاہوں کے ایڈریس بھیج رہا ہوں۔ ویسے سسٹرا وہ نادان نہیں ہے۔ اب مجھ پر بھروسا نہیں کرے گا۔ جن پناہ گاہوں کا علم مجھے ہے وہاں بھی چھپنے نہیں جائے گا۔ پھر بھی تم اپنے خاص جاں نثاروں کے ذریعے معلوم کرو کہ وہ اس شہر میں ہے یا نہیں؟“

کارمن ایسی کسی جگہ نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ دادا کے ملک اٹلی میں ہی مطمئن سے رہ سکتا تھا۔ اس وقت رینڈ ہیلی کا پٹر کے ذریعے فرانس اور اٹلی کے ایک سرحدی شہر کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں سے سرحد پار کر کے اپنے ملک میں جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی پلاننگ کے مطابق اس کا قابل اعتماد دست رات والٹو کریز اس کے ذاتی ہیلی کاپٹر کے ساتھ سرحدی شہر میں پہنچنے والا تھا۔

☆☆☆

ہم زاد نے اپنے لہو سے کیا خوب گل کھلایا تھا۔ عابد علی منگی جیسا مجوبہ پیدا ہوا تھا۔ اسی کے لہو سے دوسرا گل بھی کھلنے والا تھا۔ اس بار بیٹی پیدا ہونے والی تھی۔ میڈیکل رپورٹ سے معلوم ہوا تھا کہ وہ بھی اپنے بھائی کی طرح عجیب و غریب ہوگی۔ فکر و پریشانی یہ تھی کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے؟ یہی کہ ہم زاد کی وہ بیٹی بھی عالی کی طرح جارحانہ انداز میں پیدا ہوگی۔ اپنی جسامت اور وزن میں عالی کی طرح بھاری بھر کم ہوگی۔ جینی حمل کے دوران نکالیف سے گزرتی رہی تھی۔ زچگی کے لمحات میں ناقابل برداشت عذاب سہتی رہی تھی پھر اسے جنم دیتے وقت ماں کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔

یہ سوال سب ہی کے اندر چیخ رہا تھا، کیا زیب النساء کے ساتھ بھی یہی ظلم ہوگا؟ یوں لگ رہا تھا جیسے اس بیچاری کو، اس بے گناہ کو مزائے موت سنادی گئی ہو۔

ادھر یہودیوں کے پیشوائے اعظم اور ربیوں کے بیان کے مطابق دجال کی آمد کی نشانی یہ ہوگی کہ دنیا میں عجیب و غریب بچے پیدا ہوں گے۔ ان میں سے ایک بچہ دجال کا جھوٹا ہوگا اور وہ کسی باپ کے بغیر دنیا میں آئے گا۔

یہ ایک اتفاق تھا کہ ان دنوں مراد اور ہم زاد نادیدہ ہو جایا کرتے تھے۔ کبھی جینی نے بھی ہم زاد کا ٹھوس جسمانی وجود نہیں دیکھا تھا۔ یہودی کہہ رہے تھے کہ جب ایک ماں بننے والی نے اپنے بچے کے باپ کو نہیں دیکھا ہے تو پھر عالی



نہیں تھی۔ وہ شاپنگ کے لیے محبوب کے ساتھ باہر گھومتی پھرتی رہی تھی۔ اس نے واپس آ کر عصر کی نماز پڑھی تھی۔ پھر سجدے کی حالت میں ہی اپنے رب سے جا ملی تھی۔ ٹھیک اسی وقت زیب النساء کی حالت بگڑی تھی۔ ڈاکٹر اسے اٹینڈ کر رہے تھے۔ انہیں یہ معلوم ہو رہا تھا کہ تین ماہ میں ہی وہ ہنگی پیٹ میں متحرک ہو گئی ہے۔ مشیت ایزدی کو کون سمجھ پاتا ہے؟ یہ دل نے مان لیا تھا کہ زیب النساء کی کوکھ میں ماروی کا نام زندہ ہو گیا ہے۔

زیب النساء نے کبھی ماروی کو رو برو نہیں دیکھا تھا۔ اس کی تصویریں دیکھی تھیں اور اس کا ذکر سنتی رہی تھی۔ پھر ہم زادن نے اس کی بڑی بڑی تصویریں محل کے مختلف حصوں میں لگوائیں تاکہ وہ اسے دیکھتی رہے اور ماروی اس کے ذہن میں نقش ہوتی رہے۔

زہبی دین دار اور عبادت گزار تھی۔ دل سے ماروی کی قدر کرتی تھی۔ اس کی خواب گاہ کی دیواروں پر ماروی کی تصویریں آویزاں تھیں۔ وہ اسے دیکھتی تھی اور دل ہی دل میں کہتی تھی۔ ”ماروی! میری ہونے والی بیٹی کو جب سے ماروی کہا جا رہا ہے تب سے مجھے انجانا سا حوصلہ مل رہا ہے۔ میرا دل کہتا ہے، میں زندہ رہوں گی۔ زچگی کے مرحلے سے گزر جاؤں گی۔“

ایک رات زہبی نے خواب میں دیکھا۔ اس نے چاند جیسی بیٹی کو جنم دیا تھا پھر وہ بڑے جذبے سے بولی۔ ”میری بیٹی..... میری ماروی! مجھے ماما بولو.....“

اسے دیکھی سی معصوم سی آواز سنائی دی۔ ”ماما.....!“

زیب النساء کی آنکھ پٹ سے کھل گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ پھولے ہوئے پیٹ پر تھے۔ اس نے صاف سنا تھا۔ کہیں دور سے یا کوکھ کی تاریکی سے آواز آئی تھی۔ ”ماما.....!“

یہ ناممکن ہے۔ ایسا ہوتا نہیں ہے۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل سے سوچ میں پڑ گئی کہ خواب میں سنا تھا یا سچ بیٹی نے پکارا ہے؟ پھر عقل نے کہا۔ ”یہ سراسر بچکانا خیال ہے۔ بیٹی کے لیے جو جذبات ہیں وہ خواب میں دکھائی دیے ہیں۔ یا میرے اللہ.....! کیا یہ خواب تھا؟“

اس نے سوچا۔ ”یہ میرا بچکانا خیال ہی سہی لیکن خواب سچے ہوتے ہیں۔ اس خواب سے یہ حوصلہ ملا کہ تعبیر وہی ہوگی۔ یعنی زچگی تشویش ناک نہیں ہوگی۔“

اس نے ہم زادن سے کہا۔ ”مجھے یقین تو نہیں آتا لیکن میں نے صاف طور سے اپنی بیٹی کی آواز سنی ہے۔“

اس نے پوچھا۔ ”تم نے آواز کہاں سے سنی لی؟ یہ

زیب النساء کو کون رات آبزرویشن میں رکھتے تھے۔ دوائیں اور دعائیں دونوں جاری تھیں۔ مراد نے فون پر ہم زادن سے دیر تک باتیں کیں۔ اسے سمجھایا۔ ”آئندہ خاندانی منصوبہ بندی کے طریقہ کار پر عمل کرو۔ پھر کبھی تمہاری شریک حیات کو حاملہ نہیں ہونا چاہیے۔“

ہم زادن نے اپنے ایک کان کو پکڑ کر کہا۔ ”ان دو بچوں سے ظاہر ہے کہ آئندہ بھی مجھ بے پیدا ہوں گے۔ میں توبہ کرتا ہوں۔“

مراد نے کہا۔ ”میرا دل کہتا ہے کہ اپنے عقیدے کے مطابق عمل کرو تو مصیبتیں مل جاتی ہیں۔ میں نہیں جانتا یہ کہاں تک درست ہے۔ یونہی میرے دل میں بات آرہی ہے۔ لوک داستان کی ماروی ایک عقیدہ ہے۔ صداقت اور پاک دامن کی علامت ہے۔“

”اب میرا یہ عقیدہ ہے کہ یہی ماروی زیب النساء کو سلامتی اور حیات نو دے گی۔“

ہم زادن نے پوچھا۔ ”ماروی کیسے سلامتی دے گی؟“

مراد نے بڑی عقیدت سے کہا۔ ”ہم اپنی ہونے والی بیٹی کا نام ماروی رکھیں گے۔“

وہ خلا میں نکلتے ہوئے بولا۔ ”ایسا کہتے وقت مجھے یوں لگ رہا ہے وہ آگ سے محفوظ رہنے والی ماروی زیب النساء کے دل میں اور اس کی روح میں سارہی ہے۔“

وہ بڑے جذبے سے اپنے اندر ڈوب کر بول رہا تھا۔ ”اس کا نام ایک ماں کے لبو میں دوڑ رہا ہے۔ اس نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔ وہ زیب النساء کی بھلائی چاہے گی۔ عالیٰ جینی کے وجود کی دیوار توڑ کر آیا تھا۔ وہ ایسا نہیں کرے گی۔“

ہم زادن نے کہا۔ ”اللہ پاک آپ کی زبان مبارک کرے۔“

پھر جیسے عقیدہ رو بہ عمل ہوا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اطلاع ملی کہ ماروی نے وفات پائی ہے۔ یہ ان سب کے لیے بہت ہی المناک خبر تھی۔ مراد کسی بھی پہلی فلائٹ سے وہاں جانے والا تھا۔ ویسے موجودہ حالات کے مطابق یہ سوچا جاسکتا ہے کہ ایک روح دو اجسام میں نہیں رہتی۔ وہ جس بدن کے لیے ہوتی ہے اسی میں رہتی ہے۔ تو اب کیا ہو رہا تھا؟

کیا وہ ماروی اپنی وفات کے پردے میں ادھر سے ادھر پیدا ہونے والی کے اندر آگئی تھی.....؟

مراد کا جذبہ اور عقیدہ یہی تھا کہ ماروی نے وفات پائی ہے تو پیدا ہونے والی بچی سے ضرور کسی طرح کارروائی تعلق ہے۔ جیسا کہ فون کے ذریعے معلوم ہوا تھا ماروی بیمار



زیب النساء نے فجر کی نماز کے بعد اسے بتایا۔ ”آج ایسی انہونی بات ہوئی ہے کہ آپ سن کر یقین نہیں کریں گے۔“

”تم کہو گی تو کروں گا۔“

”آج میں نے پھر اپنی بیٹی کی آواز سنی ہے۔ پرسوں میں نے اسے ”ماما“ کہتے سنا تھا اور یہی سمجھ میں آیا تھا کہ وہ خواب ہو گا لیکن آج میری بیٹی نے بسم اللہ پڑھی ہے۔“

اس نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا واقعی؟“

وہ بتانے لگی ہم زاد نے کہا۔ ”اللہ بڑی شان والا ہے۔ اس کی قدرت سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارا ایمان کہتا ہے کہ

ہماری بیٹی، ہماری ماروی بہت ہی ایمان والی اور بہت ہی عبادت گزار ہوگی اور اس کے طفیل تمہیں سلامتی ملے گی۔“

اس نے فون پر مراد کو یہ ایمان افروز بات بتائی۔ وہ جذبوں سے سرشار ہو کر بولا۔ ”سبحان اللہ۔ اللہ تعالیٰ ہماری بیٹی کو دنیا میں لانے سے پہلے دین کے سانچے میں ڈھال رہا ہے۔ میرا دل کہتا ہے یہ بیٹی دین اسلام کے حوالے سے غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل ہوگی۔ اللہ نے چاہا تو دشمنانِ دین کی حائل کردہ رکاوٹوں کو مسمار کرتی رہے گی۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”میرے اندر بے چینی بھرنی ہے۔ کسی بھی طرح باصلاح الدین اجیری سے رابطہ ہو جائے تو وہ ہماری بیٹی کے بارے میں کچھ راہنما مشورے ضرور دیں گے۔“

آہ! بابا اجیری کہاں ہیں؟ کیا اس دنیا میں ہیں یا پردہ کر چکے ہیں؟ کسی سے ملاقات نہ ہو، اس کی آواز بھی سنائی نہ دے، ہم ہونے والے کی کوئی سن گن نہ ملے تو خیال گزرتا ہے کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔

بابا اجیری کے بارے میں ایسا پہلے بھی خیال آیا تھا کہ وہ اپنے رب کی طرف جا چکے ہیں پھر بھی دل کہتا تھا کہ وہ ہیں اور کبھی کسی مشکل وقت میں راہنمائی کے لیے ضرور آئیں گے۔

مراد زیب النساء اور ہم زاد انہیں شدت سے یاد کرنے لگے۔ ہر نماز کے بعد ان سے ملاقات کے لیے دعائیں مانگنے لگے۔ یہ امید قوی تھی کہ ان سے کبھی رابطہ ہوگا یا کسی طرح ان سے راہنمائی حاصل ہوگی۔ جو اس دنیا میں اب تک نہیں ہوا وہ ہو رہا تھا تو آئندہ بھی کوئی اور انہونی ہو سکتی تھی۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

کیسے معلوم ہوا کہ وہ تمہاری بیٹی کی آواز ہے؟“

”وہ نضحی سی معصوم سی آواز میرے اندر سے ابھری تھی۔ میں نہیں جانتی کہ نیند میں تھی یا بچی کی محبت میں تھی۔ ایسا ہوتا ہے۔ بعض اوقات پتا نہیں چلتا کہ ہم خواب دیکھ رہے ہیں یا خیالات کے ہجوم میں جاگ رہے ہیں۔“

”ہاں، ایسا ہوتا ہے۔ میں تمہارے اندر چھپے ہوئے اندیشوں کو سمجھ رہا ہوں۔ یا تو تم نے خواب دیکھا ہے یا خیالوں کی بھیڑ میں مستی کی شدت نے تمہیں ایک بچی کی آواز سنا کر بہلا دیا ہے۔“

”خدا بہتر جانتا ہے۔ ویسے مجھے حوصلہ مل رہا ہے۔ میں اپنی بچی کو سینے سے لگائے رکھنے کے لیے زندہ رہوں گی۔“

”انشاء اللہ..... ہم سب دعائیں مانگ رہے ہیں۔ تمہاری زچگی نارمل ہوگی۔ اللہ نے چاہا تو تم سلامت رہو گی۔“

وہ دن رات ڈاکٹروں کی نگرانی میں رہتی تھی۔ میڈیکل رپورٹ حوصلہ افزا تھی۔ چینی کی طرح تشویش ناک نہیں تھی۔ زیب النساء عبادت کے دوران کچھ زیادہ ہی روحانی سکون و اطمینان محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ ایک رات تہجد کی نماز کے بعد پھر بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ فجر کی اذان تک نیند لینا چاہتی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ پورے محل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ سونے سے پہلے ہمیشہ ایک مختصر سی آیت پڑھتی تھی۔ اس نے زیر لب کہا۔ ”بسم اللہ.....“

یکلخت ایک نضحی سی معصوم سی گنگناہٹ سنائی دی۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اس کے دونوں ہاتھ پیٹ پر آگئے۔ اس گنگناہٹ کی واہجیشن وہیں محسوس ہوئی تھی۔

ایک ذرا شبہ ہوا کہ فریب ساعت ہے۔ کانوں کو دھوکا ہوا ہے۔ اس نے دوبارہ زیر لب کہا۔ ”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔“

اس کے ساتھ ہی پیٹ میں واہجیشن ہوئی۔ بہت ہی دھیمی سی گن گن کرتی ہوئی آواز ابھری۔

اس نے نیم تاریکی میں آنکھیں بھاڑ کر حیرانی سے سنا۔ حروف نہیں تھے لیکن صدا تھی، یکبارگی اس پر ایمانی جذبات کی یلغار ہوئی۔ وہ خوشی سے لرزنے لگی۔ اس کا دل اور دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ”میری بچی بسم اللہ پڑھ رہی ہے۔ جو کبھی نہیں ہوا۔ جو کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ اللہ کے نام سے ہو رہا ہے۔“

ہم زاد اہم ذمے داریاں نبانے میں کہیں مصروف تھا۔



سے ڈرتے تھے۔ گزشتہ انتخابات میں اس نے بیویوں کو سپردھا کر دیا تھا۔ کھیا روپ مل نے آنا کافی کی تو جانو نے اسے بھرے بازار میں برہنہ کر کے گھسیٹتے ہوئے جیب میں ڈالا اور رئیس کے سامنے حاضر کر دیا تھا۔ جب مولوی واحد بخش نے رئیس کے کتوں کی رکھوالی کرنے والے خمیسو کو اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا تو اس وقت بھی جانو نے رئیس کی عزت قائم رکھنے کی خاطر لڑکی اٹھا کر خمیسو کے گھر ڈال دی تھی۔ ایک سر پھرے طالب علم نے زمیندار کے خلاف بولنا شروع کیا اور اس کے مزارعوں کو بھڑکانا چاہا تو اس کے گھر کو آگ بھی جانو ہی نے لگائی تھی۔ جانو دراصل رئیس کی جان تھا۔ وہ سائے کی طرح پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ رئیس کے دشمنوں کے لیے

رئیس نے ایک بار پھر مہمان خانے کی گھڑکی سے باہر گھب اندھیرے میں جھانکا۔ گہری تاریکی میں اسے دور تک کچھ دکھائی نہ دیا۔ آسمان پر شب کی تیرگی اور زمین پر سناٹے کا راج تھا۔ کہیں روشنی تھی نہ کوئی آواز۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی اداس آنکھیں ناامید ہو کر کلائی پر بندھی گھڑی پہنک گئیں۔ رات کا ایک بج گیا تھا۔

”جانو ابھی تک نہیں لوٹا..... پہلے تو اس نے کبھی اتنی دیر نہیں کی۔ کہیں وہ.....“ رئیس بڑبڑایا۔ اندیشوں کی یلغار نے اسے پریشان کر دیا تھا لیکن نہیں، جانو کی دونالی والی بندوق، فولادی جسم اور عقابانی نگاہوں پر اسے ہمیشہ فخر رہتا تھا۔ علاقے کے عام اور غریب لوگوں کا تو ذکر ہی کیا، اچھے بھلے زمیندار بھی اس

### خود ساختہ سفاکانہ رسم و رواج کا خون پس منظر

سوال کوئی بھی ہو، دماغ جواب کی تلاش میں ہمیشہ متحرک رہتا ہے اور یہی تحریک انسان میں جستجو پیدا کرتی ہے۔ بہر حال یہاں معاملہ کچھ اور ہی تھا جس کا آغاز بہت رنگین اور انجام... انتہائی سنگین تھا... مگر اس رنگینی اور سنگینی کے درمیان کسی کا شملہ اونچا ہوا اور کوئی زندگی ہی پار گیا۔

## عزت کا سوال

ابراہیم جمالی

Downloaded From  
Paksociety.com



جانو فریضہ اجل ثابت ہوتا تھا۔

لیکن آج..... جب رئیس کا بھرم رکھنے کا امتحان درپیش تھا..... اور اس کی طاقت کی دھماک بیٹھنے والی تھی تو جانو نے زندگی میں پہلی بار دیر کر دی تھی۔

اس نے کھڑکی سے ہٹ کر صوفے پر لیٹے تھانیدار کی طرف دیکھا۔ وہ تھکاوٹ اور نشے سے چور بے سدھ پڑا تھا۔ اس کا ایک پاؤں جس میں کالا بوٹ چمک رہا تھا، صوفے سے لڑھک کر نیچے قالین تک جا پہنچا تھا۔ جہاں سگریٹ کے لاتعداد ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ بایاں بازو جس پر روئیس گھڑی چمک رہی تھی، فریبی میز پر رکھی ولایتی شراب کی نصف خالی بوتل کو چھو رہا تھا۔

رئیس آہستگی سے آگے بڑھا۔ اس نے تھانیدار کا ڈھلکا ہوا پاؤں نہایت فرماں برداری سے سیدھا کر کے صوفے پر رکھ دیا۔ سر کے نیچے سے اس کا بازو ہٹا کر نرم تکیہ رکھ دیا۔ سلگتا ہوا سگریٹ انگلیوں سے الگ کر کے ایش ٹریے میں مسل دیا۔ پھر وہ تپائی جس پر دو گلاس، بوتل اور سگریٹ کا پیکٹ رکھا تھا، سر کا کردیوار کے ساتھ لگا دی۔

یہ سب کچھ کرنے کے باوجود اسے چین نہ آیا۔ وہ پھر کھڑکی کی طرف پلٹا۔ اس نے کھڑکی سے باہر اندھیرے میں جھانکا اور مایوس ہو کر کبھی پرگر گیا۔ اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں گہری ہوتی جا رہی تھیں اور اس کے اندر گویا لاوا سا کھول رہا تھا۔ وقت گزارنے..... انتظار کی شدت اور اس سے پیدا ہونے والی بے چینی کو کم کرنے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھا کر بوتل اٹھائی اور گلاس میں شراب انڈیلی۔ پھر آتشیں سیال کو حلق میں اتار دیا۔ کئی اس کے وجود میں اتر کر رگوں میں دوڑنے لگی اور فضا میں الکل کی بو پھیل گئی۔ وہ کچھ دیر تک آنکھیں موندے اس کئی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ جب اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں تو سامنے تھانیدار اسی حالت میں پڑا نظر آیا۔ اس کی نگاہیں تھانیدار صاحب کے سر کے سفید ہوتے ہوئے بالوں سے ہوتی ہوئی اس کے پھولے ہوئے نتھنوں تک پہنچیں۔ پھر ٹھوڑی کی لگی ہوئی کھال کو پھلانگی ہوئی بے ڈول توند پر آ کر ٹھہر گئیں۔

’صاحب اب بوڑھا ہو گیا ہے۔‘ اس نے سوچا۔ ’بالوں میں سفیدی آگئی ہے لیکن دبدبہ وہی ہے جو دس سال پہلے تھا۔ نر افسر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آج کے لونڈے، افسر بنے پھرتے ہیں جو اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہیں۔ بزدل.....! وہ بہادروں کی قدر کیا جانیں۔‘

دس سال پہلے جب وہ چھوٹا تھانیدار بن کر آیا تھا تو سب

سے پہلے رئیس ہی نے اس کی دعوت کی تھی۔ شراب اور شباب، دونوں پیش کیے تھے۔ رخصت ہونے کے وقت دس بڑے لوٹ بھی نذرانے میں دیے تھے۔ یہ رئیسوں کی روایت تھی۔ کوئی بھی افسر تبدیل ہو کر آتا تو علاقے کے زمیندار اس کی دعوت اور آؤ بھگت کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس میں تاخیر ہو جاتی تو صاحب سمجھ جاتا کہ ڈیرا مست ہے۔ رئیس اس بات کا قائل تھا کہ پہلا تاثر پائیدار ہوتا ہے۔ اس لیے وہ پہل کر کے اپنے ٹھاٹس باٹ کا اظہار بھر پور طریقے سے کرتا تھا۔ بس، اس دن کے بعد رئیس اور چھوٹے تھانیدار کی دوستی مشہور ہو گئی۔ رئیس کا حکم ٹالنے کی ہمت کس میں تھی؟ دوسری صورت میں دفعہ 109 اور 110 تو گویا بنی ہی اس کے لیے تھیں۔

جلد ہی چھوٹے تھانیدار کا تبادلہ ہو گیا لیکن رئیس کی دھماک ہمیشہ کے لیے بیٹھ گئی۔ یہاں تک کہ چھوٹے تھانیدار نے عیسائی شیخ کے قتل کیس میں رئیس کی کھل کر مدد کی۔ یہ بات رئیس کے دل پر آج بھی نقش تھی۔

’جوان وہ جو مشکل وقت میں کام آئے۔‘ رئیس نے جانو سے کہا تھا۔ ’باقی لوٹ مار تو سب افسر کرتے ہیں لیکن جانو! میں اس یار کے احسانات کا بدلہ کبھی نہ اتار سکوں گا۔ کبھی ایسا موقع آیا تو میں اپنا سر کاٹ کر پیش کر دوں گا۔‘

دس سال بعد وہ لوٹا تو بڑا تھانیدار بن کر آیا۔ رئیس پھر ہواؤں میں اڑنے لگا۔ اس کے دارے نیارے ہو گئے۔ اوطاق میں محفلیں جاگ اٹھیں۔ الماریاں بوتلوں سے سج گئیں۔ راگ روپ کی رم جہنم۔ کبھی حمیدہ سکرند والی، کبھی سارہ سکھر والی، شکار پورا اور روہڑی تو گویا چند قدم کے فاصلے پر تھے۔ جیپ جاتی اور حسن و شباب سے لد کر آ جاتی۔ دعوتوں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ چھوٹے بڑے افسر صبح شام حاضر ہونے لگے۔

پورے علاقے میں رئیس کا نام گونجنے لگا۔ جگہ جگہ اس کے اثر رسوخ کا چرچا ہونے لگا۔ وہ اپنے چھوٹے موٹے کام تو افسروں سے کروا ہی لیتا تھا مگر اب دوستوں کا بھی بھلا ہونے لگا تھا۔ رئیس کی ہر طرف واہ واہ ہونے لگی۔

آج تھانیدار صاحب بغیر کسی پروگرام کے غیر متوقع طور پر رئیس کے پاس پہنچا تو اسے دور ہی سے اندازہ ہو گیا کہ آج صاحب پریشان معلوم ہوتا ہے۔

رئیس نے آگے بڑھ کر استقبال کیا، خیر و عافیت دریافت کی لیکن صاحب کی پریشانی کی اکیریں بتاتی تھیں کہ معاملہ خاصا گمبھیر ہے۔ رئیس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ’صاحب! مرد کی دہلیز پر آئے ہو۔ تم نے بھی مشکل گھڑی میں میری مدد کی تھی۔ اب خادم کو بھی خدمت کا موقع دو۔‘



صاحب نے خود کو صوفی پر گرا لیا اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے بیٹھ گیا۔

پہلے تو کبھی اتنا ملول نظر نہیں آیا۔ رئیس نے سوچا۔ 'جوہری کے گھر موتیوں کی کیا کمی؟ جس کے سامنے میرا سردار ادب سے جھک کر سلام کرتے ہوں، وہ کسی کے آگے آسانی سے تو ہاتھ نہیں پھیلا سکتا۔ ضرور کوئی اہم معاملہ ہے۔'

پھر جب بوتل کھلی اور برف کی بوندیں پسینے کی طرح گلاس پر چپکنے لگیں تب صاحب نے دل کا حال کہا۔ دراصل خاکو کی بیٹی زینا نے اس کے ہوش و حواس چھین لیے تھے۔ وہ ایک دن کسی تفتیش کے لیے اس طرف چلا گیا تھا۔ لڑکی کھیتوں میں کام کر رہی تھی۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں لپچاتا وجود دیکھ کر تھانیدار کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ شکار تو روز کرتا تھا۔ بھانت بھانت کی کلیوں کا رس چکھ چکا تھا لیکن ایسا قیامت خیز حسن اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

جیب سے اتر کر معلومات حاصل کیں تو اسے پتا چلا کہ وہ ایک غریب کسان کی بیٹی ہے۔ وہ اپنے دل کو سنبھالتا ہوا واپس چلا گیا۔ اس نے سوچا کہ غریب کسان کی بیٹی آسان نوالہ ثابت ہوگی۔ لڑکی کے باپ کو دو راتیں لاک آپ میں بند کر دوں گا تو وہ خود اپنی بیٹی کو لاک میری خدمت میں پیش کر دے گا۔ جو کام آسانی سے ہو سکتا تھا اس کے لیے کسی خاص انتظام اور منصوبہ بندی کی کیا ضرورت تھی۔

اس نے پیغام بھجوائے، سپاہی بھیجے، جھوٹے کیس، جھوٹی تفتیش..... پورا محلہ مصیبت میں پڑ گیا۔ جو بھی ہاتھ لگا، اسے لاک میں بند کر دیا۔ نوٹوں کے ڈھیر لگ گئے مگر جھپٹی کانٹے میں نہیں چھنسی۔ تھانیدار کا سکون رخصت ہو گیا۔ سوچنے لگا۔ 'یہ سدری ندلی تو میری تھانیداری کس کام کی؟'

علاقے میں ڈاکوؤں نے لوٹ مار مچا دی تھی۔ جگہ جگہ ڈاکے پڑنے لگے۔ ہر روز خون ہوتے۔ چورا چکوں کو گویا کوئی روکنے نوکنے والا نہیں رہا تھا۔ ادھر تھانیدار صاحب کے دل و دماغ پر تو زینا چھائی ہوئی تھی۔ کوئی خوش خبری ملے تو بے قراری کو قرار آئے۔ آخر کار وہ ہر طرف سے ناامید ہو کر رئیس کے پاس چلا آیا۔

"تم کچھ کر سکتے ہو تو کرو رئیس! آخر میں تھانیدار نے کہا۔" ورنہ تین ماٹو لوگوں کے طعنے مجھے مار دیں گے۔"

رئیس نے ایک بڑا گھونٹ لیا اور سوچنے لگا۔ 'خاکو کی بیٹی زینا! اسے یاد آیا کہ چند سال پہلے جب خاکو خدمت گار تھا اور مویشیوں کی دیکھ بھال کرتا تھا تو اس وقت یہ لڑکی حویلی میں چھوٹے موٹے کام کاج کیا کرتی تھی۔ کم عمر تھی لیکن اٹھان

غضب کی تھی۔ رئیس کی نظر گرم سے اس لیے بھی محفوظ رہی کہ وہ اس کی لاڈلی بہن سکینہ کی سیملی بن گئی تھی۔ وہ دن بھر گھر کا کام کرتی اور فرصت ملنے ہی سکینہ کے پاس پہنچ جاتی۔ اس کا جسم دہاتی اور باتوں سے دل بہلاتی۔ سکینہ کو اکثر دورے پڑتے تھے۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتی، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے، منہ سے جھاگ بہنے لگتے اور آنکھیں انکاروں کی طرح سرخ ہو جاتی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ سکینہ پر سایہ ہے۔ ایسے مواقع پر زینا اس کا خیال رکھتی اور اس عمدگی سے سنبھالتی کہ کسی کو معلوم ہی نہ ہو پاتا کہ وڈیرانی کی طبیعت ناساز ہے۔ وہ بات بات پر ہنستی رہتی۔ بجلی کی طرح آنگن میں دوڑتی پھرتی تھی۔ کبھی دودھ گرم کر کے سکینہ کو پلاتی اور کبھی اس کے سر پر تیل کی مالش کرنے لگتی۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔ لڑکی کیا تھی، بس بجلی تھی۔ رئیس کو کیا معلوم تھا کہ یہ جوان ہو کر ایسی قیامت ڈھائے گی۔ اگر اسے یہ اندازہ ہوتا تو وہ زینا کو آسانی سے حویلی سے باہر نکلنے نہ دیتا۔ سکینہ تو اس کے جانے کے بعد بھی کئی دن تک اسے یاد کرتی رہی تھی۔

رئیس نے آخری گھونٹ حلق سے اتارا اور گلاس میز پر بیچ دیا۔ وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں پر رکھ کر سوچ میں گم ہو گیا۔

'سکینہ! اس نے سوچا۔ اس کی اکلوتی بہن کبھی تھی۔ شادی کے لیے کوئی ہم پلہ رشتہ نہیں آ رہا تھا۔ ورنہ وہ بہت پہلے اپنے گھر کی ہو چکی ہوتی۔ چچا نے اپنے بڑے بیٹے کے لیے رشتے کا پیغام بھجوایا تھا لیکن رئیس نے صاف انکار کر دیا۔ کہا تھا۔ "عیسیٰ بیچ کے گل والے مقدے میں یہی میرا چچا میرے خلاف لڑا تھا۔ پولیس اور مجسٹریٹ کے سامنے میرے خلاف بیان دیے۔ اگر تھانیدار صاحب نے معاملہ نہ سنبھالا ہوتا تو یہ شخص مجھے پھانسی کے تختے پر پہنچا کر دم لیتا۔ اس نے اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر گزشتہ ایکشن میں بھی میری مخالفت کی تھی۔ میرے ووٹروں کو ورغلا یا اور مخالف پارٹی کو ووٹ دلوائے۔ انتخابی عملے کے ساتھ سازش کر کے میرے ووٹ غائب کرائے۔ اگر میں چار لاکھ روپے خرچ کر کے ایک بڑی برادری کے ووٹ نہ خریدتا تو آج دنیا مجھ پر ہنستی۔ میری عزت دو کوڑی کی نہ رہتی۔ پچھلے سال کچے والی زمین سے زبردستی فصل اٹھا کر لے گئے۔ معاملہ پھر کورٹ کچہری میں جا پہنچا۔ ڈپٹی کو نئے ماڈل کی جیب تحفتاً پیش کی تو جا کر عزت پٹی۔ اب وہ رشتے کے لیے پیغام بھیج رہا ہے۔ جا کر کہہ دو اس سے کہ رئیس بے غیرت نہیں ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں اپنے ہاتھوں سے سکینہ کا گلا دبا دوں۔"

سکینہ اس دن بہت روئی تھی۔ اسے اپنے خاندان کی ضد



کا پتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ رئیس برادری میں کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتا۔ اس لیے اب یہیں، اسی حویلی میں جینا مرنے ہے۔ یہی ایک راہ تھی جہاں رشتہ ہونا ممکن تھا۔ وہاں نہیں ہوا تو اب کہیں نہیں ہوگا۔ اس دن اسے پہلی مرتبہ دورہ پڑا تھا۔

رئیس کو اپنی بہن کا دکھ تو بہت تھا لیکن وہ بھی مجبور تھا۔ برادری میں کوئی برابر کا رشتہ بھی تو نہیں تھا۔ اس لیے اس نے سختی سے کہا کہ خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ بیٹھی کھاتی رہے۔ خاندان میں کئی لڑکیاں بن یہاں بیٹھی ہیں اور کتنی عزت و آبرو کے ساتھ اپنا وقت گزار گئیں۔ سکینہ بھی اس چار دیواری میں عزت سے اپنا وقت گزار لے گی۔

سکینہ کی امیدیں دم توڑ گئیں۔ وہ بھی بچی سی رہنے لگی۔ اسے ہر طرف اندھیرا نظر آتا تھا۔ کوئی امید کی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔

تھانیدار نے مدہوشی میں کروٹ بدلی۔ رئیس اچھل کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا لیکن اسے بے سدھ پا کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا دوبارہ کھڑکی کے سامنے جا ٹھہرا۔ باہر وہی تاریکی کا راج تھا، ہر سو ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

”جانو! تم کہاں رہ گئے؟“ رئیس بے قراری سے بڑبڑایا۔ جانو دراصل ڈاکو تھا۔ اردگرد کے زمینداروں سے نمٹنے کے لیے رئیس نے کافی عرصے سے اس ہتھیار کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ مشہور تھا کہ جانو، عالمو کے گروہ کا ڈاکو تھا۔ عالمو کے مارے جانے کے بعد رئیس کا خاص کارندہ بن کر اس کے پاس رہنے لگا۔

کندھے پر دونالی والی بندوق، کمر کے گرد کارتوسوں کی بیلٹ، ہلکی بھوری ڈاڑھی، اوپر کوٹھی ہوئی موچھیں، آنکھوں میں سرخی، گبرو جوان۔ جب وہ اونچی آواز میں لکارتا تو سننے والے دہل کر رہ جاتے۔ ہر مہم پر مسکراتا ہوا جاتا اور کامیاب لوٹتا۔ رئیس اس پر بھرپور اعتماد کرتا تھا اور وہ بھی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے رئیس کی خاطر ہر خطرہ مول لینے پر تیار رہتا تھا۔

مگر آج، جب رئیس کی عزت کا سوال تھا..... جب دس سال پرانا احسان چکانے کا وقت آیا تو اتنی دیر..... ایک کمزور کسان کے گھر سے ایک ناتواں سی لڑکی کو اٹھالانے میں اس قدر تاخیر؟ تھانیدار کی آنکھ کھل گئی تو اس سے کس طرح آنکھ ملا پاؤں گا؟ پشیمانی سے پانی پانی نہ ہو جاؤں گا؟

اس نے اپنا سر کھڑکی کے فریم کے ساتھ ٹکا دیا اور خلا میں گھورنے لگا۔ تب اچانک اس کے کانوں میں دور سے آتی ہوئی جیپ کی مدھم آواز سنائی دی۔ یکا یک رئیس کا سینہ پھول گیا۔ ناامید آنکھوں میں امید کی کرنیں جھلکانے لگیں۔ وہ

دروازے کی طرف دوڑا۔ برآمدے سے ہوتا ہوا اوطاق کے بیرونی دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ روشنی رفتہ رفتہ قریب آرہی تھی۔ جیپ کے انجن کی آواز بڑھتی گئی اور پھر اس نے گردوغبار کے پہاڑ میں سے جانو کا قہقہہ سنا۔

”کیا خبر ہے جانو؟“ رئیس بے تابی سے چیخا۔

”کامیاب لوٹا ہوں سائیں!“

رئیس کو جیسے نئی زندگی مل گئی۔ خوشی کے مارے اس کی باجھیں کھل گئیں۔ وہ چیخ کر بولا۔ ”خوش رہو پیارے۔ گھسیٹ کر لے آؤ لڑکی کو۔“

جیپ کی دھول میں سے ایک دراز قد جوان اچھل کر باہر آ گیا۔ ہلکی بھوری ڈاڑھی، کندھے پر دونالی والی بندوق، کمر کے گرد کارتوسوں کی بیلٹ۔ اس کے سامنے بھی جیپ سے اتر آئے۔ سب کے چہروں پر ڈھانٹے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ انہوں نے رسیوں سے بندھی ایک گٹھری نیچے اتار لی۔

رئیس نے جانو کی پیٹھ تھپکی۔ ”خوش رہو جانو، میری جان۔ تم نے آج میری عزت رکھ لی..... ارے جلدی کرو۔ اسے لے جا کر اوطاق میں بیچ دو۔ کوئی جا کر تھانیدار کو خبر کرے۔ وہ بھی کیا یاد کرے گا کہ رئیس بھی کوئی چیز ہے۔“

کافی دیر بعد، جب زینا کی سسکیاں سونگئیں، تب جانو اوطاق کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس نے اپنے کپڑوں سے گرد جھاڑی۔ اجڑک سے چہرہ صاف کیا اور موچھوں کو میل دیتا ہوا چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پھر وہ حویلی کے پچھلے حصے میں واقع حوض کی طرف چل دیا۔

گھنے درختوں کی ٹہنیوں کو ہاتھ سے ہٹاتا ہوا ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ جانو چونک کر اچھل پڑا۔ اس نے بندوق پر گرفت مضبوط کر لی اور بجلی کی سی تیزی سے پلٹا۔

”کون ہے؟“ وہ دہاڑا۔

جواب میں ایک ہاتھ اس کے ہونٹوں پر آ کر جم گیا۔ پودوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ ایک سایہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ جانو نے سائے کو غور سے دیکھا۔ بندوق پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور رکی ہوئی سانس متوازن چلنے لگی۔ سائے نے دھیرے سے کہا۔ ”آج تم نے بہت انتظار کرایا جانو! میں تو مایوس ہو کر واپس جانے والی تھی۔“

جانو نے جواب دیا۔ ”آج رئیس کی عزت کا سوال تھا سکینہ! آئندہ دیر نہیں ہوگی میری جان!“







## گم شدہ شرعباس

بعض اوقات بہت سامنے کا منظر بھی صاف نظر نہیں آتا مگر... کبھی کبھی کسی مشکل پس منظر کو سمجھنے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوتی... ایسا اس وقت ہوتا ہے جب جائز لینے والا تفتیش کی پہلی کڑی نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھنے میں تیزی دکھاتا ہے... مگر افسوس اسے واقعات کے حقائق کے لیے ایک بار پھر پلٹنا پڑتا ہے جیسے کہ اسے... اس کی تیز رفتاری بھی کسی کام کی نہیں رہی تھی...

### زندگی کے گم شدہ لمحات کا احاطہ کرنے والے کی چالاکی

فیلسیا پارکر کی گمشدگی ایک معما بن گئی تھی۔ آخری بار اسے جس عورت نے دیکھا، وہ سڑک کے کنارے سزیوں کا اسٹال لگاتی تھی اور فیلسیا پارکر کو ٹماٹر دینے آئی تھی جو اس کا شوہر میک پارکر صبح کام پر جاتے ہوئے خرید کر گیا تھا اور اس عورت کو تاکید کی تھی کہ یہ ٹماٹر اس کے گھر پہنچا دے۔ گوکہ وہ عورت ان دونوں کے لیے اجنبی تھی لیکن پارکر کا پتا سمجھنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی اور وہ پارکر کے گھر سامان پہنچانے



”یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی کہ میں اسے مسئلہ بنا لیتا۔“

”سچ سچ بتاؤ مسٹر پارکر! فیلیسا کے ساتھ کیا ہوا ہے؟“ وکیل صفائی نے جھنجھلاہٹ میں براہ راست سوال کر ڈالا۔

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

استغاثہ کی دوسری گواہ ایک نرس تھی جس نے عدالت کو بتایا۔ ”چھ ماہ قبل جب وہ اسپتال لائی گئی تو اس کے جسم سے بہت زیادہ خون بہہ رہا تھا۔ اس کے پیٹ پر ضرب کا نشان تھا، ہم کوشش کے باوجود بچے کو نہ بچا سکے۔“

”کیا اس نے اس چوٹ کی کوئی وجہ بتائی تھی؟“

”نہیں بلکہ ہم نے اس سے پوچھا کہ کہیں شوہر نے تم پر تشدد تو نہیں کیا لیکن اس کا جواب نفی میں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ گر گئی تھی جبکہ گرنے کی صورت میں اس طرح کا زخم نہیں آتا۔ ایسا بھی ہوتا ہے جب اسے مارا گیا ہو۔“

☆☆☆

ایک اور گواہ نے بھی تصدیق کی کہ میک پارکر غصے کا تیز تھا۔ یہ آدمی اس کے ساتھ ہی ہارڈ ویئر اسٹور میں کام کرتا تھا۔ اس نے عدالت کو بتایا۔ ”وہ بہت جلد غصے میں آجاتا تھا۔ خاص کر فیلیسا کے ساتھ تو اس کا سلوک بہت ہی خراب تھا۔ اگر وہ اس کی کسی بات کا جواب دے دیتی تو وہ اس پر چڑھ دوڑتا حالانکہ وہ میرے خیال میں بہت ہی معقول عورت تھی لیکن میک کا کہنا تھا کہ وہ اس سے تنگ آچکا ہے اور اگر اپنے گھروالوں کے سامنے شرمندہ ہونے کا خیال نہ ہوتا تو وہ اسے چھوڑ چکا ہوتا کیونکہ اس نے ان کی مخالفت کے باوجود فیلیسا سے شادی کی تھی۔“

”کیا اس نے کبھی طلاق کی بات کی تھی؟“ سرکاری وکیل نے پوچھا۔

”نہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا مطلب اپنی غلطی تسلیم کرنا ہوگا۔“

”کیا اس نے کبھی بچہ ضائع ہونے کا ذکر کیا؟“

”بس اتنا بتایا تھا کہ اس واقعے نے فیلیسا کے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا ہے۔“

☆☆☆

سب سے اہم گواہی پارکر کے پڑوسی کی تھی۔ اس نے عدالت کو بتایا۔ ”ہم اپنے پورچ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے گھر کی بتیاں روشن تھیں۔ ہم نے اسے کچن کی کھڑکی کے پاس سے گزرتے دیکھا پھر ہمیں شیشہ ٹوٹنے،

چلی آئی۔ پولیس نے حسب روایت فیلیسا کے شوہر میک پارکر پر شک کیا۔ عام خیال یہی تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کر کے لاش دریا میں پھینک دی ہے یا جنگل میں کہیں گاڑ آیا ہے۔ عدالت میں مقدمے کی کارروائی کے دوران اس عورت نے بیان دیتے ہوئے کہا۔

”جب وہ ٹماٹر لینے باہر آئی تو اس کی آنکھیں سو جی ہوئی تھیں، یوں لگتا تھا جیسے رات بھر روتی رہی ہو۔ اس نے مجھ سے ان ٹماٹروں کو بند ڈبے میں محفوظ کرنے کا طریقہ پوچھا کیونکہ اس نے اس سے پہلے یہ کام نہیں کیا تھا۔ اس کے شوہر کا اصرار تھا کہ وہ بھی ٹماٹروں کا سوپ اسی طرح بنائے جیسا کہ اس کی ماں بناتی ہے۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی ساس کو فون کر کے سوپ بنانے کی ترکیب پوچھ لے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا شوہر یہ بات پسند نہیں کرے گا کیونکہ وہ اپنے گھروالوں سے کسی قسم کا تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔ ان لوگوں نے اس شادی کو قبول نہیں کیا تھا اور اسی وجہ سے وہ ان لوگوں سے ناراض تھا۔“

استغاثہ کا دوسرا گواہ ریڈی پارکر تھا۔ وکیل صفائی نے اس پر جرح کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ سچ نہیں ہے کہ شادی سے پہلے فیلیسا پارکر تمہارے ساتھ ڈیننگ کرتی رہی ہے اور تم اسی لیے ناراض تھے کہ اس نے تمہیں چھوڑ کر تمہارے بھائی سے شادی کر لی تھی؟“

”یہ سچ نہیں ہے۔“ ریڈی پارکر نے کہا۔ ”میں اور فیلیسا ایک دوسرے کو منے گئے تھے لیکن میں کسی میکسین لڑکی سے شادی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، خواہ وہ کتنی ہی خوب صورت کیوں نہ ہو۔“

”تمہارے گھروالوں نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا لیکن تم اس کے بعد بھی اپنے بھائی کے گھر جاتے رہے؟“

”میں اور میک ہمیشہ سے ہی ایک دوسرے سے بہت قریب رہے ہیں اور ہمارے درمیان بہت محبت ہے۔ میں اپنے بھائی کو نہیں چھوڑ سکتا۔“

”اس کے باوجود کہ اس نے اس ہفتے کے شروع میں تمہاری ناک پر گھونسا مارا تھا جب تم نے اس کی بیوی سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی۔“

”اس کا مقصد مجھے نقصان پہنچانا نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی غصے کا تیز ہے اور صرف فیلیسا ہی جانتی ہے کہ اسے کس طرح قابو میں رکھا جاسکتا ہے۔“

”کیا اس بدسلوکی پر تم نے فیلیسا سے اظہارِ ناراضگی کیا تھا؟“



سچی کہانیاں آپ بیتیوں جگ بیتیوں کے شمال مجموعہ

# سنگرزشت

کراچی ماہنامہ

شمارہ جولائی 2016ء  
کی جھلکیاں

## قصیدہ گو

اس شاعر کی زندگی میں خوشیوں نے کبھی جھانک کر بھی نہ دیکھا، رلا دینے والا زندگی نامہ

## لازوال

قلم نگری سے اس اہم شخصیت کی داستان جس نے آخر وقت میں پاکستان چھوڑ دیا

## ملکہ مارجوری

اس پاکستانی ملکہ کا تذکرہ جس کی پھوپھی اس کا پیارہ تھیا نے پراثر آئی تھی

## شمشال سے تورنتو

سحر آفرین الفاظ سے مزین انتہائی دلچسپ سفر کہانی کا ڈرامائی موڈ

## اس کے علاوہ

تاریخ عالم، جولائی کی شخصیات، دلچسپ واقعات، سچی داستانیں، سچ بیانیوں۔ وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔ آپ کو پڑھنا چاہیے

بس ایک بار سنگرزشت پڑھیں پھر آپ خود ہی اس کے اسیر ہو جائیں گے

چلانے اور تھپڑ مارنے کی آواز آئی۔ پھر یوں لگا جیسے فیلیا رور ہی ہو تب میں نے پولیس کو فون کر دیا۔“

☆☆☆

”ان کا گھر کسی مذبح خانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔“ موقع پر پہنچنے والے پولیس آفیسر نے بیان دیتے ہوئے کہا۔ ”اس کا ہونٹ پھٹ چکا تھا جبکہ بازوؤں اور ٹانگوں پر بھی زخموں کے نشانات تھے اور ان سے خون بہہ رہا تھا۔ فرش اور دیواروں پر ٹماٹر کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے جبکہ مجھے وہاں شیشے کے ٹکڑے بھی نظر آئے۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ خون کے دھبے ہیں تاہم فیلیا نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس پر کوئی تشدد نہیں ہوا بلکہ وہ بے دھیانی میں شیشے کے جار سے ٹکرائی۔ اس کے ٹکرانے سے جار زمین پر گر کر ٹوٹ گیا اور فرش پر ٹماٹر کے ٹکڑے بکھر گئے جس کی وجہ سے وہ پھسل گئی۔ اسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہوا اور وہ ایک دوسرے پر چلانے لگے۔“

”اور تم نے اس کی بات پر یقین کر لیا؟“ وکیل نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں جناب! لیکن فون پر شکایت اس نے نہیں کی تھی۔ اس لیے میں اس کے شوہر کو گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔“

☆☆☆

”جب مسٹر پارکر نے اپنی بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی تو ہم نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس واقعے میں وہ خود بھی ملوث ہو سکتا ہے۔“ شیرف کے دفتر میں تعینات پولیس سراغ رساں نے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس طرح کے معاملات میں سب سے پہلا شک شوہر پر ہی کیا جاتا ہے۔ پھر ہم نے بچن میں خون کے دھبے دیکھے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی کار کی ڈکی پر بھی خون کے نشانات تھے۔ ان کے بارے میں اس نے بھی وہی کہانی سنا کی جو فیلیا نے ایک رات قبل پولیس کو سنا کی تھی۔ یعنی شیشے کا جار ٹوٹ جانے سے وہ پھسل کر گری اور زمین پر گرے ہوئے شیشے سے زخمی ہو گئی لیکن وہ یہ وضاحت پیش نہ کر سکا کہ اس کی کار کی ڈکی میں خون کہاں سے آیا۔“

”کیا گھر کی کوئی چیز غائب ہے؟“ سرکاری وکیل نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ ایک چھ ضرب آٹھ فٹ قالین کا ٹکڑا جو گھر کے داخلی دروازے پر پڑا ہوا تھا۔“

”تمہارے خیال میں فیلیا پارکر کی جسامت کیا



تین ماہ بعد اس کا وکیل ملنے کے لیے سینٹرل جیل آیا اور اسے یہ افسوس ناک خبر سنائی۔  
 ”مجھے افسوس ہے کہ تمہاری اپیل مسترد ہو گئی ہے۔  
 بیج کا کہنا ہے کہ اسے ماتحت عدالت کی کارروائی میں کوئی سقم نظر نہیں آیا لہذا اس کی سنائی ہوئی سزا بحال رکھی گئی ہے۔ اگر جیل میں تمہارا رویہ بہتر رہا تو دس سال بعد پیرول پر رہا ہو سکو گے۔“

☆☆☆

اس مقدمے کی کارروائی میں اس شخص کا ذکر بھی آیا ہے جو کبھی پارکر کے ساتھ ہارڈ ویئر اسٹور میں کام کرتا تھا۔ وہ نیو میکسیکو منتقل ہو چکا تھا اور چھ سال میں ترقی کرتے کرتے ایک دوسری ہارڈ ویئر کمپنی میں منیجر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ دن بھر کی تھکا دینے والی مصروفیت کے بعد جب وہ شام کو گھر آیا تو اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو اس قالین پر کھلونا ٹرک چلاتے ہوئے دیکھا جو اس کی بیوی ضد کر کے اپنے ساتھ لائی تھی۔ وہ اس خاندانی یادگار کو خود سے کس طرح جدا کر سکتی تھی جس کی بدولت وہ ایک ظالم شخص سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس قالین کو یہاں تک لانے کے لیے اسے ایک بس کے ٹکٹ کے مساوی اضافی کرایہ ادا کرنا پڑا تھا۔

☆☆☆

رات کے اندھیرے میں بس سے سفر کرنے کا آئیڈیا اسی شخص کا تھا جبکہ فیلیسا نے بڑی ہوشیاری اور مستعدی سے کام لیتے ہوئے اپنی انگلیاں زخموں سے رستے ہوئے خون میں ڈبو کر گاڑی کی ڈکی کے اوپری حصے اور اندرونی فرش پر پھیر دی تھیں کیونکہ اس کے جسم سے خون کافی مقدار میں بہ رہا تھا اس لیے اسے یہ کام کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ قالین لے کر نکلنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ پولیس یہی سمجھے کہ پارکر نے اسے قتل کر کے لاش قالین میں لپیٹی اور ڈکی میں رکھ کر کہیں دور لے گیا۔  
 ”مما! ڈیڈی آگئے۔“ ان کے بیٹے نے آواز لگائی۔

لیکن وہ اس سے پہلے ہی اپنے شوہر کے استقبال کے لیے نیچے آچکی تھی۔ اس نے اپنی گود میں چھوٹی بیٹی کو اٹھا رکھا تھا اور اس کے خوب صورت گداز ہونٹوں پر ایک پیار بھری مسکراہٹ نمایاں تھی۔

”میری معلومات کے مطابق اس کا قد پانچ فٹ تین انچ تھا اور وہ دبلی پتلی عورت تھی۔“  
 ”کیا اسے اس قالین میں لپیٹا جاسکتا ہے؟“  
 ”آئیگنیشن یور آزر۔“ وکیل صفائی چلایا۔

☆☆☆

”مسٹر پارکر! تمہیں اعتراف ہے کہ کبھی کبھی بیوی کے ساتھ تمہارا رویہ سخت ہو جاتا تھا لیکن اب تم اپنے آپ کو معصوم ظاہر کر رہے ہو۔ آخر کیوں؟“ وکیل صفائی نے رسمی جرح کرتے ہوئے کہا۔

”اس لیے کہ میں نے اپنی بیوی کو نہیں مارا۔ جب میں سونے کے لیے بستر پر لیٹتا تو وہ بالکل ٹھیک تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ سونے سے پہلے کچن کی اچھی طرح صفائی کر دے لیکن اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ یقیناً وہ گھر سے باہر چلی گئی ہوگی۔“  
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ خالی ہاتھ چلی گئی ہو؟ کم از کم اپنے کپڑے تو ساتھ لے کر جاتی۔“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ وہ ڈیوڈھی میں پڑا ہوا قالین اور میرے پیسے لے گئی۔“  
 ”سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اتنا بڑا قالین لے کر کس طرح گئی ہوگی اور اس کا کیا کرے گی؟“ وکیل استغاثہ نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ”جہاں تک پیسوں کا تعلق ہے تو تم نے اس سے پہلے ان دو ہزار ڈالرز کا تذکرہ نہیں کیا جو بقول تمہارے وہ ساتھ لے گئی تھی۔ اگر تمہارے بیان پر یقین کر لیا جائے تب بھی وہ اپنے نازک کندھوں پر وہ بھاری قالین ہی لے کر گئی ہوگی۔ اس نے اپنے کپڑے، ٹوتھ برش، پرس، کچھ بھی ساتھ لے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور جاتے جاتے تمہاری کار کی ڈکی میں خون کے دھبے چھوڑ گئی۔ سچ بیچ بتاؤ مسٹر پارکر! تم نے اس کی لاش کہاں دفن کی ہے؟“

وکیل صفائی کا خیال تھا کہ لاش برآمد ہونے سے پہلے جیوری اس کے موکل کو قتل کا مرتکب قرار نہیں دے سکتی لیکن اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ پارکر کے پاس اپنی بیگناہی کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا جبکہ حالات و واقعات اور گواہوں کے بیانات صریحاً اس کے خلاف تھے۔ چنانچہ جیوری نے اسے سیکنڈ ڈگری قتل قرار دیتے ہوئے اسے مجرم ٹھہرا دیا۔

☆☆☆



# Downloaded From Paksociety.com

## فضل رحمن

ضیاء نسیم بلگرامی

اتباع رسول اور خدا کی رستی کو مضبوطی سے پکڑنے کے لیے کسی بھی انسان کو اپنے نفس کی قربانی دینا پڑتی ہے اور جو نفس پر اپنی بادشاہت قائم کر لیتا ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ فاتح قرار پاتا ہے مگر اس معراج پر پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی... اور جو اسے پالیتے ہیں وہ یقیناً اللہ کے مقرب بندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کا تعلق بھی اسی قافلے سے تھا جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دیتے ہیں اور دنیا داروں کو آخرت کا احساس دلاتے ہیں۔

سنت رسول اور احادیث کے قدردان ایک ولی کا ماجرا

یوپی (بھارت) کے قصبہ سندیلہ میں 1209ء میں اہل اللہ نامی بزرگ کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ یہ خاندان صدیقی تھا اور یہ لوگ فیروز شاہ کے زمانے میں وارد ہند ہوئے تھے۔ یہ اللہ والے اپنی بزرگ اور علمیت میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ چنانچہ جب یہ بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام تاریخ سے نکالا گیا۔ فضل رحمن..... معلوم نہیں کہ نام رکھنے والوں کو یہ خیال کیوں آیا کہ مستقبل کی عظیم اور تاریخی شخصیت کا نام تاریخ سے نکالا جائے۔



www.paksociety.com  
 فضل رحمٰن جب اس لائق ہونے کے باوجود کل کمریوں میں کمیٹیس تو لڑکوں نے انہیں بڑی عزت دی۔ یہ عزت انہیں اپنے بزرگوں سے پہلے ہی حاصل ہو چکی تھی۔ بزرگ بچوں کی عزت کریں، تو یہ غیر معمولی بات ہے۔

بچوں کے ساتھ کھیلتے تو اس میں بھی رکھ رکھاؤ رہتا۔ سنجیدگی اور مستقل سوچ۔ بچے شور و غل کرتے، یہ شور و غل سے پرہیز کرتے۔ لڑکے اپنے ساتھیوں کو مارتے پینتے مگر فضل رحمٰن مار پیٹ میں کوئی حصہ نہ لیتے۔ دوسرے بچوں میں غضب کی دنیا داری پائی جاتی تھی مگر ان میں دنیا داری کا جوش و خروش نہیں ملتا تھا۔

بچے سڑک پر کھیل رہے تھے۔ ایک بھاگتا تھا اور دس اس سے بچتے پھرتے تھے۔ اسی عالم میں فضل رحمٰن بھی ادھر ادھر دوڑ بھاگ میں مشغول تھے۔ سارے بچے ادھر ادھر روپوش ہو چکے تھے اور اس بات کو کبھی جان چکے تھے کہ صرف فضل رحمٰن ہی چھپنے والے بچوں کو تلاش کریں گے۔ آپ بچوں کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگ دوڑ میں مشغول تھے۔ اس وقت وہ سڑک پر تھے انہیں سواریوں کی آمد و رفت کا کچھ خیال نہ تھا۔ اچانک ایک تیل گاڑی دوڑتی ہوئی آتی نظر آئی۔ فضل رحمٰن کسی اور ہی دھن میں تھے۔ انہوں نے تیل گاڑی کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ گاڑی کی ٹکر نے فضل رحمٰن کو گرا دیا اور جب تک وہ سنبھلتے گاڑی کا پھیرا ان کے جسم پر سے گزر گیا۔ کان کا کچھ حصہ کٹ کر خاک میں مل گیا۔ بچوں نے اس حادثے کی بابت جانا تو شور کر دیا۔ ہر طرف سے لوگ دوڑے، بزرگوں نے انہیں گود میں اٹھالیا اور گھبرا کر پوچھنے لگے۔ ”فضل رحمٰن ٹھیک تو ہو، کچھ یولو تو، پھیرا کہاں پر سے گزر گیا؟“

فضل رحمٰن کے ہوش و حواس بالکل بجا تھے۔ انہوں نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہاں سے گزر گئی تھی گاڑی۔“

ایک بزرگ نے سر کو چاروں طرف سے دیکھا، سر پر مٹی کے نشانات موجود تھے اور ایک کان کٹ چکا تھا، وہاں سے خون جاری تھا۔ گھر والے زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ ان کے دل میں موجود یہ اندیشہ انہیں پریشان اور مایوس کر رہا تھا کہ اگر گاڑی کا پورا پھیرا سر پر سے گزر چکا ہے تو بچہ زندہ بھی رہے گا یا نہیں لیکن بچہ اپنے ہوش و حواس میں تھا اور سوال کرنے والوں کو نہایت سکون و اطمینان سے جواب دے رہا تھا۔ ان میں جو اہل نظر تھے انہوں نے بچے کی حیثیت اور مرتبے کا اندازہ لگا لیا تھا۔ گھریلو دواؤں سے خون روکا گیا اور فضل رحمٰن کو آرام کی خاطر بستر پر لٹا دیا گیا۔ اب کھیل کود بند، ہر وقت ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی بزرگ ضرور رہتا تھا۔

آٹھ سال کی عمر میں آپ ہر دوئی کے قصبہ ملاواں سے کہیں جا رہے تھے، والد... ان کے ساتھ تھے۔ ان کے ہاتھ میں طوطے کا بیجرہ تھا۔ دونوں پیدل سفر کر رہے تھے۔ ان کے دونوں طرف کھیت تھے۔ کان کن کے درخت لہلہا رہے تھے۔ طوطے نے کان کن کے خوشے جو دیکھے تو ٹپٹپٹیں مٹیں کرنے لگا۔ والد صاحب نے ہنس کر طوطے کو تسلی دی۔ ”میں سمجھ گیا تو کیوں بول رہا ہے؟ چالاک پرندے! شاید تو کان کن مانگ رہا ہے۔“

اس کے بعد ان کے والد نے کان کن کے خوشوں کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن توڑنے سے پہلے آٹھ سالہ فضل رحمٰن نے باپ کو ٹوک دیا۔ ”باوا جان! خوشے مالک کی مرضی اور اجازت کے بغیر ہرگز نہ توڑیے گا۔“

شاید باپ نے ان کی بات سنی نہیں کیونکہ وہ کسی اور ہی دھن میں تھے۔ کان کن کے خوشے توڑتے ہوئے بے خیالی میں کہا۔ ”پرندہ بھی کتنا چالاک ہوتا ہے اگر آزاد ہوتا تو کتنے ہی خوشوں کو برباد کر دیتا۔“

فضل رحمٰن نے ایک بار پھر باپ کو منع کیا۔ ”باوا جان! میں کیا کہہ رہا ہوں، میری بات تو سنئے۔“

اتنی دیر میں باپ نے کئی خوشے توڑ کر بیجرے میں ڈال دیے تھے۔ بے خیالی میں بیٹے سے پوچھا۔ ”ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے؟“

فضل رحمٰن نے کہا۔ ”یہ آپ نے کیا کیا؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”میں نے کیا کیا؟ کچھ بھی نہیں کیا۔“

فضل رحمٰن نے کہا۔ ”آپ کو کھیت کے مالک کی مرضی کے بغیر یہ خوشے نہیں توڑنے چاہیے تھے۔“

باپ نے جواب دیا۔ ”تم پریشان مت ہو، کھیت کا مالک اس وقت یہاں کہیں موجود نہیں ہے۔ کسی دن اس سے اجازت بھی لے لیں گے۔“



فضل رحمن نے کہا۔ ”کسی دن کیا، آپ کو ابھی اسی وقت آج ہی اس کی اجازت حاصل کرنی چاہیے۔“  
باپ نے کہا۔ ”فضل رحمن! خدمت کر، جب میں نے یہ کہہ دیا ہے کہ میں کھیت کے مالک سے کل یا پرسوں تک اس کی اجازت لے لوں گا تو تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟“  
لیکن فضل رحمن اپنی بات پر اڑے رہے، کہا۔ ”باوا جان! آپ نے سب سے بڑی غلطی کی ہے، اس لیے غلطی کو فوراً ہی معافی اور اجازت مانگ کر پاک و صاف کر لیجیے کیونکہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ معلوم نہیں کب موت آجائے اور یہ گناہ ساتھ ہی چلا جائے۔“

باپ کو جانے کی جلدی تھی اور بیٹے کو اجازت اور معافی مانگنے کی جلدی تھی۔ باپ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔  
”بیٹے! کیا تم مجھ سے واقف نہیں ہو؟ جو اس قسم کی نصیحتیں کر رہے ہو۔“

فضل رحمن نے عرض کیا۔ ”باوا جان! میں یہ بات بالکل نہیں پسند کرتا کہ کسی کی املاک کو.....“

باپ نے اپنی بزرگی اور بڑے پن کی اتا میں فضل رحمن کی بات نہیں مانی اور وہاں سے چل پڑے، کافی دور چلنے کے بعد باپ کو احساس ہوا کہ وہ اکیلے چل رہے ہیں۔ پلٹ کر جو دیکھا تو پتا چلا کہ فضل رحمن کا کن کے کھیت کے پاس چپ چاپ کھڑے ہیں۔ باپ نے چیخ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے فضل رحمن! وہاں کیوں کھڑے ہو؟“

فضل رحمن نے جواب دیا۔ ”باوا جان! میں اس وقت تک یہیں کھڑا رہوں گا جب تک کھیت کا مالک آ نہیں جاتا۔ میں اس سے آپ کی طرف سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔“

باپ کو غصہ آ گیا۔ ”تو میری بات پر یقین کیوں نہیں کر رہا؟“

فضل رحمن نے جواب دیا۔ ”باوا جان! بات یقین کی نہیں، وقت اور اس کی نزاکت کی ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ وہ کب تک زندہ رہے گا اور کس ملک میں وصال پائے گا۔“

باپ نے پوچھا۔ ”تو گویا تم میرے ساتھ نہیں چلو گے؟“

فضل رحمن نے جواب دیا۔ ”میں نے آپ سے جو کہہ دیا ہے، میں اس پر ثابت قدمی سے عمل کروں گا۔“

باپ سے بھی نہیں چلا گیا، بیٹے کے پاس واپس چلے آئے، کہا۔ ”تم بلاوجہ ضد کر رہے ہو۔ کھیت کا مالک معلوم نہیں کب آئے گا۔ ہم یہاں اس کا کب تک انتظار کریں گے۔“

فضل رحمن نے کہا۔ ”تب پھر آپ ایسا کیجیے کہ ان خوشوں کو پنجرے سے نکال کر کھیتوں میں ڈال دیں۔“

باپ نے یہ تجویز پسند کی اور کان کن کے خوشوں کو پنجرے سے نکال کر کھیت میں پھینک دیا۔ اس کے بعد آپ اپنے والد کے ساتھ آگے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو بڑی پریشانی لاحق ہو گئی۔ گھر کا نظام ہی درہم برہم ہو گیا۔ پھر اسی دوران ملک میں قحط پڑ گیا اور ہر طرف بھوک نے عبرتناک منظر پیش کرنے شروع کر دیے۔ ماں نے بیٹے سے پوچھا۔ ”بیٹے! ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”لوگوں سے اجتناب، عزیزوں اور رشتے داروں سے پرہیز۔“

ماں اس جواب سے بہت خوش ہوئیں، پوچھا۔ ”کیوں؟ تو نے یہ مشورہ کیوں دیا آخر؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ماں! رشتے داروں میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو قحط سالی کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے مگر

اس سے ہماری قناعت اور خودداری کو بڑا نقصان پہنچے گا۔“

ماں نے پوچھا۔ ”پرگزراوقات کس طرح ہوتی؟“

گھر میں ایک درخت لگا ہوا تھا۔ آپ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اس درخت کے پتے اور چھال کو

ابال ابال کر کھایا جاسکتا ہے۔“

ماں نے بیٹے کو سینے سے لگایا اور خوب بھینچ بھینچ کر پیار کیا، بولیں۔ ”مجھ کو تجھ سے اسی جواب کی امید تھی۔ خدا تجھے

جزائے خیر دے۔ تو نے بھی غریبی کی شرم رکھ لی۔“



اس کے بعد آپ کی ماں نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا اور لوگوں سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ درخت کی چھال اور پتے ابال کر خود کھائے اور بیٹے کو بھی کھلائے۔

آپ نے تعلیم حاصل کی اور دہلی کا سفر اختیار کیا۔ دہلی میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے علم حدیث کی تحصیل شروع کر دی۔ ان دنوں شاہ صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور یہ ایک دن میں دو دو جزو بخاری کے پڑھا کرتے تھے۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ ”برخوردار! یہاں کتنے عرصے قیام کا ارادہ ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”صرف ایک ماہ۔“  
شاہ عبدالعزیز نے فرمایا۔ ”صرف ایک ماہ! لیکن صرف ایک ماہ میں کیا پڑھو گے؟“  
آپ نے جواب دیا۔ ”میں مجبور ہوں کیونکہ میری والدہ نے مجھے ایک ماہ دہلی میں ٹھہرنے کی اجازت دی ہے، میں اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔“

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ”افسوس کہ اگر تم صرف چار ماہ میرے پاس رہ جاتے تو میں تمہیں کچھ سے کچھ بنا دیتا۔“ اس کے بعد فرمایا۔ ”اب تم مولوی اسحاق سے پڑھ لیا کرو۔“

آپ نے فرمایا۔ ”بہتر ہے، میں انہی سے پڑھ لیا کروں گا۔“  
اور انہوں نے مولوی اسحاق سے پڑھنا شروع کر دیا اور ٹھیک ایک ماہ بعد اپنے گھر واپس چلے گئے۔  
جب آپ دوبارہ دہلی تشریف لے گئے تو معلوم ہوا شاہ عبدالعزیز محدث وفات پا چکے ہیں۔ آپ نے اس بار بھی مولوی اسحاق سے علم حدیث حاصل کیا۔

دہلی میں حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں شاہ محمد آفاق کو بڑی شہرت حاصل تھی اور عشق الہی کے مارے ہوئے یہاں حاضر یاں دیتے تھے اور اپنے عشق میں اور آگ لگا لیتے تھے۔ آپ بھی شاہ محمد آفاق کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے لگے۔ شاہ صاحب ان سے بے حد التفات فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے اپنی خواتین کا پردہ تک ختم کر دیا تھا۔

آپ نے جو کچھ پڑھا تھا، استعداد اس سے کہیں زیادہ تھی، یہاں تک کہ اس عہد کے لوگ متفقہ طور پر انہیں شبلی و جنید کا ہم پلہ قرار دیتے تھے۔ آپ نے پہلی شادی کی مگر دو بیٹوں کی پیدائش کے بعد بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس دوران آپ نے ایک مسجد میں سکونت اختیار کی۔ اس مسجد میں ایک موذن کے سوا کوئی بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہ موذن بھی اذان دے کر چلا جاتا تھا۔ آپ نے اس مسجد کو آباد کیا اور نماز پڑھانے لگے۔ اس مسجد میں ایک تعزیہ رکھا ہوا تھا، آپ نے فرمایا۔ ”مسجد میں تعزیہ کا کیا کام، اس کو یہاں سے ہٹا دیا جائے۔“

گنج مراد آباد کے خواتین کو تعزیوں سے عقیدت تھی، انہیں یہ بات گراں گزری اور انہوں نے مزاحمت کی۔  
ایک خان نے لکھنؤ کے نواب کو حقیقہ خط لکھا، اس میں اس نے لکھا۔ ”حضور نواب کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں فضل رحمن نامی ایک نوجوان تعزیوں کی بے حرمتی کیا کرتا ہے اگر اس نوجوان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی تو حالات بد سے بدتر ہو جائیں گے۔“

لکھنؤ کے نواب نے اپنی فوج کو بھیجا اور حکم دیا کہ فضل رحمن نامی نوجوان کو فوراً گرفتار کر کے یہاں بھیج دیا جائے۔ چنانچہ فوج کا ایک دستہ گنج مراد آباد پہنچا اور مولانا کو گرفتار کر کے ان کے پاؤں میں بیڑی ڈال دی اور مراد آباد سے گنج آباد لے گئے۔ آپ کی گرفتاری کی خبر دور دور تک پہنچ گئی۔ ان دنوں ریاست گوالیار میں محمد جعفر خاں نامی ایک معزز شخص میرمنشی تھے اور ان کا تعلق سندیلہ سے تھا۔ انہوں نے جب یہ خبر سنی تو نواب صاحب کو ایک خط لکھا، اس میں انہوں نے اس نوجوان کے مقام اور مرتبے سے نواب صاحب کو مطلع کیا تھا اور بتایا تھا کہ مولانا فضل رحمن کے نانا ہم سب کے استاد تھے اور آپ کے بھی۔ کیا آپ اپنے استاد کے نواسے پر ظلم کر کے خوش ہوں گے؟ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ مولانا کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ غلط ہے۔

اس خط نے بڑا کام کیا۔ نواب نے ان کی رہائی کا فرمان جاری کر دیا۔ آپ کی بیڑیاں کاٹ دی گئیں اور آپ یہاں سے گنج مراد آباد واپس تشریف لے گئے۔ وہاں ان کی مرحوم بیوی کے چچا رہتے تھے، وہ مولانا کے مقام سے آگاہ تھے۔ ان



کی ایک بچی کنواری بیٹھی تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی سہیلی کا عقد مولانا سے کر دیں مگر لڑکی کے بھائی مخالفت کرنے لگے، بولے۔ ”ہم اپنی بہن کی شادی اس فقیر سے نہیں ہونے دیں گے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“

لیکن چچا نے یہ شادی کرادی۔ شادی کے بعد پریشانی کا دور شروع ہوا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ مہینوں اروی ابال ابال کرکھاتے رہے۔ آپ سنت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سختی سے عمل کرتے تھے، یہاں تک کہ جب آپ نے محنت شاقہ اور ریاضت مسلسل سے نمایاں ترین مقام حاصل کر لیا تو کسی نے آپ سے پوچھا۔ ”حضرت! یہ بلند مقام آپ نے کس طرح حاصل کیا؟“

فرمایا۔ ”سنت نبویہ پر عمل پیرا ہونے سے۔“ پھر مزید فرمایا۔ ”غوث ہو یا قطب، اگر وہ خلاف شرع زندگی گزارتا ہے تو وہ کچھ بھی نہیں۔“

آپ کو سنت کا بے حد خیال رہتا تھا۔ آپ سے کسی نے پوچھا۔ ”حضرت! آپ یہ فرمائیں کہ آپ کے وصال کے بعد چہلم و چہارم ہونا چاہیے یا نہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں ہونا چاہیے۔“

سوال کیا گیا۔ ”کیوں؟ ایسا تو ہوتا چلا آیا ہے پھر ہم کیوں نہ کریں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”صحابہؓ کا یہ فعل نہ تھا۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے ایسا اس لیے نہیں کیا تھا کہ رسول اللہ نے ایسا نہیں کیا تھا۔ ہمارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نمونہ ہے کسی اور کی نہیں۔“

کسی نے سوال کیا۔ ”حضور والا! انتقال کے بعد مزار پر عرس ہونا چاہیے یا نہیں؟“

جواب دیا۔ ”نہیں کیونکہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہونا چاہیے کہ جب سنو کہ فضل رحمن کا انتقال ہو گیا تو چار قل پڑھ کر بخش دینا، بس اتنا ہی کافی ہے، عرس وغیرہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔“

ایک ارادت مند نے کہا۔ ”دوسرے بزرگوں کا عرس تو ہوتا ہے پھر آپ کو کیا اعتراض ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”بس کہہ جو دیا کہ میری قبر پر میلا نہیں لگنا چاہیے۔“

آپ حدیث بڑی عقیدت اور محبت سے پڑھا کرتے تھے۔

آپ کے حالات یک بیک بدل گئے اور ہر طرف سے مال و زر آنے لگا لیکن آپ کو اس سے دلچسپی ہی نہیں تھی۔

ایک بار کساد بازاری کی وجہ سے چاروں طرف مالی پریشانیاں لاحق ہو گئیں، آپ نے اپنے خریدنے شروع کر دیے۔

لوگوں نے پوچھا۔ ”آپ ایلوں کا کیا کریں گے؟“

جواب دیا۔ ”آس پاس والوں کو آگ کی ضرورت رہتی ہے۔ میں نے ان کے لیے مزید سامان یہ کر دیا کہ جب وہ

یہاں سے آگ لے کر جاتے ہیں تو اس آگ کے لیے یہ اپنے بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، اس طرح ان کی مشکل آسان ہو جاتی ہے۔“

ایک بار کسی کی طرف سے آپ کی خدمت میں پانچ سو روپے نذر میں آئے۔ آپ نے اسی وقت اعلان کر دیا کہ میرے حجرے کی دیوار گرنے والی ہے اس لیے بستی کے لوگوں میں اعلان کر دو کہ جسے مزدوری کرنا ہو، وہ پھاؤڑا اور کدال لے کر میرے پاس آجائے۔

پاس پڑوس کے شرفاء کدال پھاؤڑے لے کر پہنچ گئے۔ وہاں تو ہر چیز مضبوط تھی۔ کسی کو ذرا سا ہاتھ بھی نہیں لگانا پڑا اور چشم زدن میں سارا روپیا تقسیم کر دیا اور ہاتھ جھاڑ کر دوسرے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

آپ کے پاس ارادت مندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ انگریز حکومت کو تشویش رہنے لگی۔ حکومت نے الہ آباد ہائی کورٹ کو

اس کام پر مقرر کیا۔ اس نے ایک تحقیقاتی افسر آپ کے پاس بھیج دیا۔ یہ افسر انگریز تھا۔ جب وہ آپ کے پاس پہنچا، اس

وقت حیدرآباد دکن کے نواب خورشید جاہ بھی آپ کے پاس آئے ہوئے تھے۔ انگریز تحقیقاتی افسر نے آپ کے حالات کا

خوب اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس کے بعد آپ سے پوچھا۔ ”جناب! کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کے پاس اس قدر لوگ کیوں

آتے ہیں؟“



آپ نے جواب دیا۔ ”توبہ کرنے۔ یہ سارے لوگ میرے سامنے مجھے گواہ بنا کر توبہ کرتے ہیں، اگر تم چاہو تو تم بھی شرک سے توبہ کر کے مجھے گواہ بنا لو۔ میں تمہیں بھی مسلمان بنانے کو تیار ہوں۔“

آپ نے جس نرم لہجے میں بات کی تھی، اس نے انگریز افسر کو بہت متاثر کیا، بولا۔ ”بابا صاحب! آپ درویش آدمی ہیں اگر آپ پسند کر تو ہم آپ کا کچھ مدد کرنے کو تیار ہے۔ یعنی آپ اپنی خانقاہ کو بہت بڑا بنالیں۔“

آپ نے انگریز افسر کا شکر یہ ادا کیا، فرمایا۔ ”میرے لیے میرا حجرہ اور اس میں اللہ کا ذکر کافی ہے۔“

انگریز تحقیقاتی افسر یہاں سے بہت خوش ہو کر گیا۔

لکھنؤ کے مطبع مصطفائی میں آپ دوران سفر قیام فرمایا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک بار آپ نے اسی مذکورہ پریس میں قیام کیا اور اس طرح کئی دن تک قیام فرما رہے۔ اتفاق سے انہی دنوں میر صاحب علی نامی ایک ہم وطن بھی مصطفائی پریس میں ٹھہرے۔ آپ سے بھی ملاقات کی۔ آپ ایک ایک شخص کا نام لیتے اور پوچھتے۔ ”بھائی وہ شخص ابھی زندہ ہے؟“

دوسری طرف سے جواب ملتا۔ ”جی حضرت! وہ زندہ ہے۔“

آپ پھر کسی کام نام لیتے اور پوچھتے۔ ”کیا وہ شخص ابھی زندہ ہے؟“

ادھر سے جواب ملتا۔ ”ہاں زندہ ہے۔“

آپ نے کئی ناموں کے بعد ارشاد فرمایا۔ ”اللہ انہیں سلامت رکھے۔ معلوم نہیں کس کی دعاؤں کا اثر ہے کہ دست برد زمانہ سے محفوظ ہیں۔“

میر صاحب نے ایک صاحب سے کہا۔ ”آپ ذرا میاں جی سے فرما دیجیے کہ گھر میں پیسوں کی سخت ضرورت ہے، خرچ منگوا یا ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”توبہ واستغفار! کتنے فضول ہیں یہ لوگ کہ ان کا خرچ ہی پورا نہیں ہو رہا۔“

کسی نے پوچھا۔ ”اس میں قابل اعتراض کیا بات ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”میں گھر والوں کو سولہ سیر باجرہ اور سولہ سیر جو اردے آیا ہوں پھر اتنی جلدی ختم ہو جانے کا سبب؟“

انہی دنوں شرف الدولہ نے انہیں کئی ہزار روپے دیے تھے۔ آپ ان روپوں کو حاجت مندوں اور ضرورت مندوں میں کئی دن تک تقسیم فرماتے رہے۔ آخر میں ڈیڑھ سو روپے بچ گئے، خیال تھا یہ رقم دے دیں گے لیکن آپ نے یہ رقم بھی نہیں دی۔ ضرورت مندوں کے لیے بچائے رکھی۔ آخر میں اس رقم سے آپ نے احادیث نبوی کے چند نسخے خرید لیے اور ان نسخوں کو حاجت مندوں میں مفت تقسیم کر دیا۔

ایک دن کسی نے آپ سے عرض کیا۔ ”حضرت! اودھ کے ایک بزرگ کو کیمیا کا شوق ہے۔ آپ دعا فرما دیجیے وہ اس میں کامیاب ہو جائیں۔“

آپ نے دعا کی۔ ”خدا انہیں اس میں ناکام کرے۔“

عرض کرنے والے نے کہا۔ ”حضرت! یہ کیا دعا فرمائی آپ نے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”یہ اس کے حق میں میری دعا ہے کیونکہ جس دل میں کیمیا کا شوق ہوگا اس میں نسبت الہی قرار پذیر نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ اپنے دل میں اللہ کو رکھنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے دل سے شوق کیمیا جاتا رہے۔“

اس شخص نے پوچھا۔ ”اور حضرت! دستِ غیب کی بابت آپ کا کیا خیال ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”یہ اس سے بھی بدتر ہے کیونکہ کسی نبی، فقیر اور درویشِ کامل نے ایسے امور کی تمنا نہیں کی۔“

☆☆☆

امروہے کے مولوی محب اللہ خاں صاحب کارا امپور کے دربار سے تعلق تھا اور نواب راجپور سے ان کے مراسم تھے۔ ایک دن ان سے نواب کلب علی خاں نے یہ کہا۔ ”ہمیں بڑی تمنا ہے کہ مولوی فضل رحمن محدث ہمارے ہاں



مولوی محب اللہ خاں نے پوچھا۔ ”ان کی کیا ضرورت پیش آگئی نواب صاحب؟“  
نواب صاحب نے فرمایا۔ ”میرے پاس سب اہل علم اور ہر فن کے استاد جمع ہو چکے ہیں، اگر ان میں مولانا فضل رحمن بھی شامل ہو جائیں تو خوب ہو کیونکہ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے صحبت یافتہ بھی ہیں۔“  
مولوی محب اللہ خاں نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ انہیں یہاں لے آؤں اگر میں انہیں لے آؤں تو آپ ان کی خدمت میں نذرانہ کیا پیش کریں گے؟“

نواب صاحب نے جواب دیا۔ ”ایک لاکھ روپے یہ حقیر سا نذرانہ ان کی خدمت میں پیش کروں گا۔“  
مولوی محب اللہ خاں صاحب مراد آباد روانہ ہو گئے اور وہاں مولانا سے ملاقات کی۔ مولانا نے توحید پر گفتگو شروع کر دی۔ محب اللہ خاں نے گفتگو کا موضوع ہی بدل دیا، بولے۔ ”مولانا! اگر آپ رامپور تشریف لے چلیں تو کیسا رہے؟“  
مولانا بدستور توحید ہی پر بولتے رہے۔

آخر ایک بار پھر مولوی محب اللہ خاں نے کہا۔ ”حضرت! میں کب تک آپ کو نواب کلب علی خاں کی پیشکش سنا تا رہوں گا، کوئی جواب تو دیجیے خدا را۔“

آپ نے نہایت بے نیازی سے فرمایا۔ ”محب اللہ خاں صاحب! میاں لاکھ پر ڈالو خاک۔ مجھے کہاں درباروں میں لے جا کر خوار کراؤ گے۔ اس قسم کی باتوں میں نواب کلب علی خاں کا دماغ خوب لگتا ہے، اللہ اس کو خوش و خرم رکھے۔“  
ایک دن خبر گرم ہوئی کہ لیغنینٹ گورنر آپ کے پاس یہ دیکھنے جائے گا کہ زیارت کے لیے آنے والوں کے ہجوم شوق کو اپنی نظروں سے دیکھے۔

لیغنینٹ گورنر آپ کے پاس بیٹھ گیا اور ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول ہو گیا۔ لیغنینٹ گورنر کی بیوی اس کے ساتھ تھی، وہ کھڑی ہوئی تھی کیونکہ مولانا کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

لیغنینٹ گورنر نے کہا۔ ”مولانا! میں نے آپ کے پاس کئی بار آنا چاہا لیکن محض اس لیے رک گیا کہ میں آپ کی اجازت اور خواہش کے بغیر یہاں نہیں آنا چاہتا تھا۔“

آپ نے جواب میں فرمایا۔ ”میں فقیر آدمی ہوں، سامان دنیا بالکل نہیں رکھتا۔ اسی لیے دنیا داروں سے ملتے ہوئے شرم سی محسوس کرتا ہوں۔ اب اسی کو دیکھ لو، تم اپنی بیوی کے ساتھ یہاں آئے ہو مگر کرسی نہ ہونے کی وجہ سے میں بٹھا نہیں سکتا۔“

مولانا کی نظر اپنے کمرے میں رکھے ہوئے ایک خالی گھڑے پر پڑ گئی، آپ نے اس کو الٹا کر کے بچھو دیا اور عورت سے کہا۔ ”نیک بخت! تو اس پر بیٹھ جا۔“

وہ اس گھڑے پر بیٹھ گئی۔ لیغنینٹ گورنر نے کہا۔ ”حضرت! کچھ تبرک بھی عطا فرمائیے۔“  
آپ نے اپنے خادم کو حکم دیا۔ ”بھائی دیکھ میری ہنڈیا میں کچھ ہے یا نہیں۔ اس میں جو کچھ بھی ہو۔ انہیں جسے دے۔“  
خادم نے ہنڈیا کو الٹا، اس میں مٹھائی کا چورا پڑا تھا۔ آپ نے اس چورے کو تھوڑا تھوڑا تقسیم کر دیا۔  
کچھ دیر بعد جب لیغنینٹ گورنر نے اجازت چاہی تو آپ نے اجازت دے دی۔ لیغنینٹ گورنر نے کہا۔ ”حضرت! مجھے کوئی نصیحت؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”کسی پر ظلم نہ کرنا۔“

☆☆☆

آپ لکھنؤ تشریف لے گئے تو آپ کے ارادت مندوں نے آپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ان میں ایک صاحب مولوی علی حیدر خاں بھی تھے۔ ان کے سر میں درور ہا کرتا تھا۔ اس درد نے علی حیدر خاں صاحب کو بہت تنگ کر رکھا تھا۔ انہوں نے مولانا فضل رحمن سے عرض کیا۔ ”کافی علاج کرایا گیا مگر سر کا درد نہیں گیا، کچھ آپ ہی کیجیے۔“  
مولانا نے ان کے سر کے اس حصے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا جہاں مستقلاً درد رہتا تھا اور ایک شعر پڑھا۔  
باد کیم آج یہ کیوں مشک بار ہے



شاید ہوا کے رخ پہ کھلی زلفِ یار ہے  
کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”اب کیا حال ہے؟“

مولوی علی حیدر خاں نے محسوس کیا کہ درد چا چکا ہے، بولے۔ ”اب تو نہیں لگ رہا۔“  
مولانا نے جواب دیا۔ ”اللہ نے چاہا یہ درد اب کبھی بھی نہیں ستائے گا۔“  
مولوی علی حیدر خاں آپ سے بیعت ہو گئے اور ان پر آٹھ دن تک گریہ طاری رہا۔

☆☆☆

ایک دن آپ نے فرمایا۔ ”ہماری ایک ماما تھی۔ اس کا انتقال ہو گیا۔ ہمیں یہ فکر ہوئی کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟  
لیکن پھر یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اللہ نے اسے معاف کر دیا۔ بخش دیا۔“ پھر آپ نے قدرے سکوت اختیار کیا اور فرمایا۔  
”جانتے ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیماری میں حضرت عائشہؓ کو بہت یاد کیا کرتے تھے اور یہی چاہتے تھے کہ میری  
تیار داری ان کے گھر میں ہو، کیا تم جانتے ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیوں کیا؟“ پھر خود ہی فرمایا۔ ”پیغمبر کے پاس  
بوقت انتقال جو شخص ہوتا ہے علم نبوت کا ایک حصہ اس کو مل جاتا ہے اور یہ جتنا قریب ہوتا ہے اس حصے میں اتنی ہی زیادتی ہوتی  
جاتی ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اس بار کا کوئی اور شخص نہیں ہو سکتا، بجز حضرت عائشہؓ کے چنانچہ جب  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو حضرت عائشہؓ آپ کے بالکل قریب ہی موجود تھیں۔“

☆☆☆

مولانا احمد علی محدث سہانپوری نے صحیح بخاری چھپوائی اور اس کا ایک نسخہ لے کر مولانا کی خدمت میں پہنچے اور اس نسخے کو  
نہایت ہی ادب سے پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”مولانا! میں نے اس کی حج میں بڑی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود اگر اس  
میں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو نشاندہی فرمادیں۔“  
مولانا نے صحیح بخاری کا ایک صفحہ کھولا اور اس کی ایک سطر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں پر غلطی ہو گئی، ذرا غور سے  
دیکھ لیتا۔“

مولانا احمد علی نے دیکھا، وہاں پر واقعی غلطی موجود تھی۔ اس کے بعد تین درق اور اٹلے اور ایک سطر پر انگلی رکھ دی،  
فرمایا۔ ”یہاں بھی غلطی ہو گئی۔“  
مولانا احمد علی نے دیکھا، یہاں بھی غلطی موجود تھی۔

اسی طرح آپ صفحات اٹتے رہے اور غلطیوں والی سطروں پر انگلی رکھ کر اغلاط کی نشاندہی فرماتے رہے۔  
آخر میں مولانا احمد علی نے بہ نظر استحسان آپ کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ ”مولانا! یہ جو کچھ آپ مجھے بتا رہے ہیں، اس کا  
تعلق اکتساب سے نہیں، وہب سے ہے۔“

فرنگی محل لکھنؤ کے مولوی عبدالحئی صاحب لکھنؤ سے منج مراد آباد ایک ایسے راستے سے گئے جس سے نماز قصر واجب  
ہو جاتی ہے لیکن انہوں نے مولانا فضل رحمن کو یہ بات نہیں بتائی۔ منج مراد آباد اور لکھنؤ میں اتنا فاصلہ نہیں ہے کہ نماز قصر کی  
جائے۔ لیکن جب مولوی عبدالحئی نے پوری نماز پڑھی تو مولانا نے انہیں روکا اور کہا۔ ”تم حالت سفر میں ہو اس لیے نماز  
قصر کرو۔“

مولوی عبدالحئی نے جواب دیا۔ ”لیکن مولانا لکھنؤ سے منج مراد آباد کا فاصلہ اتنا نہیں ہے کہ نماز قصر کی جائے۔“  
آپ نے فرمایا۔ ”لیکن تم جس راستے سے چل کر یہاں تک پہنچے ہو اس میں نماز قصر جائز ہے۔“  
مولوی عبدالحئی نے حیرت سے پوچھا۔ ”مگر یہ بات آپ کو کس نے بتائی کہ میں کسی دوسرے راستے سے یہاں  
تک پہنچا ہوں؟“

مولانا خاموش ہو گئے۔ بات ختم ہو گئی۔ بعد میں مولوی عبدالحئی نے کہا۔ ”بیشک آپ کو خدا نے کوئی اور ہی علم عطا فرمایا  
ہے مگر اس بات کی آپ کو کیا خبر کہ میں کس لیے راستے سے یہاں تک آیا ہوں۔“  
مولانا اشرف علی تھانوی (مولف: بہشتی زیور) کو آپ سے ملنے کا اشتیاق ہوا، منج مراد آباد پہنچے اور آپ کے در پر



حاضری وی۔ رات کا وقت تھا۔ عشا کی نماز ہو چکی تھی۔ مولانا مسجد سے حجرے میں تشریف لے جا چکے تھے۔ مولانا تھانوی نے وہاں پہنچ کر آپ کے خادم سے کہا۔ میں مولانا سے ملنا چاہتا ہوں، براہ کرم میری ملاقات کرادیں۔“

خادم واپس آیا تو یہ پیغام لایا۔ ”مولانا نے اسی وقت یاد فرمایا ہے۔“

مولانا تھانوی اسی وقت اندر چلے گئے۔ وہاں ایک چارپائی پر آپ تشریف فرما تھے۔ مولانا تھانوی سامنے کھڑے ہو گئے اور سلام کیا۔ مولانا فضل رحمن نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا۔ ”کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں آئے ہو؟“

مولانا تھانوی نے جواب دیا۔ ”طالب علم ہوں، کانپور سے آیا ہوں اور زیارت کو حاضر ہوا ہوں۔“

مولانا فضل رحمن نے فرمایا۔ ”یہ کون سا وقت ہے زیارت کا؟ آدمی کو چاہیے کہ ذرا سویرے آئے تاکہ دوسرا کچھ روٹی وغیرہ کا تو انتظام کر سکے۔ تم ہی بتاؤ میں اس وقت کھانا کہاں سے لاؤں؟ تمہیں خدا کا خوف نہ آیا؟“ مولانا تھانوی چپ چاپ سنتے رہے، کوئی جواب نہیں دیا۔ مولانا فضل رحمن نے پوچھا۔ ”تمہارے پاس کچھ میسے ہیں؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”جی ہاں، ہیں تو سہمی۔“

مولانا فضل رحمن نے فرمایا۔ ”تب پھر بازار سے کچھ لا کر کھا لو اور صبح واپس چلے جاؤ۔“

مولانا تھانوی نے جواب دیا۔ ”بہتر ہے۔“

مولانا فضل رحمن نے خادم کو آواز دی اور فرمایا۔ ”انہیں سردری میں ٹھہرا دو۔“

مولانا تھانوی کے ساتھ ان کا ایک رفیق بھی تھا اور ٹٹو بھی۔ اس سردری میں تینوں کا انتظام ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہاں پھر خادم حاضر ہوا اور کہا۔ ”آپ کو حضرت مولانا یاد فرما رہے ہیں۔“

مولانا تھانوی سمجھے کہ شاید اور ڈانٹ پڑے گی۔ چپ چاپ ان کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں ایک تخت بھی بچھا تھا اور تخت کے پاس ایک چٹائی بچھی تھی۔ مولانا تھانوی اس چٹائی پر بیٹھ گئے۔ مولانا فضل رحمن نے فرمایا۔ ”وہاں کہاں بیٹھ گئے؟ تخت پر کیوں نہیں بیٹھے؟“ مولانا تھانوی تخت پر بیٹھ گئے۔

مولانا فضل رحمن نے خادم کو حکم دیا۔ ”جان کے لیے ہماری بیٹی کے یہاں سے کھانا لے آ۔“

چنانچہ خادم گیا اور ایک پیالے میں سالن اور ارہر کی دال اس طرح لایا کہ روٹیاں بھی اس پر رکھی تھیں۔ اندر چراغ روشن تھا اور اس کی مدھم روشنی میں صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ مولانا فضل رحمن نے خادم کو ڈانٹ دیا۔ ”ارے بد تمیز کہیں کے۔ کہیں اس طرح کھانا لایا جاتا ہے مہمانوں کے لیے۔ روٹی الگ طباق میں لانا تھی، یہ کیا طریقہ ہے روٹیاں لانے کا۔ پیالے پر رکھ کر لا رہا ہے۔“

خادم نے جواب دیا۔ ”طباق کو تلاش کیا جب نہیں ملا تو میں اس طرح لے آیا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”توجھوت بولتا ہے، فلاں طاق میں دیکھ۔“

خادم بھاگا بھاگا گیا اور اس طاق سے طباق اٹھالایا اور اس میں کھانا سجا کر پیش کر دیا۔

جب مولانا تھانوی کھانا کھانے لگے تو پوچھا۔ ”کیا ہے کھانے میں؟“

جواب دیا۔ ”روٹیاں اور ارہر کی دال اور سالن۔“

مولانا مسکرائے، فرمایا۔ ”خوب! اچھا ہے کھانا۔“ پھر کچھ دیر بعد فرمایا۔ ”ماشاء اللہ تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔“

مولانا تھانوی حیران تھے کہ انہیں کیا معلوم کہ میں پڑھا لکھا ہوں۔

آپ نے مزید فرمایا۔ ”تم نے مولانا محمد یعقوب سے پڑھا ہے، بہت اچھے آدمی تھے۔“

اب مولانا تھانوی کی حیرت میں اور اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ اور حیران ہوئے کہ انہیں یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ میں مولانا محمد یعقوب سے درس لیا ہے۔

مولانا فضل رحمن نے پھر فرمایا۔ ”تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو، یہ جو کچھ تم کھا رہے ہو، بہت اچھا کھانا ہے۔ ذرا صبر کرو۔“

کے حالات پر تو غور کرو۔ وہ ایک ایک کھجور کھا کر روزے رکھتے تھے اور جہاد بھی کرتے تھے۔ اس کے بعد صحابہ کے تعریف اتنے جوش و خروش سے کی کہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ان کے پاس کھڑے ہو کر دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر یہ



اور جوش کے عالم میں صحابہ کے فضائل بیان فرماتے رہے۔

مولانا تھانوی کھانا کھا چکے تو آپ نے فرمایا۔ ”اب جاؤ اور عشا پڑھ کر سو رہو۔“

وہ چلے گئے اور صبح فجر کے وقت پھر حاضر ہوئے۔ فجر کی نماز مولانا فضل رحمن کے پیچھے پڑھی پھر اور اورو وظائف میں مشغول ہو گئے۔ آفتاب اوپر اٹھا تو آپ نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے ایک صاحب سے پوچھا۔ ”تم کب جاؤ گے؟“

یہ صاحب اپنی وضو قطع سے کہیں کے رکھیں معلوم ہوتے تھے، جواب دیا۔ ”جمعے کی نماز پڑھ کر چلا جاؤں گا۔“

مولانا نے فرمایا۔ ”یہاں جمعہ پڑھ کر کیا کرو گے؟“

ان صاحب نے جواب میں کہا۔ ”پھر میں جمعہ کہاں پڑھوں گا؟“

مولانا نے گرم ہو کر فرمایا۔ ”ہمیں کیا خبر کہ تم جمعہ کہاں پڑھو گے۔ ہم کوئی ٹھیکیدار ہیں تمہارے جمعہ کے۔ لوگوں کو شرم نہیں آتی، منہ پر ڈاڑھی لگا کر پرانے ٹکڑوں پر پڑے رہتے ہیں۔“

وہ صاحب بھی خامسے بے تکلف تھے، انہوں نے کہا۔ ”حضرت! میں نہیں جانتا۔“

مولانا نے کھڑے ہو کر ان صاحب کا شانہ پکڑ لیا اور دھکا دینے کے انداز میں کہا۔ ”نگلو یہاں سے۔“ اور پھر دھکیلتے ہوئے دور تک لے گئے۔

مولانا تھانوی نے دل میں سوچا۔ شاید اب میری باری ہے انہوں نے کہا۔ ”اچھا مولانا میں چلوں پھر۔“

مولانا فضل رحمن نے کہا۔ ”اتنی جلدی؟“

مولانا تھانوی نے عرض کیا۔ ”پھر حاضری دوں گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”بہتر ہے۔“

اور مولانا فضل رحمن مشایعت میں انہیں دور تک چھوڑنے گئے یہاں تک کہ سردری آگئی۔

مولانا تھانوی نے عرض کیا۔ ”مولانا! میرے حق میں دعا کیجیے۔“

جواب دیا۔ ”میں نے تیرے لیے بہت سی دعا کر دی ہے۔“

مولانا تھانوی نے مزید عرض کیا۔ ”کچھ پڑھنے کو بتا دیجیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”قل هو اللہ شریف اور سبحان اللہ و بھو اور درود سو بار پڑھ لیا کرو۔“

اس کے بعد مولانا فضل رحمن، مولانا تھانوی کو دوسروں کے ذریعے سلام کہلا بھیجتے تھے۔

مولانا تھانوی دوسری بار ملاقات کو گئے تو کانپور کے بیڑے اور شریعت انار کی بوتل بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ بیڑے اس زمانے میں بنگالی بیڑے کہلاتے تھے۔

مولانا تھانوی نے سوچا کہ مولانا فضل رحمن کے دربار میں حاضری دینا اور ٹیٹو پر سفر کر کے جانا یہ بے ادبی ہے۔ انہوں نے راستے میں پاپیادہ سفر شروع کر دیا۔ راستے میں ایک بزرگ مل گئے۔ یہ بھی پیدل سفر کر رہے تھے۔ مولانا تھانوی نے پوچھا۔ ”آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟“

ان بزرگ نے جواب دیا۔ ”حضرت مولانا فضل رحمن کی خدمت میں۔“

دونوں صاحبان ایک ساتھ سبج مراد آباد میں داخل ہوئے۔ یہ رمضان کا مہینا تھا۔ مولانا نے پہلے ان بزرگ کو طلب کیا اور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”روزہ ہے؟“

ان بزرگ نے جواب دیا۔ ”جی ہاں، روزہ ہے۔“

آپ نے انہیں ڈانٹ دیا۔ ”تم سے کس نے کہا تھا کہ سفر میں روزہ رکھو۔“ اس کے بعد انہیں اسی وقت رخصت کر دیا گیا۔ اب مولانا تھانوی کی باری تھی۔ آنا سامنا ہوتے ہی سوال کیا۔ ”روزہ ہے؟“

مولانا تھانوی نے جی کڑا کر کے عرض کیا۔ ”جی ہاں روزہ تو ہے۔“

آپ نے نہایت شفقت سے فرمایا۔ ”خوب! جوان آدمی ہو روزہ ضرور رکھنا چاہیے۔“

کچھ دیر ملاقات رہی، اس کے بعد یہ باہر آ گئے اور دوسروں کو حاضری دینے کا موقع ملا۔ باہر آنے والوں کی چیزیں



دیکھ کر مولانا تھانوی کو اپنے آپ پر غصہ بھی آیا اور رحم بھی کیونکہ انہیں نہیں معلوم تھا کہ مولانا فضلِ رحمن کو تمباکو اور صابن سے بڑی رغبت تھی اور مولانا تھانوی پیڑے اور شربت انار لے کر آئے تھے۔

دوسروں نے مولانا فضلِ رحمن کی خدمت میں صابن اور تمباکو کا ہدیہ پیش کیا تو آپ خاموش رہے اور زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہا لیکن جب مولانا تھانوی نے ان کی خدمت میں پیڑے پیش کیے تو آپ نے خوش ہو کر فرمایا۔ ”تم تو بہت ہی اچھی چیز لائے۔ میں تو اس کا شربت پیا کرتا ہوں۔“ پھر خادم سے کہا۔ ”انہیں حفاظت سے رکھ دو۔“

مولانا تھانوی خوش تھے کہ ان کا ہدیہ قبول فرمایا گیا تھا، اس وقت تک مولانا کی خدمت میں شربت انار نہیں پیش کیا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد مولانا فضلِ رحمن نے پوچھا۔ ”تم اپنے ساتھ کوئی دوا بھی لائے ہو؟“

مولانا تھانوی کی سمجھ میں نہ آیا۔ دوسرے وہ شربت انار لے کر آئے تھے مگر یہ فیصلہ نہیں کر سکے تھے کہ وہ اس کو خود پیئیں گے یا مولانا کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔ انہوں نے جواب دیا۔ ”میں دوا تو کوئی بھی نہیں لایا اپنے ساتھ۔“

کسی نے چپکے سے آپ کے کان میں کہا۔ ”شربت انار کی طرف اشارہ ہے آپ کا۔“

مولانا تھانوی نے کہا۔ ”شربت انار لایا ہوں اپنے ساتھ۔“

آپ نے فرمایا۔ ”لیکن وہ تو تم اپنے لیے لائے ہو۔“

مولانا نے جواب دیا۔ ”لیکن اب میں اس کو آپ کی خدمت میں پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ اگر آپ قبول فرمائیں تو میں خود کو خوش قسمت سمجھوں گا۔“

مولانا نے اسے قبول کر لیا۔ اس کے بعد مولانا فضلِ رحمن نے مولانا تھانوی پر خصوصی توجہ دی اور انہیں حدیث کا درس بھی دیا۔

ایک دن پوچھا۔ ”تم شوق کا کیا ترجمہ کرو گے؟“

مولانا تھانوی نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں کیا ترجمہ کروں گا، ترجمہ تو آپ ہی خوب کریں گے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”شوق کا ترجمہ ہے، تڑپ۔“

مولانا تھانوی کو اس بار روک لیا گیا اور وہ کئی دن رہ کر واپس گئے۔

☆☆☆

اودھ کا وزیر زیر عتاب آ گیا۔ ان دنوں آپ لکھنؤ میں قیام فرماتے تھے۔ شرف الدولہ نے وزیر سے کہا۔ ”دیکھو، اگر چاہتے ہو کہ کام بن جائے تو مولانا فضلِ رحمن کے پاس چلے جاؤ اور ان سے دعا کے طالب ہو۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔“

وزیر نے شرف الدولہ کا سہارا پکڑا اور آپ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ آپ نے مراقبے میں جا کر جو کچھ دیکھا، صاف صاف کہہ دیا، فرمایا۔ ”اودھ کا نواب تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ اس کے پاس جاؤ اور دیکھو کہ وہ تمہارے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے۔“

وزیر نے عرض کیا۔ ”حضرت! کہیں بات بگڑ نہ جائے۔ میں نواب کے پاس جانے میں خوف محسوس کرتا ہوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”مت ڈرو، اس کے پاس ضرور جاؤ۔“

وزیر ڈرتے ڈرتے نواب کے پاس گیا۔ نواب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”تم کہاں چلے گئے تھے، میں تو تمہارا انتظار ہی کرتا رہا گیا۔ اگر آج بھی نہ آتے تو میں تمہیں بلوا بھیجتا۔“ وزیر کو حیرت تھی کہ یہ کیسا انقلاب ہے۔

اس کے بعد وزیر نے آپ کی خدمت میں دو ہزار روپے پیش کیے، آپ نے فرمایا۔ ”میں یہ روپے لے کر کیا کروں گا؟“

وزیر نے عرض کیا۔ ”پھر جیسا آپ کا حکم ہو۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اس رقم کے قرآن پاک چھپوا دے۔“ اور آپ جب دوسری بار لکھنؤ تشریف لے گئے تو انہیں قرآن پاک تیار ملے۔ وزیر نے اونٹ پر رکھوا کر بھیجے۔ ایک گھوڑا ساز دیراق آپ کی خدمت میں بھیجا۔ آپ انہیں سندے لیے لے لے کر روانہ ہو گئے اور راستے بھر انہیں تقسیم فرماتے رہے یہاں تک کہ آخر میں اونٹ اور گھوڑے کی بھی باری آگئی،



انہیں بھی تقسیم کر دیا گیا۔ آپ اتباع سنت میں ایک عرصہ گزار کر جب اپنے رب سے ملاقات کے لیے تیار ہوئے تو کسی کو بھی اس کا پتا نہ تھا کہ آپ ان سے رخصت ہونے والے ہیں۔ مولانا کو زکام اور بخار کا عارضہ لاحق ہوا اس کا علاج شروع کیا گیا مگر مرض میں افات کے بجائے شدت پیدا ہوتی رہی۔ پیاس کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا، غذا بہت کم ہو گئی تھی۔

7 ربیع الاول کو نماز عصر کے بعد آپ نے فرمایا۔ ”کتاب لاؤ۔“ حکیم عظمت حسین کتاب لے آئے اور سبق شروع کر دیا۔ اس کے بعد مولوی عبدالغفار کی باری آئی اور انہوں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ تقریباً تیرہ صفحات پڑھے تھے کہ آپ نے فرمایا۔ ”اچھا بند کرو۔ جاؤ کتاب بند کر کے مسجد میں رکھ آؤ۔“ آپ کے لفظ ”بند کر کے“ پر کسی نے غور نہیں کیا لیکن بعد میں احساس ہوا کہ یہ سلسلہ آپ موقوف فرما رہے تھے۔ اس کے بعد آپ کی حالت بگڑتی ہی رہی۔

21 ربیع الاول کو تقریباً دو بجے فرمایا۔ ”ہم مر گئے۔ ہمارے جنازے کی نماز پڑھا دو اور اگر کوئی نہ پڑھے تو میں خود پڑھ لیتا ہوں تمام مقتدی کھڑے ہیں۔“ یہ کہہ کر آپ نے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیے۔ ہر شخص یہ باتیں سن کر گھبرار ہا تھا۔ تقریباً سوا دو بجے فرمایا۔ ”میں حدیث سننا چاہتا ہوں تاکہ حدیث سنتے سنتے میرا دم نکلے۔“

22 ربیع الاول بروز جمعہ تین بجے حاضرین کا مجمع تھا۔ آپ نے آنکھیں کھول کر حاضرین کو دیکھا اور اپنے بیٹے احمد میاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے رہے۔ سوا چار بجے جنس میں فرق آ گیا۔ حکیم عظمت حسین نے چہل حدیث پڑھنا شروع کر دی۔ اس کے بعد کتاب الایمان کو پڑھا اور پڑھنا پڑھا گیا۔ ایک صفحہ بہ مشکل پڑھا گیا اور پھر آخری حدیث پڑھ کر کتاب بند کر دی۔ سوا پانچ بجے ساری تدبیریں چھوڑ دیں۔ مغرب کے بعد اتنی طاقت بھی آپ میں نہیں رہی کہ ہونٹوں کو حرکت ہی دے سکتے۔

آخر لوگوں نے محسوس کیا کہ آپ نے سانس کھینچی ہے۔ یہ اوپر کھینچی جانے والی سانس پھر کبھی نیچے نہیں آئی اور آپ وصال فرما گئے۔ ایک قیامت برپا ہو گئی۔ کوئی درود پڑھنے لگا، کوئی کلمہ۔ رونے کی آواز کہیں سے بھی نہیں آتی تھی کیونکہ آپ نے یہ آواز بلند رونے سے منع فرما دیا تھا۔ ہر کسی کے رخسار تر تھے اور آنکھیں تر بہتھیں۔ آپ کو ان کی اپنی مسجد کے چبوترے پر لایا گیا۔ بیرون مسجد قبر تیار کی گئی۔ وصیت کے مطابق نماز جنازہ احمد میاں نے پڑھائی۔ ساڑھے نو بجے قبر درست کی گئی اور آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ کئی دن تک آنے والوں نے اہل خانہ اور پسماندگان سے تعزیت کی اور دلا سے دیتے رہے۔ غلہ اور کھانا تقسیم کیا جاتا رہا۔

27 ربیع الاول کو راجا محمد ممتاز علی خاں صاحب بہادر والی ریاست اتروڑہ منج مراد آباد پہنچے اور اعلان کر دیا کہ جس بقال کا جس قدر روپیہ قرض ہو ہم ادا کریں گے۔ اس اعلان کے بعد دس ہزار چار سو روپیہ یکمشت ادا کیا گیا۔ اس دوران کسی نے راجا صاحب سے کہا۔ ”حساب کتاب دیکھ کر قرض ادا کیا جائے تو بہتر ہے۔“ راجا صاحب نے فرمایا۔ ”ہمارے حضرت حساب کتاب کر کے نہ لیتے تھے پس ہم بھی اس طرح نہ دیں گے۔ ہم روپیہ مزار شریف پر رکھ دیتے ہیں جس کا جتنا ہوا اٹھالے جائے۔“ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ داسے دسے ایک ایک کوڑی تک باقی نہ رہی۔ خدارحمٰت کنڈا ایس عا شقان پاک علیست را۔

### ماخذات

امرشاد مرحمانی، سید محمد علی مونگری۔ فضل مرحمانی، سید تجمل حسین۔ ہدیہ عشاق، مولوی عبدالغفار۔ مولانا فضل مرحمن، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی



بلانے چلا گیا۔  
 کچھ دیر میں وہ ان تینوں کو لے کر آ گیا۔ بیکری کا مالک  
 ایک ابھری ہوئی ناک اور نکلی ہوئی توند کا مالک تھا۔  
 ”ہاں جی، کیا واقعہ ہوا تھا؟“ انور خان نے پوچھا۔  
 ”صاحب یہ بندہ دکان میں داخل ہوا۔“ بیکری والا  
 تفصیل بتانے لگا۔ ”اس وقت میں کسی اور طرف متوجہ تھا۔ اس  
 نے جھٹ سے ڈبل روٹی بغل میں دبا کی اور باہر بھاگنے لگا پھر  
 میں نے اپنے آدمی دوڑائے۔ انہوں نے اسے فوراً پکڑ لیا اور  
 ہم اسے آپ کے پاس لے آئے ہیں۔“  
 ”دیکھا تم نے۔“ انور خان مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”تم  
 اسے چھوٹا جرم مت سمجھو، یہ بہت بڑی بات ہے۔ یہ سمجھو کہ یہ

میں اس وقت اپنے دوست انسپکٹر انور خان کے ساتھ  
 تھانے میں بیٹھا ہوا تھا کہ دو پولیس والے ایک آدمی کو تقریباً  
 دھکے دیتے ہوئے کمرے میں لے آئے۔  
 وہ آدمی تیس یا پینتیس کے درمیان کا اکہرے جسم کا تھا۔  
 جس کے چہرے ہی سے مظلومیت ظاہر ہو رہی تھی۔  
 ”صاحب جی، اس بندے نے ایک بیکری سے ڈبل  
 روٹی چرائی ہے۔“ ایک پولیس والے نے بتایا۔  
 ”کس نے پکڑا ہے اس کو؟“  
 ”صاحب جی اس کو بیکری والا پکڑ کر لایا ہے اور اس کے  
 ساتھ دو بندے بھی ہیں۔“  
 ”ان کو بھی اندر بلا لو۔“ ایک پولیس والا ان بندوں کو

بے حسی کے سمندر میں احساسات کا کنکر بھینکنے والے شخص کی کاوش

## داستان گونگور کی

منظر رامپا

فرقوں اور طبقوں میں بننے والی قومیں کبھی مرکزی اتحاد  
 ویگانگت کی لذتوں سے آشنا نہیں ہوسکتیں۔ یہی بات ایک بے  
 زبان انسان سمجھانے کی کوشش میں تمام عمر مصروف رہا مگر  
 کوئی اس کے گونگے راز کو نہ سمجھ سکا۔





# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



اس جرم کی ابتدا ہے۔ جو شخص ایک دفعہ قانون توڑتا ہے تو تم آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ اور کیا کچھ نہیں کرتا ہوگا۔“  
”صاحب جی، یہ تو کچھ بولتا ہی نہیں ہے۔“ بیکری کے مالک نے کہا۔

”تم فکر نہ کرو پولیس پتھر کو بھی بولنا سکھا دیتی ہے۔“ انور خان اس آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اوائے کیا نام ہے تیرا۔ سچ سچ بتانا ورنہ کھال ادھیڑ دوں گا۔“  
”آں..... اوں.....“ اس آدمی نے اپنا منہ کھول کر غوں غاں شروع کر دی۔  
”صاحب جی، یہ تو گونگا ہے۔“ ایک پولیس والے نے کہا۔

”تو کیا ہوا، کیا گونگوں کے لیے چوری کرنا جائز ہے؟“  
”نہیں جرم تو پھر جرم ہے چاہے کوئی بھی کرے۔“ اس وقت ایک پولیس والے نے مداخلت کی۔ ”صاحب جی یہ اپنے ایس ایس پی صاحب کا خاص ملازم ہے۔ میں نے اس کو کوئی بار وہاں دیکھا ہے۔“

”اچھا۔“ انور خان بوکھلا سا گیا اور صورت حال... مکمل طور پر تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نے بیکری کے مالک کو دیکھا۔ ”اوائے شرم نہیں آتی۔ ایک بے چارے گونگے کو پکڑ کر لے آئے ہو۔ اس نے صرف ڈبل روٹی ہی چرائی ہے تمہاری دولت پر تو ہاتھ صاف نہیں کیا ہے۔ خود تو کھا کھا کر توند باہر نکال لی ہے اور دوسرے کو ایک ڈبل روٹی سے بھی محروم کر دینا چاہتے ہو۔“

بیکری والا اس ناگہانی افتاد سے بوکھلا گیا۔ ”صاحب مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ کون ہے؟“  
”ابھی لاگ اپ میں بند کروادوں گا تو سب پتا چل جائے گا۔“

”مجھے معاف کر دیں۔ میں نے غلطی سے اس پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔“  
”یہ غلطی نہیں، جرم ہے۔“ انور خان غرایا۔ ”ایک معصوم پر الزام لگاتے ہو۔“ پھر اس گونگے کو اپنے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

گونگا جھجکتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ انور خان نے ایک سپاہی کی طرف دیکھا۔ ”اوائے سوچ کیا رہے ہو؟ جاؤ جلدی سے بے چارے کے لیے چائے اور بسکٹ لے آؤ اور بسکٹ ختم ہونے چاہئیں۔“  
”جی صاحب۔“

اچانک ہی ایک سپاہی بول پڑا۔ ”نہ جی نہ..... یہ تو ہو

ہی نہیں سکتا۔“

”ابے کیا نہیں ہو سکتا؟“

”یہ بندہ ایس ایس پی صاحب کا خاص ملازم نہیں ہے جی۔ اس کو تو میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ تو کوئی اٹھائی گیرا لگتا ہے۔“

انور خان کے تاثرات پھر تبدیل ہو گئے۔ اس نے ہنکارا بھرا۔ ”تب ہی میں کہوں کہ یہ کم بخت صورت سے چور کیوں دکھائی دے رہا ہے، اوائے کھڑا ہو جا۔“ اس نے گونگے سے کہا۔ گونگا اس کا اشارہ سمجھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ ”ابے یہ لوگ اسی طرح دھوکا دیتے ہیں۔“ انور خان نے کہا۔ ”میں نے تو پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ یہ چور ہے اور چوری کرنا سیکھ رہا ہے۔ ابھی ایک شریف آدمی کی ڈبل روٹی چرائی ہے کل کچھ اور چرالے گا۔ عادی مجرم اسی طرح تو جینتے ہیں۔ بھائی تم تو بیٹھ جاؤ، تم کیوں کھڑے ہو؟“ یہ جملہ اس نے بیکری والے سے کہا تھا۔ بیکری والا جلدی سے اس کرسی پر بیٹھ گیا جس کو گونگے نے خالی کیا تھا۔ میں انور خان کے بدلتے ہوئے پینٹرے دیکھ رہا تھا۔

”انور خان۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔ ”اس بے چارے نے تو خود کو کسی ایس ایس پی کا ملازم ظاہر نہیں کیا تھا۔“  
”تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس نے اپنی شکل و صورت سے ہمارے بندوں کو دھوکا تو دیا ہے نا؟“ اس دوران میں چائے اور بسکٹ آ گئے تھے۔ انور خان نے دونوں چیزیں بیکری والے کی طرف بڑھا دیں۔ ”یہ لیں جی، آپ شریف آدمی ہیں۔ آپ کو بہت پریشانی ہوئی۔“  
”کوئی بات نہیں۔“ بیکری والے نے جلدی سے بسکٹوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔

”صاحب میں شرط لگا سکتا ہوں۔“ پہلے والے سپاہی نے کہا۔ ”یہ وہی ہے، ایس ایس پی صاحب کا ملازم۔“  
”ذرا دھیان سے بتاؤ۔“

”دھیان سے ہی بتا رہا ہوں صاحب۔ میں کوئی پاگل نہیں ہوں جو اتنی بڑی بات بغیر کسی دعوے کے کہہ دوں۔“  
”اچھا۔“ انور خان ایک بار پھر شپٹا گیا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ پھر اس نے بیکری والے کی طرف دیکھا جو بسکٹ ختم کر چکا تھا اور کپ کی چائے بھی آدمی ہو گئی تھی۔

”دیکھو بھائی۔“ اس نے بیکری والے سے کہا۔ ”ایک تو تم لوگ اٹنے سیدھے کیس لے کر ہمارے پاس آ جاتے ہو کہ ڈبل روٹی چرائی۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ کھانے کی چیز تھی



اٹھا کر لے گیا۔ بعد میں وہ پیسے لا کر دے دیتا کوئی جھاگا تو نہیں جا رہا تھا۔ اتنے بڑے صاحب کا ملازم ایسی حرکت تو نہیں کرے گا نا۔“

بیکری والے نے جلدی سے چائے نیچے رکھ دی۔ انور خان نے گونگے کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی ساتھ والی کرسی پر بٹھالیا۔ پھر اس نے سپاہی کو آڑھوں پر رکھا۔ ”جاؤ جلدی سے ان کے لیے دوسری چائے لے کر آؤ پہلی والی چائے تو یہ پی گئے۔ ان لوگوں کے تو پیٹ ہی نہیں بھرتے۔ غریبوں کا خون چوس چوس کر یہ حال ہو گیا ہے۔“

”دیکھیں جناب، یہ آپ زیادتی کر رہے ہیں۔“ بیکری والے نے بوکھلا کر احتجاج کیا۔

”زیادتی تو اب ہوگی۔“ انور خان غرایا۔ ”الزام لگانے سے پہلے سامنے والے کی حیثیت دیکھ لینی چاہیے۔“

”صاحب.....“ ایک دوسرے سپاہی نے مداخلت کی۔ ”جس طرح فتح محمد شرط لگا رہا ہے نا اسی طرح میں بھی لگاتا ہوں کہ اس بندے کا ایس ایس بی صاحب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تو صورت ہی سے چور دکھائی دے رہا ہے۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ انور خان نے اپنی گردن ہلائی۔ ”لگتا تو چور ہی ہے۔“

”بس کرو انور خان۔“ اب میں بول پڑا۔ ”مجھ سے اب مزید برداشت نہیں ہوگا۔ کب تک یہ ڈراما چلتا رہے گا۔

یہ ایس ایس بی صاحب کا ملازم ہو یا نہ ہو اس نے چوری ضرور کی ہے اور دوسری بات یہ کہ اس نے کیا چاہا ہے۔ صرف ایک ڈبل روٹی..... ہو سکتا ہے کہ اس کے بچے بھوکے ہوں۔ تم لوگ لاکھوں کروڑوں چرانے والوں کو تو چھوڑ دیتے ہو لیکن ایک غریب کو ڈبل روٹی کھاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ چلو ٹھیک ہے..... اب اس بد نصیب کو لاک اپ میں ڈال دو اور گیس کر دو اس پر۔“

”نہیں یار۔ اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔“ میری تقریر سن کر انور خان کے تاثرات بھی بدل گئے تھے۔ ”اب ہم لوگ اتنے بھی بے رحم نہیں ہوتے۔“ پھر اس نے بیکری والے کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں ڈبل روٹی تو واپس مل گئی ہے نا۔“

”جی صاحب، وہ تو اسی وقت مل گئی تھی۔“

”تو پھر جانے دو اس کو۔“

”جی صاحب، جانے دیں بے چارے کو۔“ بیکری والے نے اپنی جیب سے سوکا ایک نوٹ نکال کر گونگے کی طرف بڑھایا۔ ”لو یہ رکھ لو اور میری طرف سے گھر والوں کے لیے کچھ لے جانا۔“

لے لے کر لے جاتا۔“

گونگے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے سوکا نوٹ بیکری والے سے لے لیا۔ پھر انور خان نے بھی پچاس کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ ”یہ میری طرف سے لے جا۔“

گونگا بہت حیران ہو رہا تھا کہ انور خان نے اسے جانے کی اجازت جو دے دی تھی۔ وہ انور خان اور کمرے میں موجود لوگوں کو ادب سے سلام کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کمرے کی فضا پر ایک سوگوارسی خاموشی طاری ہو گئی تھی۔

”یہ سب آخر کب تک ہوتا رہے گا؟“ انور خان نے کہا۔ ”دن بھر میں اس قسم کے نہ جانے کتنے لوگ میرے پاس آتے ہیں۔ کسی کے ساتھ سختی کرتا ہوں تو کسی کے ساتھ نرمی لیکن دل بھی روتا رہتا ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ مجرم بنتے جا رہے ہیں۔“

”یہ پوری قوم کا المیہ ہے یار۔“ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا لعد پورے ماحول میں سوگواریت سی چھا گئی تھی۔

ہم بہت دیر تک اس صورت حال پر باتیں کرتے رہے پھر میں تھانے سے نکل آیا۔

میرا رخ اپنی گاڑی کی طرف تھا کہ اچانک وہی گونگا کسی طرف سے نکل کر میرے سامنے آ گیا۔ ”جناب، میری بات سنیں۔“ اس نے مجھے مخاطب کیا۔

”کیا.....!“ میں بری طرح چونک گیا تھا۔ ”تم تو بول سکتے ہو۔“

”جی جناب، میں بول سکتا ہوں۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں گونگا نہیں ہوں۔ وہ تو میں اپنی جان بچانے کے لیے گونگا بن گیا تھا۔“

”اوہ..... تو یہ بات ہے۔“ مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ ”تو تم چور ہونے کے ساتھ ساتھ دھوکے باز بھی ہو۔“

”نہ تو میں چور ہوں اور نہ ہی دھوکے باز۔“ اس نے کہا۔ ”میں تو ایک علامت ہوں۔“

”کیسی علامت!“

”تمہارے معاشرتی رویے کی جو بے حس ہو چکی ہے جہاں ایس ایس بی صاحب کے ملازم کی تو آؤ بھگت کی جاتی ہے لیکن اسی قسم کے دوسرے مجرم کو مزاد دی جاتی ہے۔ جہاں لوگ ایک روٹی کے لیے چوری کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔“

ایک لمحے میں اس کا چولا ہی بدل گیا تھا اب وہ کسی دل چلے دانش ور کی طرح باتیں کر رہا تھا۔

”یار تم تو پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔“ میں نے کہا۔

”جی صاحب، جانے دیں بے چارے کو۔“ بیکری والے نے اپنی جیب سے سوکا ایک نوٹ نکال کر گونگے کی طرف بڑھایا۔ ”لو یہ رکھ لو اور میری طرف سے گھر والوں کے لیے کچھ لے جانا۔“

لے لے کر لے جاتا۔“

لے لے کر لے جاتا۔“



جانتے ہوئے کہا: "یار ایسی باتس مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ ہماری کچھ قدریں ہیں اس لیے جی چاہتا ہے کہ صاحب کو سب کچھ بتا دوں۔"

"نہیں ایسا مت کرنا۔" اس آدمی نے کہا۔ "جانتے ہو یہی سب کچھ میں نے بھی دیکھا تھا اور خود پر قابو نہیں رکھ پایا تھا اور میں نے صاحب کو جا کر بتایا تو مجھے مار پیٹ کر اس گھر سے نکال دیا گیا۔ تم اس بات پر شکر ادا کرو کہ تم گونگے ہو۔ ورنہ تمہارا بھی وہی حال ہوتا جو میرا ہوا تھا۔ اس لیے گونگے ہونے میں بڑی عافیت ہے۔"

"بس بھائی اس دن کے بعد سے میں مستقل گونگا ہو گیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے دو۔ میں کون ہوتا ہوں آواز اٹھانے والا۔ جب یہ معاشرہ ہی گونگا ہے اور اس سے کسی کو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"لیکن اس کے بعد میں نے وہاں سے جا ب چھوڑ دی کیونکہ وہ خطرے کی جا ب تھی لیکن گونگا پن نہیں چھوڑا اور آج بھوک سے بے قابو ہو کر میں نے ذلیل رونی چرائی۔ پولیس والے تو مجھے بہت مارتے لیکن میرے گونگے پن نے مجھے بچا لیا۔"

"عجیب کہانی ہے تمہاری..... ویسے کب تک گونگا رہنے کا ارادہ ہے؟"

"جب تک اس معاشرے کو زبان نہیں مل جاتی۔" اس نے کہا۔ "یہاں انور خان جیسے لوگ ذرا ذرا سی دیر میں اپنا رویہ بدل لیتے ہیں۔ اس لیے شاید میں ہمیشہ گونگا ہی رہوں کیونکہ اس میں ہی عافیت ہے۔"

وہ مرد دانا مجھے ایک راستہ بتا کر چلا گیا۔

میں اب اس کے مشورے پر عمل کرنے لگا ہوں۔ میں خود بھی گونگا ہوں اور یقین مانیں جب سے گونگا ہوا ہوں، بہت عافیت سے ہوں۔ اپنے ارد گرد بہت کچھ ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں لیکن خاموش رہتا ہوں۔ مجھے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اسی گونگے پن نے ایک دفعہ میری جان بھی بچائی تھی۔ ایک دفعہ راستے میں کچھ لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ وہ سب مجھے مارنے کے چکر میں تھے۔ جن کا تعلق مختلف فرقوں سے تھا اور ہر فرقہ مجھے دوسرے سے وابستہ کر رہا تھا اور اسی لسانی نفرت کی بنیاد پر ہر شخص میری جان کا دشمن بنا ہوا تھا پھر مجھ سے پوچھا گیا کہ میں کون ہوں اور میرا تعلق کس فرقے سے ہے مگر..... میں تو گونگا تھا، میری کوئی زبان نہیں تھی کیونکہ اس ملک میں جس کی کوئی زبان نہ ہو اسے چھوڑ دیا جاتا ہے..... اسی لیے مجھے بھی چھوڑ دیا گیا۔

"ہاں میں پڑھا لکھا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "اور میں ہی ایس ایس پی صاحب کا ملازم ہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے.....؟"

"میں بے روزگار تھا۔ ہر جگہ سفارش اور رشوت کے بغیر کچھ نہیں ہوتا ہے اور یہ میرے بس کی بات نہیں تھی اسی لیے میں نے سوچا کہ میں خود کشتی کر لوں۔ تم نے اس قسم کی خبریں تو پڑھی ہوں گی کہ فلاں بے روزگار نے خود کشتی کر لی یا فلاں نے غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر جرائم کی راہ اختیار کر لی۔ میں نے بھی یہی سوچا کہ میں جرم تو نہیں کر سکتا..... کیوں نہ خود کشتی کر لی جائے۔"

"میں تمہاری پوری کہانی سننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ ہم کسی ہوٹل میں بیٹھ کر سکون سے بات کریں گے۔"

پھر ہم ایک ہوٹل میں آگئے جہاں اس نے اپنی کہانی سنانی شروع کی۔ وہ عام سا ہوٹل تھا۔ ایک آدمی میرے سامنے بیٹھا ہوا بہت غور سے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔ "خیر تو ہے بھائی تم کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو؟"

زندگی میں پہلی بار کسی نے میری پریشانی کا اندازہ کر کے مجھ سے خیریت معلوم کی۔ میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتاتے ہوئے کہا کہ میں نے خود کشتی کا ارادہ کر لیا ہے۔ "نہیں تم خود کشتی نہ کرو۔" اس نے کہا۔ "میں تمہیں اپنے صاحب کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ انہیں ایک ملازم کی ضرورت ہے جو بے ضرر قسم کا ہوا اور زبان نہ چلائے۔"

"اگر ایسا ہے تو یہ سمجھ لو کہ میں ایک گونگا انسان ہوں۔" میں نے کہا۔ "آج کے بعد سے میں ایک لفظ بھی نہیں بولوں گا۔"

"تو یہ ہے تمہارے گونگے ہونے کی کہانی؟"

"ہاں، مجھے ایس ایس پی صاحب کے یہاں نوکری مل گئی۔" اس نے بتایا۔ "تم میری صورت تو دیکھ ہی رہے ہو۔ میں دیکھنے سے ہی مظلوم معلوم ہوتا ہوں۔ گونگے ہونے کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ میں ان لوگوں کے اٹھے سیدھے سوالوں سے بچ گیا۔ اپنا کام پوری محنت کے ساتھ کرتا رہا لیکن کچھ دن بعد میں نے اس گھر میں ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ یہ ایک شرم ناک سی بات تھی کہ نیگم صاحبہ صاحب کے ایک دوست کے ساتھ مصروف تھیں۔ میرا جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کر سب کو بتا دوں کہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے لیکن میں تو گونگا تھا۔"

"پھر جب اس آدمی سے میری ملاقات ہوئی جس نے مجھے اس گھر میں بھیجا تھا تو میں نے اسے ساری صورت حال



جرم کی دنیا میں اکثر حیرت انگیز واقعات رونما ہوتے رہے ہیں۔ شاید جتنی ذہانت لوگوں نے مجرمانہ فعل پر صرف کی ہے اگر مثبت پہلو پر صرف کی جاتی تو یقیناً یہ دنیا جنت کا نمونہ ضرور بن جاتی... اس ذہانت کی پونلی پر بھی یہ انکشاف تو ہوا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

مختصری دولت کے حصول کی خاطر قیمتی جان دینے والے لیرے کا قصہ

اسے واپس نہیں مل جاتی۔ وہ ہر قیمت پر اسٹوریج لاکر کی چابی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی نشست پر بے چینی سے پہلو بدلا اور اپنی توجہ ان آئٹمز کی فہرست پر مرکوز کر دی جو نیلام ہونے

کارل پولیس والوں کو پسند نہیں کرتا تھا اسی لیے وہ اس کمرے میں بیٹھا نروس ہو رہا تھا جو پولیس والوں سے بھرا ہوا تھا لیکن اس کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ کم از کم اس وقت تک نہیں جب تک کہ اسٹوریج لاکر کی چابی





احتمالاً حرکت نہ کی ہوئی اور مشایط ہائے پکڑے نہ جاتے۔ لیکن جب آپ پکڑ لیے جاتے ہیں تو پھر پتا چلتا ہے کہ آپ کے آرٹ کے قیمتی کلکیشن کی نیلامی ہو رہی ہے۔ جیسا کہ اس وقت شیفرڈ کے آرٹ کے قیمتی کلکیشن کی نیلامی ہونے جا رہی تھی۔

ایزی ریٹیلو کے جس اسٹوریج لاکر میں ڈیکوری کی تیس لاکھ ڈالرز کی رقم رکھی ہوئی تھی، اس کی چابی ہنگری کے آرٹسٹ زولو سکی کی مشہور پینٹنگز میں سے ایک پینٹنگ کے فریم کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ اس پینٹنگ کا عنوان ”دی سائنگ برڈ“ تھا۔

کارل کی نگاہ میں اس پینٹنگ کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی کہ جیسے کسی پانچ سال کے بچے نے کرے اون کی مدد سے چڑیا بنانے کی کوشش کی ہو۔ وہ پینٹنگ جزائر کیری میں پائی جانے والی زورونگ کی چھوٹی چھبائی چڑیا کی تھی جسے اس کے وطن کے حوالے سے کیری کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

نیلامی کی فہرست کے مطابق اس پینٹنگ کی قیمت دو ہزار ڈالرز رکھی گئی تھی۔ عام حالات میں وہ اس پینٹنگ کے پچاس سینٹ بھی دینا گوارا نہ کرتا۔ لیکن اس وقت وہ اپنی جیب میں پانچ ہزار ڈالرز کی نقد رقم لیے نیلامی کی بولی دینے کے لیے یہاں موجود تھا اور اس نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اگر اسے یہ تمام رقم ادا کرنے کی ضرورت بھی پیش آئی تو وہ کسی قسم کی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لے گا۔

جب زولو سکی کی دیگر پینٹنگز نیلام ہونا شروع ہوئیں تو کارل نے قدرے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ اپنی سرکاری بولی سے کم قیمت پر فروخت ہو رہی تھیں۔

کرے میں درجن بھر پولیس والوں کے علاوہ لگ بھگ چالیس دیگر افراد موجود تھے۔ وہ تمام کے تمام کم سے کم قیمت میں ان پینٹنگز کو خریدنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کارل دل ہی دل میں یہ سوچ کر مسکرانے لگا کہ اگر شیفرڈ یہاں موجود ہوتا تو یہ دیکھ کر کتنا آگ بگولا ہوتا کہ اس کی مستقبل کے لیے پس انداز کی ہوئی پونجی کس معمولی قیمت پر جا رہی ہے۔ وہ دونوں خود کو چکھے باز تصور کرتے تھے اور یہاں ڈالرز کے عوض انہیں اپنی ہی مل رہی تھی۔

جب ”دی سائنگ برڈ“ نامی پینٹنگ کی بولی کا آغاز ہوا تو کارل نے یہ سوچتے ہوئے کہ اتنی بولی تو کوئی نہیں لگائے گا، فوراً ہی دو ہزار ڈالرز کی آواز بلند کر دی جو اس پینٹنگ کی سرکاری بولی تھی۔ ابھی تک کسی نے بھی کسی بھی

تھے۔ وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ کئی نکالیں اس پر ہی ہوئی ہیں لیکن وہ کسی صورت فہرست پر سے نظریں ہٹا کر ان درجن بھر پولیس والوں میں سے کسی ایک سے بھی نظریں نہیں ملانا چاہتا تھا جو اس کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

یقیناً اسے یہ احساس بھی تھا کہ وہ خلاف عقل یہ سب کچھ سوچ رہا ہے۔ اس لیے کہ یوسٹن کی پولیس کو اس کے بارے میں معلومات ہونے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ یقیناً وہاں نیویارک کی پولیس اس کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی لیکن وہ کئی ماہ قبل وہاں پر ایک بکتر بند گاڑی کو لوٹنے کے بعد نیویارک چھوڑ چکا تھا۔ اس واردات میں اس کا ساتھی شیفرڈ بھی شامل تھا اور کاروباری لحاظ سے اسے امید افزا کامیابی حاصل ہوئی تھی۔

ڈیکوری کی اس واردات میں ان کے ہاتھ تیس لاکھ ڈالرز کی رقم لگی تھی جو کہ ان کی توقع سے دگنی رقم تھی اور اب یہ رقم ایزی ریٹیلو کے اسٹوریج لاکر میں محفوظ رکھی ہوئی تھی۔ پروگرام کے مطابق معاملہ سرد ہو جانے تک یہ رقم اسٹوریج لاکر میں مزید چند ماہ تک رکھی رہتی تھی۔

لیکن شیفرڈ نے ان کے سارے منصوبے کا ستیا ناس کر دیا تھا۔ کارل نے دل ہی دل میں شیفرڈ، اس کے ماں باپ اور اس کے ان تمام رشتے داروں کو کوسنا شروع کر دیا جن کے بارے میں وہ سوچ سکتا تھا۔ لاکر میں تیس لاکھ ڈالرز کی رقم ان کی منتظر تھی اور اس شیفرڈ کے بچے نے آدھا پاؤنڈ ہیرون کی لالچ میں خود کو گرفتار کر دیا تھا۔ اور اب شیفرڈ جیل میں بند اپنے مقدمے کی سماعت کا انتظار کر رہا تھا۔ میساچیوسٹس کے ڈرگ قانون کے مطابق اس کی تمام جائیداد ضبط ہو گئی تھی۔ شیفرڈ کے پاس اپنی جائیداد کے بچاؤ کی جنگ لڑنے کے لیے کوئی اور ذریعہ موجود نہیں تھا اور نہ ہی اس کے پاس اس بات کی وضاحت کا کوئی راستہ تھا کہ آرٹ کے وہ قیمتی نمونے اس کے پارٹمنٹ میں کیوں موجود تھے۔

گزشتہ کئی برسوں کے دوران میں وہ دونوں نیویارک اور نیوجرسی میں مل کر درجن بھر سے زائد کامیاب وارداتیں کر چکے تھے۔ پھر شیفرڈ یوسٹن منتقل ہو گیا تھا۔ شیفرڈ اپنے حصے کی رقم کا ایک بڑا حصہ ہمیشہ آرٹ کے قیمتی نمونوں کی خریداری میں لگا دیا کرتا تھا۔ وہ کارل سے کہا کرتا تھا کہ اسٹاکس کی خریداری کے مقابلے میں یہ زیادہ بہتر سرمایہ کاری ہے۔ اس کے علاوہ اس کاروباری لین دین میں ٹیکس والوں یا کسی اور ادارے کی نگرانی کا ڈر بھی نہیں ہوتا۔

شاید یہ ایک بہتر سرمایہ کاری ہوتی اگر آپ نے کوئی



بھی کارل پانچ ہزار ڈالرز سے زیادہ بولی نہیں لگا سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس اس سے زیادہ نقد رقم موجود نہیں تھی۔ کارل تیزی سے عمارت کے خارجی دروازے کی جانب چل دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اس کم بخت چڑیا کی پینٹنگ کو فریب کے بغیر حاصل نہ کر سکا تو پھر اسے کسی اور طریقے سے حاصل کر کے رہے گا۔

عمارت سے باہر نکلتے ہی وہ تیز تیز قدموں سے عقبی پارکنگ لاٹ کی جانب چل دیا۔ روزمرہ پیزا کے ساتھ چھ پیک بیئر نے اس کے جسم کو کسی غبارے کے مانند پھلا دیا تھا۔ اس کا قد صرف پانچ فٹ سات انچ تھا اور وزن بھاری بھر کم۔ اس کے جسم کا گوشت سخت کپریڈر بر سے مطابقت رکھتا تھا جس کی بنا پر اسے ”باؤٹنگ بال“ کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔ اسے اپنے اس تک نیم سے چڑھتی۔ جب وہ اپنی کار تک پہنچا تو اس کی قمیض سینے میں تر

پینٹنگ کی اتنی بولی نہیں لگائی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب کوئی بھی اس سے بڑھ کر بولی کی آواز بلند نہیں کرے گا اور یہ پینٹنگ اس کی ہو جائے گی۔

وہ پینٹنگ کی قیمت ادا کرنے کے ارادے سے ابھی اٹھنا چاہ رہا تھا کہ اس کے کانوں میں اپنے عقب کی جانب سے ڈھائی ہزار ڈالرز بولی کی آواز سنائی دی۔

کارل نے فوراً ہی پلٹ کر بولی لگانے والے کی طرف دیکھا۔ وہ ایک دبلا پتلا دراز قامت شخص تھا جس کی ڈاڑھی چچی نما اور موچھیں پارک پینٹنگ کی لکیر کے مانند تھیں۔ اس کی ٹھوڑی کی نوک چچی ڈاڑھی میں چھپی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر ایک ستا سا سوٹ دکھائی دے رہا تھا اور اس نے اپنی آنکھیں چھپانے کے لیے چھوٹی بیضوی دھوپ کے شیشوں والی عینک پہنی ہوئی تھی۔

کارل کو وہ شخص انتہائی ناپسندیدہ لگا۔ کارل نے گلا کھٹکھارتے ہوئے بولی بڑھا دی۔ ”چھبیس سو ڈالرز!“

”تین ہزار!“ اس دراز قامت نے فوراً ہی آواز لگا دی۔

کارل کو اس شخص کی آواز میں اس چڑیا کی چھبھاہٹ سی محسوس ہوئی جس کی پینٹنگ پر وہ دونوں بولی لگا رہے تھے۔

کارل پلٹ کر اس شخص کو گھورنے لگا۔ یہ کوئی چمکل شخص ہے جو اسے بولی میں مات دینے کی کوشش کر رہا ہے، کارل نے سوچا۔

”چار ہزار تو سو ڈالرز۔“ کارل نے پورا زور لگانا چاہا تو اس کے حلق سے ایک بھونڈی سی آواز بلند ہو کر رہ گئی۔

اس کا خیال تھا کہ اب اس کی زیادہ بولی پر یہ کھیل ختم ہو جائے گا اور وہ اس شخص کو اس مقابلے میں ناک آؤٹ کر کے اس پینٹنگ کو حاصل کر لے گا۔ اس کے علاوہ

کمرے میں موجود ان تمام پولیس والوں کی وجہ سے وہ جلد از جلد اس جگہ سے نکل جانا چاہتا تھا۔

کمرے میں طویل خاموشی چھائی رہی۔ کارل نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”دس ہزار ڈالرز۔“ اس کے عقب سے وہی چھبھاہٹ بلند ہوئی۔

کارل کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے احساس ہو گیا کہ اس شخص کو یقیناً لاکر کی چابی کی خبر گیری کی جا چکی ہے۔ ورنہ کوئی

اور وجہ نہیں ہو سکتی کہ وہ شخص اس فضول سی پینٹنگ کی غیر ضروری اتنی اونچی بولی لگائے۔

بہر حال ”وی ساٹنگ برڈ“ کی بولی اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ نیلامی میں ادائیگی کی شرط نقد کی صورت میں تھی۔ یوں

سچی

# پاک سوسائٹی

ماہنامہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں، بہار و خزاں کی پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی جولائی کا ماہنامہ پاک سوسائٹی اپنے باکس سے بک کروالیں



اس شخص نے پینٹنگ دینے میں قدرے مزاحمت کی لیکن کارل نے اس کے ہاتھ سے پینٹنگ چھین لی۔  
”کسی نے تمہیں مخبری کر دی تھی، ہے نا؟“ کارل نے کہا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“  
”کسی نے تمہیں چابی کے بارے میں بتا دیا تھا اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی جو تم نے اس فضول ناکارہ شے کے لیے دس ہزار ڈالر کی بولی لگا دی۔“

”نہیں۔ یہ زولو سکی کی نادر پینٹنگ ہے۔ درحقیقت یہ اس کے جنگی قیدی کے دور کی نایاب پینٹنگ ہے اور اس سے میرا زولو سکی کی پینٹنگز کا کلیکشن مکمل ہو جائے گا۔“  
”شٹ اپ!“ کارل نے حکمانہ لہجے میں کہا۔

اس کا ذہن کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا اس لیے وہ ہچکچا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ پھر اس نے سوچا کہ رقم ہاتھ میں آتے ہی یہاں سے بھاگ نکلنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

”اب زمین پر لیٹ جاؤ اور اپنا سر فٹ پاتھ کی سطح سے لگا دو۔ اگر تم نے سر اٹھا کر دیکھا تو پھر تم ایک لاش ہو گے۔“

چلی ڈاڑھی والے شخص نے خود کو محتاط انداز میں فٹ پاتھ پر جھکا دیا اور اپنا سر فٹ پاتھ کے ہم سطح کر دیا۔

کارل لیک کر اپنی کار میں سوار ہو گیا اور تیزی کے ساتھ کار ڈرائیو کرتے ہوئے کمپلیکس سے نکل آیا۔ اس کا پسینا فراوانی سے بہ رہا تھا اور اسٹیرنگ وہیل کو مضبوطی سے تھامنے کے باوجود اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کے جسم میں ایک بیجانی سی کیفیت طاری تھی۔ ”جھوٹا، کتیا کا بچہ“ وہ خود سے شکایتی لہجے میں بڑبڑایا۔ ”وہ کجنت رقم کے بارے میں باخبر تھا۔ ورنہ کوئی صورت نہیں کہ وہ اس مکروہ چیز یا کی تصویر کے لیے دس ہزار ڈالر ادا کرتا۔ مجھے اس کی کھوپڑی میں گولی اتار دینی چاہیے تھی۔“

کارل نے ایک شارپ ٹرن لیا اور کار کو اس عمارت کے راستے پر ڈال دیا جہاں انہوں نے وہ لاکر کرائے پر حاصل کیا تھا جس میں تیس لاکھ ڈالر کی رقم چھپائی تھی۔

اس کی شکایتی خود کلامی اب بھی جاری تھی۔ ”شیفرڈ نے یقیناً اس احمق کے ساتھ کوئی ڈیل کی ہوگی۔ بلاشبہ وہ کتیا کا بچہ مجھے نظر انداز کر دینا چاہتا تھا۔“ یہ سوچتے ہوئے کارل کی برافروختگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ”ہم نے واردات مل کر کی تھی اور وہ مجھے چکما دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب اسے

ہور ہی تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دل سینہ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنی سانسوں کی رفتار پر قابو پایا اور کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے کار کے گلوڈ کیارٹمنٹ میں سے فورٹی فائیو کیلیپر کا پستول اٹھایا، ایک کھٹکے کے ساتھ اس کے میگزین کو باہر نکالا اور اسے چیک کرنے لگا۔

میگزین لوڈ تھا۔ اس نے ایک کھٹکے کے ساتھ میگزین کو واپس اپنی جگہ پر فٹ کر دیا اور ایک راؤنڈ کو چیمبر کر لیا۔ پھر اس نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور اس کا رخ اس طرح پھیر لیا کہ پارکنگ لائٹ اس کی نگاہ میں رہے۔

اس چلی ڈاڑھی والے دبلے پتلے دراز قامت کو باہر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ پارکنگ لائٹ میں داخل ہوا تو پینٹنگ اس کے ہاتھ میں تھی۔ کارل غور سے دیکھتا رہا کہ وہ کس کار میں سوار ہو رہا ہے۔ پھر جب وہ کار پارکنگ لائٹ سے نکلی تو کارل نے محتاط فاصلے سے اس کا پیچھا شروع کر دیا تاکہ اس شخص کو یہ احساس نہ ہونے پائے کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔

کارل سورج کی تیز روشنی میں بار بار آنکھیں میچ رہا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے میچھے ہوئے تھے جس سے اس کے چہرے کے نقوش بگڑ سے گئے تھے۔ اسے یہ سیٹ اپ پسند نہیں آ رہا تھا۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ تعاقب کے اختتام پر وہ شخص لازمی طور پر اسے پہچان لے گا۔ لیکن اس کے علاوہ اس کے پاس اب کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو رقم ہاتھ آتے ہی وہ جتنی تیزی سے ممکن ہو اس شہر سے نکل جائے یا اس شخص کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دے۔ وہ آج تک کبھی اپنی دوسری چوائس کی حد تک نہیں گیا تھا۔ اس لیے یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اس نے اگلی کار کو ایک اپارٹمنٹ کمپلیکس میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ بھی اس کار کے پیچھے اس کمپلیکس میں داخل ہو گیا اور اپنی کار اس شخص کی کار کے برابر میں لے جا کر روک دی۔ اس وقت وہ شخص اپنی کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا۔

کارل نے پھرتی دکھائی اور اچھل کر اپنی کار سے باہر آ گیا۔ ساتھ ہی اپنے پستول کی نال اس شخص کی پیٹھ میں گاڑ دی۔ ”میں یہ چیز یا کی پینٹنگ لے رہا ہوں اور تم پلٹ کر دیکھنے کی کوشش مت کرنا۔“



## کمزور اور طاقتور

انسان اتنا کمزور ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ڈر جاتا ہے اور طاقتور اتنا ہے کہ اپنے اللہ سے نہیں ڈرتا۔ ☆☆☆

یہ کیسا دور ہے؟ یہاں کوئی اپنے دکھ سے اتنا دکھی نہیں جتنا دوسروں کے دکھ سے دکھی ہے۔

مرسلہ۔ مار یہ چودھری، پاک پن شریف ☆☆☆

جج۔ ”جب میں وکیل تھا تو تم نے مرغی چرائی تھی۔ جب میں سرکاری وکیل بنا تو تم نے بکری چرائی اور آج جبکہ میں جج ہوں تو تم نے گائے چرائی۔“  
ملزم۔ ”حضور! اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ساتھ ساتھ میں بھی ترقی کر رہا ہوں۔“

طور پر زمین پر دھکیل دیا گیا اور اس کے ہاتھ پشت پر لے جا کر ان میں چھکڑی پہنادی گئی۔

”شیفرڈ نے میرے ساتھ دغا بازی کی..... ہے نا؟“ کارل نے اس وقت پوچھا جب اسے قدموں پر کھڑا کر کے ایک پولیس کار کی جانب لے جایا جا رہا تھا۔

ستے عام سے سوٹ میں ملبوس دبلے پتلے دراز قامت شخص نے جو درحقیقت ایک سراغ رساں تھا، نفی میں سر ہلا دیا۔ ”نہیں۔ ہم نے لا کر کی چابی ایک میٹل ڈیکٹیٹر کی مدد سے ڈھونڈ نکالی تھی۔ شیفرڈ تو بے حد گھٹنا ثابت ہوا۔ اس نے چپ سادہ رکھی ہے۔ ہم اس سے ایک لفظ بھی نہیں اگلا سکے جبکہ دوسری طرف تم نے ہمیں وہ سب کچھ بتا دیا جو ہم جانتا چاہتے تھے۔“

یہ سن کر کارل نے قہقہے لگانا شروع کر دیے۔ اس کے منہ سے قل قل کی آوازیں سن کر سراغ رساں کو یوں محسوس ہوا جیسے کارل کو ہارٹ ایک ہور ہا ہے۔

ادھر کارل پر ہسٹریائی کیفیت طاری تھی۔ وہ کبیری چڑیا کی پینٹنگ کے بائیس ٹکڑے سوچ رہا تھا کہ اس کی خود کی چھبھاہٹ کس طرح اسے پنجرے میں لے آئی ہے تو اس کے قہقہے اس پر بھاری پڑنے لگے۔

اور پھر تیس لاکھ ڈالر کی رقم ہاتھ سے نکلنے کے غم میں اور حراست میں لیے جانے کی جھنجلاہٹ پر اسے حقیقت میں دل کا دورہ پڑ گیا اور وہ سینہ تھامے پولیس پیٹروں کی کار کی عقبی نشست پر ڈھیر ہو گیا۔

کسی صورت اس رقم میں سے ایک دھیلا بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔“

کارل نے ایزی ریٹل بلڈنگ سے ایک بلاک کے فاصلے پر کار ایک پارکنگ اسپاٹ پر روک دی۔ اس نے ایک جیبی چاقو کی مدد سے پینٹنگ کے عقبی کینوس کو چاک کر دیا۔ اسے وہاں چابی کی موجودگی کی توقع تھی لیکن چابی کے بجائے وہاں اسے دو چھوٹے الیکٹرانک آبیجیکٹ دکھائی دیے۔

پہلے آبیجیکٹ کو اس نے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ آواز ریکارڈ کرنے کا خفیہ آلہ تھا۔ دوسرے آبیجیکٹ کے بارے میں اسے بعد میں پتا چلا کہ وہ ایک جی پی ایس ٹریکنگ ڈیوائس تھی۔ وہ دیدے بھاڑے حیرت سے ان جسی آلات کو دیکھ رہا تھا اور یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ آلات یہاں کیوں موجود ہیں کہ اسی دوران اس کے کانوں میں سائرن کی آوازیں، بریک لگنے پر ٹائروں کی چرچاہٹ اور آخر میں کار کے دروازوں کے کھلنے اور تیزی سے بند ہونے کی آوازیں سنائی دیں تو اس پر انکشاف ہوا کہ کیا کچھ ہو گیا ہے۔

وہ نگاہیں اٹھائے بغیر سمجھ گیا کہ پولیس والوں نے اسے گھیرے میں لے لیا ہے۔ اس نے خاموشی کے ساتھ اسٹیرنگ وہیل پر سے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے تاکہ وہ صاف طور پر پولیس کی نگاہوں میں آجائیں کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔

”اب کار سے باہر نکل آؤ!“

کارل نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو اسے ستے سے سوٹ میں ملبوس ایک دراز قامت دبل پتلا شخص دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں ایک سروس ریپولور تھا جس کی نال کارل کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔ اس شخص کے چہرے پر سے دھوپ کی عینک، موچھیں اور چنگی ڈاڑھی غائب ہو چکی تھی اور اس کی آواز میں وہ چھبھاہٹ بھی نہیں تھی جو کارل پہلے سن چکا تھا۔ اس مرتبہ یہ آواز سرتلی تھی۔

لیکن اس کے باوجود یہ وہی شخص تھا جس نے نیلامی کے دوران اس سے بڑھ کر بولی لگائی تھی اور زرد چھوٹی چڑیا کی پینٹنگ خریدنے میں اسے مات دے دی تھی۔

اس دراز قامت کے عقب میں درجن بھر باوردی پولیس مین موجود تھے۔ ان سب نے بھی اپنے اپنے ہتھیار نکالے ہوئے تھے اور وہ سب کارل کو اپنی زد میں لیے ہوئے تھے۔

کارل حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کار سے باہر نکل آیا۔ وہ ذہنی طور پر خود کو بے حد ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اسے فوری



نیللی کار گروسری مارکیٹ کی طرف آنے والی نیم دائروی سڑک کے دونوں پہلوؤں میں ایسا وہ کئے درختوں تلے گزرتی مارکیٹ کی جانب آرہی تھی اور چھوٹی سی مارکیٹ میں پہلو پہ پہلو واقع پانچوں دکانوں کے دکاندار چوکنا ہو گئے تھے۔

”اوائے بشیر! سیف صاحب آرہے ہیں۔ ذرا ہوشیاری سے میرا پتہ۔“ ایوب گروسری شاپ کے مالک نے اپنی نگاہ نیلی کار پر مرکوز رکھتے ہوئے ملازم لڑکے کو

انسان جب کوئی کاروبار کرتا ہے تو اس کے نفع و نقصان، اتار چڑھائو غرض ہر پہلو پر غور کر لیتا ہے اور ایک مخصوص مدت گزار کر سودوزیاں کا حساب کتاب بھی کرنے بیٹھ جاتا ہے مگر... جب زندگی سے متعلق سوچنے کی باری آتی ہے تو جانے کیوں نشیب و فراز پر نظر رکھنے کے بجائے تمام پہلوئوں کو نظر انداز کرنا اچھا لگتا ہے اور نشان بے نیازی سے یہ کہنا بھی اچھا لگتا ہے کہ زندگی تو بس آج کی ہے... کل کی کل دیکھی جائے گی... اسی نقطہ نظر کے تحت اس نے بھی اپنی کو اپنا بنائے رکھنے کے لیے تمام زندگی صرف کر دی... لیکن آخر میں ادراک ہوا کہ وہ انسان کس قدر بے بس ہوتا ہے جس کی نہ زندگی اپنی ہے اور نہ ہی زندگی سے وابستہ کوئی رشتہ... یہ کیسا ظلم ہے کہ اس نے رشتوں کو ہی اپنی کل متاع سمجھا مگر... ان رشتوں کے لیے دولت، متاع حیات نکلی۔ لہذا اس نے آخر میں جب زندگی کا گوشوارہ کھنگالا تو سود کا خانہ خالی نکلا... البتہ اس کے چاروں جانب زیست کے اوراق پر زیاں لکھا نظر آرہا تھا... ایسے میں شاید دل کی حکایت ایک اور ہی داستان رقم کر رہی تھی... کہ غرض کی اس دنیا میں غرض سے بے نیازی اچھی نہیں... رشتہ کوئی بھی ہو... تھوڑا سا مفاد عزیز رکھنا پڑتا ہے لہذا پہلے اپنے پیروں کو چادر میں چھپایا جائے پھر کسی کے سر کی فکر کی جائے مگر... ایسا سوچنا اس کی فطرت میں شامل نہیں تھا لہذا ایسا تو ہونا ہی تھا۔

محبت اور ضرورت کو ساتھ لے کر چلنے والے ایک مسافر کی بے سرو سامانی کا منظر

## حکایتیں سودوزیاں

ناہید سلطان اختر

Downloaded From  
Paksociety.com





Handwritten signature or mark in Urdu script.



شکرم ہیں، گاجر ہے، مٹر ہے..... آج تو کس سبزی ہو جائے۔“

چائنا اسٹور کے کاؤنٹر پر کھڑی ادھیڑ عمر چینی مالکہ باہر نکل آئی اور اس نے اسٹور کے باہر کھڑی سوزوکی بولان سے سبزیوں کے بھاری بھر کم تھیلے اتارتے ملازم کو اونچی آواز میں ہدایت کی۔ ”ہری اب بوائے..... فریش ویجی ٹیبل زلدی اتارو، زلدی لگاؤ۔“ گویا کستان میں برسہا برس کے قیام نے اسے اردو بھی سکھادی تھی مگر پھر بھی بعض الفاظ کا تلفظ وہ درست ادا کرنے سے قاصر رہتی تھی جیسے جلدی کو وہ ہمیشہ ”زلدی“ کہتی تھی۔

”او کے میڈم!“ ملازم نے جواب دیا۔  
نیلی کار مارکیٹ کے سامنے آن رکی تھی۔

”آج ویر کر دیا مستان کھان۔“ چینی عورت بولان کے ڈرائیور کو ڈانٹ رہی تھی۔ ”ام اپنا شاپ پر فریش ویجی ٹیبل زلدی مانگتا ہے۔“

سیف الدین گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے تھے۔ بیگم بھی ان کے ساتھ تھیں جو اکثر ہی ان کے ساتھ اس مارکیٹ میں آتی تھیں۔ پانچوں دکاندار کن انکھیوں سے انہیں اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ آج قرعہ قال کس کے نام نکلتا ہے۔ سیف الدین اپنی بیگم کے ہمراہ مارکیٹ کی طرف بڑھے اور دکانوں میں سبزی ترکاری کا طائرانہ جائزہ لینے کو ٹھنک گئے۔ بیگم نے ان کا بازو پکڑ کر کچھ کہنا چاہا اور انہوں نے بیگم کی بات سننے کے لیے اپنا سر دائیں طرف جھکا دیا۔

”ادھر تازہ سبزی ہے۔“ بیگم کی نظریں فاروق کی دکان پر تھیں۔

سیف الدین بیگم کے ہمراہ فاروق چکن اینڈ گروسری کے سامنے جار کے۔ باقی دکاندار مایوسی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ سیف الدین کوئی آسمان سے اتری مخلوق نہیں تھے مگر مارکیٹ کے تمام دکاندار جانتے تھے کہ سیف الدین جن کا ہفتے میں دو تین مرتبہ اس مارکیٹ کا ضرور چکر لگتا تھا جس دکان پر جا کھڑے ہوتے، اس کی اچھی خاصی بکری کروا کے ہی بنتے تھے۔

”سلام علیکم سر..... سلام بیگم صاحب۔“ دکان کا مالک فاروق قرعہ قال اپنے نام کھٹنے پر نہال دکھائی دیتا تھا۔

”وعلیکم السلام..... کیا حال ہے فاروق میاں؟“  
”شکر ہے پر دروگارا..... کرم ہے سرکار کا۔“

”آج تازہ سبزی آگئی ہے؟“

”ہاں جی..... کوشش تو پوری ہوتی ہے کہ صاحب لوگوں کے آنے سے پہلے سبزی پہنچ جائے مگر پھر لہجی کبھی کبھار دیر ہو ہی جاتی ہے..... گاڑی پرانی ہے ناسرکار۔“ فاروق نے ایک نظر دکان کے سامنے کھڑی پرانی ڈائن کو دیکھا۔  
”اپنی تو ہے یار..... کرایہ نہیں دینا پڑتا۔“ سیف الدین بولے۔

”شکر ہے۔“ فاروق نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا پھر گرمجوشی سے بولا۔ ”حکم سرکار..... ساگ ایک دم تازہ ہے..... مجھے پتا ہے آپ ساگ بہت شوق سے کھاتے ہیں۔“  
”بھئی تمہیں کیوں نہ پتا ہوگا بھلا..... بھیدی جو ٹھہرے۔“ سیف الدین مسکرائے۔

”سرکار! بس اس ایوب سے ذرا احتیاط رکھا کریں۔“  
فاروق نے رازدارانہ پوزیشن اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”سنا ہے خفیہ والوں کا آدمی ہے۔ رپورٹیں دیتا ہے کہ کس کے گھر میں کتنی سبزی گئی، کتنا فروٹ اور عتقی چکن۔“  
”ہاں..... مجھے کسی اور نے بھی بتائی تھی یہ بات لیکن ہمیں کیا فاروق میاں..... ہم تو جتنا کھاتے ہیں، اتنا ہی خرچ بھی کرتے ہیں..... کوئی اضافی آمدنی نہیں..... کیا سمجھے۔“  
”جی سر۔“

”ڈرے وہ جس کے ہاتھ کالے ہوں۔“  
”بالکل جناب!“ فاروق نے تائید میں گردن ہلائی۔  
”اچھا پہلے تو تم ساگ نکالو۔“  
”تا کہ یہ لوگوں کو ساگ کھلانے کو بلائیں۔“ بیگم بولیں۔  
فاروق مسکرایا۔

”ارے بھئی جو مزہ لوگوں کو کھلانے میں ہے وہ اکیلے کھانے میں کہاں..... کیوں فاروق میاں؟ اور ہاں، گاؤں سے اصلی گھی لانے کو کہا تم نے کسی سے؟“

”کہہ دیا سر۔“ فاروق ساگ کی اوپر تلے چنی گڈیوں میں سے سیف الدین کے لیے خود بہترین گڈیاں چھانٹنے لگا۔ ”سر! کتنی نکال دوں؟“

سیف الدین نے کچھ سوچا پھر بولے۔ ”ایسا کرو تین گڈیاں ساگ کی نکال دو، تین پانگ کی۔“  
”آئی میری شامت!“ بیگم زیر لب بڑبڑائیں۔

فاروق کے دونوں ملازم باقی گاہوں کو نمٹانے میں مصروف تھے۔

”سر! چکن بھی؟“ فاروق نے پوچھا۔  
”ہاں ہاں چکن بھلا کیوں نہیں..... ہمارے بچے تو چکن کے بغیر کھانا ہی نہیں کھاتے۔“



”بتا دیں سرکار کتنی بنوادوں جب تک آپ بڑی فروٹ لیں گے، چکن بن جائے گی۔“

”ایسا کرو پانچ نکلوا دو۔“ سیف الدین نے کہا۔

”پانچ کا کیا کریں گے، دو فروٹ میں رکھی ہیں نا۔“ بیگم نے ٹوکا۔

”بھئی کام آجائیں گی..... مہمانوں کا آنا جانا بھی تو لگا ہی رہتا ہے۔“ سیف الدین بولے۔

”پانچ سر؟“ فاروق حکم کا اکا بنا کھڑا تھا۔

”ہاں پانچ بنوادو..... تین کڑا ہی دو بارہ بارہ ہیں۔“

”سلیم! صاحب کی تین کڑا ہی دو بارہ بارہ۔“ فاروق نے گردن گھما کر دکان کی عقبی حصے میں مرغ ذبح خانہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہانک لگائی۔

”ٹھیک ہے پاجی۔“ ذبح خانے میں متعین نوجوان نے ایک ذبح شدہ مرغی کے سینے کو چیرا لگاتے ہوئے کہا۔

سیف الدین باقی بڑیاں نکلوانے لگے۔ ”دھڑی پیاز کر دو..... دھڑی آلو.....“

”دھڑی آلو کی کیا ضرورت ہے..... ابھی پڑے بھی ہیں گھر میں۔“ بیگم نے پھر ٹوکا۔

”بھئی بچے چپس شوق سے کھاتے ہیں۔“ سیف الدین بولے۔

”انہیں تو اگر میں اجازت دوں تو سارا دن چپس ہی کھاتے رہیں..... پچھلے مہینے ڈھائی کلو کچپ کی بوتل اڑا گئے سب مل کر۔“ بیگم نے کہا۔

آس پاس کھڑے دوسرے گاہک جنہیں فاروق کے مددگار شمار ہے تھے، سیف الدین اور ان کی بیگم کے مکالمات سن رہے تھے۔

مولی، شلجم، گاجر، گوبھی، سیم کی پھلیاں، ٹنڈے، مٹر، ہری پیاز، شملہ مرچ، سبز مرچ، دھنیا، پودینہ، لہسن، اورک..... سیف الدین نے بھی کچھ وزن کر لیا۔ بیگم بار بار انہیں ٹوکتی رہیں..... اتنا لے کر کیا کریں گے..... گھر میں رکھی تو ہے..... خراب ہو کر جائے گی..... مگر سیف الدین نے ہر طرح کی سبزی خرید ڈالی۔

سبزی کے بعد فروٹ کا سیشن شروع ہوا۔ فاروق بڑی چرب زبانی اور چابک دستی سے انہیں مائل کرنے لگا۔

”سر! ایسا لذیذ کالا کلو سیب پورے سیزن میں نہیں آیا۔“

”اچھا! تو پھر چار کلو تول دو۔“

”ریٹ تو پوچھ لیں۔“ بیگم نے کہا۔

”ریٹ ہو جائے گا بیگم صاحب..... انشاء اللہ زیادہ

”نہیں اوں کا آپ سے۔“ فاروق نے انہیں اطمینان دلایا۔

”اور چار کلو کیوں، بس دو کلو کافی ہیں۔“ بیگم نے کفایت شعاری دکھانی چاہی۔

”ارے بھئی بچے کھائیں گے..... این اپنل اے ڈے کیپس ڈاکٹر اوسے۔“ سیف الدین نے سیب کی بابت انگریزی کہاوت دہرائی۔

”سرکار! کیلا تو دیکھیں۔“ فاروق نے کیلوں کا ایک گچھا اٹھا کر انہیں لپچایا۔

”عمدہ ہے۔“

”باہر کا ہے سر۔“

”تین درجن کر دو۔“

بیگم نے کچھ کہنا چاہا مگر سیف الدین ان کے بولنے سے پیشتر ہی گویا ہوئے۔ ”تو ہیپ کور ات کو کیلے کاشیک بنا کر دیا کر دو..... دہلا پن دور کرنے کے لیے بنانا شیک بہترین ہے..... اور ہاں بھئی، فاروق مالٹوں کا کیا حال ہے؟“

”سر! ریڈ نہ نکلے تو گھر سے واپس بھجوا دیں..... چھ درجن کا پیک ہے، رکھوادوں گاڑی میں؟“

”کیوں بھئی؟“ سیف الدین نے بیگم کو دیکھا۔

”آپ کی مرضی ہے۔“ بیگم کا انداز پسپائی کا تھا۔

”رکھوادو۔“ سیف الدین نے فاروق سے کہا۔

”سر! تازہ ناریل بھی ہے..... پانی سے بھرا۔“

فاروق بولا۔

”بھئی واہ! کیا یاد دلایا ہے تم نے فاروق میاں۔“

سیف الدین بھڑک کر بولے۔ ”دو ناریل بھی نکال دو۔“ پھر انہوں نے بیگم کی طرف دیکھا اور حاضرین پر ایک اچھتی نظر ڈال کر بولے۔ ”ناریل کا پانی پیٹ کے لیے آپ شفا ہے۔“

”آپ کے لیے تو سب کچھ شفا ہی شفا ہے۔“ بیگم ناگواری سے بولیں اور سیف الدین کھیانے ہو کر ہنس دیے۔

مرغیاں بن کر آگئی تھیں۔ سبزی اور فروٹ کا کھانا کھل ہو چکا تھا۔ فاروق حساب کتاب لگا رہا تھا۔ ایک ملازم اس کی معاونت کے لیے آگیا تھا۔ بل بنا کر فاروق نے سیف الدین کی طرف بڑھایا اور ملازم کو سودا سیف الدین کی گاڑی کی ڈکی میں رکھنے کی ہدایت کی۔

سیف الدین نے اپنے کوٹ کی جیب سے چرمی بٹوا نکالا اور فاروق کو ادا تنگی کی۔ فاروق خوش تھا اور آس پاس دکانوں والے اسے رشک بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ مارکیٹ میں سیف الدین جیسے گاہک کم ہی آتے تھے۔ زیادہ تر روز کا روز سودا سلف لینے والے ہی



آجے..... سیف الدین ہفتے میں کم از کم دو مرتبہ تو ضرور خریداری کے لیے آتے تھے۔

تمام سودا سلف ڈکی میں رکھے جانے کا اطمینان کرنے کے بعد سیف الدین نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بیگم سے کہا۔ ”ساگ پکاؤ گی تو منی کو بھی بلا لیتا۔“

”ہاں ہاں، مجھے معلوم ہے۔“ بیگم نے پہلو بدلتے ہوئے قدرے ناگواری سے کہا۔ ”منی کو ساگ پسند ہے۔ کڑا ہی گوشت جتنی شوق سے کھاتی ہے۔ گڑیا کو سندھی بریانی بھاتی ہے۔ کیف نہاری پائے کا شوقین ہے اور طیف کو بھنڈی قیرہ سے عشق تھا.....“ بیگم نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر جملے سمنے لیجے میں بولیں۔ ”کیسے تو آپ کے بھانجے بھانجیوں، بیٹیجے، بیٹیجیوں اور دوسرے رشتے داروں کی پسند بھی گنوا دوں۔“

”بھئی تم تو بات کا بٹنگڑ بنا دیتی ہو۔“ سیف الدین نے واپسی کے لیے گاڑی موڑ لی۔ ”میں نے تو صرف منی کو بلانے کی بات کی تھی۔“

منی سیف الدین کی منجھلی بہن کا پیار کا نام تھا۔ ویسے اس کا اصل نام شہلا تھا۔ تاہم جو سیف الدین سے چھوٹی اور بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھی، دادی بن کر بھی جتنی کہلاتی تھی سب سے چھوٹی بہن عاتکہ کو پیار سے گڑیا کہا جاتا تھا۔ کیف ان کے منجھلے اور طیف چھوٹے بھائی کا نام تھا جو انگلستان جا بسا تھا۔

”بات کا بٹنگڑ بنانے کی کیا بات..... میں تو جب سے بیاہ کر آئی ہوں، آپ کو اپنے بہن بھائیوں کے عشق میں ڈوبے ہی دیکھ رہی ہوں۔“

سیف الدین قہقہہ مار کر ہنس دیے اور گردن گھما کر ذرا کی ذرا بیگم کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ”تم سے عشق نہیں ہے کیا مجھے؟“

”رہنے دیں بس۔“ بیگم گردن موڑ کر گاڑی کی کسٹری سے باہر دیکھنے لگیں۔

”اچھا بھئی اچھا..... ناراض مت ہو..... نہیں بلانا چاہتیں منی کو تو نہ سہی، میں کسی دن اسے فوڈ پارک سے تیار ساگ اور منی کی روٹی خرید کر پہنچا دوں گا۔“

”جتنے پیسوں میں گھر میں سارے لوگوں کے لیے ساگ یک جائے، اتنے پیسوں میں مشکل سے ایک دو کے لیے لے گا۔“ بیگم محترم ہوئیں۔

”بھئی اب کسی کل سانس بھی لو..... نہ منی کو ساگ کی دعوت پر گھر بلانا چاہتی ہو، نہ یہ چاہتی ہو کہ میں اسے پکا یا یا

ساگ باہر سے خرید کر پہنچاؤں۔“ سیف الدین بولے۔ بیگم نے گردن موڑی، شوہر کو خوشنوت سے دیکھا اور شاکی لیجے میں بولیں۔ ”آپ کو تو بس پیسے لٹانے کا بہانہ چاہیے..... جب گھر میں سبزی، گوشت موجود تھا تو کیا ضرورت تھی پھر اتنا سامان خریدنے کی۔“

”گھر میں کسی چیز کی تنگی نہیں ہونی چاہیے۔“

”کچھ آئندہ کی بھی سوچیں۔“

”اللہ مالک ہے..... کتنی دفعہ سمجھایا ہے تمہیں کہ آج اچھا گزارنے کی فکر کیا کرو، کل کا اللہ مالک ہے۔“

”آج کا بھی اللہ ہی مالک ہے اور اللہ نے اسراف کرنے والوں کو.....“ بیگم نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”رک کیوں گئیں..... کہہ دو..... میں شیطان کا بھائی ہوں.....“ ہمیشہ کے انتہائی تحمل مزاج سیف الدین کے لیجے میں گرمی نہیں ٹھنڈک تھی۔ گھر نزدیک تھا، سیف الدین نے اسٹیرنگ وھیل پر سے اپنا ہاتھ اٹھایا اور بیگم کے کندھے پر رکھتے ہوئے بولے۔ ”انسان کو تنگ دل نہیں ہونا چاہیے۔

اللہ نے یہ بھی تو کہا ہے کہ جو اسباب میں نے تمہیں دیا ہے، اسے اپنے بال بچوں اور احباب و اقارب پر خرچ کرنے میں دل چھوٹا مت کیا کرو۔“

گاڑی گھر کے باہر آن رکی تھی۔ بیگم محترم نگاہوں سے سیف الدین کو دیکھ رہی تھیں اور وہ ملازم کو گاڑی سے سامان اتارنے کے لیے بلانے کو ہارن بجار رہے تھے۔ سامان اور بیگم کو اتار کر انہیں دفتر بھی جانا تھا۔

☆☆☆

جی ٹائیپ سرکاری بینک کے چھوٹے دروازے اور بڑے گیٹ کے درمیان چوڑے ستون پر نصب پینل کی تختی پر جلی انگریزی حروف میں سیف الدین احمد کا نام اور سرکاری عہدہ لکھا ہوا تھا۔ یہ تختی دن بھر اس اسٹریٹ سے گزرنے والوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے رکھتی تھی۔ اسٹریٹ میں آسنے سامنے بنے جی ٹائیپ سرکاری بینکوں میں سے اکثر کے دروازوں پر اسی نوعیت کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ کوئی چوٹی، کوئی پلاسٹک کی۔ اس گھر میں شفٹ ہونے کے بعد جب سیف الدین نے گھر کے دروازے پر اپنے نام اور عہدے کی تختی لگوانی چاہی تو ان کی بیگم، شاہانہ نے انہیں لکڑی یا پلاسٹک کی تختی لگوانے کا مشورہ دیا تھا مگر سیف الدین نے سستانہ آزمانے کے بجائے پینل کی مینٹی تختی پر اپنا نام اور عہدہ کندہ کرا کے گیٹ پر نصب کرانا پسند کیا تھا۔ بچت کی پروا کیے بغیر غیر ضروری



چیزوں پر بھی کھلے ہاتھ سے خرچ کرنا سیف الدین کی عادتِ ثانیہ بن گئی تھی۔

بیگم اکثر کہتیں۔ ”نام شاہانہ میرا ہے اور خرچ شاہانہ انداز میں آپ کرتے ہیں۔“

”یہی تو ہماری پہچان ہے۔“ سیف الدین سینہ پھلا کر کہتے۔

سیف الدین کوئی پیدائشی رئیس نہیں تھے، نہ ہی ایک جست میں گریڈ بیس کے افسر بن کر جی ٹاؤنپ سرکاری ہینکلے کے ٹیکن بن گئے تھے۔ ان پڑھ اور مزدور پیشہ باپ کے بیٹے تھے اور تیس سالہ سرکاری ملازمت میں بتدریج ترقی کرتے بارہ سے بیس گریڈ اور دو کروڑوں کے ڈی ٹاؤنپ مکان سے جی ٹاؤنپ سرکاری ہینکلے تک پہنچے تھے۔ بہت لبا سفر تھا..... ان گنت سرد گرم دن..... اور بے شمار اچھی بری یادیں۔

سیف الدین اپنے والدین کے آٹھ بچوں میں جن میں سے دو عالم شیر خوارگی میں ہی انتقال کر گئے تھے، سب سے بڑے تھے۔ ان سمیت تین بھائی حیات تھے اور تین بہنیں۔ باپ معمولی حیثیت کے آدمی تھے۔ کوئی مستقل روزگار نہیں تھا ان کا جو کام مل جاتا کر لیتے اور اس کام سے ملنے والی اجرت سے گھر کا چولہا جلتا تھا۔ کبھی کوئی کام نہیں بھی ملتا تھا ایسے میں گھر کا چولہا ٹھنڈا ہو جاتا اور سیف الدین کی والدہ مجسم حسرت و یاس بنی منتظر رہتیں کہ کب ان کے خاوند کو کام ملے، دو پیسے آئیں اور گھر کا ٹھنڈا چولہا گرم ہو۔

سیف الدین کی والدہ دور اندیش عورت تھیں۔ شوہر کی آئے دن کی بیروزگاری اور عسرت کی زندگی سے انہوں نے یہ سبق سیکھا تھا کہ انسان کو تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہیے۔ تعلیم آدمی کو انسان بناتی ہے اور اچھے برے وقت کام بھی آتی ہے۔ پڑھا لکھا انسان کسی مستقل روزگار پر تو لگ جاتا ہے۔ ان کے اپنے ہی محلے میں کتنے لوگ تھے

ایسے۔ کوئی دفتر میں چپڑاسی، کوئی اسکول میں ٹیچر، کوئی بینک میں کلرک، کوئی کسی افسر کا پکا ڈرائیور۔ ان دنوں نوکری ملنا آج جتنا مشکل بھی نہیں تھا۔ ایف اے، بی اے تو چھوڑو میٹرک پاس بھی کوشش کر کے کہیں نہ کہیں بھرتی ہو ہی جاتا تھا۔ لکھنا پڑھنا بھی اہل اور سستا تھا۔ ماں باپ بچے کا ہاتھ پکڑ کر جاتے اور کسی نہ کسی اسکول میں داخل کر ہی آتے۔ کتابیں سستی، کاپیاں گنی چنی جنہیں اکثر بچے کسی بیگ میں نہیں اپنے سینے سے لگا کر اسکول کالج جاتے اور کسی نہ کسی طرح میٹرک، انٹر، بی اے، بی کام تک پہنچ ہی جاتے۔ نہ بچ بکسوں اور پانی کی بوتلوں کی سلت تھی، نہ

اسکول، کالج، یونیورسٹی کے فخر سے..... بچے پیدل ہی اسکول، کالج آتے جاتے۔ بہت کم ہوتے تھے جنہیں اسکول، کالج جانے کے لیے بس میں سفر کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔

سیف الدین اور ان کے بہن بھائی بھی سرکاری اسکولوں، کالجوں میں اپنے اپنے مقدر اور مقدر کے مطابق لکھ پڑھ ہی گئے۔ سیف الدین کے بعد اوپر تلے دو بہنیں تھیں، ناملہ اور شہلا پھر ایک بھائی کیف الدین، اس سے چھوٹی بہن عالمہ اور آخر میں بھائی طیف الدین۔

گھر کے حالات اور بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہونے کے سبب سیف الدین کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس بہت چھوٹی عمر ہی سے تھا۔ انہیں اپنی ماں کی پریشانیوں کا بھی خیال رہتا تھا۔ ذمہ داری کے اس احساس نے انہیں بچپن ہی سے ماں اور بہن بھائیوں کے لیے کچھ کرنے اور باپ کا ہاتھ بٹانے پر مائل رکھا۔ اسکول سے آنے کے بعد جب ان کے ہم عمر لڑکے محلے کے گلی کوچوں میں آوارہ پھر رہے ہوتے یا کھیل کود میں لگے ہوتے، وہ اپنی والدہ کی توڑنی ہوئی مونگ اور مسور کی دال کی بڑیاں بازار میں جا کر دکان در دکان سپلائی کرتے پھرتے، کبھی تو لیا ٹیکسٹری سے تولیوں کے کناروں کی سلائی کے لیے اپنے سر پر تولیوں کا گٹھا اٹھا کر لاتے اور ان کی والدہ ایک پرانی سلائی مشین پر رات گئے تک لائین کی مدھم روشنی میں تولیوں کے کنارے موڑ کر انہیں مشین کی سلائی لگائے جاتیں۔ بہن بھائی سب سو جاتے مگر سیف الدین ماں کے پاس بیٹھے لائین کی مدھم روشنی میں اپنی کتابیں اور کاپیاں کھولے لکھتے پڑھتے رہتے اور ساتھ ہی سلعے تولیوں کی تہ لگا کر اوپر تلے جمانے میں اپنی ماں کا ہاتھ بھی بٹانے جاتے۔ اپنی ماں سے سیف الدین کو محبت نہیں عشق تھا اور یہ عشق تمام زندگی ان کی قوت بنا رہا۔

آٹھویں جماعت میں سیف الدین نے اسکول سے آنے کے بعد دو پہر تا رات پرچون کی ایک دکان پر گاہکوں کے لیے سودا سلف تولنے کا کام شروع کر دیا۔ ساتھ ہی بڑیوں کی سپلائی اور تولیوں کے بجائے اب بنیادوں کی سلائی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

دسویں کا امتحان دیتے ہی سیف الدین نے اپنے ایک محلے دار کی منت سماجت کر کے ایک پرائیویٹ دفتر میں چپڑاسی کی ملازمت حاصل کر لی اور ماں کے بڑیاں توڑنے اور سلائی کرنے پر پابندی لگا دی۔ انہیں پچاسی روپینا ماہانہ تنخواہ ملتی۔ کچھ والد کا لیتے اور گھر کا دال دلیا چل جاتا۔ مزید



تعلیم کے لیے سیف الدین نے ایک کالج کی شام کی شفٹ میں داخلہ لے لیا تھا۔ بہن بھائی بھی سب پڑھ رہے تھے۔

دن میں ملازمت اور شام کو تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے سیف الدین نے بالآخر بی اے کر لیا۔ بی اے کے بعد انہوں نے ایک سرکاری محکمے میں بارہویں گریڈ کی ملازمت حاصل کر لی۔ چودہ گریڈ میں ترقی ہوئی تو انہوں نے بھاگ دوڑ کر کے سرکاری مکان بھی الاٹ کر لیا۔ ان دنوں سرکاری مکان کی الاٹمنٹ آج کل کی طرح جوئے شیر لانے کے مترادف نہیں ہوتی تھی۔ چھوٹے مکانوں کی الاٹمنٹ کے لیے چھوٹی موٹی سفارش سے بھی کام بن جاتا تھا۔

سیف الدین کو الاٹ کیا جانے والا سرکاری مکان تھا تو معمولی مگر اس کو اثر سے کہیں اچھا تھا جہاں سیف الدین اور ان کے گھر والے اس سے قبل رہتے رہے تھے۔ مکان کا محل وقوع نہایت عمدہ تھا۔ ستارہ مارکیٹ نزدیک، میلوڈی مارکیٹ قریب، آپارہ بھی زیادہ دور نہیں۔ صبح سے رات تک پبلک ٹرانسپورٹ دستیاب ہوتی۔ آس پاس کھیل کے میدان تھے۔ سرکاری اسپتال کے ساتھ ڈسپنسریاں تھیں۔ اسکول تھے، کالج بھی دور نہ تھے۔ مکان میں کمرے تو دو تھے مگر سابقہ الاٹی نے گھر کی داخلہ گاہ کے ساتھ ہی ایک بیٹھک بھی تعمیر کرا رکھی تھی۔ باورچی خانہ، غسل خانہ اور برآمدہ بھی تھا مگر محن بہت کشادہ تھا۔ اتنا کہ آس پاس ایسے ہی مکانوں میں بے سرکاری ملازمین نے اپنے محن میں پورے پورے رہائشی یونٹ تعمیر کروا کے یا تو اپنے ذاتی استعمال میں رکھے ہوئے تھے یا اس یونٹ کو کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔ سیف الدین اور ان کے گھر والوں نے بھی گھر کے خرچ میں کفایت کر کے جلد ہی محن میں دو اضافی کمرے تعمیر کروا لیے۔ ایک کمرے میں کیف اور طیف رہتے، دوسرے میں سیف الدین۔ گھر کے اندر دو کمروں میں سے ایک تینوں بہنوں کے لیے وقف تھا، دوسرا سیف الدین کی والدہ اور والد کے لیے۔ گھر میں کوئی ایسا مہمان آجاتا جسے شب گزارنے کو ٹھہرانا ہوتا تو سیف الدین نہایت خاموشی سے بیٹھک میں اپنا بستر ڈال لیتے۔

☆☆☆

ایم اے کا امتحان دیتے ہی سیف الدین نے شام کے وقت ایک پرائیویٹ دفتر میں جزوقتی ملازمت کر لی۔ دن میں سرکاری ملازمت تو چل ہی رہی تھی بقول ان کی والدہ سرکار کی نوکری تو کھڑے بھی چلتی ہے بیٹھے بھی چلتی ہے۔ جزوقتی ملازمت کی ضرورت سیف الدین کو اس لیے

پیش آئی کہ گھر میں تین بہنیں بیٹھی تھیں۔ انہیں بیاہنا تھا۔ دونوں بھائیوں کی تعلیم جاری تھی۔ کیف یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ طیف ایف ایس سی کر رہا تھا۔ بہنوں میں بڑی ناملہ گریجویٹیشن کے بعد بی ایڈ کر کے ایک اسکول میں ملازمت کر رہی تھی مگر اپنی تنخواہ وہ سیف الدین کی طرح والدہ کے ہاتھ میں نہ دیتی بلکہ اپنے پاس ہی رکھتی۔ البتہ گھر میں کوئی اتفاقی ضرورت آپڑنے پر وہ والدہ کو پیسے دے دیتی تھی۔ اپنے کپڑوں، جوتوں اور کاسٹیکس پر اچھا بھلا خرچ کرتی۔ کبھی چھوٹی بہنوں اور والدین کے لیے بھی کپڑے، جوتے وغیرہ خرید لاتی۔ شہلا ایم ایس سی کر رہی تھی اور تعلیم مکمل کرنے پر لیچررشپ حاصل کرنے کی خواہاں تھی۔ ناملہ کالج کے پہلے سال میں تھی۔

سیف الدین نے تہیہ کر رکھا تھا کہ بہنوں کی شادی ہونے تک خود شادی نہیں کریں گے۔ والدہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ پہلے کم از کم دو بہنوں کی شادی ہو جائے پھر سیف الدین کا گھر بسایا جائے ورنہ اپنے بال بچوں کے چکر میں پڑ کر بھائی اپنی بہنوں کی فکر سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ والدہ ایسا نہ بھی سوچیں تو سیف الدین ایسے نہیں تھے۔ خدا نے انہیں ایسا پسند فطرت سے نوازا تھا۔ وہ ادائل عمری سے اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے لیے زیادہ سوچتے تھے، اپنے لیے کم۔ ان کے لیے وہ اکثر اپنے جائز اور ناگزیر حق سے بھی دستبردار ہو جاتے۔ بازار سے کھانے پینے کی کوئی چیز خرید کر لاتے تو جب تک دوسروں کے منہ میں نہ ڈال لیتے خود کھانا حرام سمجھتے تھے۔ اکثر یہ ہوتا کہ وہ بازار سے اپنی ضرورت کی کوئی چیز خرید کر لاتے اور گھر میں کسی کو پسند آجانے پر وہ چیز زبردستی اسی کو دے دیتے۔ "میں اپنے لیے پھر لے آؤں گا، یہ تم رکھو۔" وہ یہ اصرار کرتے۔

"بھائی..... اس لیے تھوڑی کہا تھا ہم نے کہ اچھی ہے۔" ان کی لائی ہوئی چیز پسند کرنے والا شرمندہ ہو جاتا۔ "میں یہ کوئی کہہ رہا ہوں تم سے کہ تم نے اس لیے کہا تھا..... شاباش رکھو۔" سیف الدین چکار کر کہتے۔

والدین کی ضرورتوں کا سیف الدین کو بے حد خیال رہتا۔ انہیں کسی چیز کی تنگی نہ ہونے دیتے۔ ان میں سے کسی کی طبیعت خراب ہوتی تو اپنی حیثیت سے بڑھ کر اچھے معالج کے پاس لے جاتے۔ والدین کو سرکاری اسپتالوں میں مریضوں کی قطاروں میں کھڑا کرنا انہیں معیوب لگتا۔ شام کو جزوقتی ملازمت وہ اسی لیے تو کرتے تھے کہ گھر میں فراوانی رہے۔ والدین اور بہن بھائیوں کو کسی قسم کی تنگی نہ ہو۔



عید کے خوشمارنگ جولائی 2016ء کے رنگارنگ پاکیزہ کے سنگ

# پاکیزہ

کراچی

ماہنامہ

نگہت سیما نے اعتبارِ وفا کا دکھ یا دل پر اختتام

انجم انصار اور ڈرٹمن بلال کے ناولوں کی نئی اقساط

مدیحہ شاہد کے قلم کا جادو پتھر کا دیس بنا

نایاب جیلانی نے واکیے وفا کے انوکھے باب

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی روح پرور کاوش..... یادوں کی مالا

معروف مصنفہ اور دلنواز شاعرہ

ناہیدہ فاطمہ حسنین

سے ایک شعری نشست

خالہ نسیم کے قلم سے ایک سچا مکمل ناول

رضوانہ پرنس اور عالیہ حرا کی خوب صورت تحریریں

عزیز زبیر کے لیے بطور خاص

سیما بنت عاصم، نزہت جبین ضیا، سحرش فاطمہ،

غزالہ فرخ و دیگر قابل فخر لکھاریوں کی حسین کاوشیں

اس کے ساتھ ساتھ خوب صورت موضوعات و حکایات لیے دل خوش کن سلسلے صرف آپ جیسے خوش ذوق قارئین کے لیے

Stay Tuned To  
Paksociety.com



”امی نے بہت سچی دیکھی ہے۔ اب انہیں آرام ملنا چاہیے۔“ وہ دل ہی دل میں سوچتے۔ اسی لیے انہیں گھر میں اپنی دونوں ملازمتوں کی آمدنی ساری کی ساری خرچ ہو جانے کا ذرا ملال نہ ہوتا۔

نانکھ کا رشتہ آیا اور شادی کی بات چیت طے ہوئی تو والدہ نے نہایت فکر مندی سے کہا۔ ”نانکھ کی بات تو طے کر دی ہم نے۔ شادی کے لیے پیسا کہاں سے آئے گا؟“

”آپ فکرنہ کریں، اللہ مالک ہے۔“ سیف الدین نے والدہ کو تسلی دی۔

”فکر کیسے نہ کروں بیٹا۔ کھینچ تان کر نالکھ اور شہلا کے لیے زیور کا بس ایک ایک سیٹ ہی بنا رکھا ہے یا کبھی چادر نکلیوں کا سیٹ کبھی برتنوں کا کوئی سیٹ خرید کر رکھتی رہی ہوں۔ شادی میں تو سو خرچے ہوتے ہیں..... نالکھ سے کہتے شرم آتی ہے..... وہ کیا سوچے گی، میری شادی کے لیے مجھ ہی سے پیسے مانگے جا رہے ہیں۔“

”آپ اس سے مانگیے گا بھی مت۔“ سیف الدین نے کہا۔

”تو بیٹا پھر کیا ہوگا؟“

”اللہ مالک ہے..... ہو جائے گا۔“ سیف الدین نے والدہ کو تسلی دی۔

سیف الدین نے دفتر میں ساتھیوں کو آمادہ کر کے ایک کمیٹی ڈال لی۔ ان کی ضرورت دیکھتے ہوئے ساتھیوں نے پہلی کمیٹی انہیں کو دے دی۔ کچھ رقم انہوں نے اپنی دوسری ملازمت کے پاس سے ادھار لی۔ نالکھ کی شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد نالکھ نے سسرال سے علیحدہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں کی۔ سرکاری اسکول میں ٹیچر تو وہ تھی ہی۔ ادھر ادھر کہہ سن کر اور وزارت ہاؤسنگ کے چکر لگا لگا کر بالآخر اس نے اپنے نام ایک سرکاری مکان اپنے میکے کے نزدیک ہی الاٹ کر لیا۔ دوپہر کو اسکول سے واپسی پر وہ ماں کے گھر ہی آ جاتی اور دوپہر کا کھانا وہیں سے کھا کر بلکہ کچھ ساتھ لے کر بھی سہ پہر کو اپنے گھر جاتی۔ وہ خوش تھی کہ نیپلی میں اضافہ ہونے کی صورت میں اسے اپنی دوسری ساتھیوں کی طرح بچے کی دیکھ بھال کے لیے کسی قابل بھروسہ ملازمہ کی تلاش میں خوار نہیں ہونا پڑے گا، اس کا میکا پڑوس میں تھا، اس کے مسائل شیئر کرنے کو ہر دم تیار۔

نانکھ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں لگی۔ اس کے پہلے ہی نہیں ڈیڑھ ڈیڑھ، دو دو سال کے وقفے سے پیدا ہونے والے

تینوں بچوں، اس کے میکے میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ نالکھ کو پتا ہی نہ چلا کہ کب، کیسے اس کے تینوں بچے تنہیال کے محفوظ اور مشفق ہاتھوں میں بڑے بھی ہو گئے۔ سیف الدین کو نالکھ کا بیٹا اور دونوں بیٹیاں بہت عزیز رہیں۔ تینوں بچے بھی نانا، نانی، ماموؤں اور خالاؤں سے بہت پیار کرتے اور بمشکل ماں باپ کے ساتھ اپنے گھر جانے کو تیار ہوتے تھے۔

شہلا کی شادی نالکھ کی شادی کے تقریباً ڈھائی سال بعد ہوئی اس کی سسرال پنڈی میں تھی۔ کاروباری گھرانہ تھا۔ مالی طور پر خوشحال۔ شہلا کا شوہر ہر ہفتے اپنی ذاتی کار میں شہلا کو اس کے میکے والوں سے ملوانے کے لیے اسلام آباد لاتا۔ کبھی کبھی وہ اور شہلا ایک آدھ دن کو رک بھی جاتے۔ سیف الدین اور ان کے گھر والے دونوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے بلکہ ان کے رکنے پر نالکھ اور اس کے شوہر کو شکایت کا موقع نہ دینے کے لیے سیف الدین کی والدہ ان دونوں کو بھی اپنے ہاں بلا لیتیں۔ گھر میں رونق ہو جاتی۔ سیف الدین اپنا کرا نہایت خاموشی سے مہمانوں کے لیے چھوڑ کر بیٹھک میں اپنا بستر لگا لیتے۔ انہیں والدہ اور گھر والوں کی خوشی نہایت عزیز تھی۔

نانکھ تعلیم مکمل ہونے سے پہلے شادی کرنے کے حق میں نہ تھی اور سیف الدین چاہتے تھے کہ آخری بہن بھی اپنے گھر کی ہو جائے تو پھر خود اپنا گھر بسائیں۔ والدہ اور دونوں شادی شدہ بہنیں بھی یہی بہتر سمجھتی تھیں کہ سیف الدین کی شادی عائلہ کی شادی کے بعد ہو۔ خدشہ یہ تھا کہ سیف الدین کی بیوی خدا جانے کس مزاج کی ہو۔ عائلہ کی شادی پر انہیں کچھ خرچ ہی نہ کرنے دے۔

مگر ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ نالکھ کی نظریں بہت دنوں سے اپنے شوہر کی ایک سیکنڈ کزن پر کیف کے لیے تھیں۔ لڑکی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ خوش حال گھرانہ تھا۔ جی سکس میں لڑکی کے باپ کا دس مرلے پر دو منزلہ مکان تھا جس کا ایک حصہ انہوں نے کرائے پر اٹھا رکھا تھا، دوسرے میں خود رہتے تھے۔ لڑکی کے باپ کا قسطوں پر موٹر سائیکل فروخت کرنے کا کاروبار بھی تھا۔ اکلوتی بیٹی کی شادی وہ ایسے نوجوان سے کرنا چاہتے تھے جو گھر و اماد بن کر رہے۔

کیف کو سیف الدین نے ایک سرکاری محکمے ہی میں ملازم کرا دیا تھا اور کیف نے سرکاری مکان کی الاٹمنٹ کے لیے درخواست بھی جمع کرا دی تھی لیکن اب پہلے والی بات نہ رہی تھی۔ سرکاری مکان کی الاٹمنٹ ملنا ہنوز دلی دور است والا۔ حاملہ بن چکا تھا۔ برسوں انتظار کرنا پڑتا پھر بھی سرکاری



اسی بات میں سے نائلہ..... عزت نفس اور انا کی بھی کوئی اہمیت ہوتی ہے۔ لوگ بیٹیوں کو گھر سے رخصت کیا کرتے ہیں کیا ہم کیف کو رخصت کریں گے؟“

”سوری بھائی..... مانند نہ کیجیے گا..... کیف کو ایک نہ ایک دن تو رخصت ہونا ہی پڑے گا..... جب آپ کی اپنی بیوی، اپنے بچوں ہوں گے تو پھر کیف کیا شاید بھی کو آپ کے گھر سے جانا پڑے گا..... ویسے بھی یہ سرکاری مکان ہے۔ ایک نہ ایک دن آپ کو بھی چھوڑنا پڑے گا..... کیف بے چارہ چھوٹی مٹی تنخواہ میں کیو گھر بنائے گا اپنا گھر..... ایسا رشتہ قسمت سے ملتا ہے۔ ایک ہی بیٹی ہے اپنے ماں باپ کی..... کیف سے اس کا رشتہ ہو جائے تو کبھی کیف کی تو لاٹری نکل آئی..... سیف بھائی! آپ آخر کب تک سپورٹ کریں گے چھوٹے بھائیوں کو..... آخر آپ کی اپنی بھی تو زندگی ہے۔“

مکان ملے کیا شناخت نہ ہوتی۔ سیف الدین سے ماٹری شادی کے بعد اپنا گھر بسانے کا عندیہ ملنے پر نائلہ نے والدہ سے کہا۔ ”امی پھر تو وہ رشتہ ہاتھ سے گیا۔ کب سیف بھائی کی شادی ہوگی اور کب کیف کا نمبر آئے گا۔“

”ارے تو پھر پہلے کیف ہی کی کر دو۔“ والدہ بولیں۔

”سیف بھائی کیا سوچیں گے؟“ نائلہ نے کہا۔

”نو بھلا اس نے کیا سوچنا ہے۔ وہ خود ہی تو نائلہ کے بعد شادی کرنے کی ضد لگا کر بیٹھ گیا ہے۔“

”ضد نہیں امی، بھائی ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ آنے والی تو آتے ہی میاں کی جیب پر قابو کرتی ہے۔ اچھا ہے پہلے نائلہ ہی کی ہو مگر مجھے ڈر ہے کہ پہلے نائلہ پھر سیف بھائی کے چکر میں اس لڑکی کا رشتہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔“

”میں سیف سے بات کرتی ہوں۔“

”کیا کہیں گی ان سے؟“

”یہی کہ اچھا رشتہ ہے، کیف کو نمنا دو..... آخر بھائیوں کو بھی تو سیف ہی نے نمنا ہے۔“

”ٹھیک ہے، آپ بات کریں۔“

”تم بھی بیٹھنا، تمہارے سامنے کروں گی میں اس سے بات۔“

سیف الدین نے سنا تو کچھ نگر مند سے دکھائی دینے لگے۔ ”آپ دیکھ لیں، امی سوچ لیں، کیف کے بغیر رہ لیں گی آپ۔“

والدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”مشکل تو ہو گا میرے لیے اس کے بغیر رہنا۔“ والدہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ارے امی، کیف کون سا کوئی سمندر پار جائے گا۔ اسی شہر میں ہوگا۔ جب آپ کا جی چاہے آپ چلی جایا کیجیے گا اس کے گھر اور وہ تو خیر سے روز ہی آسکے گا آپ سے ملنے..... یہ تو دیکھیں اس کا مستقبل بن جائے گا۔ یہاں اسلام آباد میں تو جس کے پاس اپنا ذاتی گھر ہے، کبھی اس کا تو مستقبل محفوظ ہے۔ ایک ہی بیٹی ہے اپنے والدین کی..... گھر اول و آخر اسی کو ملے گا۔“

”کیا کہتے ہو بیٹے؟“ والدہ نے سیف الدین کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”کیف سے پوچھیے..... ہو سکتا ہے وہ گھر داماد بنا پسند نہ کرے۔“

نائلہ مسکرائی۔ ”ارے بھائی ایسے پرکشش رشتے سے کوئی بے وقوف ہی اتار کرے گا۔“

نائلہ کا جذباتی مکالمہ کام دکھا گیا۔

”کیف سے بات کرو..... اگر وہ راضی ہے تو ٹھیک ہے۔“ سیف الدین نے نیم دلی سے کہا۔

کیف سے بات کی گئی تو اس کے دل میں تو لڈو بھوٹ پڑے لیکن گھر والوں پر اپنی سعادت مندی ظاہر کرنے کو اس نے کہا۔ ”سیف بھائی سے پہلے!“

”ارے تو کیا ہوا..... ان کی بھی ہو جائے گی..... کس صحفے میں لکھا ہے کہ بڑے بھائی سے پہلے چھوٹے کی نہیں ہو سکتی..... آخر سیف بھائی بھی تو پہلے چھوٹی بہن کی شادی کرنا چاہتے ہیں کہ نہیں۔“ دلیل دی گئی۔

دلیل نہ بھی دی گئی ہوتی تو کیف اس نادر موقع کو گنونا نہیں جانتا تھا۔ وہ تو چشم تصور سے خود کو لڑکی کے باپ کے میٹر سائیکلوں کے شور و م میں فیگر کی کرسی پر جھولتے دیکھ رہا تھا۔ نائلہ نے لڑکی والوں سے بات چیت کی۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی کی شادی شریف اور قابل اعتبار گھرانے میں ہو۔ نائلہ کا گھرانہ ان کے نزدیک شریف بھی تھا اور قابل اعتبار بھی۔ چٹ پٹ معاملات طے پا گئے۔ نائلہ کی سسرال میں اپنے گھرانے کا اعتبار مزید بڑھانے اور کیف کی شادی پر اپنے گھر والوں کے ارمان پورے کرنے کی خاطر سیف الدین نے بھاگ دوڑ کر کے اپنے جی پی فنڈ سے قرضہ لیا اور کیف کی شادی دھوم دھام سے کی۔ ذہن رخصت ہو کر سسرال آئی، چند دن سسرال اور میکے میں آمدورفت جاری رہی پھر کیف مستقل طور پر اپنی بیوی کے سیکے میں شفٹ ہو گیا۔ والدہ اور والد دونوں ہی بیٹے کو



رخصت کر کے بہت دل گرفتہ رہے۔ ان کا رنج بٹانے کو نائلہ ایک دو دن نہیں، کئی ماہ تک اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ میکے میں رہی۔ سیف الدین نے ان کی مہمان داری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ان کے ہونے سے والدہ اور والد دونوں ہی کا دل بہلا رہتا تھا۔ شروع شروع میں کیف روزانہ اپنی بیوی کے ساتھ گھر والوں سے ملنے کے لیے آتا رہا پھر ایک آدھ دن کا وقفہ دینے لگا اور یہ وقفہ بتدریج بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس کی اور اس کی بیوی کی خاطر مدارات سوا ہوتی رہی۔

☆☆☆

سیف الدین اپنی صلاحیت سے ایف پی ایس کے ذریعے اٹھارہویں گریڈ میں پہنچ گئے تھے۔ تنخواہ کے ساتھ مراعات میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اب وہ ایف ٹائپ مکان کی الاٹمنٹ کا استحقاق رکھتے تھے بلکہ الاٹمنٹ دینے والے ارباب اختیار کی نظر کرم انہیں دو درجہ اوپر تک کی سرکاری رہائش گاہ بھی دلوا سکتی تھی مگر اپنی اور گھر والوں کی سہولت کے پیش نظر سیف الدین نے بڑے مکان کی الاٹمنٹ کے لیے کوشش نہیں کی۔ جس مکان میں وہ رہ رہے تھے وہاں انہیں بہت فائدے تھے۔ اس کا محل وقوع مثالی تھا۔ بس اسٹاپ گھر کے دروازے سے بمشکل بیس قدم کے فاصلے پر تھا۔ بازار، اسکول، کالج، بینک، ڈاکخانہ، اسپتال، کیونٹی سینٹر، سینما ہاؤس، نائلہ کا گھر سبھی کچھ نزدیک تھا۔ نائلہ کے بچے تو سیف الدین کی والدہ اور والد دونوں کی جان تھے۔ اسکول سے اپنے گھر جانے کے بجائے انہی کے گھر آتے اور اپنی ماں کے بھی وہیں آنے کے بعد سب دوپہر کا کھانا کھا کر اپنے گھر جاتے۔ چھٹی کا دن تو تینوں بچے سارا وہیں گزارتے۔ نائلہ اور اس کا شوہر چھٹی کا دن کنوارے عاشقوں کی طرح انجوائے کرتے اور شام کو آ کر بچوں کو لے جاتے۔ بچے بمشکل جانے کو آمادہ ہوتے جو آزادی، پیار اور دیکھ بھال انہیں نانی ماموں کے گھر میں میسر تھی وہ اپنے گھر میں کب ملتی۔ وہاں تو ماں اور باپ دونوں ہی انہیں سختی میں رکھتے تھے۔

عائلہ کا آخری میسٹر تھا اور سردیوں کے دن۔ بارش ہوئی اور سیف الدین کے والد کو ٹھنڈ لگ گئی۔ ایک دو دن کھاسی رہی پھر سینہ جکڑ گیا۔ سانس لینا بھی مشکل ہو گیا۔ گھریلو نوکروں سے طبیعت بہتر نہ ہوئی تو پہلے ڈاکٹر کے ہاں پھر اس کے مشورے پر اسپتال لے جانا پڑا۔ نمونیا تشخیص ہوا۔ چند دن اسپتال میں رہے پھر چل بے۔ صدرہ تو تمام

متعلقین کو تھا مگر والدہ کو جو صدرہ پہنچا وہ ناقابل بیان تھا۔ انہیں جذباتی سہارا دینے کو ساری اولاد ان کے ارد گرد بیٹھ گئی۔ پہلے تک شہلا کا شوہر جو اسے کم ہی میکے میں لاتا لے جاتا تھا نہایت باقاعدگی سے اسے پنڈی سے اسلام آباد لاتا لے جاتا رہا۔ کیف اور اس کی بیوی شام کو بلا تاغہ آ جاتے اور رات کا کھانا کھا کر جاتے۔ نائلہ کا گھر پچھلی گلی میں ہونے کی وجہ سے اسے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ والدہ کا دل بہلانے کو اس نے بچے میکے میں چھوڑ رکھے تھے۔ اسکول سے واپسی پر خود بھی آ جاتی۔ رات کو والدہ کے سونے کے بعد دونوں میاں بیوی اپنے گھر جاتے۔ احباب واقارب میں نائلہ کے شوہر کی اپنایت اور سعادت مندی کے گن گائے جاتے۔ ”داماد ہو تو ایسا..... بیٹوں سے بڑھ کر ساس کا خیال رکھتا ہے۔“

والد کی علالت سے تکلیفیں و تدفین اور بعد کے ہوش ربا اخراجات تک سیف الدین کے بہن بھائیوں میں سے کسی نے ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ جموںوں بھی کسی نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ والد کی موت کے بعد اضافی اخراجات سے وہ کیونکر عہدہ برآ ہوئے تھے۔ یہ بات وہ صرف خود ہی جانتے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک ساتھی سے رقم ادھار لی تھی۔ کیف کی شادی کے موقع پر سرکاری خزانے سے جی پی فنڈ ایڈوانس قرض کی ماہانہ اقساط کی ادائیگی بھی جاری تھی۔ سیف الدین کو سرکاری قرضے کی واپسی کے ساتھ اب دوست سے لیا گیا قرض بھی ادا کرنا تھا۔ والدہ کو فکر میں نہ ڈالنے کی خاطر انہوں نے دوست سے قرضہ لینے والی رقم کا تذکرہ گھر میں کسی سے نہیں کیا تھا اور نہ کسی نے ان سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس کی تھی کہ وہ اضافی اخراجات کیونکر پورے کر رہے تھے۔

عائلہ کی شادی کے لیے سیف الدین نے سرکاری خزانے میں دو ڈول ابھی سے لٹکا دیے تھے۔ ہاؤس بلڈنگ ایڈوانس اور کار ایڈوانس اور ان دونوں قسم کے قرضوں کے لیے انہوں نے جھکے کے ان افسران تک ابھی سے سفارش پہنچانی شروع کر دی تھی جو ان قرضوں کے حصول کے لیے منتظر افراد کی باری آگے پیچھے کر دینے میں کمال رکھتے تھے۔

انسان کچھ سوچتا ہے، خدا کو کچھ اور منظور ہوتا ہے۔ والد کے انتقال کو سال بھی نہ ہوا تھا کہ والدہ کا ہارٹ ٹیل ہونے سے انتقال ہو گیا۔ والدہ کے جانے سے گھر کا سارا نظام ہی بل کر رہ گیا۔ ان کی اصل اہمیت ان کے جانے کے بعد کھلی۔ ان کے ہونے سے کیسی ترتیب اور نظم و ضبط تھا گھر



اب تک چھوٹی موٹی پرانی گاڑی خریدنے کی استطاعت بھی نہ ہونے دی تھی جبکہ دفتر میں ان سے کم گریڈوں والے ساتھیوں کے پاس بھی گاڑیاں تھیں بلکہ بعض کے پاس تو نئی نکور زیرو میٹر گاڑیاں۔ ان کے اپنے بہن بھائیوں میں نائلہ اور شہلا اپنے شوہروں کی گاڑیوں میں نہایت ٹھے سے سفر کرتی تھیں۔ کیف اپنے سر کی دو گاڑیوں میں سے ایک کا مالک بن بیٹھا تھا۔ نائلہ نے ڈرائیونگ سیکھ کر ایک پرانی مہران خرید لی تھی۔ طیف کو کیف نے اپنے سر کے شوروم سے ماہانہ قسط پر ایک نئی موٹر سائیکل دلوادی تھی۔ سب کے پاس اپنی اپنی ٹرانسپورٹ تھی سوائے سیف الدین کے اور انہیں اپنے دوستوں اور دفتر کے ساتھیوں سے اکثر یہ مشورے ملتے رہتے تھے کہ اٹھارہ گریڈ کے افسر ہو کر وہ پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرتے اچھے نہیں لگتے۔ انہیں گاڑی خرید لینی چاہیے۔

کار ایڈوائس اور ہاؤس بلڈنگ لون کے لیے متعلقہ ارباب اختیار تک سفارشیں پہنچوانے کے باوجود سیف الدین کو کار ایڈوائس کے لیے دو سال اور ہاؤس بلڈنگ لون کے لیے تین سال انتظار کرنا پڑا۔ کار ایڈوائس ملا تو ان کے ساتھیوں نے کہا۔ ”سیف الدین صاحب پہلے تو ایڈوائس ملنے کی مٹھائی کھلایے پھر گاڑی خریدنے کا پروگرام بنائیے۔۔۔۔۔ بہت ہو گئی کجوسی۔ پیٹرول اور گاڑی کی مینینٹی ننس کے پیسے بچانے کے لیے آخر کب تک بسوں اور ویگنوں میں سفر کریں گے آپ۔“ سیف الدین مسکرا دیے۔ کچھ بولنے سے گریز کیا۔ ان کے ساتھیوں کو کیا معلوم کہ کار ایڈوائس کے لیے انہوں نے اپنی کس متوقع ضرورت کے لیے درخواست دی تھی۔ خدا نخواستہ نائلہ کی شادی کار ایڈوائس کی منظوری سے پہلے ہو گئی ہوتی تو وہ اپنی ضرورت کہاں سے پوری کرتے۔۔۔۔۔ کیا پھر کسی سے قرض اخذ جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔

طیف تعلیم کے بہانے بیرون ملک جانے اور وہیں سیٹل ہو جانے کے چکر میں تھا۔ ایجنٹ نے لندن میں واقع ایک یونیورسٹی سے جس کا کرتا دھرتا ایک پاکستانی نژاد برطانوی شہری تھا اور مذکورہ ایجنٹ پاکستان میں اس کے لیے کمیشن پر کام کرتا تھا، طیف کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ اور جعلی بینک اسٹیٹمنٹ اور دیگر دستاویزات پر برطانیہ کے تعلیمی ویزے کی درخواست جمع کر رکھی تھی۔ حسن اتفاق ادھر سیف الدین کو کار ایڈوائس ملا، ادھر طیف کے پاسپورٹ پرویزا لگ کر آ گیا۔ سیف الدین کو گاڑی کی

میں۔ وہ کیا گئیں سارے معاملات ہی الٹ پلٹ گئے۔ سیف الدین کو تو یوں لگتا جیسے ان کی حیات کا مقصد ہی گم ہو گیا تھا۔ والدہ کو خوش اور مطمئن دیکھنا ان کی سب سے بڑی چاہ ہوا کرتی تھی۔ والدہ کے انتقال کے بعد دل جیسے خالی ہو گیا تھا۔ اجڑ گیا تھا، ویران ہو گیا تھا۔ چھوٹے بہن بھائیوں کو سولی دینے کے بجائے انہیں خود سولی پانے کی حاجت محسوس ہو رہی تھی۔

بہت دن گھر میں اداسی اور دکھ نے ڈیرے جمائے رکھے۔ نائلہ کے بچے بھی بچھ سے گئے تھے۔ نائلہ چھپ چھپ کر روتی۔ طیف والدہ کی یاد میں شاعری کرنے لگا تھا۔ والدہ کی موت نے اپنی اپنی جگہ ان بھی کو دکھی کر رکھا تھا۔ بالآخر سیف الدین ہی کو حوصلہ کرتا پڑا۔ انہوں نے چھوٹے بہن بھائیوں کو دلاسا دیا، گلے لگایا۔ سر پر ہاتھ رکھا اور انہیں اپنے بڑے پن کا احساس دلایا۔

”میں ہوں نا تم لوگوں کے لیے۔۔۔۔۔ تم میں سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ امی ابو کے جانے سے اس گھر میں تمہاری حیثیت میں خدا نخواستہ کوئی فرق آ گیا ہے۔۔۔۔۔ تم لوگ مجھے اپنے اور بھی نزدیک محسوس ہونے لگے ہو۔۔۔۔۔ میں امی اور ابو کی جگہ تو نہیں لے سکتا تم لوگوں کی زندگی میں مگر انشاء اللہ العزیز میں تمہیں ان کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔“ شادی شدہ بہنوں کو انہوں نے دلاسا دیا کہ وہ، ان کے شوہر اور بچے اس گھر میں اتنے ہی اہم اور چہیتے رہیں گے جتنے والدہ کی زندگی میں ہوا کرتے تھے۔

شادی کے لیے نائلہ کا معیار بہت اونچا ثابت ہوا۔ جو رشتہ آتا، وہ اس میں کوئی نہ کوئی نقص نکال کر اسے مسترد کر دیتی۔ کسی کی اسے شکل پسند نہ آتی، کسی کا قد چھوٹا لگتا۔ کسی کا کنبہ بڑا ہونے پر اعتراض کر دیتی تو کسی کی تنخواہ سن کر ہنس پڑتی۔ خدا کی مہربانی سے مل جانے والی ایک اچھی ملازمت نے اس کا دماغ عرش پر پہنچا دیا تھا۔ اچھے اچھوں کو خاطر میں نہ لاتی، نتیجتاً بہن بھائیوں کی لاکھ کوشش کے باوجود سیف الدین کی خواہش کے مطابق خود ان سے پہلے نائلہ کی شادی نہ ہو سکی اور بہن بھائیوں نے سیف الدین سے کہا۔ ”نائلہ کی شادی کے انتظار میں آپ اپنا وقت کیوں گنواتے ہیں۔ بس اب آپ اپنی شادی کر لیجیے۔“

سیف الدین بیالیس سال کے ہو چکے تھے۔ انہیں سرکاری ملازمت کرتے آکیس سال ہو گئے تھے۔ سرکاری مکان کے کلین تھے۔ پبلک ٹرانسپورٹ سے سفر کرتے تھے۔ ملازمت میں ایمانداری اور گھریلو ذمے داریوں نے انہیں



ان کی سادہ دلی، مروت، والدین کی انتہائی فرماں برداری اور بہن بھائیوں سے ان کے حسن سلوک کے باعث لوگ انہیں فرشتہ کہتے تھے اور وہ اس پر بھی شرمندہ ہوتے تھے۔

سیف الدین کے مقدر میں شاہانہ محبوب لکھی تھیں۔ شاہانہ ان کے ایک کولیگ کی ہمیشہ تھیں۔ ایم اے پاس تھیں اور ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازمت کرتی تھیں۔ ان کی شادی میں خاصی تاخیر ہو چکی تھی اور اس تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ ان سے چھوٹی تین بہنیں رنگ روپ میں اپنی کشمیری ماں پر گئی تھیں جبکہ شاہانہ اپنے ساؤتھ انڈین باپ کا نقش ثانی تھیں۔ بچی رنگت اور پھیلے پھیلے نقوش مگر تھیں بہت سکھ اور بااخلاق۔ ان کے بھائی نے جو سیف الدین کے کولیگ تھے اور ایک عرصے سے ان پر اپنی بہن کے لیے نظریں رکھے ہوئے تھے، یہ سن کر کہ سیف الدین کا گھر بسانے کے لیے ان کے گھر والے لڑکی تلاش کر رہے تھے، ایک روز موقع دیکھ کر سیف الدین کے سامنے اپنی بہن کا ذکر چھیڑ دیا اور انتہائی دل گرفتگی سے کہا۔ ”چھوٹی تینوں بہنوں کی شادیاں ہو گئیں سیف صاحب..... سب سے بڑی ابھی گھر میں بیٹھی ہیں کیونکہ وہ چھوٹی بہنوں کی طرح خوب صورت نہیں مگر کمال کا کھانا پکاتی ہیں۔ ہماری والدہ کا تو عرصہ ہوا انتقال ہو گیا، ان کے بعد اسی بہن نے ہماری ماں کی جگہ لی۔ ملازمت بھی کرتی ہیں۔ خاندان میں ان کے اخلاق کی مثالیں دی جاتی ہیں۔“ موصوف کی تان اس پر ٹوٹی۔ ”کوئی مناسب رشتہ نظر میں آئے تو بتائیے گا سیف الدین صاحب..... نیکی کا کام ہے۔“

سیف الدین کی بہنیں ان کے لیے کوئی خوب صورت، خاندانی، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ترجیحاً انہی کی ہم پلہ افسر لڑکی ڈھونڈ رہی تھیں۔ سیف الدین نے انہیں اپنے کولیگ کی ہمیشہ کے لیے رشتہ لے جانے کی راہ دکھائی۔ سب خوش خوش گئے کہ بھائی نے اپنے لیے خود ہی رشتہ ڈھونڈ لیا تھا مگر منہ بسورتے واپس لوٹے۔ ہر ایک اپنی اپنی مایوسی کا برملا اظہار کر رہا تھا۔

”بھائی! وہ لوگ آپ کے معیار کے نہیں۔“ شہلا نے کہا۔

”کیوں بھئی!“

”آپ ماشاء اللہ انیس گریڈ میں جانے والے ہیں۔ لڑکی کے ابا رینارڈ کلرک اور بھائی آپ ہی کے دفتر میں

سٹری گریڈ میں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“

خریداری کے لیے اپنے گھنے سے طے والا قرعہ طیف کے کام آ گیا۔ طیف خوش خوش برطانیہ چلا گیا۔ بہنیں فخر سے اپنے حلقہ احباب میں بہانے بہانے طیف کے لندن مقیم ہونے کا تذکرہ کرتیں۔ انہیں یقین تھا کہ طیف اب برطانوی شہری بن کر ہی پاکستان واپس لوٹے گا اور اس کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک رشتے کی لائن لگ جائے گی۔

☆☆☆

سیف الدین کے دوست، احباب اور دفتر کے ساتھی ایک عرصے سے ان سے ایک ہی سوال پوچھ رہے تھے۔ ”شادی کب کریں گے؟“ چونکہ شادی میں تاخیر ان کی اپنی رضا سے ہو رہی تھی بلکہ ان کی اپنی رضا بھی کیا، اللہ نے ان کے دل میں ڈالی تھی کہ وہ بہن بھائیوں سے نمٹ کر اپنا گھر بسانے کی سوچیں اس لیے دوست احباب اور کولیگز کا مسلسل یہ سوال انہیں زچ کرنے کے بجائے ان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتا۔ ”کر لیں گے جناب..... جلدی کیا ہے؟“

”جلدی!“ سوال کرنے والا انہیں تعجب سے دیکھتا۔ ”سیف الدین صاحب! بہت دیر ہو چکی ہے۔ آپ کی عمر کے لوگوں کے بچے تو کالج، یونیورسٹی میں پہنچے ہوئے ہیں۔“ ”ہو جائے گی..... ہو جائے گی صاحب..... شادی بھی ہو جائے گی۔“ سیف الدین اپنی شادی کے بارے میں متفکر احباب کو تسلی دیتے۔

”بچے چھوٹے رہ جائیں گے سیف الدین صاحب۔“ یہی خواہوں کے لہجے میں دل سوزی ہوتی۔ ”اللہ مالک ہے۔“

اللہ پر سیف الدین کا یقین اور ایمان بہت بڑا تھا اور یہ اللہ کی مہربانی کے بعد ان کی ان پڑھ ماں کی عطی تھی۔ اللہ سے محبت کو یوں تو انہوں نے اپنی تمام اولاد کے دل میں راسخ کرنے کی کوشش کی تھی مگر پہلی اولاد ہونے کے ناتے سیف الدین کے دل میں اللہ کی محبت راسخ کرنے کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ ان کے بچپن میں وہ انہیں اٹھتے بیٹھتے اللہ کی وحدانیت، اس کی عظمت، قدرت اور ہیبت کا درس دیتی رہتی تھیں۔ اعمال کے نتیجے میں جنت اور دوزخ کا تصور اس بے پڑھی لکھی ماں نے سیف الدین کے ذہن میں ایسا سودا یا تھا کہ ساری زندگی وہ دامن بچا بچا کر چلنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر بھی خطا کا پتلا ہونے کے ناتے چھوٹی چھوٹی آن گنت غلطیاں ہوتی تھیں، ہوتی رہتی تھیں جن پر وہ خود احتسابی کی منزل سے گزرتے ہوئے اپنے رب کے حضور شرمندہ بھی ہو جاتے تھے۔ اب یہ اور بات تھی کہ



سرے نادر وازہ نہ کھولتی۔ نائلہ اور اس کے بچوں کا تو خیر روزانہ ہی چیکرنگ جاتا تھا پھر بھی سیف الدین چھٹی والے دن کبھی نائلہ، کبھی شہلا اور کبھی کیف اور اس کے بال بچوں کو باقاعدہ دعوت دے کر اپنے ہاں مدعو کر لیتے۔ کبھی سب کو اکٹھا بھی بلا لیتے۔ ویسے سیف الدین تھے انصاف پسند اور فراخ دل۔ اپنے بہن بھائیوں کی طرح بیگم کے میکے والوں کو بھی نہایت احترام اور اہمیت دیتے، بہانے بہانے انہیں بھی اپنے ہاں مدعو کرتے رہتے۔ کبھی حلیم کی دعوت پر، کبھی سری پائے کھانے کے لیے، کبھی اپنی شادی کی سالگرہ منانے تو کبھی کسی اور بیانے۔ بیگم کی ملازمت انہوں نے شادی کے بعد چھڑوا دی تھی۔

شاہانہ کیسی ہی سمجھدار تھی، تمہیں تو عمومی فطرت سے متصف۔ اپنے گھر والوں کا آنا تو انہیں بہت اچھا لگتا۔ سیف الدین کے بہن بھائیوں کا آنا کچھ کھلتا۔ ایک حد ہوتی ہے آنے جانے کی بھی۔ یہاں تو یہ حال تھا کہ آج شہلا توکل کیف! نائلہ اور اس کے بچوں کا ظہور تو صبح شام رہتا تھا۔ سیف الدین بازار سے پھل، مٹھائی، کیک، نمکو، ڈرائی فروٹ غرض اس قسم کی جو چیز بھی لاتے، بیگم کو ان کی پہلی ہدایت یہی ہوتی۔ "نائلہ کے ہاں بھی بھجوادینا۔" اور شاہانہ دل ہی دل میں اس وقت کو برا بھلا کہہ رہی ہوتی جب نائلہ کو سیف الدین کے گھر کے نزدیک سرکاری مکان الاٹ ہوا تھا۔ سیف الدین رات کو کھانے کے بعد بیگم کے ساتھ چہل قدمی کے لیے نکلتے تو ان کی واک نائلہ کے گھر کے دروازے پر جا کر ختمی۔ "آؤ کھڑے کھڑے ہو لیتے ہیں۔" بیگم کو نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑتا اور نائلہ کو بھائی کو دیکھتے ہی کوئی نہ کوئی کام یاد آ جاتا۔

"بھائی! ہمارے ہاتھ روم کی فلش منگی کام نہیں کر رہی ہے، آپ ذرا انکو آڑی والوں سے کہہ تو دیجیے گا پلمبر بھیجے گا۔"

"ٹھیک ہے تم فکر نہ کرو، کل آفس جاتے ہوئے کہہ دوں گا۔"

شاہانہ دل ہی دل میں تمللانے لگتی۔ "جب آؤ یہ عورت بھائی کے ذمے کوئی نہ کوئی کام لگا دیتی ہے۔ اس کا شوہر آخر کس مرض کی دوا ہے۔"

☆☆☆

شادی کے دوسرے سال سیف الدین پہلے بیٹے کے باپ بنے تو انہوں نے بیگم کی زچگی اور بچے کی ابتدائی ضرورتوں پر اپنی استقامت سے بڑھ کر کھلا خرچہ کیا۔ ان کے ایک دوست نے انہیں مبارکباد اس انداز سے دی

"بڑی آپ کو کیسی لگی؟" سیف الدین سے پوچھا۔

"اللہ کی بندی ہے۔"

"ہمارا مطلب ہے صورت شکل؟"

"ٹھیک ہے۔"

"اور عمر..... عمر کا اندازہ لگایا آپ نے؟" نائلہ نے کہا۔

"چھوٹی تین بہنوں کی شادی ہو چکی ہے، ظاہر ہے

تو جوان تو ہونیں سکتی تھی، میری عمر معلوم ہے نا تمہیں۔"

نائلہ نے پہلو بدلتے ہوئے شہلا اور نائلہ کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے..... شریف لوگ ہیں..... بہن کی شادی

نہ ہونے سے پریشان ہیں۔ ہم کسی کی پریشانی گھٹائیں گے

تو اللہ ہمیں بھی آسانیاں دے گا۔" سیف الدین کے دل

میں نائلہ کی فکر پھل رہی تھی۔

"اچھی طرح سوچ لیں سیف بھائی..... بعد میں یہ نہ

کہیے گا کہ تم لوگوں نے مجھے سمجھایا بھجایا نہیں۔"

سیف الدین کے لبوں پر بڑی مدبرانہ سی مسکراہٹ

پھیل گئی۔ "ارے بھئی سوچنا کیا ہے..... شادی سے انسان

کو زیادہ امیدیں وابستہ نہیں کرنی چاہئیں۔ گرجت گئے تو کیا

کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں۔"

"آپ کو ان سے بہتر لوگ مل سکتے ہیں بھائی۔"

"میرے لیے یہی ٹھیک ہیں۔"

سیف الدین کی شادی شاہانہ محبوب سے ہو گئی۔

محبوب ان کے والد کا نام تھا، شادی کے بعد وہ شاہانہ سیف

ہو گئیں۔ شاہانہ متوسط گھرانے سے آئی تھیں۔ رشتوں کا

احترام کرنا جانتی تھیں۔ شب عروسی سیف الدین نے ان

سے ایک ہی مطالبہ کیا تھا۔ "میرے بہن بھائیوں کا اسی

طرح خیال رکھنا جیسے میں رکھتا ہوں۔" شاہانہ سمجھدار تھیں،

اپنے بوڑھے باپ کی یہ نصیحت پلو میں باندھ کر بائبل کے گھر

سے چلی تھیں کہ شوہر کو اپنا بنانا ہو تو چپ کر کے اس کی ہر

بات مانتی جاؤ..... دو سال تم اس کی بات سنو اور مانو پھر باقی

ساری زندگی وہ تمہارے اشاروں پر چلے گا۔

چنانچہ سیف الدین کی شادی کے بعد بھی ان کے گھر

میں شادی شدہ بہنوں، ان کے شوہروں اور بچوں کو وہی

اہمیت حاصل رہی جو ان کی شادی سے قبل تھی۔ کیف اور اس

کی بیوی تو شاہی جوڑی کی طرح اپنے بچوں کے ساتھ

آتے۔ نائلہ کے خنجرے اسی طرح برقرار رہے۔ گھر کے کام

کاج سے اس کا تعلق نہ ہونے کے برابر تھا۔ دفتر سے آنے

کے بعد اس کا زیادہ وقت موبائل اور سوشل میڈیا پر گزرتا۔

چھٹی والے دن وہ لمبی تان کر سوتی اور ظہر سے پہلے اپنے



لیے آدمی کو پچاس فیصد خود غرض ضرور ہونا چاہیے۔“  
سیف الدین ان کا منہ دیکھنے لگے۔ حیرانی سے نہیں،  
ریشک سے نہیں اور قائل ہو کر بھی نہیں بلکہ ترس کھا کر.....  
سبحان اللہ! کیا سیکھا تھا انہوں نے زندگی سے۔  
سیف الدین کی نظروں کی کاٹ ایسی تھی کہ ان کے  
دوست تاب نہ لا کر نگاہیں چراتے جانے کے لیے اٹھ  
کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

اگلے برس شاہانہ ایک بیٹی کی ماں بن گئیں۔ بیٹی خوش  
قسمت تھی۔ طویل انتظار کے بعد سیف الدین کو اپنے گلے  
سے ہاؤس بلڈنگ لون مل گیا۔ بیٹی کی پیدائش اور لون کی  
منظوری آگے پیچھے ہوئی۔ سیف الدین نے بیٹی کا نام فرحانہ  
رکھا۔ شاہانہ بیگم اور ان کے گھر والوں نے سیف الدین کو  
مشورہ دیا کہ ہاؤس بلڈنگ کی مد میں ملنے والے قرضے کی رقم  
سے اسلام آباد کے مضافات میں کسی پرائیویٹ ہاؤسنگ  
سوسائٹی میں رہائشی پلاٹ خرید کر ڈال دیں تاکہ جب وہ  
ملازمت سے ریٹائر ہوں تو ریٹائرمنٹ کے وقت ملنے والے  
واجبات سے اپنے بال بچوں کے لیے اس پلاٹ پر مکان  
تعمیر کر سکیں کیونکہ ریٹائرمنٹ کے بعد سرکاری مکان تو انہیں  
بہر حال چھوڑنا ہوگا اور بچوں میں سے کوئی بھی ان کی  
ریٹائرمنٹ کے وقت اس لائق نہیں ہوگا کہ قواعد کے مطابق  
باپ کو ملی سرکاری رہائش گاہ اس کے نام الاٹ کی جاسکے۔

سسرالیوں کا مشورہ نہایت صائب تھا۔ سیف  
الدین نے دارالخلافہ کے مضافات میں نقشہ پائی نئی  
آبادیوں میں اپنے بچوں کے محفوظ مستقبل کے لیے پلاٹ  
دیکھنا شروع کیے۔ اسلام آباد کے سیکٹرز میں تو ان جیسا کوئی  
آدمی اب پانچ مرلہ زمین کا ٹکڑا خریدنے کا تصور بھی نہیں  
کر سکتا تھا۔ پراپرٹی مافیانے لاکھوں کی زمین کروڑوں تک  
پہنچا دی تھی۔ سرکاری ملازمین کو تھوڑی بہت آس ہاؤسنگ  
فاؤنڈیشن سے ہوتی تھی جو اپنی ناقص کارکردگی سے سفید  
ہاتھی بنا ہوا تھا۔ بڑی امیدوں اور جوش و خروش سے  
فاؤنڈیشن کی اسکیموں میں پیسہ لگانے والے اپنا گھر بنانے  
کا خواب دیکھتے دیکھتے قبروں میں جاسوئے تھے اور  
فاؤنڈیشن زمین ہی واگزار نہ کر پائی تھی۔

دفتر سے چھٹی کے بعد روزانہ سیف الدین پلاٹ کی  
سلاش میں نکل جاتے۔ ایک دو جگہیں پسند آئیں مگر پراپرٹی  
مافیانہ کے انویسٹرز ان کے پسند کردہ پلاٹوں کو یوں چھٹ لے  
گئے جیسے چیل گوشت کو۔

جیسے خدا نخواستہ پر سدے رہے ہوں۔“ بہت مبارک ہو  
سیف الدین صاحب مگر..... آپ نے دیر بہت کر دی۔  
آپ کی ریٹائرمنٹ کے وقت صاحبزادے حد سے حد  
کالج میں ہی ہوں گے..... دیر سے شادی کر کے آپ  
کھانے میں رہ گئے۔“  
”اللہ کی مرضی جناب۔“ سیف الدین نے مسکراتے  
ہوئے متوکل سے انداز میں کہا۔

”ہاں!“ مبارکباد دینے والے نے ایک ٹھنڈی  
سانس بھری۔ ”مرضی تو اسی کی ہوتی ہے مگر اس نے بندے  
کو بھی تو کچھ اختیار دے رکھا ہے نا صاحب..... شادی وقت  
پر ہی اچھی۔“

”جناب! اب وقت کا پہیہ الٹا تو نہیں گھما سکتا میں۔“  
سیف الدین بنا کسی ملال کے بولے اور ملال نہ ہونے کا  
سبب وہ طمانیت تھی جس نے والدین اور بہن بھائیوں کے  
ساتھ ان کے بے لوث، بے غرض سلوک نے ان کے دل  
میں گھر کر رکھا تھا۔

”درست فرماتے ہیں آپ۔“ سیف الدین کے  
دوست نے اپنا ہاتھ ان کے شانے پر رکھ دیا۔ ”وقت کا پہیہ  
تو کوئی بھی الٹا نہیں گھما سکا آج تک..... اصل میں آپ  
نے اپنے شانوں پر ذمے داریوں کا بوجھ بھی تو بہت اٹھا  
رکھا تھا۔“

سیف الدین ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے  
متعلقین کے ساتھ اپنے حسن سلوک کا نہ اپنی زبان سے  
چرچا کرتے ہیں، نہ ہی دوسروں کی زبان سے اس کا ذکر سن  
کر خوش ہوتے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسے دخل در معقولات  
نکھتے ہیں۔

چنانچہ اپنے دوست کی بات پر سیف الدین نے  
بڑے محل سے کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔“

”یہ آپ کی اعلیٰ نظر فی ہے۔“ سیف الدین کے  
دوست پسپائی کے موڈ میں نہ تھے۔ ”آپ کہیں یا نہ کہیں،  
سب جانتے ہیں کہ آپ نے اپنے بہن بھائیوں کے لیے  
بڑی قربانی دی ہے۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا جناب۔“ سیف الدین کو ان کا  
دخل در معقولات ایک آنکھ نہ بھایا۔ ”میرے بہن بھائی اپنی  
صلاحیتوں اور کوشش سے اپنی اپنی منزل تک پہنچے ہیں۔“

”خیر۔“ سیف الدین کے دوست ان کے تاثرات  
دیکھ کر کچھ جھینپ سے گئے اور مطلق ادا کیا۔ ”ہم نے تو  
زندگی سے یہ سیکھا ہے جناب کہ کامیاب زندگی گزارنے کے



"اللہ مالک ہے۔" سیف الدین نے انہیں تسلی دی۔ وہ خاموش ہو رہیں۔ اولاد کی نصیحت کے باعث جو شادی کے بعد دو سال تک موقوفہ رہنے کے بجائے اب ان کی عادت ہی بن گئی تھی دوم اس لیے کہ سیف الدین ان کا اور بچوں کا بھی اسی قدر خیال رکھتے تھے جتنا اپنے بہن بھائیوں کا۔ شکایت انہیں تب ہوتی اگر وہ ان کی یا بچوں کی حق تلفی کرتے۔ وہ ایک اچھے شوہر اور اچھے باپ تھے۔

عائلہ کی شادی اور طیف کے ویسے کے متوقع اخراجات کے پیش نظر سیف الدین نے اپنے جی پی فنڈ سے دوبارہ رقم نکلوانے کے لیے بھی درخواست دے دی۔ جی پی فنڈ سے گزشتہ لون کی رقم وہ اقساط میں واپس کر چکے تھے۔ اس مرتبہ چونکہ وہ پچاس سال کی عمر کو پہنچے ہوئے تھے لہذا اس مرتبہ انہوں نے جی پی فنڈ سے ناقابل واپسی رقم کی درخواست دی۔

ہاؤس بلڈنگ لون کی رقم سیف الدین کے ہاتھ میں تھی۔ انہیں امید تھی کہ جی پی فنڈ سے لی جانے والی رقم اور ہاؤس بلڈنگ لون سے سارے اخراجات بخیر و خوبی نمٹ جائیں گے لیکن عائلہ کے سسرال والوں نے شادی سے دو دن قبل جہیز میں صرف بیڈروم فرنیچر نہیں، ڈرائنگ روم فرنیچر کی بھی فرمائش کر کے سیف الدین کو کشمکش سے دوچار کر دیا۔ اپنی عادت کے مطابق انہوں نے عائلہ کے جہیز کی ہر چیز نہایت عمدہ اور معیاری خریدی تھی۔ کافی خرچہ ہو گیا تھا، اب ان کا بجٹ عائلہ کے سسرال والوں کی فرمائش کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے پاس اب اتنی رقم تھی جس سے وہ عائلہ کی برات اور طیف کے ویسے کی دعوت ہی نمٹا سکتے تھے۔ دعوت کا انتظام بھی انہوں نے ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں کیا تھا۔ وقت کم تھا کہ سوچنے کا موقع نہیں تھا کہ عائلہ کی سسرال کی طرف سے کی جانے والی فرمائش کون پوری کرے گا۔ سیف الدین کے سوا کوئی اس فرمائش کو سنجیدگی سے لینے کے لیے تیار نہ تھا۔

"بڑے لالچی لوگ ہیں۔" نائلہ تنک کر بولی۔  
"عجیب بات ہے لوگ یوں بھی مانتے ہیں۔" کیف نے کہا۔

"فقیر کہیں کے۔" شہلانے نیا گواری ظاہر کی۔  
"باہر یہ سب کچھ نہیں ہوتا..... ٹھیکس گاڈ! میں یہاں سے نکل گیا ہوں۔" طیف نے شانے اچکائے۔  
"انہوں نے اپنی اصلیت ظاہر کر دی، بھائی ان سنی کر دیں۔" عائلہ نے کہا مگر ان سنی نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ

سیف الدین پلاٹ دیکھتے ہی پھر رہے تھے کہ نائلہ کی سفارت کاری سے عائلہ کے لیے ایک ہم پلہ رشتہ آ گیا اور ادھر طیف کی طرف سے خوشخبری ملی کہ ایک برٹش نیشنل گھرانے کی لڑکی سے شادی کرنے کے بعد وہ اپنے خاندان والوں سے دلہن کو ملوانے اور دعوت و ایسہ کے لیے پاکستان آنے کے لیے رخصت سفر باندھ رہا تھا۔ سیف الدین نے پلاٹ دیکھنے کی مہم فوراً ترک کر دی۔ بس یہی آخری دو بہن بھائی تھے جن کی فکر انہیں اکثر مضطرب کر دیا کرتی تھی۔ پلاٹ کا کیا تھا وہ تو پھر بھی مل جاتا۔ صد شکر کہ مذکورہ رشتہ عائلہ کو خود بھی پسند آ گیا تھا۔ رشتے کی منظوری میں عائلہ کی پسند کے ساتھ نائلہ کا اسے یہ سمجھانا بھجانا بھی کام کر گیا تھا کہ بھائی اگر ہاؤس بلڈنگ لون کی رقم سے پلاٹ خرید بیٹھے تو بعد میں اگر کوئی دوسرا معقول رشتہ آیا بھی تو شادی کے اخراجات کون اٹھائے گا۔ عائلہ خود تو اتنی ہوشیار تھی کہ اس نے صاف اعلان کر رکھا تھا کہ اپنی شادی پر وہ اپنی جیب سے ایک پیسا بھی نہیں خرچ کرے گی۔ اسے رخصت کرنا بھائیوں کی ذمہ داری تھی۔ "بھائیوں" تو وہ نکلنا کہتی تھی۔ کیف اپنی زندگی میں کن تھا، طیف حالانکہ جزوقتی ملازمت سے پاؤنڈز کما رہا تھا مگر کبھی پھوٹی کوڑی بھی نہ بھیجی تھی اس نے۔ لے دے کہ سیف الدین ہی رہ جاتے تھے۔

عائلہ کا رشتہ منظور ہو گیا۔ شادی کی تیاریاں چھڑ گئیں۔ سیف الدین نے طیف سے بھی کہہ دیا کہ وہ اپنی دلہن کے ساتھ پاکستان آنے کی جلد تیاری کرے تاکہ عائلہ کی رخصتی اور اس کا ویسہ ایک ہی تقریب میں نمٹ سکے۔ شاہانہ جو چوتھی بار ماں بننے والی تھیں، تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے سیف الدین سے بولیں۔ "کیا بات ہے، آپ پلاٹ نہیں دیکھ رہے ہیں؟"

"بھئی وہ..... عائلہ کی شادی اور طیف کا ویسہ کرنا ہے۔ اگر پلاٹ خرید لیا تو ان کی شادی اور ویسے کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔"

"آپ ہی نے ٹھیک تو نہیں لے رکھا۔ عائلہ خود بھی کماٹی ہے اور طیف بھی وہاں پارٹ ٹائم جاب کرتا ہے۔ کچھ تو جمع ہو جی ہوگی اس کے پاس..... دوسرے بہن بھائیوں سے کہیے وہ بھی کچھ ہاتھ بٹائیں۔"

"کوئی بات نہیں شاہانہ..... بس اب یہ آخری آخری ذمہ داریاں ہیں۔" سیف الدین نے نہایت رساں لہجے میں کہا۔  
"کچھ اپنے بچوں کے لیے بھی سوچیں۔" بیگم بولیں۔



عزت کا معاملہ تھا اور سسرال میں عائکہ کے مستقبل کا بھی۔ سیف الدین کے دل میں تو یہ تھا کہ عائکہ کو صرف ڈرائنگ ہی نہیں ڈرائنگ سیٹ بھی دیا جائے۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے کیف سے ادھار مانگا۔

”بھائی! میرے تو اپنے حالات..... پتا نہیں کیسے اللہ عزت سے گزارہ کر رہا ہے۔“ کیف نے لاچاری ظاہر کی۔  
عائکہ سے بات کرنے سے پہلے سیف الدین کو بار بار شرمندگی کا احساس ہوا کہ وہ چھوٹی بہن سے قرض مانگنے جا رہے تھے۔ نائلہ کفایت شعار تھی۔ میاں بیوی دونوں کھاتے تھے، خوشحال تھے۔ نائلہ نے ایک سرکاری ہاؤسنگ اسکیم میں اپارٹمنٹ بک کر رکھا تھا جس کی سہ ماہی قسط بینک میں جمع کروانے کے لیے وہ گزشتہ ڈیڑھ برس سے سیف الدین کی خدمات لیتی آ رہی تھی۔ ابھی دو دن پہلے ہی اس نے سیف الدین سے کہا تھا، اپارٹمنٹ کی اگلی سہ ماہی قسط کی رقم وہ ایک دو دن میں بینک سے نکلوا کر نہیں دے دے گی تاکہ وہ قسط اس بینک میں جمع کروا سکیں جو کہ ان کے دفتر کے نزدیک ہی واقع تھا۔ سیف الدین کو امید تھی کہ وہ انہیں رقم ادھار دے دے گی اور وہ قدرے تاخیر سے اپارٹمنٹ کی قسط جرنانے کے ساتھ ادا کر دیں گے مگر جب انہوں نے اس سے رقم ادھار مانگی تو وہ بولی۔ ”بھائی! میں نے تو قسط جمع کر دادی۔“

”اچھا۔“ سیف الدین چونکے۔

”ہاں..... میں نے سوچا آپ عائکہ کی شادی اور طیف کے ویسے کے سلسلے میں ویسے ہی بہت مصروف ہیں۔ آپ کو کیا تکلیف دوں۔ اس لیے میں نے خود ہی جا کر قسط جمع کرادی۔“ اس کی آنکھیں اور چہرے کے تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

عائکہ کے سسرال والوں کی فرمائش پوری کرنے کے لیے سیف الدین کو پریشان دیکھ کر ان کی بیگم نے اپنا زیور ان کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو سیف الدین بیگم کا زیور نظر بھر کر بھی نہ دیکھتے مگر اس وقت عزت کا معاملہ تھا۔ سیف الدین نے عائکہ کو نہ صرف ڈرائنگ روم فرنیچر بلکہ ڈرائنگ ٹیبل سیٹ بھی دیا۔ عائکہ عزت سے سسرال کی ہوئی۔ طیف اپنی بیوی کے ساتھ دعوتیں اڑا کر واپس چلا گیا۔

☆☆☆

سیف الدین کی اگلے گریڈ میں ترقی ہوئی تو بیگم نے ان سے نہایت لگاؤ سے کہا۔ ”دیکھیے، میں نے شادی

سے اب تک آپ سے کوئی فرمائش، کوئی خمد نہیں کی..... ہاؤس بلڈنگ لون سے آپ نے اپنا گھر بنانے کے لیے کوئی پلاٹ خریدنے کے بجائے بہن اور بھائی کو منادیا، میں کچھ نہیں بولی لیکن اب آپ کو بڑا گھر لینا پڑے گا۔ آپ انیسویں گریڈ کے افسر ہیں تو چودہ گریڈ کے مکان میں کیوں رہیں ہم۔“

”کیا فرق پڑتا ہے..... آج نہیں تو کل جب میں رہتا ہوں گا تو مکان چھوٹا ہوا بڑا چھوڑنا تو پڑے گا..... بچوں میں کوئی اس وقت تک سرکاری نوکری میں نہیں ہوگا جو مکان اس کے نام کروا دیا جائے۔“

”اسی لیے تو کہتی ہوں چند سال ہم بھی سرکاری پگھلے میں رہنے کا مزہ اٹھالیں۔ اتنا بڑا تو لان ہوتا ہے جی ٹائپ مکان میں کہ مہمان آجائیں تو لان میں بیٹھ کر ہی چائے پی لی۔ وہیں دعوت کا بندوبست کر دیا۔ ایک نہیں دو دو تین تین گاڑیاں کھڑی دیکھی ہیں میں نے جی ٹائپ مکانوں میں۔“

سیف الدین دھیرے سے مسکرائے۔ ”ہمارے پاس تو موٹر سائیکل بھی نہیں پھر کیوں پریشان ہوتی ہو۔“

”آپ بڑا گھر تو لیں، گاڑی بھی آجائے گی۔“

”کہاں سے؟“ سیف الدین بے اختیار چونکے۔

”میں نے سوچ رکھا ہے۔ بڑا گھر ہوگا تو گاڑی ضرور خریدنی ہے۔ میں نے کمیٹی ڈال رکھی ہے۔ جب آپ بڑا گھر لیں گے تو میں کمیٹی لے لوں گی، بینک سے لیز پر گاڑی خرید لیجیے گا..... چودہ پندرہ گریڈ والے گاڑیاں دبائے پھرتے ہیں اور ایک آپ ہیں کہ انیس گریڈ کے افسر ہو کر بھی دیکھوں میں سفر کرتے ہیں۔“

”ارے بھئی تو اس میں کون سی کوئی شان گھٹ جاتی ہے میری۔“ سیف الدین نے کہا۔

”شان گھٹے یا بڑھے، اب گاڑی لینا ہے۔ بچے ترستے ہیں اپنی گاڑی کے لیے۔“

”اللہ دے گا..... ضرور دے گا۔“

”برائے مہربانی، آپ بڑے مکان کے لیے اپلائی کر دیں۔“

”دیکھو، یہاں نائلہ ہمارے نزدیک رہتی ہے۔ کیف کا گھر نزدیک ہے۔“ سیف الدین نے حسب عادت نہایت نرم لہجے میں کہا۔

”معاف کیجیے گا، اتنی زندگی تو آپ اپنے بہن بھائیوں کے لیے جی لیے۔ اب کچھ اپنے بچوں کے لیے بھی جی لیجیے!“ آخری فقرہ شاہانہ نے گز گز ادا کیا۔



”ہاں۔“ سیف الدین ان کی بات سے، اختلاف نہ کر سکے۔ ”مگر ہم کوئی غیر قانونی کام نہیں کریں گے۔“  
”آپ کی مرضی۔“

سروٹ کوارٹر میں ایک غریب فیملی رکھ لی گئی۔ مرد محنت مزدوری کے ساتھ سیف الدین کے گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کرتا۔ عورت سیف الدین کی بیگم کا گھرداری میں ہاتھ بٹاتی۔

سیف الدین کا اب بھی اپنے بھائی بہنوں سے پہلے کی طرح مستقل رابطہ رہتا۔ بھانے بھانے سے وہ انہیں کبھی اکٹھے اور کبھی علیحدہ علیحدہ اپنے ہاں مدعو کرتے رہتے۔ کبھی کبھی کوئی بہن اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ان کے ہاں رک بھی جاتی۔ سیف الدین نے گاڑی بھی خرید لی تھی۔ ایڈوانس بیگم نے دیا، باقی بینک سے معاملات طے ہوئے۔ سیف الدین کو ماہانہ قسط ادا کرنا پڑتی۔ گاڑی بڑی تھی، زیرو میٹر تھی۔ سیف الدین کی افسری کے شایان شان تھی۔ انیس گریڈ کے افسر کو چھوٹی موٹی پرانی گاڑی کہاں زیب دیتی۔ بیگم اور بچے بہت خوش تھے اور ان کی خوشی سے سیف الدین بھی خوش تھے۔

☆☆☆

سیف الدین نے ساری زندگی فیاضی سے گزار دی تھی۔ ماں، باپ، بہن بھائیوں کی ہر ضرورت، ہر خواہش کھلے دل سے پوری کی تھی۔ گوان کے وسائل کبھی بھی بے بہا نہ رہے تھے مگر نیت کی راستی نے ان کے محدود وسائل میں غیر معمولی برکت دی تھی۔ گھر کی کوئی ضرورت، اہل خانہ میں سے کسی کی کوئی خواہش ہوتی ان کی جیب خالی ہوتی اور وہ یہ سوچ رہے ہوتے کہ یہ ضرورت کہاں سے پوری ہوگی، اللہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال دیتا۔ کوئی بڑا خرچہ سر پر کھڑا ہوتا والدہ فکر مند ہو رہی ہوتیں کہ یہ ضرورت کیونکر پوری ہوگی، غیب سے کوئی سمیل نکل آتی۔ سیف الدین کو کبھی نہ کہے ہوئے واجبات مل جاتے۔ کبھی دفتر میں ڈالی ہوئی کیمپنی نکل آتی۔ کبھی کار ایڈوانس، کبھی ہاؤس بلڈنگ لون، کبھی جی پی فنڈ سے لی جانے والی رقم ضرورت پوری کرنے کا سامان بن جاتی۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے بعد سیف الدین نے والدہ کا پرس کبھی خالی نہ رہنے دیا۔ زندگی کی روزمرہ ضرورتیں، بہن بھائیوں کے تعلیمی اخراجات، بیماری، مہمان داری، تہوار، شادی بیاہ، لینا دینا سب کچھ اللہ نے بحسن و خوبی پورا کر لیا۔ سیف الدین کا دل اور ہاتھ ہمیشہ کھلے ہی رہے۔ خستہ ان کی فطرت میں تھی ہی نہیں پتھر

سیف الدین ان کا منہ تکتے رہ گئے۔ کیا کمی تھی، بچوں کی زندگی میں۔ بہترین کھانا پینا، بہترین لباس، سرکاری مگر اچھی درس گاہیں، بیگم اور بچوں کی ہر ضرورت، ہر آرام کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے وہ پھر بیگم کو ان سے کس بات کا گلہ لگا جو انہوں نے دہلی زبان ہی سے سہی مگر کیا تو تھا۔

”بچوں ہی کے لیے ہے شاہانہ۔“ وہ فقط اتنا ہی کہہ سکے۔

”بڑے گھر کی کوشش کریں..... اور ہاں، گاڑی نہیں چاہتی کہ میرے بچے گاڑی کے لیے لپچاتے رہیں۔“  
بیگم کی سیف الدین سے یہ دو فرمائشیں پہلی ضد بھی تھی، آخری بھی۔ سیف الدین نے جی ٹائپ مکان کی ایڈمنسٹ کے لیے نہ صرف درخواست داغ دی بلکہ کسی جی ٹائپ مکان اور اسے الاٹ کرانے کے لیے کسی ٹکڑی سفارش کی تلاش میں بھی لگ گئے۔

برس سوا برس تو لگا مگر سیف الدین کو وزارت ہاؤسنگ و تعمیرات میں اپنے ایک شناسا کے توسط سے ایک جی ٹائپ مکان بھی علم میں آ گیا جو جلد ہی اپنے مکین کی رہائش منٹ پر خالی ہونے والا تھا اور حسن اتفاق سے سیف الدین کو ایک ٹکڑی سفارش بھی میسر آ گئی۔ مذکورہ مکان ”سبجیکٹ نوٹیشن“ سیف الدین کو الاٹ کر دیا گیا۔ سیف الدین اپنی فیملی کے ساتھ جی ٹائپ سرکاری پینٹلے میں منتقل ہو گئے۔ انہیں افسوس تھا تو یہ کہ نائلہ کا گھر اب ان کے گھر سے بہت دور نہیں تو پہلے کی طرح بہت نزدیک بھی نہیں رہا تھا۔ بہر حال بڑے گھر میں آکر ان کی بیگم اور بچے کبھی خوش تھے۔ مکان دو منزلہ تھا۔ سروٹ کوارٹر اتنا بڑا تھا کہ ایک کنبہ بڑے آرام سے اس میں رہ سکتا تھا۔ وسیع اور سرسبز لان، کشادہ پورچ، صحن، برآمدے سبھی کچھ تو تھا اس گھر میں۔ مکان کی بالائی منزل پر ایک کمر شاہانہ نے گھر آئے گئے مہمانوں کے لیے گیٹ روم کے طور پر آراستہ کر دیا۔ ہمسایوں کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی اپنا سروٹ کوارٹر کرائے پر اٹھانے کی بات کی تو سیف الدین نے کہا۔ ”یہ نا جائز اور غیر قانونی ہے۔ گورنمنٹ کی طرف سے اپنے ملازمین کو جو مکان الاٹ کیے جاتے ہیں انہیں پورا یا کوئی حصہ کرائے پر چڑھانا غیر قانونی ہے اور اس سے حاصل ہونے والا کرایہ نا جائز رقم۔“

”مگر آس پاس کبھی نے تو چڑھا رکھے ہیں اپنے اپنے سروٹ کوارٹر کرائے پر۔“ بیگم نے سیف الدین سے کہا۔



ہونے پر معترض ہوتیں تو سیف الدین کہتے۔ ”کوئی بات نہیں، پسند ہے تو لے لے دو۔“

خاندان میں کسی کی شادی بیاہ اور عید، بقرعید کے تہواروں پر سیف الدین اپنے پرس کا منہ پورا ہی کھول دیتے۔ بچوں کی پسند کے کپڑے، جوتے اور دوسری چیزیں۔ بیگم اپنے لیے کفایت سے خریداری کرنا چاہتیں تو سیف الدین خفا ہونے لگتے۔ ”ارے بھی کوئی برانڈ سوٹ لو اپنے لیے۔“

”نہیں، بس یہی ٹھیک ہے۔“ بیگم کہتیں۔

”یہی ٹھیک نہیں ہے نا..... کنبجوسی مت کرو..... میں آخر کما تا کس کے لیے ہوں۔“ سیف الدین سرگوشی کرتے۔

ماہانہ اور ہفتہ وار سودا سلف کے علاوہ بھی سیف الدین گروسری کی خریداری کے لیے ہفتے میں ایک آدھ چکر اپنی رہائش گاہ کے نزدیک واقع منی گروسری مارکیٹ کا بھی لگا لیتے۔ مٹی تو چھوٹی سی مارکیٹ لیکن وہاں ایسی چیزیں بھی مل جاتیں جو ہفتہ وار بازار میں دستیاب نہ ہوتیں اور اگر ملتیں تو خالص نہ ہوتیں۔ سیف الدین اس مارکیٹ میں عموماً دیسی انڈوں، دیسی گھی، خالص مکھن اور اسٹور شدہ کسی بے موسمی سبزی یا پھل کی تلاش میں جاتے مگر غیر ضروری چیزیں بھی خرید لاتے۔ بیگم ان کی فضول خرچی پر معترض ہوتیں۔

”ارے بھی کام آجائے گا۔“ سیف الدین کہتے۔

”کام آنے کا کیا ہے۔ انسان جتنا چاہے خرچ کر ڈالے..... کچھ آئندہ کے لیے بھی بچانا چاہیے۔“

”اللہ مالک ہے شاہانہ۔“ وہ بیگم کو تسلی دیتے اور انہیں سمجھاتے۔ ”دیکھو میں نہیں چاہتا کہ تمہیں یا بچوں کو کسی چیز کی تنگی ہو۔“

ایک ایک وقت میں وہ پانچ پانچ سات سات کلو مچھلی خرید لاتے اور بیگم سے کہتے۔ ”ڈیپ فرائی کرنا، بچے شوق سے کھاتے ہیں۔“

بیگم جی ہی جی میں ان کے اسراف پر کڑھتیں۔ آئے دن وہ کسی نہ کسی بہانے کسی نائلہ کو، کبھی شہلا اور کبھی عائکہ کو، کبھی کیف اور اس کی بیوی کو اور کبھی سب کو ایک ساتھ اپنے پاس مدعو کر لیتے۔ کبھی حلیم کی دعوت، کبھی نہاری، کبھی پائے، کبھی مچھلی تو کبھی ساگ اور مٹی کی روٹی۔ عید، بقرعید پر تو سب کا سیف الدین ہی کے ہاں اکٹھے کھانا گویا نہایت ہی ضروری تھا۔ بیگم بہ ظاہر سب سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتیں مگر انہیں سیف الدین کی شاہ خرچیوں پر بہت تاؤ آتا۔ مہینے کے آخر تک ساری تنخواہ ٹھکانے لگی ہوتی.....

بھلا وہ اپنے بال بچوں کے معاملے میں خست کیسے دکھا سکتے تھے۔ بیگم کسی ایک چیز کی ضرورت ظاہر کرتیں، وہ دولا حاضر کرتے۔ بچے ایک فرمائش کرتے، وہ اصرار کر کے ان سے تین فرمائشیں مزید اگھواتے۔

سیف الدین کے ہاں روزمرہ استعمال کی چیزوں کی ریل پیل رہتی۔ فرنیچ ایشیائے خورونوش سے بھر رہتا۔ بن بلائے مہمان بھی گھر آجاتے تو بیگم کو ان کی خاطر تواضع کے لیے ہراساں نہ ہونا پڑتا۔ آئے دن بھائی بہنوں کی دعوتیں ہوتیں۔ انہیں اور ان کے بچوں کو لینا دینا ہوتا۔ آج اس کی سا لگرہ تو اگلے مہینے کسی اور کا جنم دن۔ کوئی پاس ہو رہا ہے، کسی کو نیا موبائل درکار ہے، کبھی عیدی، کبھی بقرعیدی، غرض ایک نہیں سو طرح کے خرچے اور سیف الدین کا ہاتھ دینے کو تیار۔ رشتے داروں اور احباب واقارب کو دینے کے معاملے میں بھی سیف الدین اپنا دل کھلا رکھتے۔

ہر ماہ تنخواہ اکاؤنٹ میں آجانے کے بعد سیف الدین ماہانہ سودا سلف کی خریداری کے لیے بیگم کے ہمراہ اپنے پسندیدہ گروسری اسٹور جاتے اور ڈھیروں ڈھیروں گروسری خرید لاتے۔ وہ چیزیں بھی جو گھر میں پہلے ہی موجود ہوتیں مزید خرید لیتے، بیگم ٹوکتیں۔ ”یہ ہے نا گھر میں۔“

”ارے بھی کام آجائے گا..... جو گھر میں موجود ہے وہ ختم ہو جائے گا، تب بھی تو خریدو گی نا۔“

ماہانہ سودا سلف کی خریداری کے علاوہ ہر ہفتے اتوار بازار جانا بھی لازم تھا۔ سبزی، پھل، گائے، بکرے اور مرغی کا گوشت، مچھلی، انڈے اور جانے کیا کچھ۔ گاڑی کی ڈکی لد پھند جاتی۔ بیگم کو گزشتہ ہفتے کی باقی ماندہ سبزی اور پھل سروٹ کوارٹر میں دینے پڑتے۔

”آپ ناحق اتنا کچھ خرید لیتے ہیں۔ پچھلے ہفتے کی سبزی پڑی تھی نا، کیا ضرورت تھی مزید خریدنے کی۔ سروٹ میں دینا پڑی۔“ بیگم کہتیں۔

”ارے بھی ان کا بھی تو حق ہے نا ہم پر..... وہ بے چاری تمہارا ہاتھ بٹاتی ہے گھر کے کام میں۔“

”تو کیا ہوا، مفت رہتے بھی تو ہیں ہمارے سروٹ میں..... آس پاس لوگوں نے کئی کئی ہزار کرائے پر اٹھا رکھے ہیں اپنے سروٹ کوارٹر۔“

”غلط ہے۔“

سیف الدین بچوں کو شاپنگ کرانے لے جاتے تو ان کی موجیں ہو جاتیں۔ بچے جس چیز پر ہاتھ رکھ دیتے خریدنا لازم ہو جاتا۔ بیگم کسی چیز کے مہنگی یا غیر ضروری



کے بچے اچھے تھے جو سستے زمانے میں پڑھ لکھ گئے۔ اب تو یہ عالم تھا کہ سیف الدین کی آدمی سے زیادہ پنشن بچوں کی فیسوں اور دیگر تعلیمی اخراجات پر اٹھ جاتی۔ اگلے ماہ کی پنشن کا انتظار مشکل ہو جاتا۔

سیف الدین کی ریٹائرمنٹ کیا ہوئی، ان کا اور ان کے بال بچوں کی زندگی کا قرینہ ہی بدل گیا۔ اب نہ وہ پہلے کی سی شاہ خرچیاں رہیں، نہ بھائی بہنوں پر سیف الدین کے وہ اللے تلے۔ اپنا ہی گزارہ مشکل ہو گیا تھا۔ ایک بچے کی فیس جاتی تو دو کی سرپر آن کھڑی ہوتی۔ کسی کو یونیفارم کا دوسرا جوڑا درکار ہوتا تو کسی کا جوتا پھٹ گیا ہوتا۔ کسی کو شرح کی ضرورت ہوتی تو کسی کو سائنٹفک کیلکولیٹر کی۔ کبھی چائے کی پتی کم پڑ جاتی، کبھی ٹیٹرا پیک دودھ مہینا ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا۔ کبھی خوردنی تیل کم تو کبھی چولہے پر تو ادھرا ہوتا اور گیس سلینڈر ہری جھنڈی دکھا جاتا۔ بیگم کو وقت بے وقت آتے مہمان برے لگتے تو سیف الدین گھر آئے مہمانوں کی آمد پر پہلے کی طرح ان کی خاطر مدارات نہ کر سکنے پر خجل جھل سے پھرتے۔ بیگم اور بچوں کے ساتھ بازار جانا پڑتا تو سیف الدین چپکے چپکے اپنی جیب ہی مٹولے جاتے۔ جب اپنے بچوں پر خرچ کرنے اور ان کی خواہشات و ضروریات پوری کرنے کا اصل وقت آیا تو ان کی جیب ہی ہلکی ہو گئی تھی۔ بچے ان کا منہ نکلتے اور وہ جھینپ کر نظریں چرا لیتے۔ جب بچے نا سمجھ تھے تو وہ ان کی ضرورتوں پر اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کیا کرتے تھے۔ اب جب وہ کچھ دار تھے تو وہ ان کی جائز ضروریات بھی کما حقہ پوری کرنے سے قاصر تھے۔ بہنیں، بھائی اور ان کے بچے جن پر سیف الدین نے بے دریغ اپنے مالی وسائل صرف کیے تھے، کبھی بھولے سے بھی سیف الدین کی عنایتوں کا ذکر نہ کرتے۔ وہ سب مطمئن اور خوش تھے۔ سیف الدین گھانٹے میں رہ گئے تھے۔ اگر انہوں نے بہن بھائیوں کے چکر میں تاخیر سے شادی نہ کی ہوتی تو آج ان کے بچے بھی ناکلہ، شہلا اور کیف کے بچوں کی طرح اپنی اپنی منزلوں سے ہمکنار ہو چکے ہوتے یا منزلوں پہنچنے والے ہوتے۔

سیف الدین کی بیگم اب کبھی کبھی زبان کھولتی تھیں۔ ”آپ نے اپنے بچوں کے لیے بھی کچھ بچا کھو گیا ہوتا تو آج ہمیں مشکل وقت نہ دیکھنا پڑتا۔“ وہ اکثر سیف الدین سے کہتیں۔

”کوئی بات نہیں گزر جائے گا یہ وقت بھی۔“ بیگم الدین بیگم کو تسلی دیتے۔

بچت صفر!

مگر سیف الدین کو تنخواہ ختم ہو جانے کا نہ ملال ہوتا نہ آئندہ کی فکر ستاتی۔ ہاتھ کھول کر کھلے دل سے خرچ کرتا ان کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ مستقبل کے لیے ان کی امید ملازمت سے ریٹائرمنٹ پر کمیونیشن کی مد میں ملنے والی یکمشت رقم اور ماہانہ پنشن تھی۔

ریٹائرمنٹ سے تقریباً دو سال قبل سیف الدین کی ترقی بیسویں گریڈ میں ہو گئی۔ گھر کے باہر نئی تختی لگ گئی۔

☆☆☆

دو سال پلک جھپکتے میں گزرے۔ سیف الدین سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ ان کے چار بچوں میں سے ایک کالج میں پانچ چکا تھا۔ باقی تین بچے اسکول کے مختلف درجوں میں تھے۔ چاروں میں سے کوئی بھی ابھی خود کفالت کی منزل کو نہ پہنچا تھا جبکہ سیف الدین سے چھوٹی دونوں بہنوں کے بچوں کی شادیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ ناکلہ نے اپنے بڑے بیٹے کی شادی کر دی تھی، بیٹی کو بھی اس کے گھر کا کر دیا تھا۔ چھوٹا یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ شہلا نے اپنے چار بچوں میں سے دو کی شادی کر دی تھی۔ کیف کا ایک بیٹا انجینئرنگ کر رہا تھا، دوسرا کالج میں سال دوم کا طالب علم تھا۔ سیف الدین کے بچوں کی شادی، منگنی ابھی دور کی بات تھی۔ تاخیر سے شادی کرنے کے باعث سیف الدین گھانٹے میں رہ گئے تھے۔ ان کے بچوں میں سے کوئی ابھی سرکاری ملازمت کا اہل بھی نہ تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد فقط چھ ماہ اور وہ سرکاری رہائش گاہ میں رہ سکتے تھے۔ پھر انہیں سرکاری اقامت گاہ چھوڑنا ہی چھوڑنا تھی۔

ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں سرکاری خزانے سے جو واجبات ملے، اس رقم سے اسلام آباد میں کوئی مکان خریدنا تو درکنار پانچ مرلہ قطعہ زمین بھی نہ خریدا جاسکتا تھا۔ کافی تلاش کے بعد مضامقات میں واقع ایک چارمرلے کا مکان ملا جہاں نہ صاف پانی میسر تھا، نہ گیس کی سہولت، نہ نکاسی آب کا مناسب بندوبست، نہ روزمرہ کچرا ٹھکانے لگانے کا انتظام۔ گھروں سے باہر پھینکا جانے والا کوڑا کرکٹ کچی گلیوں میں اڑتا بھٹکتا پھرتا۔ اس علاقے میں آکر سیف الدین کی بیگم اور بچوں کو دونوں سرکاری کوشی کی یاد ستاتی رہی۔

سیف الدین کی پنشن معقول مقرر ہوئی مگر کمر توڑ مہنگائی اور بچوں کے ہوش ربا تعلیمی اخراجات نے ان کی پنشن کا منہ چڑا دیا۔ کبھی سیکڑوں میں ادا کی جانے والی فیسیں اب ہزاروں تک جا پہنچی تھیں۔ ناکلہ، شہلا اور کیف



کینیڈا چلے گئے تھے۔ پہلے تعلیم حاصل کرنے پھر مستقل وہیں کے ہو رہے کے لیے۔ ماں باپ چھ مہینے ان کے پاس رہتے چھ مہینے یہاں اور وہاں گزارے جانے والے چھ مہینوں میں اپنی ایسی اور ہالنگ کرا کے آتے کہ یہاں گزارے جانے والے چھ مہینے بھی وہاں سے کم عیش میں نہ رہتے۔ جن کے بچے باہر نہ گئے تھے، یہیں تھے، وہ بھی اچھے اور سستے وقت میں والدین کی کفایت شعاری کے مزے لے رہے تھے۔ ایک مکان میں رہائش دوسرا کرائے پر۔ اتنی آمدن ہو جاتی جو باپ ہی نہیں بچوں بلکہ بعض کیسز میں تو بچوں کے بچوں کو بھی بزرگوار کی عاقبت اندیشی سے مستفید و مستفیض کرتی۔ بعض عاقبت اندیشوں نے تو پلازے کھڑے کر لیے تھے۔ نیچے دکانیں اوپر رہائش۔ ایک ایک دکان سے ہزاروں کی آمدنی ہوتی جو لاکھوں تک جا پہنچتی۔

کولیکز اور دوستوں سے قطع نظر سیف الدین کے اپنے بہن بھائی بھی کم فائدے میں نہ تھے۔ کیف کی اچھے وقتوں میں خیاسوشی سے کی گئی سرمایہ کاری آج کروڑوں کا حساب دیتی تھی۔ وہ بڑے فخر سے بتاتا تھا فتح جنگ میں چار کنال کا پلاٹ، بحر یہ فیڑیٹ میں کنال کا پلاٹ، غوری میں دس مرلے کا مکان، آئی فورٹین میں پانچ مرلہ پلاٹ اور گوادر میں کوڑیوں کے مول خریدا ایک ایکڑ رقبہ!..... نانکہ نے پرائم منسٹر ہاؤسنگ اسکیم میں ایک اپارٹمنٹ لے رکھا تھا۔ سوان گارڈن میں دس مرلے کا پلاٹ، فراش ٹاؤن میں مکان جو کرائے پر اٹھا رکھا تھا اور خود جس سرکاری مکان میں رہ رہی تھی، اس کے ٹخن میں دو کمرے، کچن اور باتھ روم بنا کر پچھلے رخ پر دروازہ نکال کر اسے بھی کرائے پر چڑھا رکھا تھا۔ عائلہ کا سسرالی گھر توجی ایون میں تھا مگر اس نے اپنی جیب سے ایک نئی تعمیراتی منصوبے میں دس مرلے کا پلاٹ بک کر لیا تھا اور اب اس کی سہ ماہی اقساط ادا کر رہی تھی۔ شہلا کامیاں تو تھا ہی کاروباری آدمی۔ وہ ہمیشہ ایک کے چار بنانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ ماشاء اللہ بڑی ریل ٹیکس تھی۔ رہا طیف تو وہ بھی مزے میں تھا۔ اسے برطانوی شہریت اور اس کے ساتھ بہت سی مراعات مل گئی تھیں۔ ”مینڈ ٹو ماؤتھ“ تھے تو سیف الدین اور ان کے اہل خانہ۔

ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد سیف الدین کا زیادہ وقت گھر ہی میں گزرتا یا پھر بیچ وقت نماز کے لیے قریبی مسجد میں۔ گاڑی اب ضرورتاً ہی استعمال کی جاتی۔ پنشن لینے کے لیے بینک جانے کو کفایت کی خاطر بینک سے

”ہاں گزرتو جائے گا مگر کاش آپ نے بچوں کے مستقبل کے لیے بھی کچھ منصوبہ بندی کر لی ہوتی۔“  
”ہو جائے گا انشاء اللہ سب ہو جائے گا۔“  
”اچھے وقت میں کچھ بچت کر لی ہوتی تو آج کام آتی مگر آپ نے تو جو کمایا، اپنے بہن بھائیوں پر لٹا دیا۔“  
”ان کا مجھ پر حق تھا شاہانہ۔“ سیف الدین تحمل مزاجی سے کہتے۔

”ایک بس آپ ہی پر حق تھا، کسی اور کی تو جیسے کوئی ذمے داری ہی نہیں تھی۔“ بیگم کے مزاج میں اب تیزی کے ساتھ کچھ تکی اور درستی بھی آگئی تھی۔  
”خدا جسے چاہے تو تیس دے دے۔“ سیف الدین کہتے۔  
”ہونہر!“ بیگم اپنے سر کو جھٹکتیں اور منہ ہی منہ میں کچھ بد بدانے لگتیں۔ کبھی سیف الدین کو یاد بھی دلاتیں۔  
”عائلہ کی شادی پر یاد ہے نا کیسی خود غرضی دکھائی تھی آپ کے بھائی بہنوں نے۔“

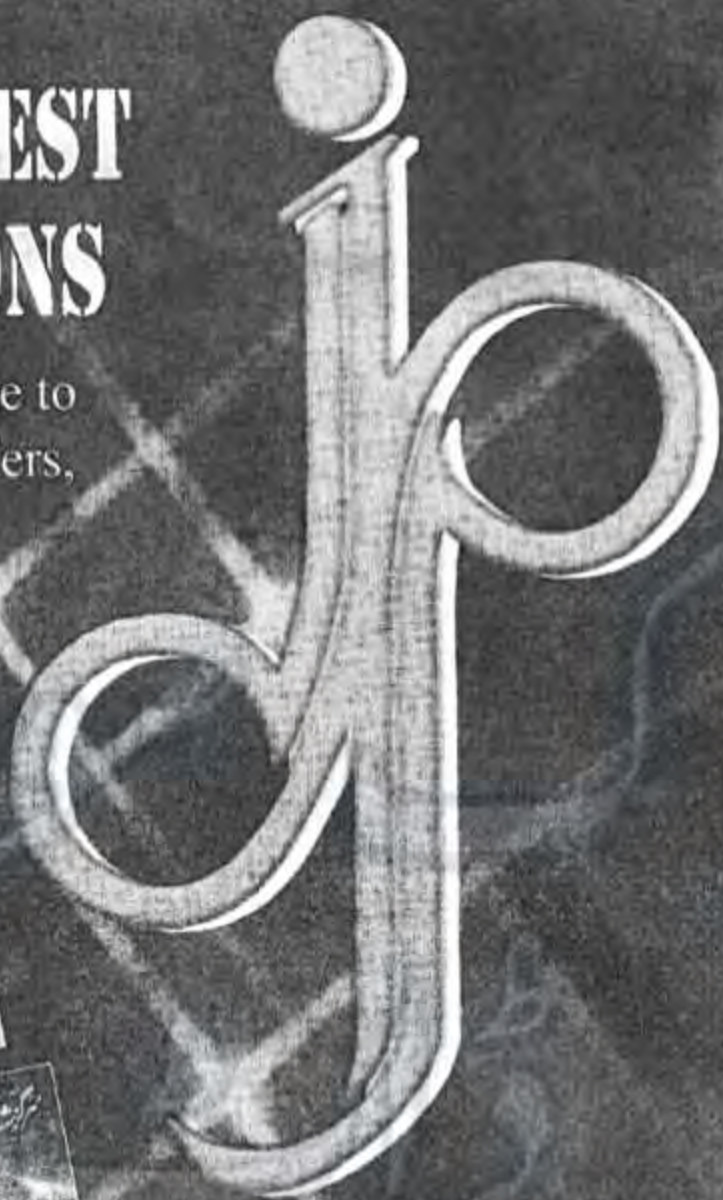
”کوئی بات نہیں۔“ کہنے کو تو سیف الدین کہہ دیتے مگر عائلہ کے سسرال والوں کی فرمائش پر اسے جہیز میں ڈرائنگ ڈائننگ فرنیچر بھی دینے کے لیے بیگم کا زیور بیچ دینے کا نہیں آج تک رنج تھا۔ نیت تھی کہ جیسے ہی ہاتھ پڑا انہیں نیا زیور بنوادیں گے مگر ہاتھ پڑ ہی نہ سکا اور اب تو یہ حال تھا کہ بال بچوں کے ساتھ بازار جاتے تو اکثر بچوں کی ضرورتیں کما حقہ پوری نہ کر سکتے پر جی مسوسے، نظریں جھکائے واپس آجاتے۔ پنشن کہنے کو تو تھیک تھا مگر روز افزوں ضروریات پوری کرنے کے لیے نا کافی تھی۔

اب سیف الدین کو اپنے وہ ساتھی اور احباب یاد آتے جو بچت اور مستقبل کے لیے پس اندازگی اور منفعت بخش منصوبوں میں سرمایہ کاری کے چکر میں رہا کرتے تھے۔ کوئی مضافات میں سستی زمین خرید کر خوش ہوتا، کوئی ترنول کے آس پاس رقبہ لے کر پھولے نہ ساتا، کوئی بحر یہ میں پلاٹ خریدنے کے لیے مرا جاتا تو کوئی ہائی وے پر پھلنے پھولنے والے رہائشی منصوبوں میں ایک کے بعد دوسرا پلاٹ خریدنے کے لیے بیسی جھاتا اور خود پہلی کمیٹی لے کر پھولے نہ ساتا۔ سیف الدین کے دفتر کے لوگوں میں چودہ، سولہ اور سترہ گریڈ میں سبکدوش ہونے والے ریٹائرڈ ملازمین بھی آج ان سے اچھے علاقوں اور تمام سہولیات سے مزین مکانوں میں رہ رہے تھے۔ ان کے بچوں کی ضروریات بھی خوب پوری ہو رہی تھیں اور وہ خود بھی مطمئن و سرور تھے۔ بعضوں کے تو بچے انگلستان، آسٹریلیا اور



# JASOOSI DIGEST PUBLICATIONS

Convey Your Message to  
Millions of Our Readers,  
World Wide  
Through



JASOOSI DIGEST    SUSPENSE DIGEST    MONTHLY PAKEEZA    MONTHLY SARGUZASHT

63-C, PHASE II EXTN., D.H.A., MAIN KORANGI ROAD, KARACHI 75500-PAKISTAN.  
PHONES : (92-21) 35802552-35804200-35895313 FAX : (92-21) 5802551  
Email : jdpgroup@hotmail.com



واپسی پر ماہانہ سودا سلف خریدتے ہوئے آنے کو، اتوار کے بجائے علاقے میں جمعے کو لگنے والے بازار سے ہفتہ وار سامان خریدنے کے لیے، خدا نخواستہ اہل خانہ میں سے کسی کے بیمار ہونے پر ڈاکٹر کے ہاں یا اسپتال لے جانے کے لیے یا پھر کبھی کبھار کسی رشتے دار یا احباب کے ہاں جانے پر۔ سیف الدین، بیگم اور بچے اپنی عمومی ضرورتوں کے لیے پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرتے۔

سیف الدین پنشن لینے کے لیے بینک جاتے تو بیگم اور کبھی کبھار کوئی بچہ بھی بشرط چھٹی ان کے ہمراہ ہوتا، پنشن لینے کے لیے سیف الدین اسی طرح تیار ہو کر جاتے جیسے دوران ملازمت دفتر جایا کرتے تھے۔ اس روز ان کا موڈ بھی غیر معمولی خوشگوار ہوتا۔ کبھی جو پنشن بروقت ان کے اکاؤنٹ میں جمع نہ ہوئی ہوتی تو وہ اور بیگم بڑے اداس سے گھر واپس لوٹتے۔ جیسے کسی میت کا پُرسہ دے کر آرہے ہوں۔ پنشن مل جاتی تو وہ ایک مخصوص ستے اسٹور سے ماہانہ سودا سلف خریدتے ہوئے گھر لوٹتے۔ ماہانہ سودا سلف کی خریداری بہت دیکھ بھال کر اور سوچ سمجھ کر کی جاتی۔ کوئی غیر ضروری یا اضافی خریداری نہیں بس نپاتلا سامان۔ ماضی کی طرح بیگم کو انہیں بار بار اسراف سے بچنے کی تلقین نہ کرنا پڑتی۔ ضرورت کی چیزیں بھی قیمت دیکھ کر خریدی جاتیں بلکہ بعض تو قیمت دیکھ کر واپس ہی رکھ دی جاتیں۔ بچوں کے لیے چاکلیٹ بھی سامان میں شامل کرنے کو بیگم ان سے دہمی آواز میں خصوصی اجازت لیتیں۔ ”ہاں ہاں، لے لو بلکہ ایک اپنے لیے بھی لے لیتا۔“ اس روز شام کی چائے کے لیے پلیم ۱۰ ایک بھی لیا جاتا۔ سودا لے کر گھر جاتے ہوئے راستے میں کسی ریزمی بان پھل فروش سے پھل بھی خرید لیے جاتے۔ پنشن والا دن سیف الدین، بیگم اور بچوں کو نہایت خوشگوار لگتا۔ گھر پہنچ کر سیف الدین حساب کتاب لگانے بیٹھ جاتے۔ چار پانچ سو اخبار کا بل، تین سو کچرا اٹھانے والے آدمی کے، تین سو ٹیوب ویل سے پانی سپلائی کے..... باقی رقم وہ بیگم کے حوالے کر دیتے۔ اس میں مہینے بھر گھر کے اخراجات، بچوں کے تعلیمی مصارف، دکھ، بیماری، کسی کو لینا دینا سب کچھ ہوتا۔ بچوں کے تعلیمی اخراجات کے لیے بیگم نے ایک صندوق رکھی ہوئی تھی۔ ہر ماہ مخصوص رقم اس میں رکھ دیتیں جیب کسی بچے کی فیسیں وغیرہ دینا ہوتیں صندوق میں محفوظ رقم کام آتی۔ باقی پیسے بہت دیکھ دیکھ کر خرچ کیے جاتے۔ بچے اپنی ضرورتوں کا اظہار ماں سے کرتے۔ کبھی ایک کی ضرورت التوا میں رکھ کر

دوسرے کی ضرورت پوری کر دی جاتی۔ کبھی تیسرے کو اگلے مہینے کی آس دلا کر چوتھے کی تلافی کر دی جاتی۔ مہینے کی ابتدائی تاریخیں اطمینان سے گزرتیں پھر بیگم اخراجات کے معاملے میں اپنا ہاتھ کھینچ لیتیں۔ آخری دن تو روتے بسورتے گزرتے۔ مگر صد شکر کہ اگلے ماہ کے آغاز پر پنشن امید بن کر آجاتی سیف الدین کی روز بروز کم ہوتی جسامت دیکھ کر بیگم سوچتیں۔ خدا برے وقت سے بچائے، اگر بچوں کے خود کفیل ہونے سے پہلے خدا نخواستہ سیف الدین نہ ہوئے تو وہ کیا کریں گی۔ خود سیف الدین بھی بیگم اور بچوں کے مستقبل کے بارے میں نہایت فکر مند رہتے۔ سرکار انہیں سرکاری ملازمت سے سبکدوش کر کے گھر بٹھا چکی تھی۔ بقول ان کے اپنا ”میٹ“ گزار کے اب وہ ”ریٹ“ پر تھے۔ کیا پتا اجل کب انہیں زندگی سے بھی سبکدوش کر دیتی۔

☆☆☆

سیف الدین کا اپنے بھائی بہنوں سے ملنا جلتا بھی ان کے دور ملازمت کے مقابلے میں برائے نام رہ گیا تھا۔ وہ خود ان کے ہاں جانے سے اس لیے گریز کرتے کہ جیب پہلے کی طرح لد بھند کر جانے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ انہیں اپنے ہاں اس لیے زیادہ بلانے سے گریزاں رہتے کہ اب پہلے کی سی خاطر داریاں ممکن نہ تھیں۔ بھائی بہنوں کے اپنے پاس ان کے ہاں کم آنے کے لیے ایک ہی بہانہ تھا کہ وہ سب سے کٹ کر بہت دور جا رہے ہیں۔

سیف الدین کو ریٹائر ہوئے پانچ برس گزر چکے تھے۔ ملازمت کا زمانہ تو جیسے یاد بن گیا تھا۔ وہ اکثر خاموش بیٹھے گزرے وقت کو یاد کرتے رہتے۔ ان کا دور افسری بھی کیا زمانہ تھا۔ دفتر جاتے تو ماتحت انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے۔ دوست ملتے تو گر بھوشی سے۔ رشتے داروں میں جاتے تو خوب آؤ بھگت ہوتی۔ بھائی بہنوں کے ہاں جاتے تو ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے اور تو اور جن دکانوں پر ان کا اشیائے ضرورت کی خریداری کے سلسلے میں آنا جانا رہتا تھا، انہیں قدم رنج فرماتے دیکھ کر ان دکانداروں کی باچھیں کھل اٹھتی تھیں۔

اور اب یہ زمانہ تھا۔ شاسا دکانداروں کی دکانوں پر جانا ترک ہو چکا تھا۔ بھائی بہن خال خال ہی ملتے۔ رشتے داروں سے ملنا تقریباً موقوف۔ بہت ہوا تو کسی کی شادی کسی کی مرگ پر مل لیے۔ دوستوں کو نہ یہ بلاتے نہ وہ یاد کرتے۔ دفتر کارا سہ تو جیسے خواب ہی بن گیا تھا۔ اب تو سیف الدین تھے، گہری سوچیں، ٹھنڈی سانسیں، مہینا عزت سے بتانے کی فکر۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایسی سسکتی ریتکتی زندگی کا تو



”میں نے اپنے بہن بھائیوں کو کیا دیا ہے..... آپ نے تو اپنی زندگی دی ہے انہیں..... وقت پر شادی کی ہوتی آپ نے تو آج ہمارے بچوں کے بھی بچے ہوتے۔“

سیف الدین کو اپنے دوست کی بات یاد آئی۔ ”شادی وقت پر ہی اچھی..... دیر سے شادی کر کے آپ گھائے میں رہ گئے۔“

مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وقت کا پہیہ الٹا تو نہیں گھمایا جاسکتا تھا۔ سیف الدین کو قلق تھا تو فقط یہ کہ وہ ساری زندگی بھائی بہنوں اور ان کے بچوں کے لیے نہایت بے غرضی سے کام لیتے رہے مگر ان میں سے کوئی بھی ان کی بچیوں کے لیے بے غرضی سے سوچنے کو تیار دکھائی نہ دیتا تھا جبکہ وہ آج بھی بڑی اپنائیت سے سوچتے تھے۔ زوہیب کسی لائق ہو جائے تو اس کے لیے شہلا کی چھوٹی بیٹی کا رشتہ مانگنے کی ہمت کریں۔

☆☆☆

حسب روایت سیف الدین کے بھائی بہن مع اپنے اپنے اہل خانہ والدہ کی برسی پر انہیں ایصالِ ثواب اور اکٹھے کھانا کھانے کے لیے ان کے گھر میں جمع ہوئے۔ ظہر کے بعد قرآن خوانی ہوئی۔ عصر کے بعد چائے۔

مغرب کے بعد کھانا کھایا گیا پھر سبز چائے کے دوران عشا کی نماز کا وقت ہونے تک گپ شپ ہوتی رہی۔ نائلہ نے جو جلد ہی سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے والی تھی، بعد افطار حاضرین محفل کو بتایا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے نو تعمیر شدہ مکان میں شفٹ ہونے جا رہی تھی۔ اس مکان کی اعلیٰ فنشنگ کے لیے اس نے اسلام آباد میں اپنا اپارٹمنٹ بھی فروخت کر دیا تھا۔ ”بھئی گھر روز روز تھوڑی بنتے ہیں۔ آدی گھر بنائے تو ایسا کہ اس میں رہنے کا بھی مزہ آئے۔ گھر ایسا ہی بنوایا ہے میں نے بھی کہ جو دیکھتا ہے تعریف کرتا ہے۔“ نائلہ نے جو ساٹھ سال کی ہو کر بھی چپاس کی دھتھی تھی، اتراتے ہوئے بتایا۔

”اللہ پھپھو! ہمارے گھر میں تو نہ گیس ہے، نہ پراپر سیوریج سسٹم..... پانی ٹیوب ویل سے آتا ہے اور وہ بھی ایک دن چھوڑ کر۔“ سیف الدین کی چھوٹی بیٹی دردانہ نے اپنی بڑی پھوپھی کی بات رشک سے سننے کے بعد قدرے درد سے اپنے گھر کا نوہ پڑھا۔

نائلہ نے نظر ترچھی کر کے سیف الدین کو دیکھا اور بولی۔ ”برامت ماننے گا بھائی۔“ سیف الدین تعجب سے اسے دیکھنے لگے کہ وہ انہیں کس بات کا برانہ منانے کو کہہ رہی تھی۔ نائلہ کی نظر نیم دائرے میں گھومتی دردانہ پر آرکی اور

سیف الدین نے تصور بھی نہیں کیا تھا کبھی۔ انہیں اپنے دوست کی بات اکثر یاد آتی۔ ”دیر سے شادی کر کے آپ گھائے میں رہ گئے۔“

سیف الدین کو اپنے گھائے کی فکر نہیں تھی۔ فکر تھی تو بچوں کے اپنی اپنی منزل پر پہنچنے کی۔ بڑا بیٹا زوہیب ابھی یونیورسٹی میں تھا۔ بیٹی فرحانہ کالج میں تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ یونیورسٹی کی بھاری فیس نے اسے یونیورسٹی میں داخل کرانے کی اجازت ہی نہ دی تھی۔ رو دھو کر بی ایس سی کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ چھوٹا بیٹا شاہ زیب فرسٹ ایئر میں تھا۔ آخری اولاد دردانہ دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ انجانے لوگ سیف الدین کو ان کے آخری دو بچوں کا دادا باور کرنے میں دیر نہ کرتے۔

روز بروز اپنے وجود میں سرایت کرتی کمزوری کے باعث سیف الدین ہر نماز کے بعد اپنے رب کے حضور اپنی درازی عمر کے لیے گڑ گڑاتے۔ اپنے دونوں ہاتھ بارگاہِ ایزدی میں بلند کر کے اور سر کو نہایت خشوع و خضوع سے جھکا کر وہ اپنے رب سے کہتے۔ ”پروردگارا! جب تک دونوں بچے اپنے پیروں پر نہیں کھڑے ہو جاتے اور بچیاں اپنے اپنے گھر کی نہیں ہو جاتیں، مجھے ان کے سروں پر سلامت رکھنا میرے مولا!“

بیٹیوں کی انہیں بیٹیوں سے بڑھ کر فکر تھی اور ان کی اس فکر سے ان کے بہن بھائی بھی بخوبی آگاہ تھے۔ نائلہ، شہلا اور کیف تینوں کے ہاں اس عمر کے بیٹے موجود تھے جن سے سیف الدین کی دونوں بچیوں کو نمٹایا جاسکتا تھا مگر تینوں میں سے کبھی کسی نے بھولے سے بھی عندیہ ظاہر نہیں کیا تھا حالانکہ اپنے پرانے سیف الدین کے تینوں ہی بھائی بہنوں کو فی سبیل اللہ یہ مشورہ دیتے رہتے تھے کہ جس بھائی نے ساری زندگی ان پر جان نچھاور کی، اس کی بیٹیوں کو گلے لگانے سے اللہ کی خوشنودی بھی حاصل ہوگی مگر وہ سب ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے۔ سیف الدین کی بیگم کبھی کبھی حسرت و ملال سے کہتیں۔ ”آج ہمارے پاس دھن دولت ہوتی تو آپ کے بہن بھائی چوم چاٹ کر اپنے بچوں سے ہماری بچیوں کے رشتے مانگ لیتے۔“

”کوئی بات نہیں شاہانہ جہاں ان کا مقدر ہوگا یہ دھن دولت کے بغیر بھی چلی جائیں گی۔“ سیف الدین بیگم کو تسلی دیتے۔

”خوب غرض ہیں آپ کے بہن بھائی۔“

”برامت ماننا تمہارے بہن بھائیوں کے ہاں بھی تو بیٹے ہیں۔ انہیں بہن کی بچیوں کا خیال کیوں نہیں آتا؟“



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



پر بہنوں کی بے رحمانہ تنقید سن کر دل گرفتہ ہو گئے تھے اہل محفل پر اپنی دل گرفتگی قطعاً ظاہر کیے بغیر نہایت تحمل سے شریک محفل رہے۔ محفل برخاست ہوئی تو مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد بیگم اور دونوں بیٹیاں کچن کی صفائی ستھرائی میں لگ گئیں، دونوں بیٹے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ سیف الدین جماعت کا وقت نکل جانے کے باعث گھر میں ہی عشا کی نماز پڑھ کر بستر پر لیٹ گئے۔ طبیعت نہایت پڑمردہ تھی۔ بہنوں کی باتیں اور بال بچوں کی نگاہیں انہیں رہ رہ کر یاد آ رہی تھیں اور مضطرب کر رہی تھیں۔

بیگم کچن سے فارغ ہو کر کمرے میں آئیں تو انہوں نے یوں ظاہر کیا جیسے سو چکے ہیں۔ بیگم نے بتی بجھائی اور دھیرے سے ”ہائے“ کہتی بستر پر لیٹ گئیں۔ ان کے منہ سے ”ہائے“ نکلتا ان کی تسکین کا غماز تھا۔ گنجائش ہوتی تو سیف الدین بیگم کا ہاتھ بنانے کے لیے ایک ملازمہ رکھتے اور انہیں تسکین نہ ہونے دیتے مگر اب اتنی گنجائش ہی نہ تھی۔

رات گئے تک سیف الدین بہنوں کی تنقید اور بال بچوں کی نگاہوں کے نرنے میں رہے۔ کبھی نانکہ، شہلا اور عالمہ کی باتوں کی بازگشت انہیں بے چین کرنے لگتی۔ کبھی بیگم اور بچوں کی متعجب اور سوالیہ نگاہیں انہیں کڑوٹ بدلنے پر مجبور کر دیتیں۔ آوازوں اور نگاہوں کی اس آنکھ بھولی میں ایک نو عمر لڑکا کبھی ماں کے ہاتھ کی توڑی اور سکھائی ہوئی مونگ اور مسور کی دال کی بڑیاں کپڑے کی ایک تھیلی میں ڈالے ایک بازار میں دکان در دکان جھانکتا یہ پوچھتا ان کے تصور میں در آتا ”بڑیاں چاہئیں؟“ بعض دکاندار اس سے بڑیاں لے لیتے اور پیسے لینے کے لیے بعد میں آنے کو کہتے۔ بعض اسے دیکھتے ہی دھتکار دیتے۔ ”ابے چل نہیں چاہئیں بڑیاں وڑیاں۔“

کبھی یہ نوعمر بچہ لائین کی مدقوق روشنی میں اپنی جواں عمر ماں کے پاس بیٹھا نظر آتا جو ایک پرانی سلائی مشین پر جھکی تویوں اور بنیانوں کو سلائی لگا رہی ہوتی اور وہ بچہ اپنا سبق یاد کرنے کے ساتھ ساتھ ماں کے سے ہوئے تویوں اور بنیانوں کو تہ لگا کر اوپر تلے رکھے جاتا۔

بے رحمی سے تنقید کرتی زبانوں اور حیرانی سے دیکھتی سوالیہ نگاہوں کو کیا معلوم کہ دکانداروں کی دھتکاریں کھاتے اور لائین کی مدقوق روشنی میں سلائی کرتی ماں کے پاس بیٹھے اس بچے نے اپنے آپ سے کیا عہد کیا تھا..... یہ کہ وہ پڑھ لکھ کر اپنی ماں کو سکھ دے گا..... اس کی ساری پریشانیوں دور کر دے گا..... اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو اس دکھ، اس اذیت سے نہیں گزرنے دے گا جس سے وہ خود چھوٹی سی عمر

اس نے دردانہ پر اپنی نظر مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے ابا نے ہم سے کہیں زیادہ کمایا لیکن جو کمایا لٹا دیا..... ایک پر اپر گھر تک نہیں بنا سکے تم لوگوں کے لیے۔“ سیف الدین دم بخود ہو کر نانکہ کو اور سیف الدین کے بال بچے انہیں دیکھنے لگے۔ ابھی یہ منظر برقرار ہی تھا کہ ایک جانب سے شہلا کی آواز سنائی دی۔ ”ہاں واقعی بھائی نے فضول خرچی بہت کی ہے۔“

سیف الدین نے شہلا کو شہلا کی طرف دیکھا۔ ”ایسی ویسی! بھائی کا ہاتھ تو ان کی جیب سے باہر نکلتا ہی نہیں تھا۔“ عالمہ بھی پیچھے نہ رہی، اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ ”انسان کو اچھی زندگی گزارنے کے لیے کوئی نہ کوئی پلاننگ کرنا پڑتی ہے..... ہم نے تو پلاننگ کی اور الحمد للہ بہت سکھی رہے۔“ نانکہ نے دانشوری جھاڑی پھر دوبارہ دردانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! تمہارے ابا میں گریڈ کے افسر تھے، کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ہم نے تو پرائیویٹ ہاؤسنگ سوسائٹی میں گھر بنایا ہے۔ ان کے گریڈ کے افسر تو اسلام آباد میں کونھیاں کھڑی کیے بیٹھے ہیں۔ تمہارے ابا نے آنے والے وقت کی پروا ہی نہیں کی، کمایا اور خرچ کر دیا بس..... ورنہ آج تم لوگوں کو اس گاؤں جیسی جگہ رہنے کے بجائے اسلام آباد کے کسی پراپر سیکٹر میں نہ سہی، کسی پرائیویٹ ہاؤسنگ اسکیم میں ہی سہی ساری سہولتوں والا گھر میسر ہوتا..... بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے آدمی کو اللہ تعلقوں سے گریز کرنا پڑتا ہے۔ اپنے دل کی بہت سی خواہشوں کو مارنا پڑتا ہے..... یہ نہیں کہ جو ہاتھ میں آیا خرچ کیا اور ہاتھ جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک ایک پیسہ دانتوں سے دبا کر رکھنا پڑتا ہے تب کہیں انسان اپنے بچوں کو اچھا مستقبل دے پاتا ہے..... تمہارے ابا نے تم لوگوں کے لیے کچھ نہیں بنایا۔“

”آپا بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ عالمہ نے تائید کی۔ ”خرچ کرنے کا کیا ہے..... خرچ کرنے پر آؤ تو قارون کے خزانے ختم ہو جاتے ہیں۔“ شہلانے کہا۔

سیف الدین نے کن آنکھیوں سے بیگم اور بچوں کی طرف دیکھا۔ بچے جنہیں ان کی بیگم ان کے بچپن سے اب تک ان کے باپ کے اپنی بیشتر کمائی اپنے بہن بھائیوں پر لٹا دینے کے قصے سناتی رہی تھیں، ہکا بکا بھی باپ کو بھی اپنی ماں کو دکھ رہے تھے۔

کیف کی بیوی کبھی تندوں اور کبھی جیٹھ اور ان کے بال بچوں کا چپ چاپ جائزہ لے رہی تھی۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ محفل کی برخواستگی تک سیف الدین جو خود



مگر بہن بھائیوں کی ساری ذمے داری صرف آپ ہی کی نہیں تھی، باقی بہن بھائیوں کے بھی کچھ فرانس اور ذمے داریاں تھیں..... سب نے اپنی اپنی پوٹ باندھ کر رکھی بس آپ ہی کو قربانی کا بکرا بنائے رکھا..... نانکھ اور عالمہ نہیں کمانی تھیں کیا..... کیف اور طیف کی کوئی ذمے داری کچھ فرض نہیں تھا کیا..... عالمہ کی شادی کے موقع پر دیکھا تھا کیسے ہری جھنڈی دکھا دی تھی سب نے اور خود عالمہ کے توکانوں پر جوں تک نہیں رہ گئی تھی۔

”خدا کا شکر ہے کہ اس نے عزت سے گزر وادی..... افسوس مجھے یہ ہے کہ تمہیں زیور دوبارہ نہیں بنا کر دے سکا۔“  
”مجھے تو ذرا بھی افسوس نہیں۔“

سیف الدین نے انہیں کچھ اس طرح دیکھا جیسے ان کی بات کا یقین نہ کر پائے ہوں۔  
”سچ کہہ رہی ہوں۔“ بیگم بولیں۔

”مجھے افسوس ہے کہ جب میرے اپنے بچوں کا وقت آیا تو میں انہیں وہ سب کچھ نہیں دے سکا جو ان کا حق تھا..... اور اب ضرورت ہے۔“ سیف الدین نے چھوٹے سے گھر کے طول و عرض میں نہایت حسرت سے نظریں دوڑائیں اور دل گرفتہ لہجے میں بولے۔

”نانکھ ٹھیک تو کہتی ہے۔ ایک پر اپر گھر تک نہیں دے سکا میں اپنے بچوں کو۔“

سیف الدین کے بچوں نے اپنے باپ کو اتنا دل گرفتہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بیگم جو ساری زندگی ایک اچھی شریک سفر کی طرح سیف الدین کی ہم قدم رہی تھیں، انہیں آزرہ دیکھ کر ان کا بازو چھوتے ہوئے بولیں۔

”ارے چھوڑیں..... آپ بھی دوسروں کی باتوں میں آگئے..... جیسا کبھی ہے ہمیں تو اپنا گھر سب سے اچھا لگتا ہے۔“

”جانتا ہوں..... میرا دل رکھنے کو کہہ رہی ہو۔“  
سیف الدین بڑے تھکے تھکے انداز میں مسکرائے۔

”اجی اہم آپ کا دل کیا رکھیں گے..... آپ کا دل تو آپ کے بہن بھائیوں کے پاس رکھا ہے۔“ بیگم کی بات میں معافی کی دنیا بسی تھی۔

”آدمی کو پورا نہ سہی تھوڑا خود غرض ضرور ہونا چاہیے۔“ سیف الدین کے لہجے میں ملال تھا۔

”بچوں کو الٹی پٹی مت پڑھائیے.....“ بیگم نے توقف کیا پھر بولیں۔ ”سچ کہیے، آپ نے بے غرض رہ کر جو کچھ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے لیے کیا، اس سے آپ کے دل کو حاصل طمانیت کا کوئی مول ہو سکتا ہے؟“  
سیف الدین چپ رہے۔

اس بچے نے اپنے آپ سے کیا ہوا عہد نبھانے میں ممکنہ حد تک کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی..... جوش تکمیل آرزو میں وہ اپنی حدوں سے گزر گیا تھا..... اور یہی اس کی غلطی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح ہفتہ واری تعطیل تھی۔ سیف الدین اور ان کے اہل خانہ اکٹھے ناشتا کرنے بیٹھے تو ناشتے کے دوران بیگم نے قدرے محتاط لہجے میں سیف الدین سے کہا۔ ”رات آپ نے اپنی بہنوں کی باتیں سنی تھیں؟“

”ہاں۔“ سیف الدین نے جواب دیا۔  
”کچھ کہا نہیں آپ نے ان کی باتیں سن کر۔“ بیگم بولیں۔

”کچھ کہنے کو ہوتا تو کہتا۔“ سیف الدین نے بیگم اور بچوں سے نظریں چرا رکھی تھیں۔  
”کہنے کو تو خیر بہت کچھ تھا۔“ بیگم نے کہا۔

”ہاں ابو۔“ بڑی بیٹی فرحانہ بولی۔ ”آپ کو کہنا تو چاہیے تھا ان لوگوں سے کہ انہیں اس مقام پر آپ ہی نے تو پہنچایا ہے۔“

”بری بات پینا..... پھوٹی ہیں تمہاری۔“ سیف الدین نے بیٹی کو سرزنش کی۔ وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

”یہ غلط تو نہیں کہہ رہی۔“ بیگم نے فرحانہ کی حمایت کی۔  
”غلط وہ لوگ بھی نہیں کہہ رہی تھیں۔“ سیف الدین نے بہنوں کی یابت کہا۔

”کیا مطلب؟“ بیگم نے نظریں ترچھی کر کے انہیں چونک کر دیکھا۔  
”میں نے جو کمایا لٹا دیا۔“ سیف الدین نے اعتراف جرم کے انداز میں کہا۔

”کس پر.....!“ بیگم نے پھر اسی طور سیف الدین کو دیکھا۔ ”کس پر لٹایا!“ ایک پل کے توقف کے بعد وہ مزید بولیں۔ ”اپنے بہن بھائیوں پر ہی نا..... انہی پر جو رات بڑھ بڑھ کر بول رہی تھیں۔“

”تھوڑا بہت تو میں نے تمہارے اور بچوں کے لیے بھی کیا۔“ سیف الدین نے دلی زبان سے کہا۔

”مگر ہم احسان فراموش نہیں..... بچوں کو خود بھی یاد ہے اور میں بھی انہیں بتاتی رہتی ہوں کہ جب تمہارے ابا کا اچھا وقت تھا تو انہوں نے ہمیں بھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی..... اچھا کھلایا، اچھا پہنایا۔“ بیگم کا لہجہ اب دھیما تھا۔

”کوئی احسان نہیں کیا..... یہ میرا فرض تھا۔“ سیف الدین بولے۔



کے جوش میں، میں اسراف کی غلطی کر بیٹھا۔ سیف الدین کی نظریں چھوٹی بیٹی دردانہ پر جا رہیں۔ ”دردانہ بیٹی! اسراف کا مطلب جانتی ہوتا؟“

”جی ابو..... فضول خرچی۔“ دردانہ نے بتایا۔  
 ”اپنی حد سے بڑھ کر زائد خرچ کرنا..... چادر سے زیادہ پاؤں پھیلاتا۔“ سیف الدین نے مزید وضاحت کی پھر ایک گہری سانس کھینچ کر بولے۔ ”میری طرح اکثر لوگوں سے یہ غلطی ہوتی ہے..... اچھے وقت میں آئندہ کی فکر نہیں کرتے..... یہ نہیں سوچتے کہ آج اگر خوش حالی ہے تو کل کو خدا نخواستہ تنگ دستی بھی آسکتی ہے..... ہم اپنے مسلمان ہونے کا شکر پیشانی کے بجائے آنکھوں سے سجدے کر کے ادا کریں تو بھی کم ہے..... دین اسلام بھی ہمیں اسراف سے بچنے اور میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے..... ضروری ہے کہ اچھے وقت میں کڑے وقت کی فکر بھی رکھی جائے..... ملازمت کے زمانے میں ریٹائرمنٹ کو بھی یاد رکھنا ضروری ہے، جب مراعات واپس لے لی جاتی ہیں۔ تنخواہ پنشن میں تبدیل ہو جاتی ہے..... وسائل گھٹ جاتے ہیں اور مسائل بڑھ جاتے ہیں..... ہم مستقبل نا اندیش انسانوں سے تو کیڑے مکوڑے اچھے جو اچھے موسم میں سخت موسم کا سامنا کرنے کی تیاری رکھتے ہیں۔“ سیف الدین لہجہ بھر کو چپ ہوئے پھر انہوں نے اپنے بچوں کو دیکھتے ہوئے قدرے دل گرفتگی سے کہا۔ ”میں نے اپنی ملازمت کے دوران ریٹائرمنٹ کی فکر بھی رکھی ہوتی تو شاید میں تم لوگوں کو بہتر گھر اور بہتر سہولیات زندگی فراہم کر سکتا تھا۔“

زویب، سیف الدین کا بڑا بیٹا ان کی دل جوئی کو اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھا اور نہایت احترام سے بولا۔ ”اپنے لیے تو سبھی جیتے ہیں ابا! آپ تو اوروں کے لیے جیے ہیں..... وی فیل پراؤڈ آف یو۔“  
 سیف الدین نے گردن گھما کر نو جوان بیٹے کو دیکھا اور ملول سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ”ٹیک کیئر..... فراخی اور کشاویگی میں تنگی کی..... اور اچھے وقت میں برے وقت کی ضرور فکر کرنا۔“  
 بیگم نے سیف الدین کو بصد محبت دیکھا اور اپنے بچوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”سیف الدین صاحب! ہمارے بچوں کے لیے اس سے اچھا وقت اور کیا ہوگا کہ زندگی کو دیکھنے کے لیے ان کے پاس آپ کے تجربے کی عینک موجود ہے۔“ سیف الدین دھیرے سے مسکرا دیے۔

”اپنے بچوں کو اس طمانیت سے محرومی کا سبق کیوں پڑھانا چاہتے ہیں آپ؟“  
 ”امی ٹھیک کہتی ہیں ابا۔“ زویب نے تائیدی۔  
 ”ہمارا گھر سب سے اچھا ہے!“

”جہاں نہ کسی ڈیم سے آتے صاف پانی کی لائن ہے نہ گیس..... نہ سیوریج سسٹم، نہ کچرا اٹھانے کا منقول بندوبست..... یہ جو کچرے والا کچرا لے جاتا ہے، آس پاس ہی کہیں لے جا کر پھینک دیتا ہے۔ فضا تو آلودہ ہوتی ہے نا۔“  
 ”ارے بھئی محبت تو ہے اس گھر میں۔“ بیگم بولیں۔  
 ”محبت سے ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔“ سیف الدین نے کہا۔

”ابا!“ بڑے بیٹے زویب نے کہا۔ ”ہماری ضرورت صرف آپ ہیں۔“

”یس!“ چھوٹے بیٹے شاہ زیب نے اپنی بائیں ہتھیلی پر دائیں ہاتھ سے مگامارا اور سیف الدین کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”وی جسٹ نیڈ یو اینڈ وی لو یو ابا۔“ شاہ زیب نے اپنا بازو عموداً کھڑا کرتے ہوئے اپنے بھائی بہنوں کو معنی خیز اشارہ دیا۔ تینوں نے اسی کی طرح اپنے بازو عموداً بلند کرتے ہوئے ایک آواز میں کہا۔ ”وی آل لو یو ابا۔“

”میں تو اچھے بیٹھے آپ کی درازی عمر اور صحت کی دعا کرتی ہوں۔“ بیگم کا لفظ لفظ محبت کے جذبے میں ڈوبا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ انہوں نے چند ثانیے توقف کیا پھر چاروں بچوں کو اچھتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”بس ایک غلطی ہوئی تمہارے ابا سے۔“

سیف الدین چونک کر نہیں دیکھنے لگے کہ ہمیشہ ان کا دم بھرنے والی رفیقہ حیات ان کی کس غلطی کا ذکر کر رہی تھیں۔  
 ”کہیں کہیں اسراف کر گئے ہیں۔“

غلطی وہی تھی جس کی نشاندہی نائلہ، شہلا اور عائکہ نے کی تھی۔ فرق تھا تو یہ کہ انہوں نے سیف الدین کے دل پر بے رحمی سے ضرب لگائی تھی۔ بیگم دل سوزی سے زخم کو چھیڑ رہی تھیں۔

”تمہاری امی ٹھیک کہتی ہیں۔“ سیف الدین نے سر جھکا کر اعتراف خطا کیا پھر ذرا حوصلے سے بولے۔ ”ہاں..... یہی غلطی ہوئی مجھ سے۔“ انہوں نے توقف کیا پھر مزید کہا۔ ”ہر آدمی زندگی کو اپنے تجربے کی عینک سے دیکھتا ہے..... میں نے زندگی کو جس عینک سے دیکھا، وہ مجھے یہ بھجاتی تھی کہ اپنے ماں، باپ، بہن بھائیوں کے لیے جو کر سکتے ہو بے عرصی سے کر جاؤ..... اپنی اس آرزو کی تکمیل